BAIS501DST

اسلام ہندوستان میں (یو.جی)

[Islam in India(UG)]

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے۔)

(پانچواں سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-انڈیا

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: Islam in India (UG)
ISBN: 978-81-969329-3-0
First Edition : **January, 2024**

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University
Publication	:	2024
Copies	:	600
Price	:	395/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Mohammad Haziq, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Islam in India (UG)
for
Bachelor of Arts (5th Semester)

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

Editor	ایڈیٹر
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja Assistant Professor (Islamic Studies) DDE, MANUU, Hyderabad	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز) نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Language Editors	**لینگویج ایڈیٹرس**
Dr. Mohammad Haziq *Assistant Professor(Contractual), / Guest Faculty (Islamic Studies), DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی (اسلامک اسٹڈیز)، ڈی ڈی ای، مانو
Dr. Mohd. Akmal Khan *Assistant Professor(Contractual), / Guest Faculty (Urdu), DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد اکمل خان اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی (اردو)، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

Editorial Board	مجلس ادارت
Prof. Abdul Ali *Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh*	پروفیسر عبدالعلی سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. S. M. Azizuddin Husain *Former Head, Dept. of History & Culture JMI, New Delhi*	پروفیسر ایس۔ایم۔عزیزالدین حسین سابق صدر، شعبہ تاریخ وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohammad Ishaque *Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi*	پروفیسر محمد اسحاق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohd. Fahim Akhter *Head, Dept. of Islamic Studies, MANUU*	پروفیسر محمد فہیم اختر صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Ghazanfar Ali Khan *Prof., of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU*	پروفیسر غضنفر علی خان پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja *Asst. Prof., Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Mohammad Haziq *Assistant Professor(Contractual)/ Guest Faculty (Islamic Studies), DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی (اسلامک اسٹڈیز)، ڈی ڈی ای، مانو
Dr. Syeda Amina *Assistant Professor(Contractual)/ Guest Faculty (Islamic Studies), DDE, MANUU*	ڈاکٹر سیدہ آمنہ اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی (اسلامک اسٹڈیز)، ڈی ڈی ای، مانو

کورس کوآرڈی نیٹر

ڈاکٹر عبد المجید قدیر خواجہ، اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	1
ڈاکٹر مزمل کریم، اسسٹنٹ پروفیسر (ٹمپروری) شعبہ عربی، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنو	2
ڈاکٹر شمیم احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تھیالوجی، عالیہ یونیورسٹی، کلکتہ	3،4
ڈاکٹر عاطف عمران ، گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	5،10
ڈاکٹر صالح امین، ریسرچ ایسوسی ایٹ، (ڈی ٹی ایل پی) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	6،7
ڈاکٹر محمد حاذق، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو	8
ڈاکٹر محمد خالد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	9
ڈاکٹر سیدہ آمنہ، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو	11
ڈاکٹر مشتاق تجاروی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	12
ڈاکٹر وحید اللہ ملتانی، سینیر فیکلٹی ممبر، ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد	13
ڈاکٹر عبد السلام، علی گڑھ	14،21
ڈاکٹر رحمت اللہ، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	15
ڈاکٹر محمد عمر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	16،19
ڈاکٹر مسیح اللہ ، گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	17
ڈاکٹر نجم السحر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، دہلی	18
ڈاکٹر محمد اسامہ، گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	20،22
ڈاکٹر عبد الرقیب، حیدرآباد	23،24

پروف ریڈرس:

اول : ڈاکٹر محمد حاذق

دوم : ڈاکٹر سیدہ آمنہ

فائنل : ڈاکٹر عبد المجید قدیر خواجہ

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9

بلاک 1 : اسلام کی آمد

اکائی 1	عرب وہند تعلقات	11
اکائی2	سندھ کی فتح	29
اکائی 3	شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد (آبادیوں کا قیام)	44
اکائی 4	شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد (اسلام کی اشاعت)	58

بلاک 2 :عہد سلطنت

اکائی 5	دہلی سلطنت (قیام واستحکام)	75
اکائی 6	دہلی سلطنت (خاندانی حکومتیں-1)	91
اکائی 7	دہلی سلطنت (خاندانی حکومتیں-2)	108

بلاک 3 : عہد سلطنت

اکائی8	دہلی سلطنت (نظم ونسق)	123
اکائی 9	دہلی سلطنت (علمی خدمات)	137
اکائی 10	دہلی سلطنت (مذہبی رواداری)	155
اکائی11	دہلی سلطنت کے تمدنی احوال	168

بلاک 4 : عہد مغلیہ

اکائی 12	مغل حکومت (قیام واستحکام)	185
اکائی 13	مغل حکومت (اہم حکمراں-1)	203
اکائی 14	مغل حکومت (اہم حکمراں-2)	219
اکائی 15	مغل حکومت (دور زوال)	236

بلاک 5 : عہد مغلیہ

اکائی 16	مغل حکومت (نظم ونسق)	250
اکائی 17	مغل حکومت (مذہبی حالات)	269
اکائی 18	مغل حکومت (علوم کی ترقی)	288
اکائی 19	مغل حکومت (فنون لطیفہ اور فن تعمیر)	301

بلاک 6 : تحریک آزادی

اکائی 20	1857ء کی جنگ آزادی	320
اکائی 21	1857ء کے بعد کے اہم واقعات	337
اکائی 22	جماعت مجاہدین اور ریشمی رومال تحریک	350
اکائی 23	جنگ آزادی میں مسلمانوں کی حصہ داری (حصہ اول)	367
اکائی 24	جنگ آزادی میں مسلمانوں کی حصہ داری (حصہ دوم)	384
	نمونہ امتحانی پرچہ	400

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی ۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج و ترقی(2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی(3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور(4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرزِ تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 161 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹر) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹر) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامیات، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامیات کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامیات کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کرسکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم بی اے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ پانچویں سمسٹر کے اس پرچہ کا عنوان "اسلام ہندوستان میں" ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت بی اے سمسٹر پانچ کے لیے ہے اس پرچہ میں کل چوبیس اکائیاں ہیں جن کو چھ بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان اکائیوں کے تحت آپ کو ہندوستان سے عربوں کے تعلقات اور ہندوستان میں اسلام کی آمد سے واقفیت حاصل ہوگی۔ دہلی سلطنت کا قیام، نظم ونسق اور مذہبی رواداری سے آگاہی حاصل ہوگی۔ اسی طرح مغلیہ حکومت کے قیام وزوال اور نظم ونسق اس کے علاوہ 1857ء کی جنگ اور اس میں مسلمانوں کی خدمات کے بارے میں جانیں گے۔ اس کتاب میں ان سبھی عنوانات سے متعلق تحریری مواد مہیا کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ (الازہری)

کورس کوآرڈی نیٹر

اسلام ہندوستان میں (یو.جی)

[Islam in India (UG)]

اکائی 1: عرب وہند تعلقات

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 عرب وہند تعلقات

1.2.1 عرب وہند تعلقات کا آغاز وارتقا

1.2.2 ہندوستان عربوں کی نظر میں

1.2.3 عرب ہندوستانیوں کی نظر میں

1.2.4 عرب وہند تعلقات کی نوعیت

1.2.5 عرب وہند کے تجارتی تعلقات

1.2.6 عرب وہند کے درمیان کی تجارتی اشیاء اور مقامات

1.3 عرب ہند کے مذہبی وثقافتی اور علمی تعلقات

1.3.1 مذہبی وثقافتی تعلقات

1.3.2 علمی تعلقات

1.4 اکتسابی نتائج

1.5 نمونہ امتحانی سوالات

1.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

عرب و ہند کے علاقے دنیا کے قدیم ترین آباد علاقوں میں ہیں۔ خطہ ارضی کی قدیم ترین انسانی آبادیوں کے نشانات بھی ان علاقوں میں موجود ہیں۔ بحیرہ عرب (یہ بحر ہند کا حصہ ہے) کے کناروں پر آمنے سامنے آباد یہ دونوں علاقے پڑوسی بھی ہیں اور یوں ان کے درمیان ربط و تعلق کا سلسلہ بھی بہت طویل ہے۔ عرب و ہند کے تعلقات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شاید اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ انسانی تاریخ۔ دونوں علاقوں (عرب و ہند) کے درمیان ربط و تعلق خشکی اور تری دونوں راستوں سے قائم رہا ہے اور دونوں ہی علاقوں کے لوگوں کی نو آبادیات بھی مختلف ادوار میں ایک دوسرے کے علاقوں میں قائم ہوتی رہی ہیں۔ تعلقات کی نوعیت اگر ایک طرف تجارتی رہی ہے تو دوسری طرف مذہبی و ثقافتی تعلقات بھی دونوں علاقوں کے درمیان بہت گہرے اور وسیع رہے ہیں۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ عرب وہند کے درمیان کے تاریخی تعلقات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ آپ کو یہ معلوم ہو سکے کہ عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان قدیم زمانے سے کس طرح کے تعلقات رہے ہیں۔ ان کے اس باہمی ربط و تعلق سے دونوں علاقوں کے لوگوں کو اور باقی دنیا کو بھی کس طرح کے تجارتی، ثقافتی، مذہبی اور علمی فوائد پہنچتے رہے ہیں؟ کس طرح ان علاقوں کے توسط سے مشرق بعید سے لے کر مغربی یورپ تک تجارتی اشیاء کی منتقلی ہوتی رہی ہے اور اس طرح دونوں جانب کے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہی ہیں۔ اس اکائی کے بعد آپ کو اسے پڑھ کر یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ دونوں علاقوں کے باشندے کس طرح کا آپس میں میل ملاپ رکھتے ہیں؟ کامیاب تجارت کے علاوہ دونوں کے درمیان علمی و ثقافتی اخذ و استفادے کی نوعیت کیا رہی ہے؟ اور کس طرح دونوں علاقوں کی زبان و ثقافت نے ایک دوسرے کے اثرات قبول کیے ہیں؟

1.2 عرب وہند تعلقات

عرب و ہند کے درمیان تعلقات کو جاننے اور سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اسلامی روایات کے مطابق ان دونوں علاقوں کے تعلقات اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ خود انسانی تاریخ۔ ان روایات کے مطابق حضرت آدمؑ نے جنت سے نکالے جانے کے بعد جس خطہ ارضی پر قدم رنجہ فرمایا وہ ہندوستان کی سرزمین تھی، اسی لیے ہندوستان 'جنت نشان' کہلاتا ہے۔ موجودہ سری لنکا (جسے قدیم ہندوستان کا ہی ایک حصہ باور کیا جاتا ہے) میں کوہ آدم کے نام سے ایک پہاڑ ہے جس کی اوپری سطح پر ایک نقش پا بھی موجود ہے اور اسے حضرت آدمؑ کے پیر کا نشان بتایا جاتا ہے۔ وہاں سے نکل کر آدم پل سے ہوتے ہوئے حضرت آدمؑ جزیرہ عرب میں وارد ہوئے جہاں روایات کے مطابق میدان عرفہ میں ان کی ملاقات حضرت حواؑ سے ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سید سلیمان ندوی کے مطابق 'عرب ہندوستان کو اپنا موروثی پدری وطن مانتے ہیں'۔

تاریخی طور پر بھی اگر دیکھا جائے تو عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تعلقات اسلام کی آمد سے بھی بہت پہلے قائم ہو چکے تھے، ان تعلقات کی تاریخ کم از کم دو ہزار سال قبل مسیح تک پہنچتی ہے۔یعنی عرب وہند تعلقات تقریباً چار ہزار سال قدیم ہیں۔ ان دونوں خطوں کے باشندے ایک دوسرے سے متعارف تھے اور ان کے درمیان باہم تجارت ہوتی تھی۔ یہ تجارت بری اور بحری دونوں راستوں سے ہوتی تھی۔ عرب تاجر ہندوستانی اشیاء کی تجارت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے راستے مشرق بعید کے ملکوں خاص طور پر چینی اشیاء کی تجارت کیا کرتے تھے اور مختلف مقامات پر انہوں نے اپنی نو آبادیات بھی قائم کر لی تھیں۔ اسی طرح ہندوستانی قومیت کے حامل متعدد گروہ عرب کے سواحلی اور دیگر علاقوں میں آمد و رفت رکھتے تھے اور اپنی تجارتی سرگرمیوں اور پیشہ ورانہ مہارتوں کے سبب کئی جگہوں پر آباد بھی ہو گئے تھے۔

جزیرۃ العرب میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد عرب وہند کے تعلقات میں مزید وسعت آئی اور اس کی تاریخی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ اس دوران دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح ہندوستانی علاقوں میں بھی اسلام اور اس کی تعلیمات کا چرچا عام ہوا۔ ہندوستان کے کچھ مذہبی رہنماؤں اور راجوں مہاراجوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں براہ راست یا بالواسطہ معلومات حاصل کیں۔ وہ اسلام کی دعوت سے متاثر بھی ہوئے اور تاریخی مآخذ میں ایسے حوالے بھی ملتے ہیں کہ ان میں سے بعضوں نے اسلام قبول بھی کر لیا۔ دوسری طرف عربی زبان و ادب میں ہندوستان اور اس کے باشندوں کا ذکر قدیم زمانے سے موجود ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے کلام بابرکات میں ہندوستان اور یہاں کے لوگوں کا ذکر خیر ملتا ہے، متعدد احادیث میں ہندوستانی چیزوں اور لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ قرآن مقدس میں بھی ہندوستان کی متعدد اشیاء کے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ آگے چل کر عرب وہند تعلقات کے مزید اثرات اسلامی ادبیات و لفظیات میں نظر آتے ہیں۔

1.2.1 عرب وہند تعلقات کا آغاز وارتقا

ہندوستان اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان گو طویل مسافت ہے، البتہ دونوں بحیرہ عرب کے ساحلوں پر ایک دوسرے کے مقابل واقع ہیں، اس لیے ان کے درمیان پڑوس اور ہم سائیگی کا تعلق بھی ہمیشہ سے قائم ہے۔ عرب وہند کے تعلقات میں سید سلیمان ندوی نے ایک بڑا ہی لطیف نکتہ بیان کیا ہے کہ: دریا کنارے کے ملک فطرتاً تجارتی ہوتے ہیں۔، اس لیے شاید تجارت ہی سب سے پہلا رشتہ تھا جو عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تعلقات کی بنیاد بنا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب وہند کے درمیان تعلقات کا آغاز تجارت سے ہوا جو آگے چل کر گوناں گوں تعلقات میں بدلتا گیا۔ یہاں یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہو گی کہ تاریخ عالم میں بحری تجارت شروع کرنے والی پہلی قوم عرب تھی۔ عربوں میں انہیں عاد ارم (کنعانی) کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ کسی زمانے میں بحرین کے ساحل سے اٹھ کر شام کے ساحل پر آباد ہو گئے تھے۔ قدیم زمانے سے ہی عرب کے یہ تاجر تجارتی مقاصد سے ہندوستان، مشرق بعید کے جزائر اور چین و جاپان تک بحری سفر کیا کرتے تھے اور ان ممالک کی پیداوار اور مصنوعات کو مصر و شام کے راستے سے یورپ کے بازاروں اور منڈیوں میں بغرض تجارت لے جایا کرتے تھے۔ اسی طرح یورپی علاقوں کی مصنوعات اور پیداوار کو ہندوستان، چین، جاپان اور مشرق بعید کے جزیروں تک بھی یہی عرب لے

جاتے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے اس تجارتی راستے کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

”عربوں کا راستہ یہ تھا کہ وہ مصر و شام کے شہروں سے چل کر خشکی بحر احمر (Red Sea) کے کنارے کنارے حجاز کو طے کر کے یمن تک پہنچتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں پر بیٹھ کر کچھ تو افریقہ اور حبشہ کو چلے جاتے تھے اور کچھ وہیں سے سمندر کے کنارے کنارے حضر موت، عمان، بحرین اور عراق کے کناروں کو طے کر کے خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے گزر کر یا تو بلوچستان کی بندر گاہ تیز میں اتر پڑتے تھے یا پھر آگے بڑھ کر سندھ کی بندر گاہ دیبل (کراچی) میں چلے آتے تھے اور پھر آگے بڑھ کر گجرات اور کاٹھیاواڑ کی بندر گاہ تھانہ (بمبئی موجودہ ممبئی) کھمبایت چلے جاتے تھے، پھر آگے بڑھتے تھے اور سمندر سمندر کالی کٹ اور راس کماری پہنچتے تھے اور پھر کبھی مدراس کے کسی کنارے پر ٹھہرتے تھے اور کبھی سراندیپ، انڈمان ہو کر پھر سیدھے مدراس کی مختلف بندر گاہوں پر چکر لگاتے ہوئے خلیج بنگال میں داخل ہو جاتے تھے اور بنگال کی ایک دو بندر گاہوں کو دیکھتے ہوئے برہما(برما) اور سیام (تھائی لینڈ) ہو کر چین چلے جاتے تھے اور پھر اسی راستے سے لوٹ آتے تھے۔“

بحری راستے کے ساتھ ساتھ عرب و ہند کے تعلقات خشکی کے راستے سے بھی عہد قدیم سے قائم تھے البتہ ان تعلقات میں واسطہ ایران تھا۔ خاص طور پر ایرانیوں نے جب عرب علاقوں پر قبضہ کیا تو سندھ و بلوچستان اور موجودہ ہندوستان کے ان کے مقبوضات اور زیر اثر علاقوں سے بہت سے ہندوستانیوں کو عرب علاقوں میں جاکر آباد ہونے اور اپنی بستیاں بسانے کا موقع ملا۔ ہندوستانیوں کی یہ بستیاں عراق سے لے کر یمن تک کے عرب علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ یہاں پر ہندوستانی اشیاء کی تجارت کرنے کے ساتھ جہازوں اور کشتیوں پر ملازمت بھی کرتے تھے۔ قاضی اطہر مبارک پوری کے مطابق عرب علاقوں میں آباد ہندوستانی زط، اساورہ، سیابجہ، احامرہ، مید، بیاسرہ اور تکاکرہ وغیرہ ناموں سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے ناموں کی اس کثرت سے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ عرب علاقوں میں موجود ہندوستانیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ عہد نبوی ﷺ کے آخری سالوں (7 اور 8 ہجری) میں اسلام کی دعوت جب عام ہوئی تو عرب علاقوں میں موجود دوسرے مذہبی گروہوں کی طرح ہندوستانی بھی دعوت اسلام سے واقف ہوئے، ان میں سے کچھ نے اسلام قبول کر لیا اور کچھ صابیوں اور مجوسیوں کی طرح جزیہ دے کر اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ بعد کے ادوار (عہد خلافت راشدہ، عہد بنو امیہ اور عہد بنو عباس) میں ان تعلقات میں مزید وسعت آئی، عرب علاقوں میں موجود ہندوستانی اقوام کے ساتھ صابیوں اور مجوسیوں جیسا معاملہ کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی سر زمین پر محمد بن قاسم کی فتح اور قیام حکومت سے پہلے بھی مختلف اوقات میں مسلمانوں کی متعدد چھوٹی بڑی حکوتیں بھی قائم ہوئیں، ان کی تفصیل قاضی اطہر مبارک پوری کی کتابوں 'اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'، 'ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں' اور 'خلافت راشدہ اور ہندوستان' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

1.2.2 ہندوستان عربوں کی نظر میں

جس خطہ زمین کو آج ہم ہندوستان کے نام سے جانتے ہیں، مسلمانوں کی یہاں آمد سے پہلے اس کا کوئی ایک نام نہیں تھا۔ یہ نام بنیادی طور پر ایرانیوں (اہل فارس) کا دیا ہوا ہے۔ ایرانیوں نے جب اپنی فوجی مہموں کے دوران دریائے سندھ کے علاقے کو فتح کیا تو اس دریا

کو انہوں نے سندھو کو نام دیا (عربوں کی زبان میں اس دریا کا نام مہران ہے) چوں کہ قدیم فارسی اور سنسکرت زبانوں میں 'س' اور 'ہ' کے حروف آپس میں بدل جاتے ہیں اس لیے دریا کو سندھو اور ہندھو دونوں بولا گیا اسی طرح اس دریا کے اطراف کے علاقے کو سندھ اور ہند دونوں ناموں سے جانا گیا۔ البتہ عرب جو سندھ کے علاوہ دوسرے علاقوں سے بھی واقف تھے، انہوں نے سندھ کو تو سندھ ہی رہنے دیا اور اس کے علاوہ علاقوں کو ہند کا نام دیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو سندھ اور ہند عربوں کے نزدیک دو الگ الگ ملک (علاقے) تھے۔ یہ دونوں ملک عرب کے مشرق میں واقع تھے اور عرب و ہند کے بیچ میں ایک بڑا سمندر (بحیرہ عرب) حائل تھا۔ دنیا کے موجودہ سیاسی نقشے کے مطابق اگر ان کی تعیین کی جائے تو موجودہ پاکستان کے تقریباً تمام علاقے اس زمانے میں سندھ کہلاتے تھے اور آج کا تقریباً پورا بھارت (انڈیا) ہند کہلاتا تھا۔ کئی بار ان دونوں علاقوں کو ایک ساتھ بھی ہند کہا جاتا تھا۔ ہندوستان نام بعد کے زمانے میں خیبر کے راستے اس علاقے میں داخل ہونے والی قوموں نے رکھا۔ ایک اور دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ ہند کا لفظ عربوں میں بہت ہی مشہور اور محبوب رہا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے اپنی خواتین کے نام ہند رکھے اور عربی شاعری میں ہند نام کو تقریباً وہی حیثیت حاصل ہے جو فارسی میں لیلی اور شیریں کو۔

1.2.3 عرب ہندوستانیوں کی نظر میں

ہندوستانی بھی عربوں اور عرب دنیا سے اسی طرح واقف تھے جس طرح عرب ہندوستان اور یہاں کے باشندوں سے۔ ہندوستانیوں کا عرب دنیا میں خشکی اور تری دونوں طرح کے راستوں سے آنا جانا تھا اور وہاں ان کی نو آبادیاں بھی موجود تھیں۔ البتہ ابھی تک ایسے ہندوستانی مآخذ کا پتا نہیں ملتا جن میں عربوں کا ذکر ہو، عربوں اور عرب دنیا کے بارے میں ہندوستانی نقطہ نظر جاننے کا ذریعہ بھی ابھی تک عربی مآخذ ہی ہیں۔ خاص طور پر محمد عربی ﷺ کی بعثت کے بعد نئے دین 'اسلام' کا چرچا اور اس پر بحث و گفتگو ہندوستان میں ہوئی اس کے شواہد موجود ہیں۔ حالاں کہ نبی کریم ﷺ کی مکہ کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے معجزہ شق قمر اور ہندوستان میں اس کے مشاہدے کے حوالے سے بھی بعض روایات موجود ہیں البتہ تاریخی طور پر وہ ثابت نہیں ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کی ہجرت مدینہ کے بعد دو مستند واقعات کا ذکر قاضی اطہر مبارک پوری نے کیا ہے۔ ایک سراندیپ کے جوگیوں اور سنیاسیوں کا آپ ﷺ کی خدمت میں معلومات کے لیے وفد بھیجنا اور دوسرا ہندوستان کے ایک راجہ کا آپ ﷺ کی خدمت میں زنجبیل کا تحفہ بھیجنا۔ یہاں ان دونوں واقعات کو انہیں کے حوالے سے مختصراً نقل کیا جاتا ہے۔

سراندیپ کا وفد: روایات کے مطابق سراندیپ کے جوگیوں اور سنیاسیوں کے ایک فرقے کے لوگوں نے جب عرب تاجروں سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں سنا تو تحقیق حال کے لیے اپنے فرقے کے ایک سمجھ دار آدمی کو مدینہ (عرب) بھیجا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے جب یہ شخص مدینہ میں وارد ہوا تو اس وقت تک نبی ﷺ اور آپ کے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکرؓ کا وصال ہو چکا تھا اور حضرت عمرؓ کا زمانہ خلافت تھا۔ اس سنیاسی نے حضرت عمر سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر سمندر کے راستے ہندوستان واپسی کے لیے روانہ ہوا مگر راستے میں ہی اس کی موت واقع ہو گئی، اس کے ساتھ جانے والا نوکر بچا اور تنہا سراندیپ واپس لوٹا۔ اسی نے وہاں کے لوگوں کو بتایا کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے پہلے خلیفہ ابو بکر کا انتقال ہو چکا ہے اور ایک صحابی رسول عمر بن خطاب خلیفہ

ہیں۔ اسی ملازم نے سراندیپ کے لوگوں کو حضرت عمر کی تواضع اور خاکساری کے بارے میں بتایا کہ وہ پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں اور بے تکلف مسجد میں سو جاتے ہیں۔ ملازم کے اس بیان کا سراندیپ کے لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا اور وہ مسلمان تاجروں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔

ہندوستانی راجہ کا تحفہ: ہجرت مدینہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی شہرت عرب ہی نہیں بیرون عرب علاقوں میں بھی پھیلی۔ روایات کے مطابق آپ ﷺ کی شہرت سن کر ایک ایک ہندوستانی راجہ نے بھی رواج کے مطابق ہدیہ اور تحفہ بھیج کر آپ ﷺ سے نہ صرف یہ کہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا بلکہ آپ ﷺ سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔ روایت ہے کہ ہندوستان کے ایک راجہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں محبت و عقیدت کے پیغام کے ساتھ زنجبیل (سونٹھ) کا ایک گھڑا بھیجا، آپ ﷺ نے راجہ کے قاصد کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ فرمایا، خود زنجبیل کے اس گھڑے میں سے تناول فرمایا اور ایک ایک ٹکڑا موجود صحابہ کرام کو بھی کھلایا۔

مذکورہ بالا دونوں واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام ہندوستانیوں خاص طور پر اس کے مذہبی اور حکمراں طبقوں میں عربوں اور عرب دنیا کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ عرب تاجروں کے ساتھ تجارتی معاملات کیا کرتے تھے بلکہ ان کے مذہب اور معاشرت سے بھی متاثر تھے۔ خاص طور پر بعثت نبوی ﷺ کے بعد عربوں کے ساتھ ہندوستانیوں کے تعلقات بہت ہی خیر خواہانہ رہے۔

1.2.4 عرب وہند تعلقات کی نوعیت

قدیم زمانے سے عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان گہرے اور خیر خواہانہ تعلقات رہے ہیں۔ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ عرب وہند کے درمیان تعلقات صرف تجارتی نوعیت کے رہے ہیں۔ لیکن یہ پوری طرح سچ نہیں ہے۔ بلاشبہ عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تعلقات میں تجارت کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے البتہ تجارت کے ساتھ ساتھ یہ تعلقات تہذیب و ثقافت اور علم و تمدن تک وسیع رہے ہیں۔ تجارتی فوائد کے ساتھ ساتھ دونوں علاقوں کے باشندوں نے ایک دوسرے سے زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی خوب خوب اخذ واستفادہ کیا ہے۔ عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے اس حوالے سے جو علمی سرمایہ چھوڑا ہے وہ ان تعلقات کو سمجھنے میں بہت ہی معاون و مددگار ہے۔ یہاں ہماری کوشش رہے گی کہ تجارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ قدیم ثقافتی و علمی تعلقات پر بھی کسی قدر روشنی ڈالی جائے۔

1.2.5 عرب وہند کے تجارتی تعلقات

عرب علاقوں کے باشندوں اور ہندوستان کے لوگوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت زمانہ قدیم سے گوناں گوں رہی ہے۔ البتہ ان تمام تعلقات میں مرکزی حیثیت ہمیشہ سے تجارتی تعلقات کو حاصل رہی ہے۔ عرب کے جغرافیے پر سرسری نظر دوڑانے سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ علاقہ زراعت کے لیے کافی سہولتوں سے محروم ہے۔ خطے کے اطراف میں تین طرف سمندر ہیں (اسی لیے اسے جزیرۃ العرب کہا جاتا ہے)، زمین زیادہ تر ریتیلی (ریگستان) ہے، چھوٹے چھوٹے نخلستانوں اور کچھ زرخیز علاقوں سے خطے کی آبادی کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے عرب ہمیشہ سے تجارت کی طرف مائل رہے ہیں، عرب بنیادی طور پر جفاکش اور بہادر ہوتے ہیں، اس

کے ساتھ ہی ان کے آس پاس کے علاقے بیشتر زرخیز اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں۔ ان کے ایک طرف عراق کا زرخیز ملک ہے اور اسی سے ملحق ایران تو دوسری طرف اپنی سرسبزی و شادابی میں یکتائے روزگار شام و فلسطین، تیسری طرف مصر اور افریقہ کے سرسبز علاقے ہیں تو اس کے بالکل سامنے اپنی تمام تر ہریالی و خوش حالی کے ساتھ ہندوستان جنت نشان۔ ان تمام علاقوں سے عربوں کے براہ راست تعلقات رہے ہیں، وہ ان علاقوں میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے رہے ہیں اور یہاں کے لوگوں اور ان کے مزاج و عادات سے واقفیت بھی رکھتے ہیں۔

اکائی کے اس حصے میں چوں کہ ہمیں خود کو عرب و ہند کے تعلقات تک محدود رکھنا ہے اس لیے یہاں ہم صرف ہندوستان اور اس کے ساتھ ہونے والی بحری تجارت اور اس کے نتیجے میں فروغ پانے والے تجارتی تعلقات کا ذکر کریں گے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عرب کے علاقے میں کافی سرسبزی و شادابی نہ تھی اس لیے عربوں کو ضروریات زندگی بہم پہنچانے کے لیے دیگر ذرائع بھی استعمال کرنے پڑتے تھے اور بیرونی تجارت ان میں بہت ہی اہم ذریعہ تھا۔ عرب فطری طور پر تجارت کی طرف مائل تھے اور ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کے چاروں طرف کے علاقے تجارت کے لیے موزوں تھے۔ ہندوستان کے ساتھ عربوں کے زمانہ قدیم سے تجارتی تعلقات کا ذکر ہو چکا ہے۔ عربوں کی یہ تجارت بحر ہند، خلیج فارس اور بحر احمر کے کناروں پر آباد بحرین، عمان، حضر موت، یمن، حجاز وغیرہ کے ساحلی مقامات سے شروع ہوتی تھی اور ہندوستان میں سندھ کے ساحلی علاقوں سے لے کر مالا بار اور خلیج بنگال تک کے بندرگاہوں تک پہنچتی تھی۔ ان مقامات سے بلکہ چین تک سے عرب تاجر مختلف طرح کی اشیاء کی تجارت کرتے تھے۔ یہ تجارت دو طرفہ ہوتی تھی۔ عرب تاجر ہندوستانی اشیاء لے کر بحری راستے سے یمن پہنچتے تھے، یمن سے ان کا بہت بڑا حصہ خشکی کے راستے بحر احمر کے کنارے کنارے حجاز سے ہوتا ہوا شام اور مصر تک پہنچتا تھا اور پھر وہاں سے بحر روم کے ذریعہ یہ تجارت یورپ تک وسیع ہو جاتی تھی۔

عرب و ہند کے درمیان یہ بحری تجارتی تعلقات اس وقت تک استوار رہے جب تک کہ پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں پرتگیزیوں نے جنوبی افریقہ کے راستے یورپ سے ہندوستان پہنچنے کا متبادل بحری راستہ نہیں دریافت کر لیا۔ بعد میں ڈچ (ولندیزی) انگریز اور فرانسیسی بھی ان بحری مہموں کا حصہ بن گئے اور ان سب نے مل کر بہ زور طاقت عرب مسلمانوں کو بحری تجارت سے بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ یورپ کے کئی ممالک جو اپنی نئی ایجادات کے سبب اس وقت تک دنیا کی بڑی بحری طاقت بن چکے تھے، ان سب نے مل کر ہندوستان کی وہ تجارت، جس پر بڑی حد تک عربوں کی اجارہ داری قائم تھی، ان سے چھین لی۔ انہوں نے بظاہر تجارتی جہازوں کو فوجی بحری بیڑوں میں تبدیل کر لیا اور عرب تاجروں سے سمندر میں جنگ شروع کر دی۔ یورپ اور عرب و ہند کے درمیان ہونے والی ان جنگوں میں اہل یورپ کا پلڑا بھاری رہا جس کی بنیادی وجہ ان کے جدید بحری جہاز اور اسلحے تھے۔ عرب جہاز راں اور ہندوستانی ساحلوں کی متعدد ہندو مسلم ریاستیں یورپی بحری طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں اور نتیجے میں ہندوستان سے لے کر سواحل شمالی افریقہ تک کی (مشرقی افریقی سواحل کے ساتھ کی) تمام تجارت جو کبھی عرب اور ہندوستانی تاجروں کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی وہ یورپی ممالک کے قبضے میں چلی گئی۔ حالاں کہ خلیج فارس کا تجارتی راستہ اس کے بعد بھی کافی عرصے تک عربوں کے ہاتھ میں رہا البتہ اس کے بھی اہم مقامات پر یورپی ملکوں کے مراکز قائم ہو گئے جو ان

کے تجارتی مفادات کی نگرانی کرتے تھے۔ یورپی ملکوں کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے اہم ساحلی مراکز پر قبضے جما لیے یہاں تک کہ ہندوستان سے لے کر شمالی افریقہ تک کے روایتی بحری تجارتی راستے پر بھی، جو بہر حال قریب تر اور زیادہ محفوظ تھا، ان کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔ اسی مقصد کے پیش نظر انیسویں صدی کے نصف آخر میں بحر احمر اور بحر روم کو ملانے کے لیے اور یورپ کو براہ راست ہندوستان سے بحری راستے کے ذریعے جوڑنے کے لیے نہر سویز کھودی گئی اور اس طرح ہندوستان اور یورپ کے درمیان کا بحری تاریخی تجارتی راستہ اور بحری تجارت ایک طویل عرصے کے لیے یورپی جہازرانوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

1.2.6 عرب و ہند کے درمیان کی تجارتی اشیاء اور مقامات

عرب و ہند کے درمیان تعلقات میں تجارتی تعلق سب سے زیادہ اہم اور قدیم ہے۔ عربوں کی نگاہ میں ہندوستان سے ہونے والی تجارت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خلیفہ دوم حضرت عمر نے جب ایک عرب سیاح سے ہندوستان کے بارے میں اس کی رائے معلوم کی تو اس نے بڑے ہی بلیغ انداز میں صرف تین فقروں میں یہ جواب دیا: بحرھا در، وجبلھا یاقوت و شجرھا عطر (اس کے دریا موتی ہیں، اس کے پہاڑ یاقوت ہیں اور اس کے درخت عطر ہیں)۔ یہ بات جیسے زمانہ قدیم میں درست تھی اسی طرح موجودہ زمانے میں بھی بالکل صحیح ہے، آج بھی عرب و ہند کے درمیان تجارتی تعلقات بہت گہرے اور وسیع ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عرب و ہند کے درمیان کی تجارت یک طرفہ نہیں تھی دونوں علاقوں سے مختلف اشیاء کی درآمد اور برآمد کا کام ہوتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان کی برآمدات زیادہ اور درآمدات نسبتاً کم تھیں۔ سید سلیمان ندوی اور قاضی اطہر مبارک پوری دونوں مصنفین نے مختلف حوالوں ان اشیاء کا تذکرہ کیا ہے جن کا دونوں علاقوں کے درمیان لین دین ہوتا تھا۔ یہاں پر انہیں کا خلاصہ بیان کیا جائے گا

1. ہندوستان سے برآمد کی جانے والی اشیاء اور ان کے مقامات

ہندوستان سے مختلف علاقوں کی متعدد طرح کی چیزیں عرب علاقوں کو برآمد کی جاتی تھیں۔ یہ ہندوستانی برآمدات ایک طرف عرب کے مختلف علاقائی بازاروں میں فروخت ہوتی تھیں تو دوسری طرف بہت ساری چیزیں عرب سے باہر دوسرے ملکوں میں لے جا کر فروخت کی جاتی تھیں۔ قاضی اطہر مبارک پوری نے عرب جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ کی کتاب المسالک والممالک کے حوالے سے جو تفصیل بیان کی ہے وہ معمولی حذف و اضافے کے ساتھ کچھ اس طرح ہے:

ہندوستان سے ہر قسم کا عود، صندل، کافور، ماخور، جوزبوا، قرنفل، قاقلہ، کبابہ، نارجیل، نباتی کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے اور ہاتھی دیار عرب میں جاتے تھے۔ سراندیپ سے ہر قسم اور ہر رنگ کے یاقوت، موتی، بلور، سنباذج، ملی اور سنجان (سندان) سے فلفل، کلہ سے رصاص قلعی، جنوب سے بقم اور داذی (تاڑی) اور سندھ سے قسط، بانس اور بید کی لکڑیاں عرب بھیجی جاتی تھیں۔ اس کے بعد علاقہ وار برآمد کی جانے والی اشیاء کا ذکر ہے۔

سندھ	:	سندھ کی برآمدات میں قسط، بانس اور بید کی لکڑیاں، سندھی کپڑے، سندھی مرغی، پالہ اونٹ
سندان	:	ساگوان اور بانس کی پیداوار بہت ہے، فلفل

کم کم(موجودہ کوکن): سا گوان بہت ہوتا ہے،

جزیرہ رامی: گینڈے پائے جاتے ہیں اور بید کی پیداوار ہوتی ہے، یہاں کے باشندے سمندر میں تیر کر اور کشتیوں پر عرب تاجروں کے جہاز تک آتے ہیں اور لوہے کے بدلے عنبر فروخت کرتے ہیں، یہاں بید بقم اور سم ساعہ پائے جاتے ہیں، اس تریاق کو مسافروں نے سانپ کے زہر میں آزمایا ہے، یہاں گینڈا بھی ہوتا ہے۔

کلہ	:	بید کے جنگل ہیں، رصاص قلعی کی کان ہے،
بابتن	:	چاول کی پیداوار ہوتی ہے
سنجلی	:	چاول کی پیداوار ہوتی ہے
کیشکان	:	چاول کی پیداوار ہوتی ہے
کنجہ اور لواء	:	چاول اور گیہوں دونوں پیدا ہوتے ہیں
سمندر	:	چاول زیادہ ہوتا ہے
بالوس	:	چاول زیادہ ہوتا ہے
قمار	:	چاول زیادہ ہوتا ہے، عود بھی پیدا ہوتا ہے۔
شلاہٹ (موجود سلہٹ)	:	قرنفل یعنی لونگ پیدا ہوتی ہے، صندل اور سنبل ہوتا ہے،
کامرون (قامرون)	:	یہاں سے عود سمندر کے مقام پر لائی جاتی ہے، یہاں گینڈا اور سونا بہت زیادہ ہے،

سراندیپ: یہاں کے پہاڑوں پر عود کی پیداوار ہے، مشک اور زباد ہوتے ہیں، عطر اور قسم قسم کی خوشبوئیں ہوتی ہیں، یہاں کے پہاڑوں پر اور ان کے اطراف میں ہر قسم اور ہر رنگ کے یاقوت پائے جاتے ہیں، اور اس کی وادیوں میں املاس اور پہاڑوں میں عود، فلفل، عطر، خوشبو، مشک زباد کے جانور، نارجیل اور سنباذج کی کثرت ہے۔ یہاں کے دریاؤں میں بلور ہے اور اطراف کے سمندر سے موتی نکلتے ہیں۔

رہمی (بنگال)	:	روئی کا مخملی کپڑا اور عود ہندی پیدا ہوتا ہے،
جزیرہ تیومہ	:	یہاں عود پیدا ہوتا ہے، کافور کی بھی پیداوار ہوتی ہے،
صنف	:	یہاں عود پیدا ہوتا ہے۔ قمار کی عود سے بہتر صنف کی عود ہوتی ہے
زانج	:	یہاں کے پہاڑوں میں کافور ہوتا ہے، پہاڑوں میں سانپ اور اژدہے پائے جاتے ہیں
جزیرہ بالوس	:	یہاں کا کافور بہت ہی عمدہ ہوتا ہے،

جابہ : عطر کا دیس ہے،

جزیرہ نکبالوس : یہاں کی دولت لوہا ہے۔

نشین : ہاتھی، چوپائے، بھینسیں، اور دیگر اشیاء پائی جاتی ہیں

ابیٹہ : یہاں ہاتھی پایا جاتا ہے،

مذکورہ اشیا کے علاوہ بھی بہت سی تجارتی چیزیں ہندوستان سے عرب جاتی تھیں مثلاً ہندی تلواریں، سندھ سے سندھی کپڑے، سندھی مرغی، پالہ اونٹ (فالج) جس کی نسل سے عرب کا مشہور بختی اونٹ ہوتا ہے۔ مندل سے عود ہندی۔ بروص (بھڑوچ) سے بھڑوچی نیزے، کھنبائت اور سندان سے نعال کنبایتیہ یعنی کھمبائت کے جوتے اور نارجیل، تھانہ سے عمدہ کپڑے اور اسی طرح مختلف مقامات سے مختلف چیزیں عرب جایا کرتی تھیں۔

2. ساحلی عرب میں ہندوستانی مال (اشیاء) کی منڈیاں

سید سلیمان ندوی اور قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنی کتابوں میں عرب علاقوں میں قائم ایسی متعدد منڈیوں اور بازاروں کا ذکر کیا ہے جہاں کثرت سے ہندوستانی برآمدات پہنچتی تھیں، یہاں ان کے بڑے بڑے گودام تھے۔ انہیں گوداموں سے یہ اشیاء عرب کے اندرونی علاقوں اور بیرون عرب دور دراز تک کے علاقوں تک لے جائی جاتی تھیں۔ عرب کی ساحلی منڈیوں (بندرگاہوں) میں ابلہ، صحار، عدن اور جار کی بندرگاہوں کو خاص شہرت حاصل تھی، ان بندرگاہوں پر ہندوستان اور چین کے بحری جہاز وہاں کی برآمدات لے کر پہنچتے تھے اور انہیں مقامات سے انہیں دیگر علاقوں تک بہ غرض تجارت بھیجا یا لے جایا جاتا تھا۔

ابلہ: خلیج فارس کے کنارے عربوں کا یہ قدیم اور سب سے بڑا بندرگاہ تھا، یہ موجودہ بصرہ (جسے عراق کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے بسانے کا حکم دیا تھا) کے قریب واقع تھا اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ہی مسلمانوں نے اسے بھی فتح کر لیا تھا۔ ہندوستانی تجارت کی غرض سے یہاں اس کثرت سے آتے جاتے رہتے تھے کہ اہل عرب اسے ہندوستان کا ہی ایک خطہ خیال کرتے تھے۔ عربوں میں یہ بندرگاہ ارض الہند اور فرج الہند والسند کے نام (لقب) سے شہرت رکھتا تھا۔ بصرہ کی بندرگاہ بن جانے کے باوجود ابلہ کی تجارتی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ بعد کے زمانے میں بھی ایک تجارتی شہر کے طور پر ہندوستان آمد و رفت کا یہ ایک بڑا مرکز رہا۔ 256 ہجری میں زنگیوں کی لڑائی میں یہ بندرگاہ تباہ ہو گئی۔

ظفار اور صحار: حضرموت (یمن) کے مشرق میں خلیج فارس کے ساحل پر ظفار اور صحار نامی قدیم ساحلی منڈیاں تھیں۔ خاص طور پر ظفار زمانہ قدیم سے ہندوستانی گرم مسالوں، خوشبوؤں اور عبادت گاہوں میں استعمال ہونے والے مختلف قسم کے بخور کی اہم منڈی تھی۔ ایک طویل عرصے تک اسے ہندوستانی بحری تجارت کے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ اسی طرح عمان کے ساحل پر صحار اور دبا (دبئی) کے بازاروں کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان بازاروں میں ہندوستانی و چینی ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے دیگر علاقوں کے تاجر بھی آتے تھے اور بڑے پیمانے پر مختلف علاقوں کی اشیاء کی یہاں خرید و فروخت ہوتی تھی۔

عدن اور یمن کی دوسری منڈیاں: جنوبی عرب میں یمن کا علاقے میں بحری تجارت کے سب سے بڑے تجارتی مراکز قائم تھے۔ ان میں عدن کا بندر گاہی شہر سب سے اہم اور بڑا ساحلی بازار اور تجارتی مرکز تھا۔ یہاں سے ہندوستان، چین، مشرقی افریقہ، حجاز، عراق اور بحر قلزم (احمر) کے علاقوں میں پیدا اور تیار ہونے والی تجارتی اشیاء کی بہت بڑے پیمانے پر نقل و حمل اور خرید و فروخت ہوتی تھی۔ قدیم زمانے سے ہی یمن کے لوگوں کو بحری تجارت پر غلبہ حاصل تھا۔ خاص طور پر ہندوستان اور چین کی اشیاء انہیں لوگوں کے ذریعے شام و مصر، اندرون عرب اور یورپ تک پہنچتی تھیں۔ یمن کے دوسرے بڑے تجارتی مراکز اور شہروں میں صنعاء، قصر، غمدان، مآرب اور نجران کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

جار: عرب کے مغربی علاقے میں جار کی بندر گاہ بہت ہی قدیم اور مشہور تجارتی منڈی ہوا کرتی تھی۔ یہاں پر مصر، حبشہ اور بحرین کے علاوہ ہندوستان اور چین سے بھی تجارتی جہاز آکر لنگر انداز ہوتے تھے اور ان ملکوں کی تجارتی اشیاء یہاں کے بازاروں میں کثرت سے فروخت ہوتی تھیں۔ جار کے بندر گاہی شہر کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ یہ مدینہ منورہ سے قریب ترین بندر گاہ تھی اور مدینہ سے اس کی مسافت اس زمانے میں ایک دن اور رات کی تھی۔ یہاں کا سامان تجارت مدینہ اور اس کے اطراف کے شہروں میں بڑے پیمانے پر فروخت ہوتا تھا۔ مدینہ اور اس کے اطراف کی تقریباً تمام تجارت یہودیوں (مسلمانوں سے پہلے) کے ہاتھ میں تھی۔ مدینہ اور اطراف مدینہ کے یہودیوں کی مالداری میں یہاں سے ہونے والی تجارت کا اہم رول تھا۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے بھی اس بندر گاہی شہر سے تجارت شروع کی اور انہیں بھی کاروبار میں ترقی ملی۔

اندرون عرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز مکہ: رسول اللہ ﷺ کی ولادت و بعثت سے پہلے عرب کے دونوں جانب ایرانیوں اور رومیوں کی مضبوط و مستحکم حکومتیں قائم ہوچکی تھیں۔ یہ دونوں ہی حکومتیں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے پیہم کوشاں رہتی تھیں اور اس سلسلے میں ان کے درمیان جنگیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان کی اس کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ یمنیوں کی بحری تجارت کمزور پڑنے لگی خاص طور پر بحر احمر پر رومیوں کے غلبے کے بعد تو مصر و شام کی منافع بخش تجارت گویا یمنی عربوں کے ہاتھ سے بالکل ہی نکل گئی۔ اس لیے یمنی عربوں نے متبادل کی تلاش شروع کی اور اس سلسلے میں انہوں نے بحری راستے کے ذریعے تجارت کے بجائے خشکی کے راستے ہندوستانی اور مشرقی ممالک کی چیزوں کی تجارت شروع کی۔ تجارت کا یہ متبادل راستہ قاضی اطہر مبارک پوری کے مطابق جنوب میں حضر موت (یمن) سے شروع ہوتا تھا اور بحر احمر کے اوپر صحرائے نجد سے بچتا ہوا مکہ مکرمہ تک جاتا تھا اور پھر مکہ سے شمال میں یہ راستہ شام تک جاتا تھا۔ یمن اور شام کے درمیان اس متبادل بری راستے کا فائدہ یہ ہوا کہ مکہ جو پہلے ہی اپنی مذہبی مرکزیت کی وجہ سے عربوں کی سماجی و سیاسی زندگی میں اہم مقام کا حامل تھا، اب اسے اقتصادی مرکزیت بھی حاصل ہوگئی اور ایک بڑی تجارتی منڈی بن گیا۔ قدرتی طور پر مکہ کی اس تجارتی مرکزیت کا اہل حجاز اور خاص طور پر مکہ والوں کو ہوا۔ قریش مکہ نے اس موقعے سے خوب فائدہ اٹھایا اور جنوب میں یمن کا اور شمال میں شام کے تجارتی اسفار شروع کیے۔ قرآن مجید میں اہل مکہ کے انہیں تجارتی اسفار کو رحلۃ الشتاء والصیف سے تعبیر کیا گیا ہے کیوں کہ اہل مکہ سردیوں میں جنوب میں یمن کا سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شمال کی جانب شام کا سفر

کرتے تھے۔ مکہ کے تجارتی مرکز بن جانے کے سبب مکہ اور اس کے اطراف میں بڑے بڑے سالانہ بازار لگنے لگے جن میں مقامی اور بیرونی تمام طرح کے سامان آسانی سے ملتے تھے، مثال کے طور پر عکاظ اور ذوالمجاز کے بازاروں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یمن کے راستے ہندوستانی سامان تجارت مکہ پہنچتا تھا اور پھر وہاں سے قافلوں کے ذریعے یہ مال شام و مصر کے بازاروں تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ تجارتی قافلے عام طور پر بہت بڑے ہوتے تھے یہاں تک کہ بعض بعض قافلوں میں صرف باربرداری کے اونٹوں کی تعداد 1500 ہوا کرتی تھی۔ مکہ کے تجارتی مرکز بن جانے کی وجہ سے قریش یعنی اہل مکہ کی تمدنی زندگی میں بھی کافی ترقی ہوئی اور ساتھ ہی ان کی زبان میں بھی بہت زیادہ وسعت پیدا ہو گئی۔ قریش کی یہی عربی زبان بعثت نبوی کے بعد قرآن اور مسلمانوں کی زبان بنی اور یہی وجہ ہے کہ قرآن اور احادیث و روایات میں متعدد ہندوستانی الفاظ بھی ملتے ہیں، مثلاً کافور (کپور)، زنجبیل (زنجابیر) مشک (موشکا) وغیرہ ہندوستانی الفاظ معرب ہو کر قرآن میں وارد ہوئے ہیں اور احادیث میں بھی قسط (کٹھ)، زط (جاٹ)، عود ہندی وغیرہ ہندوستانی نام ملتے ہیں بعض احادیث میں ہندوستانی جاٹوں اور لوہاروں کی مکہ شہر میں موجودگی کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

3. عربوں سے تجارت کے لیے استعمال ہونے والی ہندوستانی بندرگاہیں

جس طرح عرب دنیا کے ساحلی علاقوں میں آباد تجارتی بندرگاہوں میں ہندوستانی و دیگر مشرقی ممالک کی اشیاء درآمد کی جاتی تھیں اور پھر وہاں کی منڈیوں میں خرید و فروخت کے ذریعے یہ چیزیں اندرون عرب اور بیرون عرب علاقوں تک لے جائی جاتی تھیں اسی طرح ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں بھی بہت سی بندرگاہیں قائم تھیں جہاں اندرون ہند اور آس پاس کے علاقوں سے تجارتی سامان پہلے یکجا کیا جاتا تھا اور پھر وہاں کی منڈیوں سے خرید کر عرب اور دوسرے علاقوں تک لے جایا جاتا تھا۔ جس طرح عرب کی یہ ساحلی بندرگاہیں ہندوستانی اشیاء کی بڑی منڈیاں بن گئی تھیں اسی طرح ہندوستانی سواحل کی بندرگاہیں بھی برآمدی ہندوستانی اشیاء کی بڑی تجارتی منڈیاں تھیں۔ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب عرب و ہند کے تعلقات میں ایسی کئی اہم ہندوستانی بندرگاہوں کا ذکر کیا ہے۔

''ہندوستان کی بندرگاہوں کے نام ہم کو پہلی صدی ہجری سے ملنے شروع ہوتے ہیں اور تیسری صدی تک بکثرت نام بڑھ جاتے ہیں اور پھر آخر تک وہی قائم رہتے ہیں، جن میں سے عربوں کے نزدیک خلیج فارس کے بعد سب سے پہلے بلوچستان کی بندرگاہ تیز، پھر سندھ کی بندرگاہ دیبل تھا۔ گجرات میں تھانہ، کھنبایت، سوبارہ، جیمور، مدراس میں کولم ملی، ملیبار، راس کماری (قمار) اس کے بعد یا جزائر میں چلے جاتے تھے، یا بنگال ہو کر پھر وہاں سے قامرون (قاموب یا کامروپ) یعنی آسام چلے جاتے تھے، پھر وہاں سے چین۔ انہیں بندرگاہوں کے نام عربی جغرافیوں میں آیا کرتے ہیں۔ ابن حوقل نے دسویں صدی عیسوی میں سندھ کی بندرگاہ دیبل کی نسبت لکھا ہے کہ 'یہ تجارت کی بہت بڑی منڈی ہے اور یہاں مختلف قسم کی تجارتیں ہوتی ہیں۔''

4. عربوں سے ہندوستان میں درآمد کی جانے والی اشیاء

عربوں کی ہندوستان کے ساتھ تجارت بالکل یک طرفہ نہیں تھی۔ یہ بات درست ہے کہ عرب جہاز راں اور تاجر ہندوستان سے بکثرت اشیاء تجارت عرب اور یورپ کے بازاروں تک لے جاتے تھے، جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ اسی طرح یہ عرب تاجر

عرب اور مغرب کے دیگر علاقوں کی پیداوار اور مصنوعات ہندوستان کو برآمد بھی کرتے تھے۔ قدیم زمانے میں ہندوستان اور اس کے اطراف کے جزائر میں جن چیزوں کی خاص مانگ تھی ان میں کپڑوں اور لوہے کو اہمیت حاصل تھی۔ اسی طرح ہندوستان کے جنوب میں طلائی (سونے کے) سکوں کی مانگ رہتی تھی جنہیں عرب تاجر سندھ سے لے کر آتے تھے۔ سندھ کی ایک اشرفی کی قیمت جنوبی ہندوستان میں تین اشرفی کے برابر ہوتی تھی۔ مصر سے حاصل ہونے والے زمرد کی بھی ہندوستان میں بہت مانگ تھی خاص طور پر مصری زمرد سے بنی ہوئی انگوٹھیاں یہاں بڑے اہتمام سے استعمال کی جاتی تھیں۔ ہندوستانی علاقوں میں مرجان اور دھنج، جو پتھر کی ایک معمولی قسم ہوتی تھی، کی بھی بہت مانگ تھی۔ مصر میں تیار شدہ شراب بھی ہندوستان میں خوب پسند کی جاتی تھی اور وہاں سے درآمد کی جاتی تھی۔ روم اور دیگر یورپی علاقوں سے ریشمی کپڑے، سمور، پوستین اور تلواریں ہندوستان میں درآمد کی جاتی تھیں۔ ایران کا مشہور عرق گلاب ہندوستان میں بڑے پیمانے پر درآمد کیا جاتا تھا۔ بصرہ کے بندر گاہ سے ہندوستان میں خاص طور پر سندھ کے بندر گاہ دیبل میں کھجوریں درآمد کی جاتی تھیں۔ اسی طرح مغربی و جنوبی ہند کی مختلف بندر گاہوں میں عربی گھوڑوں کی بہت مانگ تھی۔

1.3 عرب ہند کے مذہبی و ثقافتی اور علمی تعلقات

1.3.1 مذہبی و ثقافتی تعلقات

قبل از اسلام عہد کے عربوں اور قدیم ہندوستانیوں کے درمیان عقیدے اور مذہب کی بھی بعض مماثلتیں پائی جاتی تھیں، جو ان کے تجارتی رشتے کے ساتھ ساتھ مذہبی رشتے کو بھی مضبوط کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر بحر عرب کے کنارے آمنے سامنے موجود دونوں ملکوں کے باشندوں میں یکساں طور پر بت پرستی، مظاہر پرستی اور کواکب پرستی عام تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم میں جو ہندوستانی عرب علاقوں میں جا کر آباد ہوئے انہیں مقامی عربوں میں عقیدے کے اس اشتراک کی وجہ سے گھلنے ملنے میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ قاضی اطہر مبارک پوری نے عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مذہبی عقائد کے اشتراک کے حوالے سے عبدالکریم شہرستانی کی کتاب الملل والنحل کے مقدمے سے یہ عبارت نقل کی ہے: ”عرب اور ہند دونوں کا مذہب قریب قریب یکساں ہے۔ ان دونوں میں سے اکثروں کا رجحان اشیاء کے خواص کے ثبوت اور ماہیات و حقائق کے احکام پر چلنے اور روحانیات کے استعمال کرنے کی طرف ہے۔“

شہرستانی کے مطابق فطرت و مظاہر پرستی کا رجحان آگے چل کر بت پرستی میں تبدیل ہو گیا اور عالمی سطح پر سات بڑے بت خانے وجود میں آئے۔ 1۔ بت خانہ اصفہان (اہل فارس کا بت خانہ) 2۔ بت خانہ ملتان (اہل سندھ کا بت خانہ، مسعودی نے اس کی جگہ اہل چین کے بت خانے کا ذکر کیا ہے) 3۔ بت خانہ سومنات (اہل ہند کا بت خانہ) 4۔ بلخ کا نوبہار (وسطی ایشیائی بودھوں کا بت خانہ) 5۔ بت خانہ غمدان (صنعا میں اہل یمن کا بت خانہ) 6۔ بت خانہ فرغانہ (وسطی ایشیا میں سورج پرستوں کا بت خانہ) 7۔ کعبہ (مکہ میں اہل عرب کا بت خانہ، اصل میں یہ خانہ خدا تھا جسے اللہ کے حکم سے سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا تھا، حضرت ابراہیم نے اس کی تعمیر نو کی تھی اور عمرو بن لحی کے زمانے میں پہلی بار خانہ کعبہ میں بت رکھے گئے)۔ شہرستانی نے لکھا ہے کہ ”عرب اور ہندوستان کے مشہور بت خانے سات ہیں، جو

سات ستاروں کے نام پر بنے ہوئے ہیں" اور پھر اوپر مذکور سات بت خانوں کا ذکر کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے مشہور معبد خانہ کعبہ سے ہندوستانیوں کو خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ حضور نبی پاک ﷺ کے دادا عبد المطلب نے اپنے زمانہ تولیت میں جب چاہ زمزم کی دوبارہ کھدائی کی تو اس میں سے ملنے والے دفینے میں ہندوستانی تلواریں بھی تھیں جن کا استعمال خانہ کعبہ کے دروازے میں کیا گیا۔ اسی طرح ہندوستانیوں کو عرب کے بعض دوسرے معبدوں سے بھی عقیدت تھی، ان میں سے بعض کی تعمیر میں ہندوستانی لکڑیوں (شیشم اور ساگوان) کا استعمال کیا گیا تھا اور بعض بتوں کو تراشنے کا کام بھی ہندوستانیوں نے کیا تھا کیوں کہ انہیں اس فن میں خاص مہارت تھی۔

ثقافتی سطح پر بھی عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان کافی لین دین ہوتا رہا ہے۔ چوں کہ دونوں علاقوں کے باشندوں کے درمیان تجارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی تعلقات بھی زمانہ قدیم میں قائم ہو چکے تھے اس لیے ان کے درمیان ثقافتی و تہذیبی لین دین بھی بڑے پیمانے پر ہوتا رہا۔ ہندوستانی علاقوں میں عربوں کو عام طور پر ملیچھ سمجھا جاتا تھا، جن کو چھوا نہیں جاسکتا، اس کے باوجود ان کے ساتھ تجارت و صنعت کے تعلقات پر کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ ہندوستانی مزدور عرب تاجروں کے جہازوں پر کام کرتے تھے، اسی طرح جہاز سازی کے ہندوستانی ماہرین اور ملاح بھی عربوں کی بحری تجارت کا لازمی حصہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندوستانی عرب علاقوں میں جا کر آباد بھی ہو گئے تھے۔ عرب بھی ہندوستانیوں کو ان کی خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کی علمی عظمت، پیشہ ورانہ مہارت، صفائی و ستھرائی اور حساب کتاب میں ایمان داری و وفاداری کے سبب عربوں میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ عرب سماجوں میں ہندوستانیوں کو ان کے مذہبی عقائد کے سبب نجوم پرست صابیوں اور ثنویت کی طرف رجحان رکھنے والے مجوسیوں جیسی حیثیت حاصل تھی۔ زمانہ اسلام میں بھی پہلے یمن اور عراق کے ساحلی علاقوں میں اور پھر سندھ میں ہندوستانیوں کو صابیوں اور مجوسیوں کے حکم میں رکھا گیا اور سماجی رشتوں اور تعلقات میں ان کے ساتھ انہیں جیسا معاملہ کیا جاتا رہا۔

1.3.2 علمی تعلقات

گمان غالب یہ ہے کہ تجارتی تعلقات کے ساتھ ہی عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان علمی تعلقات بھی قائم ہوئے ہوں گے کیوں کہ لین دین یا کسی بھی طرح کا معاملہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ علمی تعلقات کی قدامت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ سوامی دیانند کے مطابق مہابھارت کی جنگ کے وقت بھی کچھ ہندوستانیوں کو عربی زبان آتی تھی۔ سید سلیمان ندوی کے مطابق ہندوستانی زبان کے کم از کم تین الفاظ (مسک یعنی مشک، زنجبیل یعنی سونٹھ یا ادرک اور کافور یعنی کپور) قرآن مقدس میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد ہندوستانی الفاظ جاہلی عربی شاعری، تاریخی روایات اور احادیث مبارکہ میں موجود ہیں۔ ہندوستانی علوم خاص طور پر طب اور نجوم وغیرہ قدیم زمانے سے عربوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے ماہرین کی عرب دنیا میں عزت افزائی کی جاتی تھی۔ بعثت نبوی سے قبل بھی مکہ اور عرب کے دیگر مقامات پر ہندوستانی طبیبوں اور ماہرین فن کی موجودگی کے شواہد ملتے ہیں۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عرب و ہند کے درمیان علمی تعلقات میں زیادہ وسعت عباسی عہد میں اسلام کی علمی تحریک کے شجر سایہ دار بننے کے دوران آئی جب

سنسکرت زبان کی علمی کتابوں کے عربی زبان میں ترجموں کا آغاز ہوا۔

ہندوستانیوں کی ذہانت اور علمی لیاقت کے عرب زمانہ قدیم سے قائل تھے، خاص طور پر علم نجوم، طب، ریاضی اور مجسمہ سازی وغیرہ میں ان کے کمال کا اعتراف کرتے تھے۔ عربی زبان کا مشہور ادیب و فلسفی اور مصنف جاحظ اپنے ایک رسالے میں ہندوستانیوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے :

”ہندوستان کے باشندے جوتش (نجوم) اور حساب میں بہت آگے ہیں، ان کا ایک خاص ہندی خط ہے، طب کے میدان میں بھی انہیں مہارت حاصل ہے اور متعدد اہم بیماریوں کی خاص دوائیں بھی ان کو معلوم ہیں۔ مجسمہ سازی، تصویروں میں رنگوں کا استعمال اور عمارتوں کی تعمیر میں ان کو کمال حاصل ہے۔ ذہانت کے بہترین کھیل شطرنج کے وہ موجد ہیں، تلواریں بہت عمدہ بناتے ہیں اور انہیں چلانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ زہر اتارنے اور درد دور کرنے کے منتر انہیں آتے ہیں، موسیقی اور مختلف قسم کے رقص میں بھی انہیں خاص دسترس حاصل ہے۔۔۔ طب، فلسفہ، ادب و اخلاق وغیرہ علوم بھی ان کے پاس ہیں، کلیلہ و دمنہ جیسی کتاب انہیں سے ہمیں ملی ہے، رائے اور بہادری جیسی خوبیاں بھی ان میں پائی جاتی ہیں۔۔۔ صرافے اور روپے کا کاروبار کرنے والے اپنی تجوریاں اور خزانے ان کے سوا اور کسی کے حوالے نہیں کرتے۔۔۔ کیوں کہ ان کو حساب و کتاب اور صرافی کے کاموں سے فطری مناسبت ہے پھر یہ ایمان دار اور وفادار ملازم بھی ہوتے ہیں۔“

عباسی خلفاء میں منصور، ہارون اور مامون کی علمی دل چسپی اور سرپرستی کا حال سب کو معلوم ہے اور بیت الحکمہ کا قیام اور اس کی کارکردگی اس کا منہ بولتا ثبوت۔ البتہ عباسی وزراء میں خاندان برامکہ اس لحاظ سے بہت ہی نمایاں اور ممتاز ہے کہ اس کی علمی قدردانیوں اور فیاضیوں کی وجہ سے ہندوستانی علوم وفنون کا بڑے پیمانے پر نہ صرف عربی زبان میں ترجمہ ہوا بلکہ ہندوستانی ماہرین فن کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ برامکہ کی ہندوستانی علوم وفنون اور ان کے ماہرین میں دل چسپی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق وہ خود بھی ہندی الاصل تھے اور اسلام سے پہلے ایک ہندوستانی مذہب بودھ مت کے پیروکار تھے۔ انہوں نے جن ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور جن کی سرپرستی کی ان کے بارے میں بھی مولانا ندوی کا خیال ہے کہ زیادہ تر بودھ مت کے پیروکار تھے۔ ہندوستانی زبانوں سے جن علوم وفنون کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں ان میں سے چند کا ایک بہت ہی مختصر تعارف ذیل میں دیا جارہا ہے :

حساب: گنتی یا اعداد ہندوستانیوں کی ایجاد ہے۔ عربوں کو یہ اعتراف ہے کہ 1 سے 9 تک کے ہندسے انہوں نے ہندوستانیوں سے سیکھے اسی لیے انہیں ہندسہ یا ارقام ہندیہ کہا جاتا ہے اور پھر عربوں سے یہ اسپین کے راستے اہل یورپ تک پہنچے چنانچہ وہ انہیں ارقام عربیہ (عربک فیگر) کہتے ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ عربوں میں ارقام (نمبروں) کا استعمال برہم گپت کی علم نجوم و ہیئت میں کتاب برہمسپت سدھانت کے ترجمے سے شروع ہوا جس کے دو ابواب 24,13 میں ارقام پر بحث ہے۔، سب سے پہلے محمد بن موسی خوارزمی نے ہندی ارقام کو عربی کے قالب میں ڈھالا، خوارزمی خود بھی ایک بڑا حساب داں تھا یورپ میں علم الحساب کی ایک مخصوص شاخ (Algorithm) اسی سے منسوب ہے۔

فلکیات وہیئت: ہندوستانی علم فلکیات وہیئت بھی بنیادی طور پر عربوں میں برہمسپت سدھانت کے ترجمے سے ہی رائج ہوا، یہ ترجمہ ایک ہندوستانی پنڈت کے دو عرب شاگردوں (ابراہیم فزاری اور یعقوب بن طارق) نے الگ الگ کیا تھا اور یہ 'السند ہند' کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسری کتاب آریہ بھٹ کی سنسکرت سے عربی میں 'ارجبہذ' (آریہ بھٹ) کے نام سے ترجمہ ہوئی۔ تیسری ہندوستانی کتاب جو ہیئت و فلکیات کے موضوع پر 'ارکند' کے نام سے عربی میں ترجمہ ہوئی برہم گپت کی ہی کھنڈ کھڈیک (Khandakhadyaka) ہے۔ ہندوستانی علم فلکیات کی بنیاد زمانہ کی اس تقسیم پر ہے جو سات سیاروں کی چال پر مبنی ہے اور جسے سنسکرت میں کلپ کہتے ہیں، برہم گپت کے مطابق ایک کلپ 14 ارب 32 کروڑ سال کا ہوتا ہے۔ یہ ہندوستانی ماہرین فلکیات (برہم گپت اور آریہ بھٹ) زمین کی حرکت کے قائل تھے اسی طرح برہم گپت کا تیار کردہ کیلنڈر موجودہ شمسی کیلنڈر کے عین مطابق تھا۔

طب: ہندوستان سے عربوں کو ملنے والے علوم میں ایک اہم علم طب ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ خلیفہ ہارون رشید کے علاج کے لیے ہندوستان سے ایک طبیب (وید) بلوایا گیا جس کا نام منکہ یا مانک تھا اور اس کے علاج سے خلیفہ کو شفا ملی۔ اس طرح ہندوستانی طب کی طرف عباسی حکومت کی توجہ ہوئی اور برامکہ نے اس کی نشر و اشاعت میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ ان کے شفاخانے کا افسر اعلی ایک وید تھا، یحی بن خالد برمکی نے اپنا ایک کارندہ ہندوستان بھیج کر اس کے ذریعے یہاں کی جڑی بوٹیاں منگوائیں، ایک وید کو دار الترجمہ میں اس لیے رکھا گیا کہ وہ سنسکرت کی طبی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کروائے۔ سنسکرت سے جن طبی کتابوں کے ترجمے ہوئے ان دو بہت مشہور ہیں ایک ششرت (Susruta)، جسے عرب سسرو کہتے ہیں، کی ششرت سمہتا، یہ کتاب دس بابوں میں تھی اور اس میں بیماریوں کی علامات اور ان کے علاج و دوا کی تفصیل ہے۔ یحی بن خالد برمکی کے حکم سے منکہ نے اس کا ترجمہ کیا تا کہ برامکہ کے شفاخانے میں وہ ایک طبی دستور العمل کا کام دے۔ دوسری کتاب چرک کی، جو ہندوستان میں طب کا بہت بڑا ماہر ہوا ہے، چرک سمہتا، یہ کتاب پہلے فارسی میں ترجمہ ہوئی اور پھر فارسی سے عربی میں منتقل ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی درجنوں طبی کتابیں ہندوستانی زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔

جنگ وسیاست: جنگ وسیاست یعنی راجنیتی میں بھی عربوں نے ہندوستانیوں کی مہارت سے فائدہ اٹھایا۔ ان میں سے ایک چانکیہ (عربی شاناق) ہے جس کی کتاب (شاید ارتھ شاستر) کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ اس کا مضمون یہ ہے: "لڑائی کا انتظام، بادشاہ کو کیسے لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیے، سواروں کی ترتیب، کھانا اور زہر"۔ دوسرا باجھریا ویاگھر ہے، اس کی کتاب میں "تلواروں کی پہچان، اس کی خوبیاں اور نشانات" بیان کیے گئے ہیں۔ سیاست میں سنسکرت کی ایک اور کتاب ادب الملک (حکومت کے طریقے) کے نام سے عربی میں ترجمہ ہوئی جس کا مترجم ابو صالح بن شعیب ہے، البتہ اصل عربی ترجمہ اب مفقود ہے۔

1.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- عرب وہند کے درمیان تعلقات بہت ہی قدیم ہیں شاید اتنے ہی قدیم جتنی کہ خود انسانی تاریخ۔ بحر عرب کے کناروں پر ایک دوسرے کے مقابل آباد یہ علاقے ایک طرح سے پڑوسی بھی ہیں۔ عرب تو ہندوستان کو اپنا پدری وطن باور کرتے ہیں اور اسی طور پر ہمیشہ سے وہ

ہندوستانیوں کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں۔ ہندوستانی بھی عربوں سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔

- زمانہ قدیم سے وہ عرب تاجروں کا اپنی سرزمین پر خیر مقدم کرتے رہے ہیں اور انہیں نوآبادیات قائم کرنے سے لے کر مذہبی آزادی تک ہر طرح کی سہولیات بھی فراہم کرتے رہے ہیں۔ عرب وہند تعلقات کی نوعیتیں مختلف رہی ہیں۔ البتہ ان میں تجارتی، مذہبی وثقافتی اور علمی تعلقات کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔
- خصوصی طور پر تجارتی تعلقات میں زمانہ قدیم سے لے کر آج تک گرم جوشی برقرار ہے۔ زراعت کے قدرتی وسائل سے بڑی حد تک محروم عرب دنیا کو ہندوستان کی ہریالی وخوش حالی نے ہمیشہ اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ مذہبی طور پر قدیم عربوں اور ہندوستانیوں میں بت پرستی، مظاہر پرستی اور کواکب پرستی وغیرہ یکساں طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ دونوں علاقوں کے درمیان علمی لین دین کی روایت بھی بہت پرانی ہے خاص طور پر عربوں نے طب وسیاست سے لے کر فلکیات وہیئت اور حساب وریاضی تک مختلف علوم وفنون میں ہندوستانی ماہرین سے استفادہ کیا ہے۔

1.5 نمونہ امتحانی سوالات

1.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ''عرب ہندوستان کو اپنا موروثی پدری وطن مانتے ہیں''۔ یہ کس مفکر کا قول ہے؟

(a). سید عبدالحئ حسنی (b). سید سلیمان ندوی (c). سید ابوالاعلی مودودی (d). سید ابوالحسن علی ندوی

2. تاریخ عالم میں بحری تجارت شروع کرنے والی پہلی قوم کون سی ہے؟

(a). ہندوستانی (b). چینی (c). ایرانی (d). عرب

3. ہندوستان اور عرب کے بیچ کون سا سمندر حائل ہے؟

(a). بحر عرب (b). بحر گیلان (c). بحر احمر (d). بحر روم

4. سراندیپ کا وفد دارالخلافہ مدینہ کب پہنچا؟

(a). عہد نبوی (b). عہد صدیقی (c). عہد فاروقی (d). عہد اموی

5. ہندوستان کے ایک راجہ نے خدمت نبوی ﷺ میں کیا تحفہ بھیجا تھا؟

(a). ناریل کا (b). ہاتھی دانت کا (c). کپڑوں کا (d). زنجبیل کا

6. ''اس کے دریا موتی، اس کے پہاڑ یاقوت اور اس کے درخت عطر ہیں'' کس ملک کے بارے میں کہا گیا ہے؟

(a). چین (b). ہندوستان (c). شام (d). مصر

7. بحر احمر کو بحر روم سے کون سی نہر جوڑتی ہے ؟

(a). نہر سویز　　(b). نہر زبیدہ　　(c). پناما نہر　　(d). نہر زیتون

8. کتاب المسالک والممالک کس کی تصنیف ہے ؟

(a). ابن مقفع کی　　(b). ابن سینا کی　　(c). ابن رشد کی　　(d). ابن خرداذبہ کی

9. اندرون عرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز کیا تھا ؟

(a). طائف　　(b). مکہ　　(c). یثرب　　(d). خیبر

10. سیاست میں چانکیہ کی کونسی کتاب عربی میں ترجمہ ہوئی ؟

(a). ارتھ شاستر　　(b). پنچ تنترا　　(c). کھنڈ کھنڈیک　　(d). سب غلط

1.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. عرب وہند کے مذہبی تعلقات پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. عربوں کے ساتھ تجارت کے لیے استعمال ہونے والی ہندوستانی بندر گاہوں پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔
3. عربوں کے توسط سے ہندوستان میں درآمد کی جانے والی اشیاء کے بارے میں لکھیے۔
4. ساحلی عرب کے علاقوں میں ہندوستانی مال کی منڈیوں کا ذکر کیجیے۔
5. سراندیپ کے وفد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصرا لکھیے۔

1.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عرب وہند تعلقات کے آغاز وارتقاء پر ایک مضمون لکھیے۔
2. عرب وہند کے درمیان تجارتی تعلقات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیل سے لکھیے۔
3. عرب وہند کے علمی تعلقات کا احاطہ کیجیے۔

1.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. عرب وہند کے تعلقات　:　سید سلیمان ندوی
2. عربوں کی جہاز رانی　:　سید سلیمان ندوی
3. برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش　:　محمد اسحاق بھٹی
4. عرب وہند عہد رسالت میں　:　قاضی اطہر مبارک پوری
5. ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں　:　قاضی اطہر مبارک پوری

اکائی 2: سندھ کی فتح

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید
2.1 مقاصد
2.2 سندھ کی طرف مسلمانوں کی توجہ کے اسباب
2.2.1 سندھ پر ابتدائی حملے
2.2.2 محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ
2.2.3 محمد بن قاسم کے حملے کی وجہ
2.3 حملہ کا آغاز
2.3.1 محمد بن قاسم کی پیش قدمی
2.3.2 دیبل کی فتح
2.3.3 سندھ کی مختلف قلعوں کی فتوحات
2.3.4 راجہ داہر کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ
2.3.5 راور شہر
2.3.6 برہمن آباد کی فتح
2.3.7 ملتان شہر
2.3.8 محمد بن قاسم کے آخری ایام
2.4 کلیدی الفاظ
2.5 اکتسابی نتائج
2.6 نمونہ امتحانی سوالات
2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

بر صغیر کا علاقہ کبھی بھی عربوں کے لئے اجنبی نہیں رہا، عرب و ہند کے تعلقات کی تاریخ محض محمد بن قاسم کے سندھ پر حملہ سے نہیں شروع ہوتی، بلکہ یہ تاریخ اس سے بہت زیادہ قدیم ہے، یہ تعلقات اتنے ہی قدیم ہیں جتنی بر صغیر کی تاریخ ہے، عرب اور بر صغیر کے بیچ میں صرف بحر عرب حائل ہے، لہذا دونوں علاقوں کے بیچ قدیم زمانے سے ہی تجارتی تعلقات رہے ہیں، عربوں کی تجارتی کشتیاں بعثت نبوی سے قبل بھی ہندوستانی ساحلوں پر لنگر انداز ہوتی رہی تھیں، گجرات و کیرلا کے ساحل سے لے کر خلیج بنگال اور آگے بڑھ کر انڈونیشیا تک مسلسل آتی رہیں، ان ساحلوں پر باقاعدہ عربوں کی بستیاں آباد تھیں جن کے باقیات آج بھی ان علاقوں میں پائے جاتے ہیں، اور ان کی تاریخ صدیوں پرانی ہے، یہ عرب وہند کے قدیم تعلقات کی گواہ ہیں۔ بعثت نبوی کے بعد اس تعلقات میں مزید اضافہ ہوا، تجارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ مسلمان تاجروں کے عمدہ اخلاق اور دین اسلام کی توحید اور عدل وانصاف پر مبنی تعلیمات سے ہندوستانی حکمراں اور عوام دونوں ہی بہت متاثر ہوے اور ان تاجروں کے نئے دین نے ان کو بہت اپیل کیا، لہذا ایک بڑی تعداد نے اس دین کو قبول بھی کیا اور فتح سندھ کے بعد عرب وہند تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔

2.1 مقاصد

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ سندھ کی فتوحات کے احوال سے واقفیت حاصل کی جائے اور یہ بات معلوم ہو کہ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر فتح سندھ کا واقعہ پیش آیا اور یہ علاقہ مسلمانوں کی توجہات کا مرکز بن گیا۔

2.2 سندھ کی طرف مسلمانوں کی توجہ کے اسباب

سندھ موجودہ پاکستان میں واقع ہے، وہاں کے چار صوبوں میں سے ایک ہے، اس کو باب الاسلام بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ یہ پہلا علاقہ ہے جہاں سے ملک ہندستان میں مسلمانوں کی فتوحات آغاز ہوا اور بہت تیزی سے عوام کو اسلام کی سنہری تعلیمات سے واقفیت ہوئی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے، یہ علاقہ خلفاء راشدین کے دور سے ہی مسلمانوں کی توجہات کا مرکز رہا، مسلمانوں کے ذریعہ فارس کو فتح کرنے کے بعد ایران کے بہت سے سردار سندھ، ترکستان اور چین کی طرف بھاگ گئے اور مسلمانوں کے خلاف خانہ جنگیوں میں مصروف ہو گئے، سوء اتفاق سے بنو ہاشم اور بنو امیہ میں جب قومی وخاندانی رقابت نے ترقی کی تو ان ایرانیوں کو بھی قومی رقابت یاد آگئی

اور انہوں نے عبد اللہ بن سبا اور دوسرے منافقوں کی سازشوں میں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لینا شروع کر دیا، ان کی وجہ سے مسلمانوں کو ایران وخراسان کے علاقوں میں برابر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، سندھ کا علاقہ چونکہ بصرہ یعنی عراق سے نسبتاً قریب تھا اور ایرانی حکومت کی سرحد اس سے ملتی تھی، لہذا زیادہ تر شرارت پیشہ ایرانیوں کا مامن ملک سندھ ہی بنا ہوا تھا، اسلامی فتوحات کے سیلاب کو دیکھ کر سندھ کا راجہ خود بھی ایرانیوں کی بربادی سے متاسف اور اس امر کے لئے کوشاں تھا کہ کسی طرح ایرانی اپنی سلطنت کو پھر سے قائم کر سکیں، چنانچہ ایران کے آخری بادشاہ نے معرکہ نہاوند کے بعد کئی مرتبہ فوجیں جمع کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کیا تو ان مقابلوں اور معرکوں میں شاہ ایران کے ساتھ سندھ کی امدادی فوج ضرور ہوتی تھی، ایرانی سلطنت جب برباد ہوئی تو ایرانیوں نے سندھ کے راجہ کو اپنی سرحدی ایرانی صوبوں کو بخوشی سندھ کے راجہ کے سپرد کر دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے قبضہ میں نہ جا سکیں اور اس کے معاوضہ میں سندھ کے راجہ کی حمایت ان کو حاصل رہے۔ اس طرح سے یہ علاقے ہمیشہ مسلم فاتحین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔

2.2.1 سندھ پر ابتدائی حملے

روم وفارس کی فتح کے بعد مسلمان اس کے پڑوسی علاقوں کی طرف متوجہ ہوئے، کیوں کہ ہندوستان سے متصل مسلم علاقوں کی حدود پر اکثر حملہ ہوتے رہتے تھے، لہذا ان خطرات کی طرف ابتدا ہی سے مسلمانوں کی توجہ تھی، حضرت عمرؓ کے دور سے ہی مسلمانوں نے اس جانب توجہ دینی شروع کر دی تھی، گرچہ کسی بڑی مہم کا سلسلہ نہیں شروع ہوا مگر مسلم فاتحین کبھی اس جانب سے غافل نہیں رہے، عمرؓ نے جب سنہ 10 ہجری میں عثمان بن ابی العاص الثقفی کو بحرین اور عمان کا والی بنایا تو انہوں نے اپنے بھائی حکم کو بحرین کی طرف بھیجا اور عمان میں خود ایک بڑا لشکر تیار کر کے تھانہ پر حملہ کیا، واپسی پر عمرؓ کو سارے احوال سنائے، عمرؓ نے انہیں لکھا کہ تم نے مسلمانوں کو ایک مشکل حالات میں ڈال دیا ہے، بخدا جتنے لوگ بھی اس جنگ میں شہید ہوں گے اتنے ہی آدمی میں تمہاری قوم سے لوں گا، چوں کہ عمرؓ دور دراز علاقوں میں مسلم لشکر کو بھیج ان کی جانوں کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے، لہذا انہوں نے ان دور دراز علاقہ پر فوج کشی کی اجازت نہیں دی، اسی طرح عثمان بن ابی العاص نے حکم کو بھڑوچ کی طرف بھی بھیجا، اور اپنے دوسرے بھائی مغیرہ بن ابی العاص کو دیبل (موجودہ کراچی کا علاقہ) کے حدود میں بھیجا اور وہ وہاں سے فتح یاب ہو کر لوٹے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ بھی مسلسل اس خطہ کی طرف متوجہ رہے اور اس سے متعلق حالات متعلقہ افراد سے دریافت کرتے رہے، حضرت علیؓ کے دور میں حارث بن مرہ العبدی نے سندھ سے متصل علاقوں پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوئے۔

2.2.2 محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ

سندھ کا علاقہ ہمیشہ ہی مسلم فاتحین کی توجہ کا مرکز رہا لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور امیر معاویہؓ کے زمانے میں سندھ کے لئے کوئی بڑی مہم نہیں شروع کی جا سکی، امیر معاویہؓ کو جب خانہ جنگی سے سکون نصیب ہوا تو انہوں نے ان علاقوں کی طرف توجہ کی جو کبھی ایران کا حصہ تھے اور انہیں سندھ کے فرمانروا نے اپنی سلطنت میں ضم کر لیا تھا، پھر یزید بن معاویہ کے دور میں اندرونی خلفشار شروع ہو گیا اور پیش رفت رک گئی، لیکن مسلم خلفاء ہمیشہ کسی ایسے مناسب موقع کے منتظر تھے جب اس سلسلے میں پیش قدمی کی

جاسکے، اچانک سندھ کے راجہ نے خود ہی یہ حالات پیدا کر دئے کہ اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کے عہد میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کو محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ کو فتح کرنے کے لئے فوج روانہ کرنی پڑی۔

2.2.3 محمد بن قاسم کے حملے کی وجہ

اس کی تفصیل یہ ہے کچھ مسلمان سوداگر جزیرہ سراندیپ میں بہ حالت سفر فوت ہوگئے تھے، ان کے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں جو اس جزیرہ میں رہ گئیں تھیں ان کو سراندیپ کے راجہ نے حجاج بن یوسف ثقفی اور خلیفہ ولید بن عبد الملک کی عنایت ومہربانی اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے بہترین ذریعہ سمجھا، سراندیپ کا راجہ مسلمانوں کی فتوحات کا حال سن سن کر پہلے سے مرعوب ہوچکا تھا اور اپنی نیاز مندی کے اظہار کی غرض سے کسی ذریعہ اور حیلہ کا متلاشی تھا، چنانچہ اس نے ان یتیم بچوں اور بیواؤں کو بڑی تعظیم واکرام کے ساتھ اپنے معتمدوں کے ساتھ اپنے خاص جہاز میں بیٹھا کر حجاج کے پاس روانہ کیا، بہت سے قیمتی تحفے اور ہدیے حجاج اور خلیفہ ولید کے لئے بھیجے اور ان یتیموں اور بیواؤں سے امید رکھی کہ یہ حجاج سے ضرور میری تعریف کریں گی، یہ کشتیاں سراندیپ سے روانہ ہوکر ساحل کے قریب قریب سفر کرتی ہوئی خلیج فارس کی طرف روانہ ہوئیں تاکہ وہاں سے خشکی پر اتر کر یہ لوگ مع تحفہ وہدایا حجاج کی خدمت میں کوفہ پہونچیں، راستے میں باد مخالف طوفان نے ان کشتیوں کو سندھ کی بندرگار دیبل میں لا ڈالا، یہاں سندھ کے راجہ مسمی داہر کے سپاہیوں نے ان کشتیوں کو لوٹ لیا اور سواریوں کو قید کر لیا، یہ حال جب حجاج کو معلوم ہوا تو اس نے سندھ کے راجہ کو لکھا کہ وہ کشتیاں ہمارے پاس آرہی تھیں تم لٹیروں کو قرار واقعی سزا دو اور مسافروں کو مع سامان مسروقہ ہمارے پاس بھیج دو، صاحب فتوح البلدان نے ذکر کیا ہے کہ اس میں قبیلہ بنی یربوع کی ایک عورت تھی جب ڈاکوؤں نے قافلہ کو لوٹ لیا تو اس نے حجاج کو مدد کے لئے پکارا، جب حجاج کو اس کا علم ہوا تو اس نے کہا لبیک میری بہن، اور اس مظلوم بہن کا بدلہ لینے کے لئے کاروائی شروع کر دی، اس نے راجہ داہر سے ان لوگوں کو واپس کرنے کو کہا مگر راجہ نے جواب دیا کہ وہ ڈاکو میری دسترس سے باہر ہیں میں ان کو نہیں پکڑ سکتا، راجہ داہر کی اس ہٹ دھرمی بھرے جواب سے حجاج بہت ناراض ہوا۔

2.3 حملہ کا آغاز

اس وقت حجاج بن یوسف اموی خلافت کی طرف سے عراق کا حاکم تھا، اور سندھ کی سرحد بھی عراق سے ملتی تھی جس کے نتیجہ میں وہاں کے متصل امور کا ذمہ دار وہی تھا، لہذا جب سندھ کے راجہ کی قید میں موجود ان مسلمان عورتوں نے مدد کے لئے حجاج بن یوسف کو پکارا تو اس نے سندھ پر حملہ کا ارادہ بنا لیا، چنانچہ سب سے پہلے حجاج نے عبد اللہ بن نبہان کو دیبل کی طرف لشکر کے ساتھ روانہ کیا، مگر انہیں شکست ہوئی اور شہید ہوگئے، پھر حجاج نے بدیل بن طہفہ البجلی کو جو اس وقت عمان کے گورنر تھے دیبل کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا، مگر دوران جنگ ان کا گھوڑا بدک گیا اور وہ دشمنوں کی ضد میں آگئے اور وہ بھی شہید کر دئے گئے۔

2.3.1 محمد بن قاسم کی پیش قدمی

ان دونوں مہم کی ناکامی پر حجاج کو بہت صدمہ پہونچا، مگر ہار ماننا اس نے گوارا نہیں کیا اور ایک بڑے حملے کی تیاری شروع کر دی، لہذا

اس نے سندھ کو فتح کرنے کے لئے خلیفہ وقت ولید بن عبد الملک سے اجازت طلب کی اور اس سے درخواست کہ وہ ایک عظیم لشکر کی تیاری کے سارے سامان حرب ورسد فراہم کرے، اولاً تو ولید دور دراز علاقے پر فوج کشی، شاہی خزانہ پر بوجھ اور سابقہ دونوں حملوں کا انجام سوچ کر تیار نہیں ہوا، لیکن حجاج بن یوسف کے اصرار پر اس نے رضامندی دے دی اور شام کے جانباز چھ ہزار لشکر بھی فراہم کئے، حجاج بن یوسف بھی کسی مناسب سپہ سالار کی تلاش اور اس مہم کی تیاری میں مصروف ہو گیا، بالآخر اس کی نظر انتخاب محمد بن قاسم پر پڑی جو اس کا بھتیجا تھا اور صرف سترہ سال کا تھا، لیکن انتظامی امور اور شجاعت وبہادری میں شہرت حاصل کر چکا تھا، حجاج بن یوسف نے اسے 22ھ مطابق 711ء سندھ کی طرف ایک لشکر اس کی قیادت میں روانہ کیا، اس بار لشکر کی کمان حجاج نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی تھی اور یہ حکم دیا کہ ہر تیسرے دن تمام حالات بذریعہ خطوط اس کے پاس بھیجے جائیں، تاکہ ان خطوط کے ذریعہ حجاج مسلسل ہر پیش قدمی سے واقف ہوتا رہے اور مناسب ہدایتیں دیتا رہے، حجاج کا حکم ملنے کے بعد محمد بن قاسم شیراز پہونچا، وہیں قیام کیا، وہاں عراق اور شام سے بھیجی جانے والی فوجیں اسے مل گئیں، حجاج نے اس لشکر کے ساتھ ضروریات کے تمام ہی سامان فراہم کئے تھے، یہاں تک کہ سوئی دھاگہ اور سرکہ بھی ساتھ میں بھیجا جو عربوں کی بہت محبوب غذا تھی، تاکہ سامان رسد کی کمی فتوحات میں کسی طرح حائل نہ ہو، اس میں تین ہزار اونٹ بھی تھے جو صرف جنگی سامان واسباب اٹھانے کے لئے تھے، چوں کہ سندھ کی حکومت کی فوج میں ایک بڑی تعداد میں ہاتھی بھی تھے، جو بڑے سے بڑے لشکر کو منتشر کرنے کی اہلیت رکھتے تھے، لہذا حجاج نے کچھ ایسے درزیوں کو بھی بھیجا تھا جو ہاتھیوں کی شکلیں تیار کر سکیں، سامان رسد کے ساتھ حجاج نے ایک خط بھی روانہ کیا تھا، جس میں اس نے فوج کے لئے جنگی حکمت عملی کا ذکر کیا تھا:

"تمہیں سبھی سامان رسد فراہم کر دئے گئے ہیں، تم میں سے ہر چار فوجی پر ایک اونٹ ہے جسے وہ اپنا سارا سامان اٹھانے کے لئے استعمال کرے گا، اونٹ پر اس سے زیادہ بوجھ مت ڈالو، اس سلسلے میں اللہ سے ڈرو، صبر کرو اور جمے رہو، جب دشمن کے ملک پہونچو تو صحراء ہامون میں اترو اور جب لڑائی کا وقت آئے تو فوج کی شکل میں منتشر ہو جاؤ اور کناروں سے نکل کے آؤ، کیوں ہاتھیوں کی جنگ کی یہی حکمت عملی ہے، جب دشمن حملہ کرے تو اپنی جگہ ٹھہر جاؤ اور اس پر تیروں کی بارش کرو"

تمام فوج اور سامان رسد ملنے کے بعد محمد بن قاسم شیراز سے مکران پہونچا، کچھ عرصہ وہاں قیام کیا، پھر قندپور شہر آیا اسے فتح کیا، اس کی فتح میں زیادہ مشکل نہ پیش آئی، پھر ارمائیل شہر کی طرف بڑھا، یہاں بھی مقابلہ ہوا، لیکن اہل شہر بہت جلد ہمت ہار بیٹھے، بالآخر شہر محمد بن قاسم کے سپرد کر دیا، محمد بن قاسم نے ان شہروں کو اس لئے فتح کیا کیوں کی یہ دیبل شہر کے راستے پر پڑتے تھے، اور دیبل کی طرف آگے بڑھنے کے لئے ان دونوں کو فتح کر بہت ضروری تھا۔

2.3.2 دیبل کی فتح

دیبل اس وقت سندھ کی سب سے بڑی بندرگار تھی، اس شہر کو دیول بندر بھی کہتے تھے، محمد بن قاسم فارس کے جنوبی سمت سے ساحل سمندر کے قریب سے ہوتا ہوا دیبل کی طرف روانہ ہوا، جمعہ کے روز دیبل کے ساحل پر سمندر کے راستے حجاج نے جو جنگی ساز وسامان اور مزید فوجیں بھجوائی تھی وہ اس سے آکر مل گئیں، اس طرح سے بری اور بحری فوج دونوں ہی جمع ہو گئیں، ساتھ میں حجاج بن یوسف کا

خط بھی تھا، جس میں اس نے محمد بن قاسم کو یہ حکم دیا تھا کہ "جب وہ دیبل پہونچے تو لشکر کے پڑاؤ کے ارد گرد خندق کھودی جائے، تا کہ لشکر کسی بھی طرح کے اچانک حملہ سے محفوظ رہے اور یہ نصیحت کی کہ باہمی اختلاف سے بچنا اور دشمن سے میل جول نہ کرنا"، محمد بن قاسم نے شہر کا گھیراؤ کرلیا، ہر طرف منجنیقیں نصب کروائیں، اس میں ایک منجنیق ایسی تھی جسے پانچ سو آدمی مل کر کھینچتے تھے، اس کا نام "عروس" تھا، قائد لشکر نے منجنیقوں سے پتھراؤ کا حکم دیا، ابتدائی سات دن شہر کی فوج قلعہ سے نکل کر حملہ کررہی تھی، مسلم فوج اقدامی حملہ سے گریز کرتی رہی، بالآخر آٹھویں دن محمد بن قاسم نے پرزور حملہ کا حکم دیا، مسلم فوج نے اس زور کا حملہ کیا کہ دیبل کی فوج قلعہ بند ہونے پر مجبور ہوگئی، کئی دنوں تک محاصرہ جاری رہا، آخر کار فتح کا سراغ لگ گیا، دراصل شہر دیبل کے اندر ایک بڑا معبد تھا، جس کی لمبائی چالیس گز تھی، اس پر ایک بڑا گنبد بنا ہوا تھا، اس کی چوڑائی بھی چالیس گز تھی، اس کے اوپر ایک جھنڈا لہرا رہا، جو ان کے نزدیک بہت ہی مقدس تھا، اہل سندھ وہند جو اس کے پجاری تھے ان کے دل اس کی طرف کھنچے جاتے تھے، وہ اس کی تعظیم کرتے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے قربانی کے جانور ذبح کرتے، جیسے عرب قبل از نعمت اسلام دور جاہلیت میں کیا کرتے تھے، دیبل کا صنم یا بدھ کا نام جیسا کہ عرب فاتحین نے محطم [شیر] رکھا تھا، وہ بہت بڑے ہیکل کی بلندی پر رکھا تھا، اس پر وسیع سرخ پرچم لہرا رہا تھا، پرچم کے کپڑے کی ضخامت اتنی تھی کہ جب اس کے پاس سے ہوا کا گزر ہوتا تو یوں لہراتا کہ اہل شہر کے دل اس کی محبت سے سرشار ہو کر اس کی طرف مائل ہو جاتے، حجاج کو جب اس بارے میں معلوم ہوا تو اس نے منجنیق کو ایک خاص زاویہ میں رکھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا، اور کہا اس مینار پر حملہ کرکے اس جھنڈے کو زمین دوز کرو، لہذا نویں دن سورج طلوع ہوتے ہی محمد بن قاسم نے جعونہ السلمی کو جو کہ منجنیق کے امور کا ذمہ دار تھا گنبد کو نشانہ بنانے کا حکم دیا اور اس کے گرتے ہی اہل شہر کی ہمت ٹوٹنے لگی، لہذا انہوں نے باہر نکل کر حملہ شروع کیا مگر مسلم لشکر کی تاب نہ لا کر واپس قلعہ بند ہوگئے، محمد بن قاسم نے سیڑھی لگا کر فصیل پر چڑھنے کا حکم دیا، چنانچہ کوفہ کا مراد نامی شخص سب سے پہلے اس پر چڑھا، اور دروازہ کھول دیا، تین دن شہر میں لڑائی چلتی رہی، آخر کار راجہ داہر کا گورنر قلعہ کی دیوار کود کر فرار ہوگیا، یہ 89 ھجری کا واقعہ ہے، ایک بڑی مقدار میں مال غنیمت ملا جس میں سے پانچواں حصہ دار الخلافہ بھیج دیا گیا، باقی سارا مال غنیمت فوجیوں میں تقسیم کردیا گیا، وہیں پر کچھ وہ مسلمان قیدی بھی تھے جنہیں راجہ داہر کی فوج نے قید کر رکھا تھا، محمد بن قاسم نے ان کو آزاد کرایا اور باعزت ان کے وطن واپس پہونچایا، محمد بن قاسم نے شہر کا نظام درست کرایا، ایک مسجد تعمیر کرائی اور چار ہزار مسلمانوں کو وہاں آباد کیا اور وداع بن حمید البحری کو شہر کا گورنر بنا کر آگے کے لئے روانہ ہوگیا۔

2.3.3 سندھ کی مختلف قلعوں کی فتوحات

دیبل کا حاکم شکست کے بعد نیرون بھاک گیا، جہاں راجہ داہر کا بیٹا جئے سنگھ حاکم تھا، جب راجہ داہر کو دیبل ہار جانے کی خبر پہونچی تو اس نے فوراً اپنے بیٹے جئے سنگھ کو حکم دیا کہ وہاں کسی اور کو حاکم مقرر کرے اور اس کو حکم دے کہ وہ شہر کے انتظامات درست کرے اور وہ خود فوراً بر ہمن آباد پہونچے، محمد بن قاسم بھی نیرون شہر کی طرف متوجہ ہوا، یہ وہی شہر ہے جہاں آج شہر حیدر آباد موجود ہے، پہلے منجنیق اور بحری فوج کو ندی کے راستہ نیرون کی طرف روانہ کیا اور خود بری فوج کے ساتھ سیسم شہر کے راستے روانہ ہوا، جب وہ سیسم شہر پہونچا وہاں حجاج بن یوسف کا خط بھی آپہونچا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ "ہم پوری محنت، کوشش اور مال اس لئے صرف کررہے ہیں تا کہ تم فتح حاصل

کر سکو اور دشمن اپنے کئے کہ سزا پا سکے، یاد رکھو جتنے بھی مال غنیمت ہیں وہ سب تمہیں حاصل ہوں گے، تمہیں چاہئے کہ تم ہر ایک کا احترام کرو، تاکہ وہ مضبوط دل کے ساتھ لڑ سکے، فتح کے بعد تم اس ملک کے حاکم ہوگے، مال غنیمت کو فوجیوں میں تقسیم کرو، ان کی کسی بھی ضرورت پر خرچ کرنے میں ذرا بھی کنجوسی نہ کرو اور مال کے ذریعہ اپنی رعایا کو اپنی طرف مائل کرو اور جب رعایا خوشحال ہوگی تو ملک ترقی کرے گا"۔

نیرون شہر دیبل سے پچیس فرسخ کے فاصلہ پر تھا، چھ دن کی مسافت طے کر کے مسلم فوج نیرون کے اطراف میں پہونچی، وہاں سیحون ندی تھی جو اس وقت بالکل خشک ہو چکی تھی، فوج وہاں پہونچتے پہونچتے بالکل ہی تھک گئی تھی، سامان رسد ختم ہو گیا تھا، محمد بن قاسم نے دعا مانگی اور اللہ تعالی نے دعا قبول کرلی، زور کی بارش ہوئی ندی پانی سے بھر گئی اور پوری وادی ہری بھری ہوگئی، فوج اور جانور سبھی سیراب ہوگئے، جب محمد بن قاسم نیرون پہونچا تو لوگوں نے قلعہ بند کرلیا، اس وقت وہاں کا حاکم ایک راہب تھا جو راجہ داہر کے پاس گیا ہوا تھا، جب وہ واپس نیرون پہونچا تو اپنے دو قاصد سامان رسد کے ساتھ محمد بن قاسم کے بھیجا اور کہا کہ ہم سب اور پوری عوام دار الخلافہ کے خدمت گار ہیں، چونکہ میں شہر میں نہیں تھا اس لئے میری عدم موجودگی میں اہل شہر نے قلعہ کا دروازہ بند کرلیا تھا، اس کے لئے ہم معافی کے خواستگار ہیں، پھر اس نے شہر کا دروازہ مسلمانوں کے لئے کھول دیا، محمد بن قاسم نے کہا آپ کے شہر کے لوگوں نے قلعہ کا دروازہ مسلمانوں کے لئے بند کر کے جو غلطی کی اس کو آپ کی معذرت طلب کرنے پر معاف کرتے ہیں اور شہر کے حاکم بذات خود ہمارے پاس حاضر ہوں اپنی معذرت پیش کریں، اگلے دن حاکم راہب خود محمد بن قاسم کے سامنے حاضر ہوا، شہر میں مسلمانوں کو داخل ہونے کی اجازت دی اور محمد بن قاسم کی فوج کی ضیافت کی، محمد بن قاسم نے بھی اہل شہر کو امان دی، ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، شہر میں ایک مسجد تعمیر کرائی، مسلمانوں کی ایک کالونی بنائی، رعیت کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کے حکم صادر کئے۔

نیرون کو زیر کرنے کے بعد سیوستان پہونچا، یہاں پر راجہ داہر کا بھتیجا بجھرا حکومت کرتا تھا، یہاں پجاریوں اور مذہبی طبقہ نے محمد بن قاسم کے سیوستان کی طرف رخ کرنے کی خبر سنی تو وہ شہر کے حاکم بجھرا کے پاس پہونچے اور کہا کہ ہم عبادت گزار لوگ ہیں، جنگ و قتال سے دور رہتے ہیں، ہمیں ڈر ہے کہ مسلم لشکر ہم پر غالب آجائے گا اور ہمارے مال واسباب لوٹ لے گا کہ ہم بھی تمہارے ساتھ تھے، ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ دار الخلافہ سے یہ حکم ہے کہ جو بھی امان طلب کرے اسے امان دے دیا جائے، لہذا اگر تم ہماری بات سے اتفاق کرو تو ہم امن کے سفیر بن کر مسلم فوج کے پاس جائیں اور ان سے صلح وامان کا وعدہ لے لیں، اور ہمیں معلوم ہے کہ عرب اپنا وعدہ وفا کرنے والے ہوتے ہیں، لیکن بجھرا نے ان کی بات نہ مانی اور مقابلہ کرنے کی ٹھانی، مسلم لشکر نے شہر کا محاصرہ کرلیا، محاصرہ انتہائی سخت ہو گیا، شہر پر تیروں، نیزوں اور منجنیق سے حملہ کیا گیا، آخر کار اہل شہر نے یہاں کے حاکم کا ساتھ نہ دیا اور وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا، اس شہر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، سیوستان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم سربیدس شہر پہونچا، یہاں کے لوگوں نے بھی صلح کرلی اور خراج دینے پر رضامندی کا اظہار کیا، پھر شہر سیسم کا رخ کیا، شہر کے راجہ نے محمد بن قاسم سے صلح کرلی، محمد بن قاسم نے اس کی عزت افزائی کی، اس نے آئندہ مہم میں مسلمانوں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا، پھر مسلم لشکر اشبہار شہر کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا بھی محاصرہ کرلیا، ابتدا میں وہاں کی فوج نے مقابلہ

کیا اور خوب بہادری سے لڑائی کی، لیکن محاصرہ طویل ہونے کی وجہ سے ان کی ہمتیں بھی ٹوٹنے لگیں اور یہ یقین ہو گیا کہ مسلمان بنا فتح کئے واپس نہیں ہوں گے، لہذا اہل شہر نے اس شرط کے ساتھ ہتھیار ڈال دئے کہ انہیں جان و مال کی امان دی جائے، مسلمانوں نے ان کی شرط کو قبول کر لیا، اس طرح سے یہ شہر بھی مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا، اسی طرح جس شہر کے لوگوں نے صلح کی درخواست کی سپہ سالار نے انہیں امان دی، جنہوں نے لڑائی کا ارادہ کیا انہیں بزور شمشیر فتح کیا گیا، راجہ داہر کے تمام ہی عمال محمد بن قاسم کے مقابلے میں ایک ایک کر کے شکست کھاتے چلے گئے، کوئی بھی ان کی بہادری کے آگے نہ ٹھہر سکا، اس طرح محمد بن قاسم شہروں کو فتح کرتا ہوے آگے بڑھتا گیا۔

2.3.4 راجہ داہر کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ

دیبل کے بعد سب بڑا اور فیصلہ کن معرکہ راجہ داہر سے ہوا، راجہ داہر سندھ کا اصل حکمراں تھا، یہ ایک متعصب برہمن زاد تھا، اس نے بدھ مت کے پیروکاروں پر بہت زیادہ ظلم ڈھائے اور بزور طاقت ان کو مٹانے کا ارادہ کر لیا تھا، انہیں مظلوموں میں جاٹ اور لوہان قومیں تھیں جن کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے راجہ داہر کے باپ نے یہ پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ ریشم، مخمل اور شال نہیں استعمال کر سکتے اور انہیں اصل تلوار کے بجائے مصنوعی تلوار رکھنے کا حکم دیا تھا، سندھ کے یہ سبھی مظلوم افراد مسلمانوں سے مدد کے طالب تھے۔

راجہ داہر سے مقابلہ کا وقت اس وقت آیا جب محمد بن قاسم کے پاس سامان رسد ختم ہو چکا تھا، یہاں تک کہ گھوڑوں کو کھلانے کے لئے چارہ تک بھی میسر نہ تھا، مسلمان گھوڑوں کا گوشت کھانے پر مجبور تھے، لشکر میں بیماریاں بھی پھیل رہی تھیں، محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف سے مدد طلب کی، لیکن مقابلہ کا وقت آ چکا تھا، مسلمانوں نے شوق جہاد میں ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کرنے لئے خود کو تیار کر لیا، لہذا محمد بن قاسم دریاء سندھ تک جا پہونچا، دریا عبور کرنا بڑا مشکل کام تھا، لیکن راجہ موکا جو پہلے ہی محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر چکا تھا اس کے تعاون سے یہ کام کافی آسان ہو گیا، جنگ کے آغاز سے پہلے محمد بن قاسم نے فوجیوں کو ذکر و استغفار کی طرف ابھارا، اس نے فوجیوں کو مخاطب کیا اور کہا: اے مسلمانوں کثرت سے استغفار کرو، اللہ تعالی نے مسلمانوں کو دو بہت اہم چیزیں عطا کی ہیں، اول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود دوسرا استغفار، لہذا کثرت سے اللہ کا ذکر کرو اور نبی صلی اللہ علیہ پر دورد پڑھو تا کہ اللہ تعالی تمہیں غلبہ عطا کرے اور دشمن پر تمہیں مسلط کر دے، راجہ داہر مسلم لشکر کی ان تمام فتوحات کو حقیر سمجھتے ہوے غفلت میں پڑا رہا، جب محمد بن قاسم نے دریائے سندھ عبور کر لیا تب راجہ داہر بھی اپنی فوج لے کر میدان جنگ میں آ گیا، محمد بن قاسم نے فوج کو منظم انداز میں تعینات کیا، گھڑ سواروں کا ایک دستہ منتخب کیا، مروان بن اشحم اور تمیم بن زید کو امیر مقرر کیا، اور انہیں حکم دیا کہ دشمنوں کی فوج پر پیچھے سے حملہ کریں۔

یہ ایک فیصلہ کن معرکہ تھا، میدان جنگ میں راجہ داہر ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے آس پاس بھی ہاتھیوں کا ایک گھیرا تھا، وہ اس کے چاروں طرف اس طرح سے کھڑے ہوتے تھے کہ کسی دشمن کی رسائی اس تک ممکن نہ لگ رہی تھی، مسلمانوں کے گھوڑوں نے جب فیل بانوں کا یہ لشکر دیکھا تو ان کے اعضاء بدن لرزنے گے، دوسری طرف ہیبت ناک فیل بانوں نے جب ان گھڑ سواروں کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان دیو قامت گھوڑوں نے اپنی کمر پر جنوں جیسے انسان اٹھائے ہوئے ہیں، بہر کیف ہاتھیوں کی چنگھاڑ نے گھوڑوں کی ہنہنانے والی آوازوں کو دبا لیا پھر مسلمانوں نے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوے اس زور سے حملہ کیا کہ دشمن دو ٹکڑوں میں بٹ گیا، مسلمان آگے پیچھے دونوں طرف

سے حملہ کرنے لگے اور ان پر زبردست خوف وہراس طاری ہو گیا۔

غرض دونوں لشکر بڑی بے جگری سے لڑے، شدید ترین جنگ ہوئی، کئی دنوں تک یہ جنگ جاری رہی، آخری دن سخت معرکہ ہوا شام تک لڑائی جاری رہی، تیر اندازوں نے اپنے تیروں میں آگ لگا کر فیل بانوں اور ہودجوں پر حملہ کیا، ایک تیر راجہ داہر کے ہودج پر بھی لگا، ہودج میں آگ لگ گئی، فیل بان ہاتھی کو قابو میں نہ رکھ سکا، اور ہاتھی راجہ داہر کو لے کر بھاگا اور پانی میں گر گیا، ایک بہادر ہیرو نے اس زور سے تلوار ماری کہ تلوار سر کو چیرتے ہوئے کمر تک اتر گئی، راجہ کے موت کی خبر سنتے ہی بقیہ فوج شکست تسلیم کرتے ہوئے بھاگ کھڑی ہوئی، مسلمانوں نے راور قلعہ تک اس کا پیچھا کیا، اس طرح 93ھ رمضان المبارک کے مہینہ میں سندھ کی فتح پر آخری مہر ثبت ہوگئی، سبھی نے اللہ کا شکر ادا کیا، محمد بن قاسم نے سبھی کو امان دی، اور حجاج کے پاس فتح کی خوشخبری بھیج دی۔

2.3.5 راور شہر

راجہ داہر کی شکست کے بعد اس کا بیٹا جےئ سنگھ اور اس کی بیوی رانی بائی فرار ہو کر راور شہر کے قلعہ میں پناہ لی، جےئ سنگھ کو اپنی جوانی اور قوت پر بڑا غرور تھا، باپ راجہ داہر کی موت نے بھی اس کی ہمت کو نہیں توڑا اور دوبارہ حملہ کرنے کی ٹھانی، فوج اکھٹا کرنی شروع کی اور ارادہ کیا کہ راور کے قلعہ ہی سے مسلم فوج کا مقابلہ کیا جائے، لیکن اس کے وزیر سی ساگر نے اس وقت مقابلہ کرنا صحیح نہیں سمجھا، اور جے سنگھ کو مشورہ دیا کہ یہاں پر مقابلہ کرنا صحیح نہیں بلکہ ہم اپنے آباؤاجداد کے شہر برہمن آباد پہونچیں اور وہاں سے مقابلہ کیا جائے، لہذا وہ اپنے تمام ہی لاؤلشکر لیکر وہاں سے نکل گیا، لیکن راجہ داہر کی بیوی رانی بائی نے اس کی مخالفت کی اور وہیں رہ کر مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا، اس کے پندرہ ہزار کا لشکر بھی موجود تھا، محمد بن قاسم کو جب اس کا علم ہوا، وہ اپنے لشکر کو لے کر آگے بڑھا، اور راور شہر کا محاصرہ کرلیا، منجنیقوں سے شہر کی دیوار توڑنی شروع کر دی، ہر جانب سے تیر اندازوں نے تیر برسانا شروع کر دیا، داہر کی رانی کو جب شکست واضح طور پر دکھنے لگی اور عربوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا خطرہ لاحق ہوا تو اس نے خود کو اور اپنی کنیزوں کو مع قیمتی سامان اور نفیس تحائف سب کچھ جلاڈالا، پھر باقی سبھی نے ہتھیار ڈال دئے اور بہ آسانی مسلمانوں نے اس شہر کو بھی فتح کر لیا۔

2.3.6 برہمن آباد کی فتح

راجہ داہر کی شکست کے بعد جن بڑے شہروں میں سے چند ایک نے مزاحمت دکھائی ان میں ایک برہمن آباد بھی تھا، یہ شہر سندھ کا ایک تاریخی شہر ہے، تمام شکست خوردہ متفرق لشکر اسی شہر میں جمع ہو گئے تھے تاکہ مل کر مسلمانوں کا مقابلہ کریں، خاص طور راجہ داہر کا بیٹا جےئ سنگھ، راور، اس نے وہاں کے قلعہ کو مضبوط کیا اور فوجوں کو منظم کیا اور مقابلہ کی تیاری کرنے لگا، محمد بن قاسم کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ بھی برہمن آباد کی طرف روانہ ہوا، راستہ میں قلعہ وہلیلہ کی فوج نے مقابلہ کیا، وہاں سولہ ہزار کی فوج موجود تھی، لیکن محمد بن قاسم کی فوج کے سامنے نہ ٹک سکی اور کچھ ہی دنوں میں یہ قلعہ بھی فتح ہو گیا، آگے چل کر قلعہ بہرور کی فوج نے بھی مقابلہ کیا، لیکن محمد بن قاسم نے دو مہینہ تک محاصرہ جاری رکھا، یہاں تک کہ قلعہ کے اندر سامان رسد ختم ہونے لگا، آخر ایک رات تمام فوج نہر کے راستہ فرار ہوگئی، محمد بن قاسم کی فوج قلعہ میں داخل ہوگئی، ان تمام قلعوں کی فتوحات کی خبر جب راجہ داہر کے وزیر سی ساگر کو پہونچی جو کہ اس کے بیٹے کے ساتھ

برہمن آباد میں موجود تھا، اس نے محمد بن قاسم سے امان طلب کی اور اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا، محمد بن قاسم نے اس کی عزت افزائی کی اور اسے اپنا وزیر بنالیا۔

ان قلعوں کو زیر کرنے کے بعد محمد بن قاسم برہمن آباد پہونچا اور جلوانی نہر کے کنارے خیمہ زن ہوا اور ارد گرد خندق کھودنے کا حکم دیا تاکہ دشمن کی فوج شب خون نہ مار سکے، راجہ جئے سنگھ کے لشکر چار، پانچ ہزار کی تعداد میں روز نکلتے، شام تک لڑائی جاری رہتی، سورج غروب ہونے کے بعد قلعہ میں داخل ہو جاتے، چھے مہینہ تک یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک اہل شہر نے تنگ آکر محمد بن قاسم سے امان طلب کی اور قلعہ کا دروازہ محمد بن قاسم کے لئے کے لئے کھول دیا، راجہ داہر کا بیٹا کشمیر کی طرف بھاگ گیا، آخر کار یہ شہر بھی فتح ہوا، اور مسلمان بحیثیت فاتح شہر میں داخل ہوئے، محمد بن قاسم نے کچھ دنوں شہر میں قیام کیا، وہاں کے انتظامی امور کو درست کیا، اہالیان شہر کو امان دی، ان کو پوری آزادی دی گئی کہ وہ اپنے رسوم وعبادات اسی طرح بجالاتے رہیں جس طرح وہ پہلے سے کر رہے تھے اور جو جزیہ ان کے اوپر واجب ہے اسے ادا کریں۔ مزید آگے بڑھتے ہوئے مسلم فوج ساوندی شہر میں داخل ہوئی، وہاں پہلے ہی مسلمانوں کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی، وہ کسی بھی طرح اپنی جانوں کو جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے، لہذا وہاں کے لوگوں نے امان طلب کی اور کسی بھی طرح کی لڑائی سے گریز کیا، سپہ سالار لشکر نے انہیں اس شرط کے ساتھ امان دی کہ وہ مسلمانوں کی ضیافت کریں گے، وہ اس پر راضی ہو گئے، کچھ دنوں بعد سبھی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ مزید آگے بڑھتے ہوے مسلم لشکر بسمد شہر پہونچا، وہاں کے لوگوں نے بھی جنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی جسے محمد بن قاسم نے بخوشی قبول کر لیا اور یہ شہر بھی مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا۔ آگے بڑھتے ہوئے روہڑی شہر آیا، یہ علاقہ مسلمانوں تیر اندازوں کی زد میں تھا، سندھ کے پہاڑی علاقوں میں سے ایک پہاڑ پر واقع تھا، اس کا راستہ دشوار گزار تھا، اوپر چڑھنا مشکل تھا، محمد بن قاسم نے کئی ماہ تک محاصرہ جاری رکھا، یہاں تک کہ اس کے باشندوں نے مصالحت کی پیشکش کی، محمد بن قاسم نے ان کی صلح قبول کر لی، پھر سکھر شہر بھی فتح کیا، سفر یہیں ختم نہیں ہوا، بلکہ وہ دریائے بیاس عبور کر کے ملتان تک پہونچ گیا۔

2.3.7 ملتان شہر

یہ سندھ کے اہم شہروں میں سے ایک ہے، یہ کافی قدیم اور بڑا شہر تھا، اہل سندھ کے خیال میں اس شہر کا تقدس دیبل شہر پر فوقیت رکھتا تھا، اس میں عظیم بودھ یا صنم خانہ بھی تھا، جس پر مال و دولت، ہدایا و تحائف نذروں کی شکل میں نچھاور کئے جاتے تھے، لوگ یہاں عقیدت بھرے جذبات لئے دور دراز سے حاضری دینے آتے تھے، اس کے احترام میں دل جھکے جاتے تھے، سر اور داڑھی کے بال اس کے قرب میں منڈواتے تھے، قربانی کے جانور کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کرتے تھے، زائرین ہجوم مسلسل وہاں موجود رہتا تھا، لوگ مصروف عبادت رہتے تھے، وہاں کے صنم خانوں کی ضخامت و وسعت اس قدر تھی کہ اس کے دربانوں و خدمات گاروں کی تعداد چھ ہزار کاہنوں تک پہونچتی تھی، جو شب و روز وہیں مقیم رہتے تھے، یہ ہر آنے والے کا استقبال کرتے تھے، سندھ کی بستیوں میں اس کا ایک نمایاں مقام تھا۔

محمد بن قاسم ملتان شہر پہنچا، لوگوں نے قلعہ بند ہو کر لڑائی شروع کی، اولاً تو یہ خیال تھا کہ محاصرہ طویل نہ کھنچ سکے گا جلد ہی ان کے راشن پانی کے ذخائر ختم ہو جائیں گے، بھوک پیاس انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں گے، لیکن محاصرہ طویل ہو گیا، مسلمان یہ سمجھ رہے تھے

کہ پانی کا جو ذخیرہ ان کے پاس ہے جلد ہی ختم ہو جائے گا، مگر بارش کا پانی نالہ کے ذریعہ قلعہ کے اندر داخل ہو رہا تھا، اور بارش کے پانی کا ذخیرہ اندرون شہر ہی تھا، بالآخر شہریوں میں سے کسی نے مخبری کر دی، تو مسلمانوں نے خفیہ نالہ بند کر دیا، جب پانی اندر نہ پہونچا تو محصورین کو پیاس نے ستایا، حتی کہ پیاس سے زبانیں لٹک گئیں، ان حالات سے چھٹکارا پانے کے لئے کوئی چارہ نہ رہا، پھر صلح کے لئے ہتھیار ڈال دئے، اور قلعہ کا دروازہ مسلمانوں کے لئے کھول دیا، لڑنے والے ہلاک ہوئے اور دوسروں کو قیدی بنالیا گیا۔

محمد بن قاسم جب شہر میں داخل ہوا تو وہاں کے بڑے مندر میں بہت سارا سونا ملا، جو قدیم بدھ کے زائرین نے وہاں رکھا تھا، سالوں گزرنے کی وجہ سے سونے کے اوپر نیچے تہ بہ تہ ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سندھی ہیرو نے حکم دیا کہ یہ سونا ایک کمرے میں جمع کیا جائے، اس کمرے کا طول قریباً پندرہ فٹ اور عرض بارہ فٹ تھا، اسی وجہ سے ملتان کا نام سونے کا خزانہ رکھا گیا، محمد بن قاسم نے اس مال کا پانچواں حصہ نکال کر باقی حصہ فوجیوں میں تقسیم کر دیا۔

سقوط ملتان کے بعد کوئی بھی مزاحمت کرنے والا باقی نہ رہا، اور پورا سندھ محمد بن قاسم زیر نگیں ہو گیا، اور وہ پورے سندھ کا امیر مقرر ہوا اور سندھ کی زمام کار سنبھالی، اس نے جس نظم ونسق کو جاری کیا وہ عدل ومساوات پر مبنی تھا، اس طرح اس نے سبھی کا دل جیت لیا، ہندو مسلم سبھی کو شریک حکومت کیا، سندھی، جاٹ اور پنجابی یہ سب اس کی طرف سے سندھ کے مختلف علاقوں میں حکومتی امور انجام دیا کرتے تھے، راجہ داہر کے وزیر سی ساگر کو اپنا مشیر خاص مقرر کیا، ہندوؤں سے متعلق نظام کو بڑی حد تک جوں کا توں باقی رکھا، مثلاً اگر مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ مسلم قاضی کرتے تو ہندوؤں کے مذہبی امور کا فیصلہ ان کے پنڈت کرتے، ان اقدامات کے بدولت حاکم ومحکوم کے درمیان بہترین تعلقات قائم ہو گئے، حکومت میں امن وامان قائم ہو گیا، اس رواداری کے نتیجہ میں وہاں بہت ہی تیزی کے ساتھ اسلامی تہذیب وتمدن کو فروغ ملا۔

2.3.8 محمد بن قاسم کے آخری ایام

سندھ کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے مزید پیش قدمی کے لئے تیاری کی، چنانچہ حجاج بن یوسف کے پاس خط بھیجا جس میں مملکت قنوج پر فوج کشی کی اجازت طلب کی، یہ شمالی ہند میں اپنے وقت کی سب سے بڑی مملکت تھی جس کی حدود سندھ سے لے کر بنگال تک پھیلی ہوئی تھی، حجاج نے اس کی اجازت دے دی، محمد بن قاسم نے قنوج کے راجہ کے دربار میں اپنی طرف سے وفد روانہ کیا، اور راجہ کو دعوت دی کہ یا تو وہ اسلام قبول کر لے یا جزیہ دینے کے لئے تیار رہے، لیکن قنوج کے راجہ نے وفد کے ساتھ برا سلوک کیا، لہذا محمد بن قاسم نے قنوج فتح کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن ابھی وہ تیاری کر ہی رہا تھا تبھی خبر پہونچی کہ خلیفہ وقت ولید بن عبد الملک کا انتقال ہو گیا ہے اور سلیمان بن عبد الملک اس کی جگہ خلیفہ مقرر ہو گیا ہے، چونکہ سلیمان کو حجاج بن یوسف سے سخت نفرت تھی، لہذا اس نے خلیفہ بنتے ہی حجاج کے مقرر کردہ جتنے بھی عمال اور گورنر تھے ان سب کو ہٹا دیا، محمد بن قاسم بھی اس کی زد میں آ گیا، سلیمان بن عبد الملک نے محمد بن قاسم کو بھی معزول کر دیا اور اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا گورنر مقرر کر دیا اور محمد بن قاسم کو والی عراق صالح بن عبد الرحمان کے حوالہ کر دیا گیا جس نے اس کو واسط کی جیل میں مختلف طرح سے تکلیفیں پہونچا کر مار ڈالا، سندھ میں قیام کے دوران وہ اپنی ہمت وبہادری اور عدل وانصاف کی وجہ

سے عوام میں بہت مقبول تھا، عوام اس سے بہت محبت کرتے تھے، جب وہ سندھ چھوڑ کر جارہا تھا تو عوام کا ایک بڑا طبقہ اس کے جانے پر آنسو بہارہا تھا، اس کے جانے کے بعد اہل سندھ نے اس کی یاد میں مجسمہ بنایا اور بہت سارے شعراء نے اس کا مرثیہ لکھا۔

2.4 کلیدی الفاظ

محاصرہ	:	شہر کو چاروں طرف سے گھیر لینا
منجنیق	:	سنگ باری کرنے والا ایک آلہ جسے عربوں نے ایجاد کیا تھا
مسمی	:	نام رکھا گیا
سراندیپ	:	موجودہ سری لنکا
سوداگر	:	تاجر
دیبل	:	موجودہ کراچی کے آس پاس کا علاقہ
معزول	:	منصب سے ہٹا دینا

2.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- برصغیر ہند کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے انتہائی قدیم ہے، فتح سندھ سے پہلے بھی اسلام اور مسلمان یہاں موجود تھے، اور بہت ہی امن و سکون کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہے تھے، اپنے اخلاق و کردار اور اسلامی تعلیمات کے نتیجہ میں عوام و خواص دونوں کو متاثر کررہے تھے، اور عوام کے درمیان اسلام اور مسلمانوں سے دلچسپی میں اضافہ ہورہا تھا۔
- فتح سندھ سے پہلے ہی عرب مسلمان یہاں تجارتی تعلقات قائم کر چکے تھے، یہاں مسلمانوں کی اپنی بستیاں قائم تھیں، یہ مسلمان تاجر عرب وہند کے درمیان سماجی اور ثقافتی تعلقات کے ایک پل کے طور پر اپنا کردار ادا کررہے تھے۔
- ایران کی فتح کے بعد سندھ کے علاقہ پر ہمیشہ مسلمانوں کی نظریں تھیں، کیوں کہ یہ ایک ہمسایہ ملک تھا، اور یہاں سے مسلسل اسلامی سرحدوں پر حملہ ہوتا تھا، اور وہ اسلامی حکومت کے مجرمین کے لئے بھی یہ ایک جائے پناہ کی حیثیت تھی، اسی وجہ سے مسلمان تلاش میں تھے کہ انہیں کوئی ایسا موقع میسر ہو جب وہ اس کے خلاف کوئی فوجی کاروائی کر سکیں، لہذا متعدد بار مختلف علاقوں کے گورنروں نے سرحد کی حفاظت کے لئے مختلف فوجی کاروائیاں کیں مگر کوئی فیصلہ کن مہم نہیں چھیڑی جاسکی جو اسلامی مملکت کو درپیش مختلف چیلنجز کا خاتمہ کرسکے، آخر کار محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر کے ان چیلنجز کا سدباب کیا۔
- اسلامی حکومت اپنے وقت کی سپر پاور تھی، بڑی بڑی سلطنتیں بھی اس سے ٹکرانے سے ڈرتی تھیں، اسلامی حکومتیں اپنے شہریوں

کی حفاظت کے لئے ہمیشہ تیار رہتی تھیں، لہذا سندھ کے راجہ داہر نے جب کچھ بے گناہ مسلمان عورتوں کو قیدی بنالیا اور ان کا سارا سامان لوٹ لیا تو ایک مسلمان عورت نے حجاج بن یوسف کو مدد کی آواز لگائی تو اس نے فوراً ان کی آواز پر لبیک کہا اور ان کی مدد کے لئے فوج بھیج دی۔

- کسی بھی بڑی مہم سے پہلے اس کی مکمل تیاری کرنی ضروری ہوتی ہے، جیسا کہ سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے سے واضح ہوتا ہے، لہذا حجاج بن یوسف نے جب محمد بن قاسم کو فوج دے کر روانہ کیا، تو ضرورت کا ہر سامان مہیا کرایا، بری اور بحری دونوں طرح کی فوجیں روانہ کیں، سامان رسد میں ہر ایک چیز مہیا کیں، حتی کہ سوئی دھاگہ اور سرکہ جس کو عرب بڑے ہی شوق سے کھاتے تھے وہ بھی ساتھ بھیجا تاکہ تیاری میں کسی بھی طرح کی کمی نہ رہ جائے۔
- ہمت وبہادری اور جدید اسلحہ یہ سب جنگ کی اہم اسٹریٹیجیز ہیں، یہ وہ ساری چیزیں تھیں جو محمد بن قاسم کے پاس تھیں، کم عمری کے باوجود اس کے اندر زیرکی وہوشیاری اور شوق جہاد بدرجہ اتم موجود تھا، منجنیق اس وقت کا سب سے جدید اور اہم اسلحہ تھا جو صرف مسلم فوجوں کے پاس تھا، جس نے ہر لڑائی میں بہت ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔
- محمد بن قاسم کی فتوحات کسی ایک معجزہ سے کم نہیں ہے، تین سال سے بھی سے کم عرصہ میں پورے سندھ کو فتح کرکے اسے مملکت اسلامیہ کے حدود میں داخل کردیا، اس قدر طویل مملکت کو محض اس قلیل عرصہ میں زیر کرلیا، ایک ایسے دور میں جب کہ طویل مسافت کو طے کرنے کے لئے سوائے اونٹ اور گھوڑوں کے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، اتنے وسیع وعریض خطہ کو فتح کرنا کسی تعجب خیز امر سے کم نہیں، خصوصاً ایک ایسے مرحلے میں جب کہ عمر کی دوسری دہائی بھی پار نہ کی ہو اور دوسرے بڑے بڑے تجربہ کار سپہ سالار اس مہم میں ناکام ہوچکے ہوں، لیکن تجربہ کی کمی کو اس نے اپنی ذہانت وہوشیاری سے پوری کرلی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا پورا سہرا محمد بن قاسم کے شوق جہاد اور اللہ کی مدد پر کامل بھروسہ کو جاتا ہے۔

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اس وقت سندھ کا راجہ کون تھا؟

(a) راجہ گوپال (b) راجہ منیش (c) راجہ اہرن (d) راجہ داہر

2. محمد بن قاسم کو کس اموی گورنر نے سندھ پر حملہ کے لئے روانہ کیا؟

(a) موسی بن نصیر (b) حجاج بن یوسف (c) عبداللہ بن زبیر (d) مہلب بن ابی صفرہ

3. کسی خلیفہ وقت کے دور میں سندھ فتح ہوا؟

(a) مروان بن حکم (b) عبدالملک بن مروان (c) ولید بن عبدالملک (d) سلیمان بن عبدالملک

4. سندھ کا علاقہ اس وقت کہاں واقع ہے ؟

(a)ہندوستان (b) پاکستان (c)افغانستان (d)بنگلہ دیش

5. سندھ کی سب سے مشہور بندر گاہ کا نام کیا تھا؟

(a)دیبل (b)ملتان (c)سربیدس (d)برہمن آباد

6. راجہ داہر نے جس قافلہ کو لوٹا تھا وہ کہاں سے آرہا تھا؟

(a)افغانستان (b)ایران (c)سراندیپ (d)ترکستان

7. محمد بن قاسم کی فوج کی سب سے بڑی منجنیق کا کیانام تھا؟

(a)عروس (b)طیار (c)شاہین (d)عاصفہ

8. سندھ پر حملہ کا آغاز کس سن ہجری میں ہوا؟

22(a) 24(b) 21 (c) 23 (d)

9. سندھ کی فتح کا سہرا کس سپہ سالار کے سر ہے ؟

(a)محمد بن قاسم (b) قاسم بن محمد (c) قاسم بن ثعلبہ (d)حامد بن ابراہیم

10. کس خلیفہ نے محمد بن قاسم کو معزول کر کے واپس بلالیا؟

(a)ولید بن عبد الملک (b)ہشام بن عبد الملک (c) حجاج بن یوسف (d) سلیمان بن عبد الملک

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. محمد بن قاسم سے پہلے حجاج بن یوسف نے کن کن قائدین کو فتح سندھ کے لئے بھیجا؟
2. فتح سندھ کی سب اہم وجہ کا ذکر کریے۔
3. شہر دیبل کی فتح کے حالات کا ذکر کیجیے۔
4. نیرون شہر کی فتح کے احوال درج کیجیے۔
5. راور قلعہ کے فتح کے حالات ذکر کیجیے۔

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. فتح سندھ سے پہلے اہل عرب کے اہل ہند سے کس طرح کے تعلقات تھے، روشنی ڈالیے۔
2. مسلمانوں کے سندھ کی طرف متوجہ ہونے کے اسباب کا ذکر کریے۔
3. ملتان شہر کی فتح کے حالات ذکر کیجیے۔

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	تاریخ سندھ	:	اعجاز الحق قدوسی
.2	چچ نامہ	:	قاضی محمد اسماعیل بن علی
.3	تاریخ اسلام	:	اکبر شاہ نجیب آبادی
.4	فاتح سندھ	:	محمد عبد الغنی حسن

اکائی 3: شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد (آبادیوں کا قیام)

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 خلفائے راشدین کے عہد میں مسلم آبادیاں
3.3 بنوامیہ کے عہد میں مسلم آبادی
3.3.1 محمد بن قاسم کی معزولی
3.3.2 محمد بن قاسم کے بعد سندھ کی حالت
3.3.3 شہر محفوظہ اور منصورہ کی تعمیر
3.3.4 'سندھ'-خلفائے عباسی کے عہد میں
3.3.5 محمد بن منصور المہدی کا عہد
3.3.6 ہارون رشید کا عہد خلافت
3.3.7 مامون کا عہد خلافت
3.3.8 سندھ و ہند متاخرین عباسی خلفا کے عہد میں
3.3.9 خود مختار مسلم ریاستوں کے اثرات
3.4 کلیدی الفاظ
3.5 اکتسابی نتائج
3.6 نمونہ امتحانی سوالات
3.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

قدیم زمانے سے ہی 'ہندوستان' کا تعلق دیارِ 'عرب' سے رہا ہے اور عہد ماضی سے ہی یہ ملک اپنی طبعی، فطری اور تہذیبی خصوصیات کی بنا پر بھی دنیا بھر میں اہمیت اور توجہ کا حامل رہا ہے۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ یہاں اسلام اپنا تعارف عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی کرا چکا تھا اور اہل ہند کے دلوں میں اس کے جاننے اور سمجھنے کی خلش پیدا ہو گئی تھی۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی 'اہل ہند' سے اچھی طرح واقف تھے، جس کی شہادت حدیث کی معروف کتاب سنن نسائی میں بھی ملتی ہے۔ لیکن سرزمین ہند کے شمالی حصے میں اسلام کے دیرپا اثرات بعد کی صدیوں میں مجاہدانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں اثر انداز ہوئے۔

3.1 مقاصد

اس مضمون کے ذریعے ہم جاننے کی کوشش کریں گے کہ اسلام جو ایک آفاقی مذہب ہے، جس نے ابتدائی عہد میں ہی پورے عالم کو اپنے فیوض وبرکات سے مستفیض کر دیا تھا، ہندوستان کے شمالی حصے میں کب اور کس طرح اس کی روشنی اثر انداز ہوئی اور یہاں جو اسلام وارد ہوا، اس کی وجوہات کیا تھیں۔ لہٰذا اس سبق میں ہم خلفائے راشدین سے لے کر ہندوستان میں خاندان غزنوی کے ورود تک کے حالات کا جائزہ لیں گے اور جاننے کی کوشش کریں گے کہ کیسے یہاں اسلام کی آب یاری ہوئی۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ دوران تدریس سندھ وہند میں واقع شہر اور علاقوں کے جو نام آئے ہیں ان میں بیش تر شہر اور علاقے گردش زمانہ کی وجہ سے معدوم ہو گئے اور کچھ کے نام تبدیل ہو گئے۔ کچھ شہر اور قصبات کے قدیم نام اب بھی مستعمل ہوتے ہیں، لیکن عرب مورخین، سیاحوں سفر نامے اور بعض علاقائی قدیم کتب میں پرانے نام ہی ملتے ہیں، اس لئے اسے سامنے رکھ کر مطالعہ کیا جائے، تبھی جا کر ہم سندھ کے حالات سے کماحقہ واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

3.2 خلفائے راشدین کے عہد میں مسلم آبادیاں

شمالی ہندوستان میں اسلام جنوبی ہند کے بعد داخل ہوا۔ اس کا باقاعدہ تعارف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (645-634ء) کے عہد خلافت میں ہوا۔ ان کے حکم سے ایک فوجی دستہ سمندر کے راستے 'تھانہ' موجودہ مہاراشٹر کے علاقے تک آیا تھا، جب کہ سپاہیوں کا دوسرا دستہ 'دیبل' جو سندھ میں واقع تھا کی طرف گیا تھا۔ یہاں سے کوچ کرتے ہوئے یہ لوگ 'بروض' (بھروچ) تک آ گئے تھے۔ ان حملوں کے اسباب کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کا راستہ 'سندھ' کے ساحلی علاقوں سے تھا۔ وہ بغرض تجارت اسی راہ سے ہندوستان کی بندرگاہوں سے گزرتے ہوئے بنگال کی کھاڑی اور ارض چین تک پہنچتے تھے۔ آمد ورفت کے دوران انہیں یہاں کے لٹیروں اور قزاقوں سے

واسطہ پڑتا اور جن سے ان کو جانی ومالی نقصان پہنچتا تھا، اس لئے یہ حملے انہیں قزاقوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے ہوئے ہوں گے۔

حضرت عثمان غنیؓ(644-655ء) بھی چاہتے تھے کہ اسلامی فتوحات کا سلسلہ دراز ہو اور 'ہندوستان' کو بھی اسلامی قلم رو میں شامل کیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے عبداللہ بن عامر بن کریز والی عراق کو حکم دیا کہ 'ہندوستان' کی طرف دریائی مہم بھیجنے کی تیاری کی جائے، تاکہ 'بلاد ہند' کے حالات کا تفصیلی علم ہو سکے۔ چناں چہ عبداللہ بن عامر کریز نے حکیم بن حبلہ کو ایک فوجی دستہ دے کر سمندر کے راستے نواحِ 'سندھ' بھیجا تھا۔ وہ یہاں آئے اور جو کچھ یہاں دیکھا، سنا اور سمجھا اسے جا کر خلیفہ کے سامنے بیان کر دیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فی الحال یہاں کی سرزمین سازگار نہیں ہے۔

شمالی ہند میں قائم ہونے اوالی آبادیاں جنوبی ہند میں مسلمان آبادیوں کے بعد قائم ہوئی تھیں۔ عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی مسلم بستی سراندیپ میں قائم ہوئی، مشہور مورخ فرشتہ اس سلسلے میں لکھتا ہے:

"چونکہ اسلام کے پہلے ہی سے عرب ان جزیروں میں تاجرانہ آتے تھے اور یہاں کے لوگ عرب جایا کرتے تھے۔ اس لئے سراندیپ کے راجہ کو اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہی زمانہ میں سنہ 40 ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کی تائید مشہور سیاح اور ناخدا بزرگ بن شہریار کی تصنیف عجائب الہند سے بھی ہوتی ہے۔ وہ سراندیپ کے بیان میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان کے پجاریوں، سنیاسیوں اور جوگیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک "بیکور" ہوتے ہیں جن کی اصل سراندیپ سے ہے۔ یہ مسلمانوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں"۔

اسی طرح عہد خلفاء راشدین کے دور میں ہی ملیبار اور کولم کے علاقے میں بھی مسلم آبادیوں کا ثبوت ملتا ہے۔ عرب جہازراں بہت قدیم زمانے سے اس کا نام لیتے آئے تھے اور اس کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ مسالوں والے ملک کا آخری شہر ہے۔ یہاں سے جہاز عدن کو جاتا تھا اور یہاں مسلمانوں کا ایک محلہ آباد ہو گیا تھا اور یہاں ان کی ایک جامع مسجد بھی تھی۔

شمالی ہند کی ابتدائی آبادیوں میں کشمیر کا علاقہ آتا ہے چونکہ حضرت عثمان کے عہد میں وہاں کے راجہ کے قبول اسلام اور ان سے خط وکتابت کی روایتیں تاریخ میں ملتی ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ (655-660ء) نے بھی 'سندھ' سے تعلق قائم کرنے کی تگ ودو جاری رکھی۔ اگر ان کی شہادت (40ھ) کا حادثہ نہ پیش آتا تو بعید نہ تھا کہ بعد کے زمانہ میں جو اقدام حجاج بن یوسف (661-714ء) کو 'سندھ' کی تسخیر کے لیے کرنا پڑا، وہ حضرت علیؓ کے زمانہ ہی میں ہو جاتا اور پورا خطہ نعرہ تکبیر سے گونج جاتا۔ ان کے ایما پر حارث بن مرہ العبدی نے یہاں آکر جو داد شجاعت دی، اس سے سندھی عوام میں اسلام اور مسلمانوں کا رعب بیٹھ گیا تھا۔

3.3 بنو امیہ کے عہد میں مسلم آبادی

حضرت امیر معاویہؓ (660-679ء) کے ابتدائی زمانہ خلافت تک حارث بن مرہ 'قیقان' (یہ سندھ سے متصل علاقہ تھا) میں رہے اور جنگی کاروائی میں مصروف تھے کہ 42ھ میں وہ اپنے چند ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔ ان کے بعد امیر معاویہؓ نے یکے بعد دیگرے راشد بن عمرو عبدی اور مہلب بن ابی صفرہ کو یہاں کے حالات کو درست کرنے کے لیے بھیجا، مگر ان کو بھی یہاں کامیابی نہیں ملی۔ امیر معاویہ نے 44ھ میں علاقہ 'قیقان' کی بغاوت سر کرنے لئے عبداللہ بن سوار عبدی کو یہاں مامور کیا۔ وہ فتوحات اسلامی کو بڑھاتے ہوئے 'کابل' تک پہنچ گئے تھے، مگر 47ھ میں وہ شہید کر دیے گئے۔ اس کے بعد امیر معاویہ نے اپنے ایک بہادر جنرل حضرت سنان بن سلمہ ہذلی کو یہاں بھیجا۔ انہوں نے گزشتہ تمام ناکام یابیوں کو کام یابی میں تبدیل کر دیا اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ امیر معاویہؓ کے آخری عہد تک بلکہ اس کے بعد بھی کافی دنوں تک یہاں کے باشندے سر اٹھا نہ سکے۔

اموی دور میں سندھ اور گجرات کے علاقے میں مسلم آبادیوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ ان میں اکثر آبادیاں ان عربوں کی تھیں جو بنو امیہ کی حکومت کے خوف سے یہاں ہجرت کر کے آباد ہو گئے تھے۔ محمد علافی کے بارے میں آپ نے پچھلی اکائی میں پڑھا کہ اموی دور میں پانچ سو عربوں نے محمد علافی کی ماتحتی میں بغاوت کی تھی اور اموی گورنر عبدالرحمن بن اشعث کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد روپوشی اختیار کی اور پھر پوشیدہ طور پر عبدالرحمن کو مارڈالا۔ اوراپنے قبیلہ کے پانچ سو آدمیوں کو لیکر عمان کی راہ سے سندھ پہنچ کر سندھ کے علاقے میں آباد ہو گئے۔ راجہ داہر کے زیر حکومت امن کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ فتح سندھ سے پہلے بھی یہاں مسلم آبادیاں موجود تھیں۔

فتح سندھ کے اسباب اور اثرات کے بارے میں آپ نے پچھلی اکائی میں پڑھا کہ بنو امیہ کے عہد میں یہاں باقاعدہ طور پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی اس کے بعد متعدد علاقے فتح ہوئے اور نئے شہر آباد کیے گئے۔ جو علاقہ فتح ہوتا یا شہر آباد کیا جاتا وہاں مسجد تعمیر کی جاتی اور وہاں کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے فوج اور عہدے دار کی تقرری ہوتی اس طرح ہر علاقے میں بکثرت مسلم بستیاں قائم ہو گئیں۔

محمد بن قاسم نے سندھ کی فتح کے دوران نے عفوودرگزر اور رحم دلی کی جو مثال قائم کی ہے وہ تاریخ کے کسی فاتح کی زندگی میں تلاش بسیار کے باوجود بھی نہیں مل سکتی۔ ذکر کیا جاچکا ہے کہ 'نیزوں' کی فتح پر وہاں کے باغیوں کو صرف اس وجہ سے بخش دیا گیا کہ انہوں نے امان نامہ دکھادیا۔ جنگ داہر کے وقت کچھ لوگ گرفتار کیے گئے، ان کے چہرے سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ لوگ قابل گردن زدنی تھے، مگر انہیں رہا کر دیا گیا۔ برہمن آباد کی فتح پر عفوودرگزر اور رحم دلی کے جو واقعات پیش آئے وہ سونے کے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ جب 'دیبل' کی فتح ہو گئی اور وہاں کے اعیان واشراف کو پکڑ کر محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا تو محمد بن قاسم نے سب کو معاف کر دیا اور ان کو اختیار دیا کہ چاہے تو وہ اسلام قبول کریں یا اپنے آبائی مذہب پر برقرار رہیں، البتہ جزیہ ادا کریں، جو بہت خفیف رقم تھی۔ اسلام لانے والوں میں 'دیبل' کے جیل خانہ کا محافظ بھی تھا۔ وہ محمد بن قاسم کے اعزاز واکرام کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے اسے 'دیبل'

کا حاکم بنا دیا اور 'مولانائے اسلامی' کا خطاب دیا اور ان کی ماتحتی میں حمید بن ذراع کو یہاں کا پولیس افسر مقرر کیا۔ یہی نہیں بلکہ محمد بن قاسم کے عفوو در گزر کے عام اعلان کو سن کر 'برہمن آباد' کے پجاری ٹولی بنا کر آتے اور محمد بن قاسم سے کہتے کہ یہی منادر ہمارے لئے گزر اوقات کا ذریعہ ہیں۔ یہاں جو چڑھاوا آتا ہے، اس سے ہم لوگوں کا گزر بسر ہوتا ہے۔ جب سے مسلمان یہاں آئے ہیں، لوگ مندر میں نہیں آتے اور چڑھاوا بند ہو گیا ہے۔ محمد بن قاسم نے ان کو تسلی دی۔ چوں کہ بت پرستی کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ اس لیے محمد بن قاسم نے فی الوقت کوئی فیصلہ نہ لیا اور حجاج بن یوسف کے پاس خط لکھ کر شرعی نقطہ نظر کی وضاحت طلب کی۔ وہاں سے اجازت ملنے کے بعد 'برہمن آباد' کے معزز لوگوں اور پجاریوں کو بلا کر اطلاع دی کہ تم لوگ مندر میں بلا خوف و تردد جاسکتے ہو اور اپنے آبائی رسم کے مطابق عبادت کر سکتے ہو۔ کسی کو اس کام سے روکا نہ جائے گا۔ اس فرمان کے ملتے ہی مندر آباد ہو گئے اور نذر و نیاز چڑھنے لگے۔ بلکہ مندروں سے متعلق محمد بن قاسم نے یہ بھی کہا کہ ان کے مندر ایسے ہی ہیں جیسے شام اور عراق کے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں اور مجوسیوں کے آتش کدے۔ ان کو اجازت ہے کہ جس طرح چاہیں عبادت کریں۔ یہ شہادت بھی ملتی ہے کی بعض خستہ مندروں کی محمد بن قاسم نے مرمت بھی کروائی اور ان کو آباد رکھنے کے لئے اوقاف دیئے۔

3.3.1 محمد بن قاسم کی معزولی

95ھ میں محمد بن قاسم ملتان ہی میں تھے کہ انہیں حجاج بن یوسف کے انتقال کی خبر ملی۔ انہوں نے مرتے وقت اپنے بیٹے عبد اللہ کو اپنا قائم مقام بنا دیا تھا اور یزید بن کبشہ کو افواج کوفہ و بصرہ اور یزید بن مسلم کو صیغہ مال پر مقرر کر دیا تھا۔ یہ خبر ملتے ہی محمد بن قاسم 'ملتان' سے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے لوٹ آئے اور 'ارور' و 'بغرور' میں مقیم ہو گئے۔ یہیں سے ہندوستان کے ساحلی علاقوں کی تسخیر کے لیے اپنے لشکر روانہ کیے۔ 'بھیلمان'، 'سورٹھ' اور 'کیرج' کے علاقے میں کامیابی حاصل کی اور یہاں کے لوگوں کو مطیع بنایا۔ اسی عرصے (96ھ) میں خلیفہ ولید کا انتقال ہو گیا۔ ان کی جگہ سلیمان بن عبد الملک (715-717ء) خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے حجاج بن یوسف کے مقرر کردہ عراقی امرا کو معزول کر کے یزید بن ابی کبشہ سکسکی اور یزید بن مہلب بن ابو صفرہ کو یکے بعد دیگرے یہاں کا حاکم نامزد کیا۔ ساتھ ہی صالح بن عبد الرحمٰن تمیمی کو خراج کی وصولی پر مقرر کیا۔ موخر الذکر دونوں کو حجاج کے خاندان سے پرانی عداوت چلی آرہی تھی۔ موقع ملتے ہی ان لوگوں نے آل ابی عقیل سے انتقام لینا چاہا۔ ادھر خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے بھی آل ابی عقیل سے بدلہ لینے کی انہیں شہ دی۔ صالح بن عبد الرحمٰن نے یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو 'سندھ' کی ولایت پر مامور کیا۔ اس وقت محمد بن قاسم ہندوستان کے ساحلی علاقہ 'گجرات' میں مصروف جہاد تھے۔ یزید بن ابی کبشہ نے آتے ہی محمد بن قاسم کی گرفتاری کا حکم دیا اور انہیں گرفتار کر کے یزید بن مہلب کے بھائی معاویہ بن مہلب کی نگرانی میں 'عراق' روانہ کر دیا۔ صالح نے انہیں 'واسط' کے جیل میں قید کر دیا اور طرح طرح کی اذیت ناک سزا دے کر انہیں مار دیا۔

3.3.2 محمد بن قاسم کے بعد سندھ کی حالت

محمد بن قاسم کے بعد جو امرا 'سندھ' میں آئے گو کہ ان کا زمانہ محمد بن قاسم کی مدت سے بہت طویل رہا، مگر جو کامیابی محمد بن قاسم کو

مختصر مدت میں ملی وہ کسی اور کے حصہ میں نہ آسکی۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی باغی ہو گئے جن کو محمد بن قاسم نے مطیع بنایا تھا۔ ایسی بھی شہادت ملتی ہے کہ کچھ نو مسلم اسلام سے پھر گئے۔ کیوں کہ جس قسم کے وصف حکم رانی کی یہاں ضرورت تھی وہ بعد کے امرا میں نظر نہیں آتی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ جس محنت شاقہ اور دور اندیشی سے محمد بن قاسم نے 'سندھ' اور اس سے آگے بڑھ کر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اسلام کی آبیاری کی اور جگہ جگہ مسلمانوں کو بسایا وہ قلیل مدت میں ہی منتشر ہو گیا۔ خطہ 'سندھ' کو سابقہ حالت پر لانے کے لیے اموی امرا کو کافی جدوجہد کرنا پڑی، مگر وہ آخر تک فائز المرام نہ ہو سکے۔

سلیمان کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز (717-719ء) خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے حبیب بن مہلب کو معزول کر کے عمر بن مسلم باہلی کو 'سندھ' کی ولایت سونپی۔ انہوں نے بڑی حد تک ملک میں امن کی فضا قائم کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے 'سندھ' سے آگے بڑھ کر 'راجہ بلہرا' کی سرزمین میں قدم رکھا اور نعرہ تکبیر بلند کیا۔ خود حضرت عمر بن عبد العزیز مرکز میں رہ کر اس بات کے متفکر تھے کہ اسلام کی اشاعت طاقت سے زیادہ پیار و محبت کے ذریعہ کی جائے۔ انہوں نے یہاں کے بہتیرے راجاؤں مہاراجاؤں کے نام دعوتی خطوط لکھے۔ ان میں کئی راجاؤں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی شرافت، عدل وانصاف، تقویٰ اور خدا ترسی کو دیکھ کر راجہ 'جے سنگھ' جو بغاوت پر اتر آیا تھا وہ بھی حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

یزید بن عبد الملک (719-723ء) خلافت کی مسند پر رونق افروز ہوئے۔ انہیں بھی زیادہ دن حکومت نصیب نہ ہوئی۔ جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اس مدت میں تین امرا و عمال 'سندھ' آئے۔ فلان سبی، عبید اللہ بن علی سلمی اور عبد الحمید بن عبد الرحمن۔ موخر الذکر نے آل مہلب کے قتل کی شکل میں کامیابی حاصل کی جو بعد میں مرکز سے بغاوت کر کے 'سندھ' میں خود مختار ہو گئے تھے۔ یزید بن عبد الملک کے بعد ہشام بن عبد الملک خلیفہ (723-744ء) ہوئے تو 107ھ میں جنید بن عبد الرحمن المری کو 'سندھ' کا حاکم بنایا گیا۔ انہوں نے یہاں آکر کامیاب حکومت کی اور پورے ملک سے باغیوں اور سرکشوں کا صفایا کیا۔ بڑھ بڑھ کر فتوحات حاصل کیے اور غنائم جمع کیے۔ 'سندھ' کے حالات پر قابو پانے کے بعد وہ مرمد (ماڑوار) آئے۔ یہاں سے مانڈل (ویرم گام کے پاس) اور پھر دھنج (پٹن کے پاس) اور وہاں سے بھروچ بندر گاہ پہنچے۔ ان کے ایک افسر حبیب نامی نے اجین (مالوہ) پر دھاوا بولا۔ وہاں سے بہریمد (سرحد ماروار) اور پھر بھیلمان (گوجروں کے پایہ تخت) کی طرف بڑھے اور اس کو فتح کر کے مال غنیمت حاصل کرتے ہوئے 'سندھ' واپس ہوئے۔ اسی زمانہ میں شہر چینیاب (بیاس ندی سے پچھم طرف دس میل) کی ریاست مطیع فرماں بردار ہوئی۔

3.3.3 شہر محفوظہ اور منصورہ کی تعمیر

تمیم بن زید عتبی کے انتقال کے بعد والی عراق خالد قسری نے خلیفہ کی اجازت سے حکم بن عوانہ کو 'سندھ' کا عامل نامزد کیا۔ یہاں کے حالات کی خبر سن کر انہوں نے محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد کو اپنے ساتھ 'سندھ' لے جانے کی اجازت خلیفہ سے حاصل کر لی۔ چوں کہ مسلمان اپنے اپنے مرکز چھوڑ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے تو مقامی لوگوں نے ان پر اپنا قبضہ جما لیا۔ کوئی ایسی اہم جگہ نہ تھی جو اسلامی عساکر کے لیے قابل اطمینان ہو۔ چنانچہ فوراً ہی حکم نے دریائے 'سندھ' کے دہانہ پر مشرقی جانب ایک شہر آباد کیا اور اس کا نام 'محفوظہ' رکھا جو

گویا کہ ایک مضبوط چھاؤنی تھا۔ یہیں سے تمام ملکی و سیاسی امور انجام پاتے تھے۔ خالد قسری کو معزول کر کے عراق کی ولایت یوسف بن ثقفی کے سپرد کی گئی۔ انہوں نے خالد کے مقرر کردہ تمام عمال و حکام کو معزول کر دیا۔ یہاں تک کہ حکم بن عوانہ کلبی بھی ان کی بد سلوکی کے خوف سے 'سندھ' کے ایک اہم معرکہ میں حصہ لیا اور 121ھ میں جام شہادت نوش کر گئے۔ حکم کی شہادت کے بعد یوسف ثقفی نے خلیفہ کے حکم سے عمر بن محمد بن قاسم کو 'سندھ' کا مستقل والی مقرر کر دیا۔ یہ یہاں پہلے سے ملک کی تسخیر اور اس کا نظم و نسق بحال کرنے میں عوانہ کے رفیق و مشیر چلے آ رہے تھے۔ ولایت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد انہوں نے 'سندھ' میں ایک نیا شہر بسایا۔ اس کا نام 'منصورہ' رکھا اور اسے دارالخلافہ بنایا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن محمد کے والی نامزد ہوتے ہی 'سندھ' کے شورش پسندوں نے سر اٹھایا، آمادہ بغاوت ہوئے اور پورے ملک میں بد نظمی پھیلا دی۔ قریب تھا کہ وہ یہاں کی ولایت میں ناکام ہو جاتے کہ یوسف ثقفی نے چار ہزار فوج 'منصورہ' بھیج کر ان کا تعاون کیا، جس کی مدد سے وہ حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔ عمر نے اپنے حریفوں کی سرزنش کی تاکہ 'سندھ' کی فضا پر امن و خوشگوار ہو سکے اور اسی کام میں مصروف تھے کہ 125ھ میں ہشام بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے یہاں صرف پانچ سال بحیثیت حاکم اپنے فرائض انجام دیئے۔ ادھر مرکز میں ولید بن یزید بن عبدالملک (743-744ء) خلیفہ بن گئے۔ انہوں نے سابقہ تمام امرا و عمال کو معزول کر دیا اور نئے حکام و عمال اور امرا مقرر کیے۔ اگر عمر بن محمد بن قاسم کچھ دن اور یہاں رہ جاتے تو امید کی جا سکتی تھی کہ وہ کم از کم 'سندھ' کے مقامی باشندوں میں اسی طرح محبوب و مقبول ہو جاتے جس طرح چند سال قبل ان کے والد نے یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی تھی۔

ولید بن ہشام کے یک سالہ مدت خلافت میں 'سندھ' کی ولایت یزید بن عرار کے سپرد کی گئی۔ یہ بھی 'سندھ' کی نگرانی کے لیے موزوں ثابت ہوئے اور ملک میں بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ اندرونی بد نظمیوں کو دور کر کے آس پاس کے راجاؤں مہاراجاؤں پر حملے کیے اور ان کو اپنا باج گزار بنایا۔ بقول یعقوبی: "عمرو بن محمد کی جگہ یزید بن عرار سندھ کے امیر ہوئے تو انہوں نے اٹھارہ لڑئیاں لڑیں۔" ولید بن ہشام کے بعد یزید بن ولید الناقص خلیفہ ہوئے۔ صرف 6 ماہ حکومت کرنے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ابراہیم بن ولید (744-745ء) خلیفہ ہوئے۔ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان الحمار ہوئے۔ انہوں نے 127ھ / 745ء سے 132ھ / 749ء تک اموی حکومت کو سنبھالا دیا۔ انہوں نے اپنے دور خلافت میں منصور بن جمہور کلبی کو امیر بنایا تھا۔ انہوں نے یزید بن عرار کی جگہ محمد بن غزان کلبی کو 'سندھ' کا امیر مقرر کیا۔ مگر کسی وجہ سے یزید بن ولید نے منصور کو عراق کی امارت سے معزول کر کے عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو امیر بنایا تو منصور نے بغاوت و سرکشی اختیار کی اور ایک دن ایسا آیا کہ وہ 'سندھ' کا خود مختار حاکم بن کر حکومت کرنے لگا۔

3.3.4 'سندھ'-خلفائے عباسی کے عہد میں

خلفائے بنی امیہ کے زوال کے بعد ابو العباس عبداللہ بن محمد المعروف بہ سفاح (753-749ء) بنو عباس کے پہلے خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے بنی امیہ کے تمام عمال و حکام کو اسلامی قلمرو سے معزول کیا تو 'سندھ' میں بھی تبدیلی کی اور مفلس عبدی کو یہاں کا والی بنا کر بھیجا۔ یہ یہاں زیادہ دنوں تک ٹھہر نہ سکے اور قتل کر دیئے گئے۔ ان کے بعد موسیٰ بن کعب آئے اور باغیوں کو ٹھکانے لگا کر ملک میں امن و امان

قائم کرنے کی کوشش کی۔ابو العباس کے انتقال کے بعد ابو جعفر عبداللہ بن محمد الملقب بہ منصور (774-753ء) خلیفہ ہوئے۔ان کے ابتدائی چار سالوں تک موسیٰ بن کعب تمیمی ہی 'سندھ' کے حاکم رہے۔انہوں نے یہاں جو انتظام وانصرام کیا،اس سے یہاں کے باشندے خوش اور مطمئن تھے۔غالباً یہی وجہ تھی کہ خلیفہ نے یہاں کی ولایت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔لیکن جب انہیں اپنے وطن کی یاد ستانے لگی تو وہ 140ھ میں یہاں سے چلے گئے اور اپنی نیابت کے لیے اپنے بیٹے عیینہ بن موسیٰ تمیمی کو مامور کر دیا۔موسیٰ کی وفات 141ھ میں ہو گئی تو عیینہ یہاں کے مستقل حاکم مقرر کر دیئے گئے۔وہ حکومت کے استحکام میں وہ جوہر نہ دکھا سکے جو ان کے والد کے اندر تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دن بدن یہاں بد نظمی پھیلتی گئی اور لوگ ان کے مخالف ہوتے گئے۔یہاں تک کہ وہ خود اپنے قرابت داروں کا جو ان کی بد انتظامی کی وجہ سے ان کی مخالفت کر رہے تھے،قتل کرنا شروع کر دیا۔بعد میں وہ خلافت سے بغاوت کر کے یہاں کے خود مختار حکمراں بن گئے۔ان کی سرزنش کے لیے منصور نے عمر بن حفص بن عثمان بن ابی صفرہ العتکی کو روانہ کیا۔شدید معرکہ اور محاصرہ کے بعد یہ گرفتار کر کے منصور کے پاس بھیجے گئے،کسی طرح وہ ان کے قبضہ سے نکل کر 'رنج' پہنچ گئے۔چوں کہ ان کی سیاہ کاریوں کا علم وہاں کے 'قحطانیوں' کو پہلے ہی ہو گیا تھا۔اس لئے لوگوں نے مل کر عیینہ کا قتل کر کے سر خلیفہ منصور کے پاس بھیج دیا۔

کسی وجہ سے عمر بن حفص کو 151ھ میں معزول کر کے افریقہ بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ ہشام بن عمر تغلبی 'سندھ' کے گورنر بن کر آئے۔ان کی معزولی کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے نفس ذکیہ کے دعاۃ کو یہاں پناہ دی تھی۔جس کی وجہ سے یہاں شیعیت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔شیعیت کی نشر واشاعت کے لیے عبداللہ اشتر اپنے چند بہی خواہوں کو لے کر تجارت کے بہانے 'سندھ' میں داخل ہوئے۔ہشام 'لاہور' سے آگے بڑھ کر 'کشمیر' کی سرحد میں داخل ہو گئے اور حملہ کر کے اسے اسلامی مقبوضات میں شامل کر لیا تھا۔جب وہ یہاں سے واپس 'منصورہ' آرہے تھے تو دیکھا کہ یہاں کے لوگ باغی ہو گئے اور خود مختار حاکم بن گئے ہیں۔اس لئے ان لوگوں سے سخت جنگ کی اور اس پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا۔ان کی کامیابی کو دیکھ کر منصور نے 'کرمان' کی ولایت بھی انہیں کے سپرد کر دی۔مگر وہ 157ھ میں رخصت لے کر اپنے وطن چلے گئے۔کچھ عرصہ کے بعد وہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

3.3.5 محمد بن منصور المہدی کا عہد

محمد بن منصور الملقب بہ مہدی (775-785ء) خلیفہ ہوئے۔انہوں نے 'سندھ' کی ولایت میں فوری طور پر کوئی تبدیلی نہیں کی۔ چوں کہ منصور کے آخری زمانہ میں ہشام رخصت لے کر اپنے وطن چلے گئے تھے۔ان کی جگہ پر معبد بن خلیل کو یہاں کا والی نامزد کیا گیا۔انہوں نے یہاں دو سال حکومت کی اور عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ان کا انتقال 159ھ میں ہو گیا تو خلیفہ نے روح بن تمیم کو 'سندھ' کی ولایت سونپی۔اسی زمانہ میں خلیفہ کے حکم سے ایک بحری مہم عبدالملک بن شباب مسمعی کی قیادت میں روانہ ہوئی جو 'بھار بھوت' تک گئی اور سخت لڑائی کے بعد حالات پر کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔روح بن تمیم کے آنے سے یہاں کے حالات میں سدھار کی بجائے دن بہ دن بد نظمی پھیلتی گئی۔جاٹوں نے 'سندھ' کے مغربی حصے میں ایسا سر اٹھایا کہ خلیفہ وقت پریشان ہو گئے اور کئی گورنر یکے بعد دیگرے روانہ کیے۔مثلاً نصر بن محمد خزاعی،نصر بن محمد الاشعث خزاعی،زبیر بن عباس وغیرہ۔مگر سب ناکام رہے۔آخر میں لیث بن ظریف 164ھ میں یہاں آئے۔

بڑی حکمت و تدبر کے بعد انہوں نے یہاں کے حالات پر قابو پایا۔ انہوں نے یہاں فوجی قانون (مارشل لا) نافذ کیا تاکہ باغی دوبارہ سر اٹھا نہ سکے۔ مہدی نے اسلام کی اشاعت کے لیے قابل تحسین اقدامات کیے۔ جہاں جنگ کے ذریعہ اشاعت اسلام ممکن ہو سکی تو اس پر بھی عمل کیا اور جہاں اخوت و محبت اور دعوتی خطوط موثر ہو سکتے تھے وہاں اس طریقہ عمل کو بھی اختیار کیا۔

3.3.6 ہارون رشید کا عہد خلافت

ہارون رشید (786-809ء) نے بغداد کی حکومت کو سنبھالا۔ ان کا عہد بڑا شاندار رہا۔ اس عہد میں بہت سے علاقے اسلام میں داخل ہوئے اور بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ 'سندھ' کے حالات بھی ان کے عہد میں اچھے رہے۔ مگر چوں کہ جس وقت وہ بغداد کے تخت پر متمکن ہوئے اس وقت 'سندھ' میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور قبائلی عصبیت کا جھگڑا زوروں پر تھا، جس کو درست کرنے کے لیے ہارون رشید نے اپنی طرف سے کئی امرا یہاں روانہ کیے، جو ناکام ثابت ہوئے۔ سالم یونسی، اسحاق بن سلیمان بن علی ہاشمی، طیفور بن عبداللہ بن منصور حمیری، سعید بن مسلم، قتیبہ کے بھائی کثیر بن مسلم، محمد بن عدی تغلبی، عبدالرحمن، ایوب بن جعفر سلیمان وغیرہ یکے بعد دیگرے 'سندھ' آئے، مگر ناکام لوٹے۔ آخر میں داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی نے 184ھ میں اپنے بھائی مغیرہ کو اپنی جانب سے 'سندھ' کا گورنر نامزد کر کے بھیجا۔ ان کے اعلیٰ انتظام سے ملک میں ان کا سکہ خوب بیٹھ گیا۔ ان کا عہد اتنا شاندار رہا کہ جنید کے بعد کوئی اس پایہ کا والی یہاں نہ آیا۔ ان کے رعب و دبدبہ سے جس طرح اندرون ملک باغی اور مفسد خوف کھاتے تھے، اسی طرح بیرون ملک کے راجہ اور زمین دار بھی خوف کرتے تھے۔ انہوں نے یہاں کی قبائلی عصبیت کو بھی کچلا۔

3.3.7 مامون کا عہد خلافت

عبداللہ بن ہارون الملقب بہ مامون (813-833ء) تخت خلافت پر مسند نشیں ہوئے۔ اس وقت تک داؤد مہلبی ہی 'سندھ' کے گورنر رہے۔ انہوں نے یہاں بیس سال حکومت کی۔ 205ھ میں ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے لڑکے بشر بن داؤد مہلبی کو مامون رشید نے اس شرط پر 'سندھ' کی ولایت سونپی کہ وہ سالانہ دس لاکھ درہم خراج خلافت کو روانہ کریں گے۔ چند سالوں تک تو وہ اس شرط پر عمل کرتے رہے، مگر بعد میں وہ بغاوت پر اتر آئے۔ اس حکم عدولی کے جرم میں ان کی سرزنش کے لیے 212ھ میں حاجب بن صالح کو بھیجا گیا۔ وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود یہاں حکومت نہ کر سکے اور نہ بشر کو 'سندھ' سے نکال سکے۔ آخر میں 'سندھ' کی ولایت غسان بن عباد کو سونپی گئی۔ وہ اپنے بھائی محمد بن عباد کو لے کر موسیٰ بن یحییٰ خالد برمکی کے ساتھ یہاں آئے۔ غسان کے منصورہ پہنچنے کے ساتھ ہی بشر نے بغیر کسی عذر اور مزاحمت کے اطاعت قبول کر لی۔ تاہم غسان نے انہیں نظر بند کر دیا۔ یہاں چند مہینے رہ کر انہوں نے حالات کو قابل اطمینان بنا دیا اور 216ھ میں وہ یہاں سے لوٹ کر بغداد چلے گئے۔ انہوں نے جانے سے قبل یہاں کا چارج موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی کے سپرد کر دیا۔ ان کا قیام بھی 'سندھ' کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ اس زمانے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ فضل بن ماہان نے 'سندھ' کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا اور بڑی چالاکی سے خلیفہ مامون سے اس کی توثیق کرا لی۔ آگے چل کر یہ خود مختار علاقہ عباسی خلفا کے لیے ایک بڑے چیلینج کی صورت میں ظاہر ہوا اور بالآخر عباسی خلافت سے 'سندھ' کا تعلق منقطع ہو گیا۔

3.3.8 سندھ وہند متاخرین عباسی خلفا کے عہد میں

ابو اسحٰق محمد بن ہارون الملقب بہ معتصم باللہ (833-841ء) کے ابتدائی عہد یعنی 221ھ تک موسیٰ بن یحییٰ خالد برمکی ہی 'سندھ' کے والی رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے عمران بن موسیٰ کو باپ کی جگہ نیابت سونپی۔ انہوں نے ہر جگہ امن وامان قائم کیا اور ان جاٹوں کو سزائیں دیں جو موقع پاتے ہی بغاوت پر اتر آتے اور ملک میں خوف وہراس پیدا کر دیتے تھے۔ ان لوگوں کی مستقل نگرانی اور کنٹرول کے لیے انہوں نے ایک چھاؤنی بنوائی جس کا نام 'بیضا' رکھا۔ سخت نگرانی کے باوجود عمران کے پورے عہد میں یہاں کے ہندو، مسلمان، جاٹ اور 'مید' قومیں موقع ملتے ہی بغاوت وسرکشی پر اتر آتے تھے۔ لیکن عمران نے بھی ان لوگوں کا سختی ومستعدی سے مقابلہ کیا۔ اس عرصہ میں اگر یمنی اور حجازی کا جھگڑا پیدا نہ ہوتا تو ان کا عہد بہت شاندار ثابت ہوتا۔ مگر اسی قبائلی جھگڑے نے عمران کو موت کی نیند سلا دیا۔ عمران کی شہادت کے بعد پھر مید قوم نے سر اٹھایا اور امرا نے مختلف قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ عمران کے بعد 226ھ میں عنبسہ بن اسحٰق ضبی کو 'سندھ' کا والی مقرر کئے گئے۔ انہوں نے اپنی حکمت عملی سے یہاں کے لوگوں کو مطمئن کر دیا اور خانہ جنگی پر پوری طرح قابو پالیا۔ یہاں تک کہ ملک میں امن وامان کی بحالی کے لیے عمران کے قاتل عمر ہباری سے بھی کوئی مواخذہ نہ کیا۔ جو لوگ قلعہ دبا بیٹھے تھے انہیں اطاعت کی دعوت دی۔ وہ لوگ مطیع بھی ہوئے۔ ایک شخص جس کا نام عثمان تھا اس نے اس سے گریز کیا۔ اس کے ساتھ مسلسل 9 سالوں تک جنگ جاری رہی۔ کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی انہوں نے سانس لیا۔ اس فتح کے ساتھ ہی ان کا رعب 'سندھ' میں قائم ہو گیا اور لوگ ان سے خائف رہنے لگے۔

معتصم کے بعد ابو جعفر ہارون الملقب بہ واثق باللہ (841-847ء) کے زمانہ تک عنبسہ نے 'سندھ' میں کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ جعفر بن معتصم الملقب بہ متوکل علی اللہ (847-861ء) کے ابتدائی دو تین سالوں تک وہ یہیں رہے۔ متوکل کے زمانہ خلافت میں ان کو معزول کر دیا گیا۔ ان کی جگہ ہارون بن ابی خالد کو یہاں بھیجا گیا۔ خلیفہ کا یہ فیصلہ غلط ثابت ہوا۔ متوکل کے بعد محمد بن جعفر الملقب بہ منتصر باللہ (861-862ء)، احمد بن محمد بن معتصم الملقب بہ مستعین باللہ (862-865ء)، ابو عبداللہ محمد بن جعفر الملقب بہ معتز باللہ (865-869ء) اور ابو عبداللہ محمد بن واثق الملقب بہ مہتدی باللہ (869-870ء) یکے بعد دیگرے مختصر مدت کے لئے خلیفہ ہوئے۔ افراتفری کی وجہ سے عباسی خلفاء کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ 'سندھ' کی طرف باضابطہ توجہ کر سکیں۔

3.3.9 خود مختار مسلم ریاستوں کے اثرات

اس طویل مدت میں عمر بن عبدالعزیز یہاں بے فکری سے حکومت کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے اصل وطن 'بانیہ' سے نکل کر 'منصورہ' کو پایہ تخت بنایا۔ اپنی ماتحتی وتابعداری کا دم بھرنے کے لئے گاہے بگاہے تحفے تحائف اور خطوط ہر نئے آنے والے خلیفہ کی خدمت میں بھیجتے اور انہیں یہاں کے حالات سے مطمئن کرتے رہے۔ یہ بہت چاق وچوبند اور ملکی وخارجی سیاست کے ماہر آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکز سے بے تعلق رہنے کے باوجود انہوں نے 'سندھ' میں بہترین نیابت کی اور ایسا بہت ہی کم ہوا کہ مقامی باشندوں اور غیر مسلم راجاؤں نے سرکشی وبغاوت کرنے کی جرأت کی۔ مگر جب ابو العباس احمد بن متوکل الملقب بہ معتمد باللہ (870-892ء) خلیفہ ہوئے تو اندرونی خلفشار جو

مرکز میں پیدا ہو گیا تھا، پر کسی حد تک قابو پانے کے بعد 'سندھ' کی طرف متوجہ ہوئے۔ 257ھ میں انہوں نے یعقوب بن لیث صفاری کو ترکستان، سجستان و مکران کے ساتھ 'سندھ' کی ولایت بھی سونپی۔ اس وقت عمر بن عبد العزیز ہباری نے مصلحتاً ما تحتی اختیار کی اور اس طرح وہ 270ھ تک 'سندھ' پر حکومت کرتے رہے۔ عمر بن عبد العزیز ہباری کے انتقال کے بعد ان کا لڑکا عبد اللہ بن عمر عبد العزیز ہباری موروثی تخت پر متمکن ہوئے۔ 279ھ میں صمہ غلام بنی کندہ (جو عمر بن حفص کے ساتھ سندھ آئے تھے) نے 'منصورہ' کو اپنے قبضہ میں کر کے حکومت کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جب عبد اللہ کی طاقت مستحکم ہو گئی تو انہوں نے ان سے جنگ کر کے دوبارہ 'منصورہ' کو حاصل کر لیا۔ مگر اسی کے ساتھ ہی 'سندھ' دو حصوں میں بٹ گیا۔ 'منصورہ' پر تو عبد اللہ قابض رہے، لیکن 'ملتان' میں بنو سامہ (جو یہاں پہلے سے آباد اور بڑے مضبوط و مستحکم تھے) نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہ 290ھ کی بات ہے۔ عبد اللہ بن ہباری کی حکومت 'سندھ' میں تقریباً تیس سال تک رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک 'سندھ' کا تعلق کسی نہ کسی طرح بغداد سے قائم رہا۔ کیوں کہ معتضد باللہ بن موفق (892-902ء) کے زمانہ میں جب 'دیبل' میں شدید زلزلہ آیا تو اس حادثہ میں بڑی تعداد میں لوگ شہید ہو گئے۔ اس کی اطلاع خلیفہ کو دی گئی۔ عبد اللہ بن عمر ہباری کے بعد 302ھ میں ان کا لڑکا عمر بن عبد اللہ کنیت ابو منذر نے 'منصورہ' کے تخت کو رونق بخشا۔ انہوں نے بھی بڑی شان سے یہاں حکومت کی۔ ان کے بعد یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ 375ھ تک سریر آراء سلطنت ہوئے۔ اس حکومت کا قلعہ قمع 401ھ میں ہوا۔ اس خاندان کے اور دوسرے حکمرانوں کے کارناموں اور سندھ میں ان کی کامیابی کے اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے سید ابو ظفر ندوی نے اپنی کتاب تاریخ سندھ میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

ان خود مختار ریاستوں میں دولت ہباریہ اور دولت سامانیہ کے علاوہ بھی سندھ اور ان کے نواحی علاقوں میں خود مختار مسلم ریاستیں قائم ہوئیں جو اگرچہ بہت مختصر علاقے میں محدود تھیں، مگر اسلام کو استحکام دے کر ان ریاستوں نے تاریخ میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ اس کے نقوش تابندہ کے اثرات بعد کے زمانہ میں بھی پڑے۔ جیسا کہ قاضی اطہر مبارک پوریؒ لکھتے ہیں: "دولت ماہانیہ سنجان کے قیام 813ء سے لے کر دولت معدانیہ مکران اور دولت متغلبہ طوران کے خاتمہ 1078ء تک کی درمیانی مدت جو کم و بیش تین سو سال ہے، ہندوستان میں عرب حکمرانوں کی حکومت کا زمانہ ہے، جس میں خلافت عباسیہ کی ماتحتی میں ان حکومتوں کو یہاں قیام و ثبات ملا۔ اس مدت میں ان حکومتوں نے ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے لیے نہ صرف زمین ہموار کی بلکہ اس چمن کی آبیاری اور تختہ بندی بھی کی اور ہندوستان کو عالم اسلام کا ایک قابل قدر حصہ بنایا۔ جب دولت غزنویہ (976-1182ء) نے ان پر قبضہ کیا تو اسے یہاں سجا سجایا گلستاں ملا اور اس نے 'نقاش نقش ثانی بہتر کشید زوال' کے اصول پر ہندوستان میں بڑی شان دار اور کامیاب حکومت کی، جس سے مشرقی عالم اسلام میں ہندوستان کو بڑی اہمیت و عظمت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد دولت غزنویہ کے زوال کے نتیجہ میں دولت غوریہ کا ظہور ہوا، جس نے عربوں اور غزنویوں دونوں کے ساختہ و پرداختہ گلستان ہند کی وراثت سنبھالی اور 1207ء تک اس ملک میں اسلامی علوم و حضارت اور دینی ذہن و مزاج کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے ذوق کے مطابق کام کیا۔ الغرض عجم کی دولت غزنویہ ہو کہ دولت غوریہ دونوں نے دولت عربیہ کی جانشینی اور وراثت پا کر یہاں حکومت کی اور عربوں کے ادھورے خاکے میں رنگ بھرا۔"

3.4 کلیدی الفاظ

مسند نشین : مسند پر آنے ولا، بادشاہ، والیٔ ملک

گھمسان : لڑائی، رن، جنگ، رزم، قتل، عام خون زیزی، لاشوں کے انبار کے انبار، بھیڑ، ہجوم

خلش : چبھن، کھٹک، جھگڑا، مناقشہ، مخاصمت، رنجش، بغض

بندر گاہوں : (واحد بندر گاہ) بحری جہازوں کے ٹھہرنے کی جگہ

قلم رو : سلطنت، حکومت، ریاست، عمل داری، بادشاہی راج

منتشر : بکھرنے والا، پھیلنے ولا، پراگندہ ہونے والا، متفرق، تتر بتر، حیران، پریشان

3.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مسلمان 'سندھ' میں داخل ہوئے تو قلیل عرصے میں یہاں کی تہذیب وثقافت کو اسلامی قدروں کو متاثر کیا۔ اس کی وجہ سے 'سندھ' سے آگے بڑھ کر 'ہندوستان' کے دوسرے علاقوں میں مسلمان کثرت سے آباد ہوئے اور غیر مسلموں کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ ہندوستان کے حالات پر اسلامی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'سندھ' کی تسخیر نے اسلام کی آمد کا راستہ کھول دیا اور مسلمان فاتحین کی وجہ سے بر صغیر پاک وہند کا شمالی حصہ پہلے پہل اسلام سے روشناس ہوا اور اس کے اثرات تادیر قائم رہے۔ مسلمانوں کے عدل وانصاف اور مساوات واخوت پر مبنی نظام حکومت کی بدولت مقامی آبادی نے کثیر تعداد میں اسلام قبول کیا۔ مسلمان یہاں نہ آتے تو شاید غیر مسلموں کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوتی، کیوں کہ مذہبی زنجیروں میں ایسے جکڑے ہوے تھے کہ اس سے آزادی حاصل کرنا ان کے لئے آسان کام نہ تھا۔ ابتدائی فتوحات کے ساتھ ہی 'سندھ' مستقل طور پر اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز بنتا چلا گیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں قائم ہونے والی غزنوی وغوری حکومت نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. شہر 'دیبل' کی فتح کس کی ولایت میں ہوئی؟

(a). مہلب بن ابی صفرہ (b). سنان بن سلمہ ہذلی (c). عبد اللہ بن سوار عبدی (d). محمد بن قاسم

2. محمد بن قاسم سندھ کی امارت سے قبل کہاں کے امیر تھے؟

(a). ایران (b). قابل (c). اصفہان (d). فارس

3. شہر 'دیبل' کہاں واقع تھا؟

(a). مکران (b). سندھ (c). اصفہان (d). سجستان

4. محمد بن قاسم کو سندھ کی ولایت سے کس خلیفہ کے حکم سے معزول کیا گیا؟

(a). سلیمان بن عبدالملک (b). ولید بن عبد الملک (c). عمر بن عبد العزیز (d). ہارون رشید

5. تسخیر 'ملتان' کے وقت 'یہاں' کا حاکم کون تھا؟

(a). گورسنگھ (b). کاکا (c). داہر (d). کسکا

6. کتاب 'تاریخ سندھ' مصنف کون ہیں؟

(a). ابو ظفر ندوی (b). اشتیاق احمد قریشی (c). ابن خلدون (d). ابوالحسن البلاذری

7. شہر 'منصورہ' کہاں واقع تھا؟

(a). ایران (b). ترکستان (c). مکران (d). سندھ

8. ہندوستان وسندھ کے ساحلی علاقوں پر پہلا بحری حملہ کس خلیفہ کے عہد میں ہوا؟

(a). حضرت ابو بکرؓ (b). حضرت عمر فاروقؓ (c). حضرت عثمان غنیؓ (d). حضرت علیؓ

9. معتصم باللہ کے ابتدائی عہد میں سندھ' کے ولایت کس کے سپرد رہی؟

(a). موسیٰ بن یحیٰ خالد برمکی (b). مہلب بن ابی صفرہ (c). محمد ہارون (d). عمر بن عبدالعزیز ہباری

3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. شہر 'محفوظہ' و 'منصورہ' کیوں، کب قائم ہوا اور کس کے حکم سے آباد ہوا؟
2. محمد بن قاسم نے سندھ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، اس پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. خلیفہ امیر معاویہؓ کے زمانے میں عرب امرا نے علاقہ سند پر لشکر کشی کی، اس پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. حجاج بن یوسف کے حکم سے سندھ پر لشکر کشی کی گئی، اس کا سبب کیا تھا؟
5. فتوحات سندھ کے دوران مقامی باشندوں کے ساتھ مسلمانوں کا برتاؤ کیسا تھا۔

3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. خلیفہ ولید بن عبد الملک کے عہد میں عرب امرا نے فتح سندھ حوالے سے کیا خدمات انجام دیں؟
2. فتوحات سندھ وہند کے حوالے سے محمد بن قاسم کی خدمات کا جائزہ پیش کیجیے۔
3. فتح سندھ کے لئے حجاج بن یوسف کی سرگرمیوں پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

3.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	فتوح البلدان (اردو ترجمہ)	:	ابوالحسن علی بلاذری
2.	تاریخ سندھ	:	سید ابو ظفر ندوی
3.	عجائب الاسفار (سفر نامہ ابن بطوطہ)	:	ابن بطوطہ
4.	تاریخ فرشتہ	:	ہندوشاہ قاسم فرشتہ

اکائی 4: شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد (اشاعت اسلام)

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید
4.1 مقاصد
4.2 محمد بن قاسم کے عہد میں قبول اسلام کے واقعات
4.3 ہندوؤں کے اونچے طبقات کا اسلام سے دل چسپی کا مظاہرہ
4.4 'سندھ' کی درس گاہیں
4.5 گہوارہ علم سے منسوب شہر اور قریے
4.6 ہندوستان میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے فیوض وبرکات
4.7 عالم اسلام کے علماء ومحدثین کا ہندوستان میں قیام
4.7.1 کتب صحاح میں ہندوستانی محدثین کی مرویات
4.7.2 ہندوستانی شہروں سے منسوب علماء ومحدثین
4.7.3 ہندوستانی علوم سے عربوں کی دل چسپی
4.8 علم فقہ کا فروغ
4.9 عربی زبان وادب کا فروغ
4.10 ابتدائی عہد کے صوفیا
4.10.1 مذہب کی سچائی پر بین المذاہب مناظرہ
4.11 بعد کے عہد میں شمالی ہند میں اسلام کے اثرات
4.12 کلیدی الفاظ
4.13 اکتسابی نتائج
4.14 نمونہ امتحانی سوالات

4.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
4.14.2 مختصر جوابات کے حامل سولات
4.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
4.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

'شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد (آبادیوں کا قیام)' میں تفصیل موجود ہے کہ محمد بن قاسم سے قبل بھی عرب امرا اور والیوں نے سندھ وہند پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور ان کے دلوں میں یہ خلش ضرور تھی کہ اس خطہ کو بھی اسلامی قلم رو میں شامل کرکے اسے اسلام کی روشنی سے منور کیا جائے۔ مگر ایک 'حادثہ' جو سندھ میں واقع ہوا تھا، اس نے فتح سندھ وہند کا جواز فراہم کردیا۔ چناں چہ محمد بن قاسم الثقفی (715-695ء، یہی سال پیدائش اور وفات مشہور ہے) کی فتوحات سندھ کے ساتھ ہی یہاں مسلمانوں کا ورود اور مستحکم قیام شروع ہوا اور مختصر مدت میں یہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی۔ انہوں نے جہاں جہاں اپنا تسلط قائم کیا، مقامی باشندوں میں خاص کم زور طبقات نے فراخ دلی سے اسلام کو سینے سے لگایا، کیوں کہ یہ لوگ مقامی راجے مہاراجے اور اونچی ذات والوں کے رویے سے تنگ اور رائج سماجی ومعاشرتی اونچ و نیچ کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے، جن سے وہ نکلنا چاہتے تھے، مگر ان کے پاس اس وقت تک نہ کوئی متبادل دین تھا اور نہ ہی ایسی قوم تھی جو ان کے درد کا مداوا بن سکے اور انہیں اپنے سینے سے لگائے۔ اس لئے مسلمانوں کے حملے یا ان کی آمد کو ان لوگوں نے فال نیک سمجھا اور اپنی عزت ناموس کی حفاظت اور سماج ومعاشرہ میں سربلندی کے لئے اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے اور جو لوگ اپنے ہی دین پر قائم رہے، ان کے ساتھ مطلق زور وزبردستی نہیں کی گئی، البتہ ان پر 'جزیہ' نافذ کرکے ان کے جان ومال کی حفاظت کی گئی اور ان کے ساتھ اچھے اخلاق کا برتاؤ کیا گیا۔ لیکن فتوحات ہند یا اشاعت اسلام کا یہ سلسلہ محمد بن قاسم کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور بعد کے اموی خلفا کے علاوہ عباسی خلفا نے بھی اس جانب اپنی توجہ مبذول رکھی۔ اس کے علاوہ سندھ وہند میں بعض خود مختار مسلم ریاستیں بھی وجود میں آئیں جس کے اچھے اثرات مقامی باشندوں پر پڑے۔

4.1 مقاصد

اس مضمون کے ذریعہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں سندھ وہند میں اشاعت اسلام کا م کس طرح ہوا اور اس کے لئے کون کون سے طریقے عمل میں لائے گئے، نیز اس مقدس کام کو انجام دینے والے کون لوگ تھے۔ اس کے ذریعے ہم یہ بھی جان سکیں گے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں عرب ممالک کے بہت سے اہل علم، علما و محدثین اور فقہا و مفسرین نے یہاں قدم رنجہ فرمایا،

جنہوں نے جگہ جگہ قال اللہ و قال الرسول کی صدا بلند کی۔ یہاں اس امر کو بھی واضح کیا جائے گا کہ مختصر مدت میں خود ہند کی خاک سے ایسے بلند پایہ اہل علم تیار ہوئے جو عرب اور دیگر ممالک میں پہنچ کر اپنے علم کا لوہا منوایا اور سب سے اہم بات یہ کہ اسلام اپنی پاکیزہ تعلیمات اور مسلمانوں کے اچھے اخلاق وعادات کی بدولت پھیلتا چلا گیا۔ اسی کے ضمن میں اشاعت اسلام کے واقعات بھی دن بہ دن عمل میں آتے رہے۔

4.2 محمد بن قاسم کے عہد میں قبول اسلام کے واقعات

تحفۃ الکرام' اور چچ نامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم سندھ نے جن علاقوں پر حملہ کیا، مقامی باشندوں کی بڑی تعداد نے بغیر کسی مزاحمت اور دباؤ کے اسلام قبول کرنے میں پہل کی۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ محمد بن قاسم نے دیبل کے حالات پر قابو پالیا اور مقامی باشندوں کو اپنا مطیع بنالیا تو بقول: ابو الحسن علی بلاذری یہاں کی زمین کی پیمائش کرا کے قطعات فاتحین میں تقسیم کر دیئے اور وہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروا کر چار ہزار مسلمانوں کو آباد کروا دیا۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کہاں سے وجود میں آگئی، یقینی بات ہے کہ محمد بن قاسم کے رحم وکرم اور عفو درگزر کر دیکھ مقامی باشندوں نے اسلام قبول کیا ہو گا۔ 'چچ نامہ' کی صراحت کے مطابق فتح سندھ کے دوران برہمنوں کا ایک وفد محمد بن قاسم کے پاس پہنچا، جس کی محمد بن قاسم بڑی عزت کی اور اس سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ وفد کے سربراہ نے عرض کیا کہ ہندو دستور کے مطابق ہمارا قومی درجہ دوسری ذات والوں سے بلند ہے، اس لئے ہمیں وہی مقام دیا جائے۔ محمد بن قاسم نے بعد تحقیق ان کو اسی مقام ومرتبہ پر قائم رکھا۔ اس بے مثال رواداری کا برہمنوں نے شکریہ ادا کیا اور گاؤں گاؤں گھوم کر محمد بن قاسم کی وسعت قلبی کی تعریف کی۔ سیوستان کا راجہ وجے رائے تھا، جب اسے خبر ملی کہ محمد بن قاسم یہاں بھی پہنچ گیا ہے، تو اس نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے، ایک پنڈت نے مشورہ دیا کہ مسلمانوں کی فتح یقینی ہے، اس لئے ان سے مزاحمت بے سود ہے، مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا، قبل اس کے کہ وہ ان کے مقابلہ کے لئے کوئی مستحکم اقدام کرتا، اس نے مسلمانوں کی طاقت کا راز معلوم کرنے کے لیے خفیہ طور پر اپنے ایک معتمد کو مسلمانوں کے کیمپ کے قریب بھیجا، اس وقت یہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔ واپس آکر مسلمانوں کی طاقت اور اتحاد واتفاق کے بارے میں راجا کو بتایا تو وہ خوف کھا کر فرار ہو گیا۔ راجا کا اپنی رعایا کو بے یار ومددگار چھوڑ کر بھاگ جانے سے یہاں کے لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کر لیا۔ 'نیرون' میں چینہ' قوم کے لوگ وافر تعداد میں تھے، مسلمانوں کے جاہ جلال اور کامیابی کو دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ اس علاقہ پر مسلمانوں کی فتح یقینی ہے، مقابلہ آرائی کرنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے، اس لئے سب ایک ساتھ محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ اقوام 'سندھ' میں 'چینہ' ہی ایک ایسی قوم تھی جس نے مجموعی طور پر اسلام قبول کرنے میں پہل کی تھی۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا کہ بغیر کسی مزاحمت اور اور دباؤ کے سندھیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور قبول اسلام کے بعد یہی لوگ خادم دین واسلام بنے۔ مختصر دور امارت میں محمد بن قاسم کو سندھی عوام اور اس کے نواحی علاقوں کے باشندوں نے بہت زیادہ مقبول اور ہر دل عزیز بنا دیا تھا، کیوں کہ انہوں نے کبھی اور کسی کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا، سبھوں کے ساتھ نرمی اور محبت کا برتاؤ کیا۔ یہی وجہ کہ جب انہیں خلیفہ سلیمان کے حکم سے معزول کر کے بھیجا جا رہا تھا تو 'کیرج' علاقہ گجرات کے لوگوں نے غم کے آنسو بہائے اور ان کے یاد تازہ رکھنے کے لئے ان کا پتلا بھی بنالیا تھا۔

4.3 ہندوؤں کے اونچے طبقات کا اسلام سے دل چسپی کا مظاہرہ

یہ تفصیل طلب بحث ہے کہ سندھی عوام نے خلفائے بنی امیہ کی ماتحتی میں جو اسلام قبول کیا ان کی تعداد کتنی ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب حکمراں جہاں بھی گئے، اس کے اچھے اثرات مقامی باشندوں پر پڑے۔ اس کا آخری ثمرہ قبول اسلام کی شکل میں ہی ظاہر ہوتا تھا۔ یا نہیں تو وہ مسلمانوں سے حد درجہ محبت ضرور کرنے لگتے تھے، جس کا اظہار وہ مختلف طریقے سے کرتے تھے۔

حضرت امیر معاویہ (660-679ء) کے زمانہ میں عبد اللہ بن سوار عبدی نے قیقان (گیگان) پر فتح پائی تو یہاں کے راجہ نے فدیہ ادا کر کے اپنے قیدی چھڑائے۔ پھر اس نے عبد اللہ بن سوار عبدی کے پاس ہدیہ میں ہندوستان کے ایسے ایسے عجائب اور عمدہ عمدہ سامان بھیجے کہ ان کی مثال اس زمانے میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ انہیں میں سے ایک آئینہ کا ٹکڑا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد بہت زیادہ ہو کر زمین پر پھیل گئی تو اس کو اللہ نے اتارا۔ حضرت آدم اس آئینہ میں جس اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس کو عبد اللہ بن سوار عبدی نے حضرت معاویہ کی خدمت میں روانہ کر دیا جو منتقل ہوتے ہوتے عباسی خلفا کی ملکیت میں آ گیا۔

ہشام بن عبد الملک (723-744ء) کے دور خلافت میں 'سندھ' کے والی جنید بن عبد الرحمن مری کے پاس ہندوستان کے ایک راجہ نے جواہر سے مرصع ایک اونٹنی بھیجی۔ اس کے تھن میں موتی اور گردن میں سرخ یاقوت بھرا ہوا تھا۔ یہ اونٹنی چاندی کی ایک گاڑی پر تھی جب وہ زمین پر رکھ دی جاتی تو خود بخود حرکت کرنے لگتی تھی۔ جنید نے یہ تحفہ ہشام کی خدمت میں روانہ کر دیا جسے اس نے بہت پسند کیا۔

خلیفہ منصور عباسی (753-774ء) کے عہد میں ہشام بن عمر ثعلبی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور 'سندھ' کو عبور کر کے قندھار (کندھار ضلع بھروچ واقع گجرات) تک آئے۔ انہوں نے یہاں لوہے کا ایک بہت موٹا مینار پایا جو ایک سو ہاتھ لمبا تھا۔ انہوں نے مقامی لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ابنائے فارس کی وہ تلواریں ہیں جن کی مدد سے انہوں نے تبع حمیری کے ساتھ حملہ کر کے ملک کو فتح کیا تھا۔ فتح کے بعد انہوں نے اپنی تلواریں اکٹھا کر کے توڑ دیا۔ انہی ٹوٹی ہوئی تلواروں سے یہ مینار بنایا گیا ہے۔

راجہ رہمی جو اگرچہ بنگال کا راجہ تھا۔ وہ عباسی خلیفہ مامون (813-833ء) کے عہد میں تھا۔ اسے جب اسلام کے اخلاقی، دینی، مذہبی اور معاشرتی اوصاف کا علم ہوا تو وہ خلیفہ سے اپنے تعلقات قائم کیے اور خطوط و تحائف بھیج کر اسلام سے قربت کا اظہار کیا۔

873ء میں 'سندھ' کا ایک راجہ مسلمان ہوا اور اس نے کعبہ کے لیے سونے کا ایک طوق ہدیہ بھیجا جس کا وزن ایک سو مثقال تھا۔ راجہ نے یہ ہدیہ کعبہ کے خدام کے پاس بھیجا تو انہوں نے خلیفہ معتمد کو اس کی اطلاع دی۔ معتمد نے لکھا کہ اس کو دوسرے ہدایا کے ساتھ کعبے میں آویزاں کر دیا جائے۔

891ء میں الور کا راجہ مہرون بن رائق نے عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز ہباری کو خط لکھا کہ مجھے اسلامی تعلیمات سمجھائیے۔ انہوں نے ایک عالم کو الور بھیج دیا۔ انہوں نے اسے قرآن حکیم کی تعلیم دی اور اس کے لیے ہندی زبان میں اس کی تفسیر لکھی۔ اس طرح تین سال

تک اسے اسلامی احکام سکھاتے رہے۔ آخر میں راجہ مسلمان ہو گیا۔ مگر ملکی مصالح کی وجہ سے اسلام کا اظہار نہ کر سکا۔ راجہ نے اپنے اس استاذ کو دولت اسلام حاصل ہونے کی خوشی میں کئی من سونے سے نوازا تھا۔

علامہ بلاذری نے پنجاب کے ایک راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ لکھا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ 'کابل' اور 'ملتان' کے بیچ میں ایک شہر عیشقان (اسیوان) تھا۔ وہاں ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک بیٹا تھا۔ ایک مرتبہ وہ سخت بیمار پڑا۔ اس نے مندروں کے پجاریوں کو بلا کر کہا کہ اس کی سلامتی کے لیے دعا کرو۔ پجاریوں نے دوسرے دن آکر کہا کہ ہم لوگوں نے دعا کی ہے اور دیوتا نے اس کی شفایابی اور زندگی کا وعدہ کیا ہے۔ اتفاق سے وہ لڑکا تھوڑی ہی دیر کے بعد مر گیا۔ اس حادثہ سے راجہ کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ اسی وقت اٹھا اور مندروں کو ڈھا دیا اور پجاریوں کا قتل کر دیا۔ پھر شہر میں جو مسلمان سوداگر تھے ان کو بلوا کر ان کے مذہب کا حال دریافت کیا جس کو سن کر وہ بہت مرعوب ہوا یہاں تک کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔

4.4 'سندھ' کی درس گاہیں

عرب امرا نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ جہاں بھی فتح و کامرانی حاصل کی جائے وہاں مسلمانوں کو آباد کاری کے ساتھ مسجد ضرور تعمیر کی جائے، تاکہ ادائیگی نماز کے ساتھ درس و تدریس کا شغل جاری رہے۔ محمد بن قاسم نے 'دیبل' سے لے کر 'ملتان' تک مختلف علاقوں میں مسجدیں تعمیر کروائیں اور اسلامی شعائر کو زندہ کیا۔ غالباً آخری مسجد انہوں نے 'ملتان' میں تعمیر کروائی، جسے بعد میں جلم بن شیبان اسماعیلی شیعہ حاکم نے بند کروا دیا تھا۔ اسی طرح ایک مسجد 'الور' میں بھی تعمیر کروائی۔ اس کے خطیب موسیٰ بن یعقوب ثقفی مقرر ہوئے تھے۔ بعض روایتوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ محمد بن قاسم نے مال غنیمت کے خمس سے ہر شہر اور قصبے میں مسجدیں تعمیر کروائیں اور ضرورت محسوس کی تو ان مسجدوں کو آباد رکھنے کے لیے بڑی تعداد میں مسلمانوں کو بھی وہاں بسایا۔ ان مساجد کے بارے میں پروفیسر محمد اسلم لکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے 'سندھ' کے طول و عرض میں جو مساجد تعمیر کروائی تھیں، ان کی واپسی کے بعد وہاں علوم اسلامیہ کا درس شروع ہو گیا تھا اور یہاں سے ایسے باکمال عالم پڑھ کر نکلے جنہوں نے دنیائے اسلام میں اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔

جب حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ (717-719ء) ہوئے تو ان کی دعوت پر بہت سے راجاؤں، مہاراجاؤں اور مقامی باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے خلیفہ نے عمدہ نظم کیا۔ اپنے ماتحت گورنر کو حکم دیا کہ جگہ جگہ مسجدیں تعمیر کریں اور ان میں ائمہ و خطیب مقرر کریں۔ ابن بطوطہ (1304-1377ء) سیاحت کرتے ہوئے 'سیہون' پہنچے تو وہاں کے خطیب نے انہیں حضرت عمر بن عبد العزیز کا ایک فرمان دکھایا۔ اس میں ان کے جد اعلیٰ الشیبانی کو جامع مسجد سیہون کا خطیب مقرر کیے جانے کا ذکر تھا۔

ابو جعفر عبد اللہ بن محمد الملقب بہ منصور عباسی کے زمانہ میں 'سندھ' کے گورنر ہشام بن عمر تغلبی نے عمر بن جمل کو 'گجرات' کی مہم پر روانہ کیا۔ انہوں نے 'گندھار' میں ایک مسجد بنوائی۔ غالبا یہ سرزمین ہندوستان کی پہلی مسجد تھی۔ مہدی نے اپنے دور حکومت میں اس بات کی بڑی کوشش کی کہ اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ ان کی دعوت پر پندرہ راجاؤں کے اسلام قبول کرنے کا پتا چلتا ہے۔ انہیں میں ایک 'سندھ' کا

راجہ تھا جس کو 'رائے' اور ایک ہندوستان کا راجہ تھا جس کو 'مہراج' کہتے تھے۔ ہارون بن مہدی الملقب بہ رشید نے اپنے عہد خلافت میں فتوحات ہند میں بڑی سرگرمی دکھائی اور اشاعت اسلام کی کوشش کی اور علوم وفنون کو ترقی دی۔ ان کی علماء پروری اور علمی دلچسپی کے ذکر سے تاریخ کے اوراق مزین ہیں۔

813ء میں فضل بن ماہان نے سندان (سنجان) پر قبضہ کیا اور وہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کی۔ اس عہد میں یہاں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی جس کے منبر پر خلیفہ مامون کی صحت وعافیت کی دعا کی جاتی تھی۔ اس دیار کی یہ دوسری مسجد تھی۔ بعد میں اس علاقے پر ہندوؤں کا قبضہ ہوگیا، مگر مسجد بہ دستور مسلمانوں کے قبضہ وتصرف میں رہی، جسے مدتوں مسلمان آباد کیے رہے۔ اصطخری (م 951 کے قریب) نے 340ھ کے قریب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'قامہل'، 'سندان'، 'صیمور'، 'کھمبائیت' میں جامع مسجدیں تھیں اور ان میں اسلامی عبادت کھلے عام ادا کی جاتی تھی۔ یاقوت حموی (1178-1229ء) نے 'صیمور' کے بیان میں تصریح کیا ہے کہ یہاں جامع مسجد تھی جس میں جمعہ کی نماز ہوتی تھی۔ نیز انہوں نے 'قامہل' کے ذکر میں لکھا ہے کہ یہاں جامع مسجد تھی، جس میں باقاعدہ جمعہ کی نماز ہوتی تھی۔ 'تھانہ' جو شہر ممبئی سے ملحق ہے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ان علاقوں میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان بھی آباد ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی بستیوں میں مسجدیں بھی ہوں گی جہاں لوگ اجتماعی طور پر نماز ادا کرتے ہوں گے اور یہیں سے دینی وشرعی امور کے حل کے ساتھ درس وتدریس کا عمل بھی انجام دیتے ہوں گے۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی یہاں موجود تھی تو مسجدوں کے علاوہ مدرسے اور دارالعلم بھی قائم کیے گئے ہوں گے۔

'سندھ' کے مرکزی شہروں میں 'دیبل' بھی تھا۔ اسے علمی حیثیت سے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ اس کا شمار دنیاءِ اسلام کے عظیم شہروں میں ہوتا تھا۔ مشہور جغرافیہ داں یاقوت حموی نے اس شہر کی زرخیزی اور اس کی علمی رفعت کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہاں سے علم وعمل کی قندیلیں روشن ہوئیں تو اس کے دورس نتائج بر آمد ہوئے۔ "یہاں کے علماء خاص طور سے پورے عالم اسلام سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ملک میں ان کی آمد ورفت جاری تھی۔ یاقوت حموی کا بیان دیبل کے بارے میں گزر چکا ہے کہ شہر دیبل کی جانب حدیث کے راویوں کی ایک جماعت منسوب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سندھ کا یہ شہر احادیث رسول کا شہر تھا اور یہاں پر احادیث کی تعلیم وروایت عام تھی۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں امام خلف بن محمد موازینی دیبلی کے ذکر میں امام علی موسیٰ دیبلی کی درس گاہ کی نشان دہی کی ہے جو دیبل میں تھی اور جس میں امام خلف بن محمد دیبلی نے اپنے شیخ امام علی بن موسیٰ دیبلی سے حدیث پڑھی... دیبل ساحلی شہر اور ہند وعرب کی تجارت کا بہت اہم مرکز تھا۔ اس لیے یہاں کے بعض محدثین تاجر بھی تھے۔ چنانچہ ابو محمد حسن بن حامد دیبلی بغدادی جو علم حدیث میں اہم مقام کے مالک تھے، بغداد کے بڑے تاجروں میں بھی تھے... چوں کہ دیبل بہت قدیم شہر تھا اس لیے یہاں ہماری حکومت سے پہلے اور اس کے بعد علوم اسلامیہ کا رواج رہا اور بہت سے محدثین ورواۃ حدیث دیبل کے مطلع پر جلوہ افروز ہو کر اپنے دور میں آسمان علم کے شمس وقمر بنے اور پورے عالم اسلام میں خوب چمکے۔"

4.5 گہوارہ علم سے منسوب شہر اور قریے

مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا ایک بڑا مرکز 'منصورہ' بھی تھا۔ یاقوت حموی نے 'منصورہ' کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ایک بڑا شہر ہے اور یہاں کے لوگ اچھی خصلت کے مالک ہیں۔ قاضی اطہر مبارک پوری 'سندھ' کی علمی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کرنے کے بعد 'منصورہ' کو گہوارۂ علم قرار دیا ہے۔ 'سندھ' کے دوسرے شہروں میں 'بوقان' بھی تھا۔ اسے بھی علمی اعتبار سے بڑی اہمیت اور شہرت حاصل تھی۔ یہاں مسلمان بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ہباری دور حکومت (861-1025) میں یہاں کئی نامور علماء پیدا ہوئے، جنہوں نے 'سندھ' کے علاوہ دوسرے شہروں میں علم کا چراغ روشن کیا۔ یاقوت حموی نے اس شہر کے ایک باکمال عالم کا ذکر کیا ہے، جس سے اس شہر کی علمی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان دنوں 'بوقان' کے باشندے مسلمان ہیں۔ اسی شہر سے متصل 'قیقان' کے قریب عباسی گورنر عمران بن موسیٰ برمکی نے 'بیضا' نامی شہر بسایا تھا، جہاں سے سرکشوں (جو شہر میں فساد مچاتے پھرتے تھے) کی سرکوبی کی جاتی تھی۔ یہ شہر بھی آگے چل کر علمی اعتبار سے بہت مشہور ہوا۔ علم وادب کے مرکزوں میں 'قصدار' کا بھی نام آتا ہے۔ اس شہر کی خاک سے کئی مشہور علما پیدا ہوئے جو دنیائے علم وادب کے آسمان پر مہر وماہ بنے۔ اصطخری کے زمانہ میں یہاں مغیرہ بن احمد نامی ایک شخص حاکم تھا جو عباسی خلفاء کے نام کا خطبہ پڑھتا تھا۔ علماء 'قصدار' میں جعفر بن الخطاب قصداری بڑے اونچے پایہ کے عالم، محدث اور فقیہ مانے جاتے تھے، زہد وورع کی وجہ سے اپنے معاصرین میں ضرب المثل تھے۔ 'ملتان' قدیم زمانہ سے ہی بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اسلام جب یہاں پہنچا تو بڑی تعداد میں مسلمانوں نے یہاں سکونت اختیار کی۔ اس لیے وہاں تعلیم وتدریس کا رواج بھی عام ہوا اور کئی مرکز علم وجود میں آئے۔ ابن حوقل جب یہاں آیا تو اس نے یہاں کے باشندوں میں قرآن کی طرف رغبت پائی اور ساتوں قرأت سے قرآن پڑھنے والے قراء کو پایا۔ بشاری مقدسی (م1000ء) اس شہر کی پاک بازی اور دیانت داری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ان کے ہاں زنا نہیں ہے اور نہ ہی شراب پی جاتی ہے، جو ایسا کرتے ہیں اور پکڑا جاتا ہے تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے یا اس پر حد جاری کی جاتی ہے۔ وہ خرید وفروخت میں جھوٹ نہیں بولتے ہیں مسافروں سے محبت کرتے ہیں۔" 'لاہور' میں بھی بڑے بڑے علمی مراکز تھے۔ وہاں کے علماء ساری دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بعد کے زمانے میں بھی دوسرے ملکوں کے نامی گرامی علماء، محدث، فقیہ، صوفیاء اور برگزیدہ ہستیاں یہاں وارد ہوئیں۔ ابوالحسن علی بن عمر الحکم بڑے ادیب اور شاعر تھے، حدیث پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

جب کبھی مرکزی حکومت کا تعلق 'سندھ' سے کم زور ہوا تو 'سندھ' اور اس سے ملحق علاقوں کے مسلمانوں نے اس کم زوری کا فائدہ اٹھا کر خود مختار ریاست قائم کرلی۔ برائے نام اپنی وفاداری کا دم بھرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح مرکز سے بھی تعلق برقرار رکھا۔ ان میں خاص طور سے 5/ ریاستیں بڑی اہم تھیں اور ایک خود مختار اسلامی ریاست کا تعلق براہ راست ہندوستان کے ساحلی علاقہ سے تھا۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں نے اپنے اپنے عہد میں اشاعت تعلیم پر بڑی توجہ دی اور بڑے بڑے نامی گرامی علماء کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ اس طرح یہاں کے علمی مزاج میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ 'سندھ' کی علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

"چوتھی صدی ہجری میں پورا عالم اسلام علمی ودینی نشاط سے معمور تھا۔ مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کے بلاد وامصار اور شہر و

قریہ اسلامی علوم وفنون اور دینی رجال و شخصیات کے گہوارے تھے، جن میں اسلامی ثقافت پرورش پارہی تھی۔یہی پر بہار زمانہ سندھ میں ہباریوں کی حکومت کا دور تھااور بغداد وبصرہ کی طرح سندھ و منصورہ اور دیبل وغیرہ بھی اسلامی علوم وفنون کے مرکز تھے۔ جگہ جگہ دینی علوم وفنون کی بساط بچھی ہوئی تھیں۔گھر گھر دارالعلم بناہوا تھااور ایک ایک بستی میں سینکڑوں علماء و فضلاء رہتے تھے۔اس دور میں سندھ میں اسلامی زندگی اپنے پورے شباب پر تھی۔ ہباری حکمراں بڑے علم دوست اور اہل علم کے قدرداں تھے۔انہوں نے دینی علوم ورجال کی سرپرستی کی۔ علمی خاندانوں سے ان کے تعلقات تھے اور اہل علم وفضل ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ان کا مسلک اگرچہ امام داؤد ظاہری کا تھااور وہ ظاہر حدیث پر عمل کرتے تھے، مگر پورے سندھ میں فقہاء احناف کی کثرت تھی۔معتزلہ کی عقلیت پسندی سے نجات تھی۔عام مسلمانوں کا دینی حال نہایت اچھا تھا۔مذہبی تعصب، گروہ بندی اور جانب داری کا نام تک نہیں تھا۔بلکہ ہر مسلک کے لوگ آزادی اور سکون سے اپنے مسلک پر عمل کرتے تھے۔حسن اخلاق، سیر چشمی اور انسانیت ومروت سندھ کے مسلمانوں کی امتیازی صفات تھے۔بڑے بڑے شہروں کی زبان عربی اور سندھی دونوں تھیں۔بودوباش اور طرز زندگی مرکز عراق سے ملتا جلتا تھااور ذہن ومزاج کے اعتبار سے وہ سچے مسلمان تھے۔خاص طور سے بڑے بڑے شہروں میں اسلامی شان وشوکت کا غلبہ تھا۔الور بہت بڑا شہر تھااور وہاں مسلمانوں کی بہت زیادہ آبادی تھی۔نیرون بھی خالص علمی شہر تھا۔دیبل علماء وفضلاء کا مرکز تھااور منصورہ تو گویا دارالاسلام والمسلمین بن کر بغداد اکا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔رسم ورواج عراق سے ملتے جلتے تھے۔ساتھ ہی حسن اخلاق اور شرافت میں بھی یہ لوگ مشہور تھے۔"(ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:150-149)

4.6 ہندوستان میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے فیوض وبرکات

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت سے لے کر عباسی حکومت کے زوال تک بالخصوص ہندوستان کے شمالی حصے میں متعدد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین وارد ہوئے اور ان کے فیوض وبرکات سے یہاں کی سرزمین سیراب ہوئی۔جو صحابہ کرام یہاں آئے، ان کی تعداد 25/رہے۔12/صحابہ کرام عمر بن خطابؓ کے عہد خلافت میں، 5/عثمان غنیؓ کے زمانہ خلافت میں، 3/علیؓ کے عہد میں، 4/معاویہ بن ابی سفیانؓ کے خلافت میں اور 1/یزید بن معاویہ کے عہد میں یہاں آئے۔ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ، عبداللہ بن عمر الاشجعیؓ، حکم بن ابوالعاص ثقفیؓ، مغیرہ ابوالعاص ثقفیؓ، سہل بن عدی بن مالک حرام الخزرجیؓ، عبداللہ بن عتبان الامویؓ، عاصم بن عمرو التمیمیؓ، ربیع بن زیاد الحارثیؓ(م 671ء) عبید اللہ بن معمر بن عثمان التمیمی القرشیؓ، مجاشع بن سعود بن ثعلبہ السلمیؓ، عبدالرحمن بن سمرہ بن حبیب العبشی القرشیؓ(م 675ء) سنان بن سلمہ المحتبق الہذلیؓ، منذر بن جارود العبدیؓ(م 681ء) عمرو بن عثمان بن سعد التمیمیؓ، خریت بن راشد الناجیؓ، یاسر بن سوار عبدیؓ، مہلب بن ابوصفرہ ازدی عتکیؓ(م702ء) کلیب ابووائلؓ وغیرہ۔

بڑی تعداد میں تابعین وتبع تابعین نے بھی ہندوستان کا رخ کیا، جن کا شب وروز کا مشغلہ ہی دین کی اشاعت اور دلوں کو فتح کرنا تھا۔یہ باشندگان ہند کو شائستگی کی اعلیٰ اقدار سے بہرہ مند کرنے کی سعی کرتے تھے۔بلاد عرب سے ہندوستان تشریف لانے والے تابعین کی تعداد تقریباً 42/بیان کی جاتی ہے۔سعید بن ہشام بن عامر انصاری، مہلب بن ابی صفرہ، موسیٰ بن یعقوب ثقفی، یزید بن ابی کبشہ السکسکی،

المفضل بن المہلب بن ابی صفرہ، عمرو بن مسلم الباہلی وغیرہ کا ہندوستان آنا ثابت ہے۔ انہوں نے اپنے اخلاق و کردار اور علمی خوبیوں سے ہندوستان کو فیض پہنچایا اور یہاں کے باشندوں کے اندر جوش ایمانی پیدا کر کے انہیں کفر والحاد سے نکال کر شاہراہ ایمانی پر کھڑا کیا۔

محمد بن قاسمؒ کے ساتھ جو تابعین 'سندھ' کی مہم پر آئے ان میں ایک ابو شیبہ یوسف بن ابراہیم التیمی الجوہری تھے۔ یہ نہ صرف جنگی معرکوں میں شریک ہوئے، بلکہ تعلیم و تدریس کا شغل بھی جاری کیے ہوئے تھے۔ دوسرے تابعی زیاد بن الحواری العبدی تھے، ان کا شمار جلیل القدر تابعی کے ساتھ بڑے محدثین میں ہوتا تھا۔ ایک تابعی زائدہ عمر الطائی الکوفی تھے جن کے ذمہ 'ملتان' کے نو مسلموں کو اسلامی احکام کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ محمد بن قاسمؒ کے دوش بہ دوش جہاد میں شرکت کا شرف ابو قیس زیاد بن رباح القیشی بصری کو بھی حاصل تھا۔ انہوں نے ابو ہریرہؓ وغیرہ سے علم حدیث حاصل کیا تھا اور حسن بصریؒ وغیرہ نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔

سلیمان بن عبد الملک (717-719ء) کے عہد میں یزید بن ابی کبشہ الشامی 'سندھ' کے والی خراج بن کر آئے۔ یہ بڑے پایہ کے محدث تھے۔ ولید بن عبد الملک کے زمانہ خلافت میں سعید بن اسلم بن ذرع الکلابی یہاں کے گورنر بن کر آئے، درس حدیث ہی ان کا اولین مقصد تھا۔ اسی طرح ایک تابعی اسید بن اخنس بن شریک الثقفی تھے، عبد الملک بن مروان کے زمانہ حکومت میں یہاں کے والی مقرر ہو کر آئے، انہوں نے بھی یہاں اشاعت علم کی طرف بڑی توجہ دی۔

4.7 عالم اسلام کے علماء و محدثین کا ہندوستان میں قیام

بعد کے عہد میں حضرت امام حسن بصری (642-728ء) کے دو کبار شاگردوں کا ہندوستان سے بڑا گہرا تعلق رہا۔ ان کے واسطے سے امام بصری کے فیوض و برکات ہندوستان میں عام ہوئے۔ ان میں سے ایک حضرت امام ابو حفص ربیع بن صبیح بصری ہیں۔ وہ یہیں 160ھ / 776ء میں فوت ہوئے۔ یہ گجرات میں جہاد کے لیے آئے تھے، جس کی قیادت عبد الملک مسمعی کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے یہیں قیام اختیار کیا اور درس و تدریس کا شغل جاری رکھا۔ آپ علم حدیث کے ان ممتاز لوگوں میں ہیں جنہیں دوسری صدی ہجری میں جمع و تدوین حدیث کا شرف حاصل ہے۔ دوسرے حضرت امام ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری (م155ھ / 771ء) ہیں۔ انہوں نے ایک عرصے تک ہندوستان میں علم حدیث کا درس دیا اور یہیں سکونت اختیار کی۔

4.7.1 کتب صحاح میں ہندوستانی محدثین کی مرویات

امام بخاری (810-869ء) نے اپنی جامع میں مذکورہ دونوں حضرات سے مروی احادیث نقل کی ہیں۔ صحاح کے علاوہ حدیث کے دوسرے مجموعوں میں بھی ان کے طرق سے حدیثیں ملتی ہیں۔ اول الذکر محدث کی روایت ترمذی ابواب تفسیر القرآن، تفسیر سورہ آل عمران، مسند احمد، ابن ماجہ، طحاوی اور موطا امام محمد بن الشیبانی میں الفاظ کے قدرے فرق کے ساتھ موجود ہے۔ موطا میں ہے: ہمیں ربیع بن صبیح نے رقاشی نے خبر دی، انہوں نے حضرت انس بن مالک سے روایت کی، نیز ربیع نے حسن بصری سے روایت کی اور یزید و حسن دونوں مرفوعاً نبیؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن وضو کرے تو یہ بھی اچھی بات ہے اور جو شخص غسل کرے تو غسل

افضل ہے۔(محمد بن الحسن الشیبانی، موطاامام محمد، کتاب الصلوٰہ، باب اغتسال الجمعۃ)

اسی طرح ایک اور حدیث انہیں کے طرق سے بیان ہوئی ہے، جس میں پانچ دنوں میں روزہ رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ جب کہ ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ کوئی شخص رمضان کے دنوں میں یا غیر رمضان میں روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھاپی لے تو اس کا روزہ ہو جائے گا۔ ''ہمیں ربیع بن صبیح نے خبر دی کی حسن بصری نے ہم سے بیان کیا کہ نبیؐ نے فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی رمضان یا غیر رمضان میں روزے رکھے اور بھول کر کھاپی لے تو اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا، اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے۔''(موطا امام محمد، باب الرجل یاکل اویشرب ناسیا)

ثانی الذکر محدث سے مروی حدیث صحیح البخاری، کتاب الصلح، کتاب مناقب الحسن والحسین اور کتاب الفتن کے علاوہ ترمذی، ابوداؤد اور سنن نسائی میں ملتی ہے۔ بخاری میں ہے: ''سفیان بن عیینہ نے ابو موسی اسرائیل سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا میں نے حسن بصری کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت حسن بن علی فوج لے کر نکلے (اس کے بعد پورا قصہ بیان کیا) حسن بصری کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابو بکرہ سے سنا ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے نبیؐ کو منبر پر اس حال میں دیکھا ہے کہ حضرت حسن آپ کے پہلو میں تھے اور آپ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی حسن کی طرف توجہ فرماتے اور فرماتے کہ یہ میرا بیٹا سردار ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔ مدینی نے کہا کہ ہمارے نزدیک حسن بصری کا حضرت ابو بکرہ سے سماع کا ثبوت اسی حدیث سے ہے۔''(صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب قول النبیؐ للحسن بن علی۔ کتاب المناقب، باب علامات النبوت، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ، باب مناقب الحسن والحسین۔ کتاب الفتن، باب قول النقب للحسن بن علی)

4.7.2 ہندوستانی شہروں سے منسوب علماء و محدثین

اسلام کے ابتدائی دو تین صدیوں میں 'سندھ' کے مسلمانوں نے حصول علم کے سلسلے میں جو سرگرمیاں دکھائیں ان سے ان کی بڑی نیک نامی ہوئی۔ عرب ملکوں میں بھی وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ وہاں کے مرکز علم کو اپنی علمی خوبیوں سے بھی رونق بخشا۔ ان میں خالص ہندوستانی النسل علماء، محدثین اور فقہاء تھے، جو اسلام قبول کر کے تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کیے تھے۔ اوپر جن علماء کرام و محدثین عظام کا ذکر کیا گیا ہے وہ 'سندھ' سے منسوب کیے جاتے تھے۔ لیکن ایسے بھی علماء و محدثین تھے، جو 'سندھ' کے دوسرے شہروں اور علاقوں کی نسبت سے جانے جاتے تھے۔ قاضی ابو محمد منصوری داؤدی مسلک کے امام تھے اور 'منصورہ' میں مستقل قیام پذیر تھے۔ اسی طرح قاضی ابوالعباس احمد بن محمد منصوری یہاں کے قاضی تھے۔ ابو بکر احمد بن محمد منصوری بکر آبادی (م1030ء) کا شمار محدث کبیر میں ہوتا تھا۔ متعدد لوگوں نے ان سے حدیث کی سند حاصل کی ہے۔ ابو محمد عبد اللہ بن جعفر بن مرہ منصوری قرآن کے مستند قاری و مقری تھے۔ انہوں نے احادیث کی سماعت حسن بن مکرم اور ان کے معاصرین سے کی۔ ابوالعباس احمد بن عبد اللہ دیبلی نیساپوری (م954ء) کی شہرت محدث وفقیہ کی حیثیت سے تھی۔ انہوں نے امام ابن خزیمہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تکمیل علم کی اور نیساپور کو ہی رونق بخشا۔ ابو بکر احمد بن محمد بن ہارون حربی دیبلی رازی (م980ء) نے امام جعفر محمد قزیابی اور ابراہیم بن شریک کوفی وغیرہ سے روایت کی ہے۔ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم

دیبلی بغدادی چوتھی صدی کے مشاہیر علماء حدیث میں سے تھے۔ ابو محمد حسن بن حامد دیبلی بغدادی محدث وادیب وشاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بغداد کے بڑے تاجروں میں سے تھے۔ ابوالقاسم حسین بن محمد بن اسد دیبلی دمشقی چوتھی صدی کے محدث تھے۔ خلف بن محمد موازینی دیبلی بغدادی، ابوالقاسم شعیب بن محمد بن احمد دیبلی، علی بن احمد بن محمد دیبلی، علی بن موسیٰ دیبلی بغدادی، ابوجعفر محمد بن ابراہیم دیبلی مکی، ابوبکر محمد بن حسین محمد بن دیبلی شامی، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ دیبلی شامی وغیرہم چوتھی صدی ہجری کے محدثین عظام اور علماء کبار میں سے تھے۔ محدثین 'بوقان' میں ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد بوقانی سندی اونچے پایہ کے عالم تھے۔ یہ امام بغوی کے شاگرد تھے۔ محمد بن احمد منصور بوقانی نامور محدث تھے۔ انہوں نے حدیث کا درس امام حاتم بن محمد حبان (م965ء) سے لیا تھا۔ محمد بن احمد بن محمد بن خلیل بن احمد بوقانی کا شمار پانچویں صدی کے علماء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حدیث کی تکمیل امام ابوبکر بن خلف شہرازی سے کی تھی۔ ان کے شاگردوں میں عبدالرحیم بن سمعانی نے علم حدیث میں بڑی شہرت پائی۔ ابوسعید بن احمد اسعد بن محمد بوقانی کا شمار شوافع علماء میں بڑی عزت سے لیا جاتا تھا۔

4.7.3 ہندوستانی علوم سے عربوں کی دل چسپی

عباسی دور حکومت میں بالخصوص منصور کے زمانے میں یونانی فلسفہ ومنطق کا رواج عام ہوا اور عربی میں ترجمہ کا کام بڑی تیزی سے شروع ہوا تو لوگوں کی توجہ ان علوم کی طرف ہوئی۔ اس کا اثر ہندوستان میں بھی پڑا اور اس کی تعلیم کے لیے بڑے بڑے فلاسفہ اور کلامی علماء نے ہندوستان کا رخ کیا۔ نیز حسب ضرورت حکومت کے ایما پر نہ صرف عرب علماء کی جماعت یہاں آتی رہی، بلکہ ہندوستان کے بڑے بڑے عالموں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے انہیں بغداد بلایا گیا۔ ہارون رشید کی درخواست پر کئی ہندو 'بیدوں' اور فلسفیوں کے مرکز خلافت پہنچنے کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے۔ ایک ہندو طبیب کے متعلق صراحت ملتی ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ 'صالح بن بہلہ' کے نام سے مشہور ہوا۔ 'سدھانت' جو ہندوستانی تصنیف ہے، جس کی زبان سنسکرت ہے اور ہیئت اس کا موضوع ہے، 771ء میں اس کا ترجمہ عربی میں ہوا اور اس کا نام 'السند ہند' رکھا گیا۔ اس کے ترجمہ کے لیے خلیفہ وقت نے کمیٹی تشکیل دی تھی، جو سنسکرت کے ساتھ عربی زبان کے بھی ماہر تھے۔ اس کے علاوہ علم ریاضی بھی ہندوستانیوں کے ذریعہ عرب ملکوں میں پہنچا۔ جیسا کہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں: ''علم ہیئت کے علاوہ علم حساب میں بھی عرب ہندوستانیوں سے اور تمام اہل مغرب عربوں سے مستفید ہوئے۔ عربوں کا بیان ہے کہ انہوں نے حسابی رقم (ہندسے) لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا۔ اس لیے وہ ہندسوں کو حساب ہندی یا 'ارقام ہندیہ' کہتے تھے۔ اقوام یورپ نے یہ ہندسے عربوں سے سیکھے، اس لیے وہ انہیں Arabic Numeral یا اعداد عربیہ کہتے ہیں۔ اس سے پہلے عرب لفظوں میں عدد لکھتے تھے۔ پھر حروف ابجد میں لکھنے لگے اور اہل مغرب رومن ہندسوں میں (جن کا استعمال بہت پیچیدہ تھا) اعداد کو بیان کرتے تھے۔ یہ امر صحیح طور پر معلوم نہیں کہ ''ارقام ہندیہ'' عرب میں کب پہنچے، لیکن خیال ہے کہ جو پنڈت سدھانت لے کر بغداد گیا تھا، اسی نے عربوں کو حساب کا نیا طریقہ سکھایا ہو گا۔'' (رودکوثر)

4.8 علم فقہ کا فروغ

عرب دور حکومت میں جو علمی مراکز قائم ہوئے، ان میں نہ صرف قرآن حدیث کی تعلیم کا انتظام تھا، بلکہ فقہ وکلام اور دوسرے علوم کے درس و تدریس کا بھی توجہ دی جاتی تھی۔ چوں کہ شروع کی صدیوں میں جمع و تدوین حدیث کا عمل جاری تھا اور مسلمان کوشش کرتے تھے کہ وہ حدیث کی خدمت زیادہ سے زیادہ انجام دیں تاکہ یہ سرمایہ محفوظ اور شکوک و شبہات سے پاک رہے۔ اس لیے ان لوگوں نے اپنی خصوصی توجہ کی اسی جانب مبذول رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت عام طور سے حدیث سے جوڑدی گئی یا انہیں محدث کے لقب سے یاد کیا جانے لگا، جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی بڑے بڑے فقہاء ومفسرین قرآن اور دوسرے علوم کے ماہرین بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ محمد بن قاسم نے جن علاقوں کو فتح کیا، وہاں مسجدیں بنوائیں اور اس کے لیے امام وخطیب کا تقرر کیا جو حدیث کے ماہر ہونے کے ساتھ فقہی مسائل میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ اسی مسجد کے منبر و محراب اور صحن سے مسلمانوں کے پیش آمدہ نت نئے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا اور قضاۃ کی خدمات انجام دی جاتی تھیں۔ مولانا اسحاق بھٹی لکھتے ہیں: ”ابتدائی صدی ہجری میں ہی اسلام کے لئے ترقی وتقدم کی راہیں کھل گئی تھیں اور اس نے بحر وبر کے دور دراز فاصلوں کو طے کرکے برصغیر پاک وہند کو بھی اپنی آغوش شفقت میں لے لیا تھا۔ پھر یہاں بھی مختلف اسلامی علوم نے اپنے لئے جگہ بنائی۔ مفسرین پیدا ہوئے، محدثین نے بساط علم بچھائی اور فقہانے بھی فہم وادراک کی مسندیں آراستہ کیں اور کتاب وسنت کی ضیا پاشیوں کی وساطت سے اپنے ملکی ماحول کے مطابق پیش آئند مسائل کی گرہ کشائی کی۔ کتابیں لکھیں، مدرسے قائم کئے اور وعظ وارشاد کی محفلیں سجائیں۔ غرض ہر طریق اور ہر نہج سے اپنی بات لوگوں کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔“ (برصغیر میں علم فقہ، ص:35)

چوں کہ اس عہد میں غیر مسلم بڑی تعداد میں اسلام قبول کررہے تھے اور جنگ وجدال کا بازار بھی گرم تھا، اس لیے شرعی موقف کی وضاحت بھی درکار تھی، تاکہ غیر مسلموں کے شرعی حقوق متعین کیے جائیں۔ اس لئے دوسرے فقہی مسالک کی تعلیم سے بھی تعصب نہیں برتا جاتا تھا، تاہم فقہ حنفی کو ہی یہاں قبول عام حاصل رہا اور اکثر لوگ حنفی مسلک پر عمل پیرا تھے۔ بساری مقدسی 'سندھ' کے مشہور مقامات کی علمی حیثیت اور لوگوں کی تعلیم وتعلم سے دل چسپی کا ذکر کرنے کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں: ”سندھ کا کوئی بڑا شہر حنفی مذہب کے فقہاء سے خالی نہیں، مگر مالکیہ، معتزلہ اور حنابلہ بالکل نہیں ہیں۔ یہ لوگ سیدھے راستے اور صحیح مسلک پر ہیں۔ پاک باز اور ان کے خصائل پسندیدہ ہیں۔“ (بحوالہ تاریخ سندھ، ص:376)

محمد بن قاسم کے سامنے پہلی بار یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ 'دیبل' کے غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اور فقہاءِ اسلام کی صراحت کے مطابق انہیں غیر مسلموں کے کس خانے میں رکھا جائے۔ 'اہل کتاب' میں شمار کیا جائے، یا 'شبہ اہل کتاب' میں، یا پھر ان کا شمار ان میں سے کسی میں نہ کیا جائے۔ اس زمانے میں یہ مسئلہ پیچیدہ بن کر سامنے آیا، مگر کوئی واضح صراحت نہ ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت سے رجوع کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجاج بن یوسف (661-715ء) نے علماء سے استفسار کرکے اس کا شرعی حل معلوم کیا، پھر محمد بن قاسم کو اس کی اطلاع دی گئی، جس کی روشنی میں سندھ کے غیر مسلموں کو 'ذمی' کا درجہ دیا گیا۔

ابتدائی عہد کے ہندوستان میں جن فقہاءِ کرام کی فقہی سرگرمیوں میں دل چسپی کا پتہ چلتا ہے، ان کی تعداد 36/ ہے۔ جب کہ دوسری صدی ہجری کے 17/ اور تیسری صدی کے 7/ ہیں۔ اسی طرح چوتھی صدی کے 7/ فقہاء کرام کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں بیش تر حضرات کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ جن لوگوں نے حدیث کی تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دیا ان میں اکثر حضرات فقہ اور شرعی مسائل کے بھی ماہر ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے فقہاء کرام تھے جو عام طور پر فقہی خدمات انجام دے رہے تھے۔

4.9 عربی زبان وادب کا فروغ

علماء و محدثین اور فقہائے کرام کے علاوہ ایسے حضرات بھی تھے جو شعر و ادب سے بڑی دل چسپی رکھتے اور شعر و شاعری کی محفل گرم کرتے تھے۔ ان میں ابو المکارم سندھی، ابو العطا سندھی، اسحاق (م 849ء)، منصور ہندی، سندھ بن صدقہ، کشاجم سندھی، ہارون عبد اللہ ملتانی وغیرہ کے اسماء گرامی بقائے دوام کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر حضرات صاحب تصانیف ہیں۔ عرب کے ابو تمام کا ہم عصر نامور شاعر ابو عبادہ ولید بن عبید البحتری (م 897ء) کے ہندوسان آنے کی شہادت ملتی ہے، لیکن وہ کس سنہ میں ملتان آئے، اس کا تعین کرنا مشکل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز ہباری کے دور میں 'منصورہ' کے والی بنائے گئے تھے۔

4.10 ابتدائی عہد کے صوفیا

خطہ 'سندھ' کی فتوحات کا زمانہ عہد صحابہ، تابعی و تبع تابعی سے بہت قریب ہے، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے یہاں اسلام کی روشنی کو جلا بخشا اور دلوں کو فتح کر کے حلقہ اسلام میں داخل کیا اس لئے ان کی مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ بعض تذکروں میں ایک صوفی تبع تابعی شیخ ابو تراب کا ذکر ملتا ہے۔ جنہوں نے ملکی فتوحات کے ساتھ اپنے کشف و کرامات کے ذریعہ بہت سے غیر مسلموں کو حلقہ اسلام میں داخل کیا۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ وہ عباسی خلفاء کے عہد حکومت میں آئے اور کئی علاقوں پر قابض تھے۔ ان کا مزار زیارت گاہ خاص وعام ہے اور اس کے گنبد پر 171ھ / 788ء درج ہے۔ ان کے مزار پر ہر مہینے چھوٹا سا میلہ لگتا ہے۔ عوام الناس نے ان کو باکرامت پیر بنا دیا ہے۔ مقامی روایت میں ہے کہ اس علاقہ میں 'تھارنہ' نام کا ایک ہندو راجہ تھا، شیخ نے اپنی کرامت سے اسے اور اس کی فوج کو ایک پہاڑی کی صورت میں منتقل کر دیا، یہ پہاڑی بھی زائرین کو دکھائی جاتی ہے۔

4.10.1 مذہب کی سچائی پر بین المذاہب مناظرہ

عربوں کے زمانہ قیام میں غیر مسلموں کو یہاں تک آزادی حاصل تھی کہ وہ جب اور جس وقت چاہیں اپنے مذہب کی فضیلت کو ظاہر کرنے کے لیے مسلمان علماء اور فلاسفہ سے مذہبی اور علمی مناظرہ کریں اور دلائل و براہین کے ذریعہ جس مذہب کی فضیلت ثابت ہو، اسے قبول کریں۔ عباسی عہد میں ایسے کئی مناظرے ہوئے۔ اس طرح کی ایک مناظرانہ سرگرمی کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں: "ہارون رشید (دوسری صدی ہجری کا اخیر) کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ہندوستان کے کسی راجہ نے ہارون رشید کو کہلا بھیجا کہ "آپ اپنے مذہب کے کسی عالم کو میرے پاس بھیج دیجیے جو مجھ کو اسلام سے آگاہ کرے اور میرے سامنے میرے ایک پنڈت سے بحث کرے۔ دوسری

روایت یہ ہے کہ سندھ کے کسی راجہ کے یہاں ایک بدھ مذہب کا فاضل پنڈت تھا اس نے راجہ کو آمادہ کیا تھا کہ تلوار کے سوا آپ کے پاس آپ کے مذہب کی سچائی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر آپ کو اپنے دھرم کی سچائی کا یقین ہو تو اپنے ہاں کے کسی عالم کو بھیجئے جو میرے ایک پنڈت سے آ کر بحث کرے۔ خلیفہ نے ایک مقدس محدث عالم کو اس کام کے لیے بھیج دیا۔ پنڈت نے جب عقلی اعتراضات شروع کیے تو ملا نے جواب میں حدیثیں پیش کرنی شروع کیں۔ پنڈت نے کہا یہ تو ان کے لیے سند ہیں جو تمہارے مذہب کو مانتے ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ پنڈت نے پوچھا کہ تمہارا خدا اگر ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اپنی جیسی کسی ہستی کے بنانے پر بھی اس کو قدرت ہے ان بھولے بھالے عالم صاحب نے کہا اس قسم کی باتوں کا جواب دینا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ علم کلام والوں کا کام ہے۔ راجہ نے ان عالم صاحب کو واپس کیا اور ہارون رشید کو کہلا بھیجا کہ پہلے تو بزرگوں کے کہنے سے مجھے معلوم ہوا اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین ہو گیا کہ آپ کے پاس آپ کے مذہب کی سچائی کی کوئی دلیل نہیں۔ خلیفہ نے کلام والوں کو بلوا کر یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ اس جماعت کے ایک کمسن بچہ نے اٹھ کر کہا "امیر المومنین یہ اعتراض لغو ہے، اللہ تو وہ ہے جس کو نہ کسی نے بنایا، نہ پیدا کیا، وہ مخلوق نہ ہو۔ اب اگر وہ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے کو پیدا کرے گا تو وہ اس جیسا ہو نہیں سکتا کیوں کہ وہ بہر حال اس کا مخلوق ہی ہو گا۔ پھر یہ کہ بعینہ خدا کسی طرح کیسی دوسری ہستی ہو سکتا خدا کی توہین ہے اور خدا اپنی توہین و تحقیر پر جو محال ہے قدرت نہیں رکھتا۔ یہ سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ خدا جاہل ہو سکتا ہے؟ خدا مر سکتا ہے؟ خدا کھا سکتا ہے، یا پی سکتا ہے، یا سو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے خدا کچھ نہیں کر سکتا ہے، کہ یہ سب اس کی ذات کی شان کے خلاف ہے۔ یہ جواب سب نے پسند کیا اور خلیفہ نے چاہا کہ اس پنڈت کے مقابلہ کے لیے اسی لڑکے کو ہندوستان بھیجا جائے، مگر تجربہ کاروں نے عرض کی کہ حضور یہ بہر حال بچہ ہے، ایک جواب بن آیا تو ضروری نہیں کہ سب جواب بن آئے، چنانچہ ایک دوسرے مشہور متکلم کو خلیفہ نے چن کر ہندوستان بھیجا، ایک روایت میں ہے کہ وہ بدھ اس متکلم سے کبھی مناظرہ کر چکا تھا اور شکست کھا چکا تھا اور دوسری روایت میں ہے کہ اس نے راستہ ہی میں ایک آدمی کو بھیج کر پتہ چلایا کہ یہ صرف مذہبی ملا ہے یا عقلیات سے بھی واقف ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ عقلیات کا بڑا فاضل ہے تو پھر دونوں روایتوں میں ہے کہ اس پنڈت نے اس کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور پا کر اس سے پہلے کہ وہ مسلمان مناظر راجہ کے دربار میں پہنچے راستہ ہی میں اس کو زہر دلوا دیا۔" (عرب و ہند کے تعلقات، ص:158-157)

4.11 بعد کے عہد میں شمالی ہند میں اسلام کے اثرات

محمد بن قاسم کی معزولی کے بعد سے لے کر عہد عباسی کے درمیانی عرصے تک 'سندھ' اور اس کے نواحی علاقے 'ملتان' اور 'لاہور' وغیرہ سے 'عرب' کا تعلق تو ضرور رہا، مگر ان کی طرح تیز رفتاری سے کسی دوسرے امرا فتوحات نہ کر سکے۔ اگر کسی نے آگے بڑھ کر 'ہندوستان' میں عباسی خلفا کا اثر و رسوخ قائم کرنے کی کوشش کی تو اسے صرف وقتی فتح و کامرانی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے میں خلافت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سندھ میں اور اس سے آگے بڑھ کر شمالی ہند کے ساحلی علاقوں سے متصل چند خود مختار ریاستوں کا وجود عمل میں آیا، جن کے حکمراں عرب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر خلافت بغداد سے ان کا تعلق برائے نام تھا۔ ان حکومتوں کے قیام سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ یہاں سے مسلمانوں کا تعلق منقطع نہ ہو سکا۔ اس لئے 'درہ خیبر' کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہونے والے عجمی فرماں رواؤں کو یہاں

ایک سجاسجایا گلستاں ملا اور ابتدائی لڑائی بھرائی کے بعد جلد ہی انہوں نے یہاں اپنے قدم جمالئے اور اتحاد واتفاق، سماجی لین دین، تعلیم وتدریس، دین ومذہب اور اخلاق ومحبت سے دل چسپی اور عمل آوری کی ایسی فضا قائم ہوگئی کہ جسے دیکھ کر دوسرے لوگ متاثر ہوئے۔

4.12 کلیدی الفاظ

زہدوورع : تقویٰ وپرہیز گاری

جنگ وجدال : لڑائی، معرکہ، مار کٹائی، جھگڑا، فساد

مستفید : فائدہ چاہنے ولا، فائدہ طلب کرنے ولا، فائدہ اٹھانے والا

شغل : کام دھندا، مشغلہ، پیشہ

قریے : قریہ کی جمع: بستی، گاؤں

عساکر : عسکر کی جمع: بہت سے لشکر

4.13 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شمالی ہند کا عہد ابتدائی ہو یا بعد کا زمانہ، اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ مسلمانوں نے سرزمین ہند میں قدم رکھا اوراپنا اقتدار قائم کیا تو یہاں کی مقامی آبادی پر ظلم وجور روا رکھا اور ان کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا۔ جو لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے، وجہ اس کی جو بھی رہی ہو، مگر انہیں مسلمانوں کا خوف تو بالکل نہیں تھا۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ مسلمانوں جنگ یا امن کے دنوں میں منظم طریقے سے اشاعت اسلام کی طرف متوجہ ہوئے ہوں، لیکن ان کے رویے اور اور ان کے اخلاق اور ان کی پیش کش نے اشاعت اسلام کی راہ ہموار ضرور کی۔
- نیز مسلمانوں نے درس وتدریس اور وعظ وارشاد کی جو محفل سجائی اس سے بہت سے قلوب منور ہوئے اور اسلامی علوم وفنون کی آبیاری ہوئی۔ کیا ہمارا یہ مشاہدہ نہیں ہے کہ دنیا میں غیر مسلم آئے دن اسلام قبول کرتے ہیں، کسی ایسے مبلغ اسلام یا جماعت کا نام نہیں ملتا جو ان کے پاس جاکر ان کی ذہن سازی کرتے ہوں۔
- دراصل اسلام میں وہ اسپرٹ موجود ہے جو کسی کو بھی اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے اور اس کے لئے نہ کوئی وقت متعین ہے اور نہ زمانہ۔ اگر مبلغین اسلام کی باضابطہ کوئی جماعت ہوتی، جن کا مرکزی نقطہ قبول اسلام کے لئے ذہن سازی کرنا ہوتا تو ہندوستان ہی کیا پوری دنیا کا نقشہ ہی الگ ہوتا۔ علاقہ سندھ اور اس سے ملحق ہندوستانی علاقوں میں جو اسلام کی ضیاپاشی ہوئی وہ اسلام کی اصل روح، درس

وتدریس کی آبیاری اور مسلمانوں کے عادات واخلاق کی وجہ سے ہوئی۔

4.14 نمونہ امتحانی سوالات

4.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. قاضی ابو محمد منصوری کس مسلک کے امام مانے جاتے تھے؟

(a)داؤدی (b)شافعی (c)مالکی (d)حنفی

2. کتاب 'سدھانت' کس زبان میں تصنیف کی گئی؟

(a)عربی (b)یونانی (c)سنسکرت (d)فارسی

3. 'ارقام ہندیہ' کس فن کے لئے استعمال ہوتا ہے؟

(a)حساب (b)جغرافیہ (c)طب (d)ادب

4. ابن بطوطہ 'سیہون' پہنچے تو یہاں کے خطیب نے کس خلیفہ کا فرمان دکھایا؟

(a)حجاج بن یوسف (b)عمر بن عبد العزیز (c)ولید بن عبد الملک (d) ہارون رشید

5. اس اکائی میں وارد خطہ سندھ کے صوفی کا نام کیا ہے؟

(a)شیخ نظام الدین (b)شیخ ابوتراب (c)شیخ محی الدین (d)شیخ فخر الدین

6. سندھ میں کس فقہی مسلک کے ماننے والے زیادہ پائے جاتے تھے؟

(a)شافعی (b)حنبلی (c)حنفی (d)مالکی

7. امام ابو حفص ربیع اور امام موسیٰ اسرائیل کس کے شاگرد تھے؟

(a)امام ابوحنیفہ (b)امام حسن بصری (c)امام شافعی (d)امام مالک

8. محمد بن قاسم کی ایما پر آخری مسجد کہاں تعمیر ہوئی؟

(a)لاہور (b)ملتان (c)بھیلماران (d)بھکر

9. شہر عیشقان(اسیوان) کن دوشہروں کے درمیان واقع تھا؟

(a)کابل اور ملتا (b)لاہور اور سجستان (c)دیبل اور مکران (d)الور اور تاجکستان

10. راجہ رہمی کہاں کا راجہ تھا؟

(a)بنگال (b) کیرالا (c)تھانہ (d) گجرات

4.14.2 مختصر جوابات کے حامل سولات

1. عربوں کی ہندوستانی علوم سے دل چسپی پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. شہر 'دیبل' کے علما و محدثین پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. کتب صحاح میں وارد ہندوستانی محدثین کا تذکرہ کیجیے۔
4. خلفائے عرب سے ہندوستان کے راجا و مہاراجا اپنی محبت و عقیدت کا دم کس طرح بھرتے تھے؟
5. خطہ سندھ کے معروف صوفی پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

4.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سندھ و ہند میں جو علمی درس گاہیں قائم ہوئیں، اس کے اثرات کا جائزہ پیش کیجیے۔
2. سندھ میں 'علم فقہ' کے فروغ پانی کی وجہ کیا تھی؟
3. عہد ہارون میں مذہب کی صداقت ثابت کرنے لئے جو مناظرہ ہوا تھا، اس کا پس منظر بیان کیجیے۔

4.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	فتوح البلدان (اردو ترجمہ)	:	ابوالحسن علی بلاذری
.2	تاریخ سندھ	:	سید ابوظفر ندوی
.3	عجائب الاسفار (سفر نامہ ابن بطوطہ)	:	ابن بطوطہ
.4	تاریخ فرشتہ	:	ہندوشاہ قاسم فرشتہ
.5	ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	:	قاضی اطہر مبارک پوری
.6	تاریخ سندھ	:	اعجاز الحق قدوسی
.7	خلافت امویہ اور ہندوستان	:	قاضی اطہر مبارک پوری
.8	آئینہ حقیقت نما	:	اکبر شاہ نجیب آبادی
.9	اسلامی ہند کی عظمت رفتہ	:	قاضی اطہر مبارک پوری

اکائی 5: دہلی سلطنت قیام واستحکام

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 دہلی سلطنت کا پس منظر

5.3 ہندوستان میں غوری حکومت

5.4 سلطان معزالدین کے اقدامات

5.4.1 ترائن کی دوسری جنگ

5.5 دہلی سلطنت کا قیام

5.5.1 قطب الدین ایبک کے ابتدائی اقدام

5.5.2 شمس الدین التمش

5.5.3 دہلی سلطنت کے استحکام کی طرف پیش قدمی

5.5.4 غیاث الدین بلبن

5.5.5 بلبن کے انتظامی اقدامات اور حکومت کی تنظیم

5.6 اکتسابی نتائج

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں غوری فرماں رواشہاب الدین غوری کے غلاموں میں سے ایک قطب الدین ایبک نے ایک وسیع اور مضبوط حکومت کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر دہلی سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں پانچ خاندان شامل ہیں جنھوں نے شمالی ہندوستان پر تقریباً تین سو برس سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ اس سے قبل غزنوی حکمرانوں نے ہندوستان پر متعدد حملہ کئے تھے لیکن وہ یہاں ایک مستقل حکومت قائم کرنے میں ناکام رہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی ہندوستان میں مستقل حکومت قائم کرنے کی کوشش بھی نہ کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان ذات پات، چھوا چھوت اور دیگر غیر اخلاقی بیماریوں میں ملوث تھا نیز یہاں کے باشندوں کو حکمرانوں کی طرف سے امن وسکون بھی حاصل نہ تھا۔ ایک ایسے زمانہ میں دیگر قوم کا ہندوستان جیسی عظیم جگہ میں حکومتی انتظام کا قائم کرنا اور اسے مقامی عوام کے ساتھ مل کر اس طرح چلانا کہ عوام اور خواص کو امن وسکون، فرحت وانبساط اور فارغ البالی حاصل ہو نہایت دشوار امر تھا۔ لیکن باوجود اس کے سلاطین غوری جو بعد میں ہندوستانی تاریخ میں سلاطین دہلی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اپنی قابلیت، صلاحیت اور حکومتی وانتظامی معاملات میں اپنے جوہر دکھائے اور اس مخلوط معاشرے میں اپنی ساخ قائم کی اور دیکھتے دیکھتے سلاطین دہلی نے شمالی ہندوستان میں ایک مضبوط ومستحکم حکومت قائم کرلی جس کے زمانہ میں ہندوستان تمدنی ترقیات کا مرکز بن گیا۔ فنون لطیفہ ہو یا شہروں کو آباد کرنا، صنعتوں کا فروغ ہو یا کاشتکاری وآب پاشی کا ہنر، علم وادب کے فروغ کے لئے درسگاہیں کا قیام ہو یا کتابوں کے ذریعہ اسے فروغ دیا گیا ہو، عوام کی اخلاقی تربیت ہو یا سماجی برائیوں کے خاتمہ کی کوششیں ہوں اور ملک کو بہتر دفاعی نظام سے مسلح کرنا ہو، عدالتی انتظام کی سرخ روی ہو، مسافروں کے لئے سرائے خانے وشاہراہیں بنائی گئیں نیز خبر رساں ایجنسیوں کو منظم کیا گیا اور ڈاک کا بہتر نظم قائم ہوا جس سے حکومتی نظم ونسق میں بہتری پیدا ہو۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاحات ونئے تجربات کئے گئے اور ہندوستان کی عظیم تاریخ میں ایک مستحکم اور مضبوط حکومت کہلائی اور اسلامی وہندوستانی تہذیب وتمدن کی تاریخ رقم کردی۔

5.1 مقاصد

اس یونٹ کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اس بات سے واقف ہوں کہ

دہلی سلطنت کے آغاز وارتقا کے اسباب کیا ہیں۔

سلاطین دہلی کی پیش رفت وقیام حکومت میں ان کی پالیسیوں کا تجزیہ کرسکیں۔

آپ کو اس بات سے واقفیت ہوگی کہ دہلی سلطنت قیام واستحکام کے زمانہ میں ہندوستان ترقی کے کن منازل سے ہمکنار ہوا نیز اس کی اہمیت وثمرات کے اثرات کیسے مرتب ہوئے۔

ہندوستان میں قیام حکومت کے دوران قطب الدین ایبک کو کن کن عوامل کا سامنا رہا۔

5.2 دہلی سلطنت کا پس منظر

دہلی سلطنت کے قیام و استحکام کی تاریخ لکھنے سے قبل بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں کا مختصر احوال، دہلی کے احوال نیز سلاطین غور کے حالات بیان کیے جائیں تاکہ دہلی سلطنت کے قیام میں کن عوامل کی شمولیت رہی اس کو سمجھنے میں مدد ملے۔

محمد بن قاسم کے بعد ہندوستان پر محمود غزنوی نے متعدد حملے کئے لیکن وہ یہاں حکومت قائم نہ کر سکے اس کے بعد غوریوں نے اپنے زمانہ میں ہند کی سرزمین پر اپنے قدم جمائے لیکن محمود اور غوریوں کے درمیانی عرصہ میں ہندوستان میں، خاص کر شمالی ہند میں راجپوت سلطنت کا بول بالا تھا۔ راجپوتی نظام حکومت ہندوستان میں ذات پات اور جاگیردارانہ اداروں کو وجود میں لے آئی، جس نے اس خطہ کے سماج کو الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا جس سے ایک مشترکہ شہرت کا احساس ختم ہو گیا اور اسی صورتحال نے ہندوستان میں غوریوں کی کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار آدا کیا۔ (تاریخ ہند، محمد حبیب - خلیق احمد نظامی، ص 201) ایسے ماحول نے ترکوں کے اندر فوجی کاروائیوں کے لئے حوصلہ افزائی کا کام بھی کیا۔

اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی نظام کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ متعدد خود مختار ریاستوں پر مبنی تھا، ہر ریاست خود مختار تھی اور اکثر آپسی رنجش اور جارحانہ اقدامات کی وجہ سے سرحدیں بدلتی رہتی تھیں۔ یہ راجپوت ریاستیں جاگیردارانہ نوعیت کی تھیں، ہر ایک سلطنت شاہی خاندان کے افراد پر مبنی جاگیروں پر مشتمل تھی۔ لیکن انہیں اپنی طرف سے سکہ جاری کرنے کا اختیار نہ تھا لیکن ان راجپوتوں نے دھیرے دھیرے ان مرکزی رجحانات کو مسترد کیا اور ذاتی افواج نیز مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر ان زمینداروں کے تعین نے بادشاہ کی بچی کچی ساکھ کو اور بھی کمزور کر دیا تھا۔ عہد وسطیٰ میں جب ہندوستان میں ترکوں کا داخلہ ہوا اس وقت ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام تاریخ کے سب سے شورش انگیز دور میں داخل ہو چکا تھا اور یہ سیاسی نظام تقسیم در تقسیم میں ضم ہو گیا تھا جس کے تحت بڑے جاگیرداروں کے ماتحت چھوٹے جاگیردار ہوتے تھے جن میں سامنت، ٹھاکر اور راوت وغیرہ شامل تھے۔ یہی وہ عناصر تھے جنہوں نے شمالی ہند کے سیاسی نظام میں اتھل پتھل مچا رکھی تھی اس نظام میں ملک کے اندرون کی انتظامیہ انہی چھوٹے جاگیداروں کے حوالے تھی اور وہ جیسے چاہتے اسے استعمال کرتے تھے، جب دل چاہتا مرکزی حکومت کے خلاف ورزی پر آمادہ ہو جاتے۔

یہ ایک ایسا سیاسی نظام تھا جو ملک کی سماجی نظام کی بنیادی کمزوریوں سے پردہ اٹھاتا تھا ذات پات کا یہ نظام سیاست عہد وسطیٰ کے ایک ایسے سماج کی عکاسی کرتا تھا جس نے شہریت اور حب الوطنی کے جذبات کو مجروح کر دیا تھا جس سے سماج کا تانا بانا اپنے حکمرانوں کی طرف سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اور اسی ماحول نے سماجی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی ابتری پیدا کر دی جو نتائج کے حساب سے تباہ کن ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر بنی پرساد اپنی کتاب "اسٹیٹ ان اینشیئنٹ انڈیا" (قدیم ہندوستان میں ریاست اور حکومت) میں اس نظام کی خامیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے اور اسے سماج کی ترقی و انفرادی عظمت کے منافی قرار دیا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے سماج میں چار ذاتیں پائی جاتی تھیں۔ برہمن، چھتری، ویش، اور شودر۔ سماجی حیثیت سے سب سے اونچا مقام برہمنوں کو حاصل تھا کیوں کہ مذہبی معاملات انہی کی اجارہ داری میں طے پاتے

تھے۔ اور ہندو تعلیمات کے مطابق دنیاوی برائیوں سے نجات کا حق صرف ان برہمن اور چھتریوں کو ہی حاصل تھا۔ چونکہ سماجی درجات میں دوسرا مقام چھتریوں کو حاصل تھا کیونکہ وہ ان برہمنوں کے محافظ اور ساتھ ہی ملک کے نگہبان تھے۔ اسی طرح ویش اور شودر سماج کے نچلے طبقہ سے متعلق تھے ان کی ذمہ داری مویشیوں کی دیکھ ریکھ اور برہمن سماج کے لئے اپنی خدمات کو وقف کرنا تھا۔

ان نامساعد حالات نے ترکوں کو ہندوستان میں اپنی حکومت کی توسیع کا موقع فراہم کیا اور یکے بعد دیگر بادشاہوں نے ہندوستان کے مختلف حصہ پر اپنی حکومت کے قیام کا راستہ نکالا یہاں تک کہ وہ بنارس اور گجرات تک پہنچ گئے ان میں سے زیادہ تر حملہ غزنویوں کے دور میں ہوا جن کے آخری زمانہ میں ہندوستان پر حملہ سلاطین غزنہ کا معمول بن گیا تھا۔ جس کا پورا اثر ہمیں غوریوں کی جنگی کاروائیوں میں نظر آتا ہے جو کہ ایک صدی سے چلی آرہی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کی آخری کڑی ثابت ہوئی اور ہندوستان میں مستقل طور پر اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

5.3 ہندوستان میں غوری حکومت

غور کا علاقہ موجودہ افغانستان کے مغربی مرکزی حصہ میں واقع ہے۔ یہ علاقہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے جن کی بلندی دس ہزار فٹ تک ہے اور یہی وہ راز ہے جس نے غور کو باہری دنیاء سے ہمیشہ تحفظ فراہم کیا۔ غور کا سیاسی اقتدار اپنی جغرافیائی حالات کا مرہون منت تھا جس کی وجہ سے پورا خطہ مختلف حصوں میں منقسم تھا اور ہر قلعہ کا مالک اپنے تابع علاقوں پر بلا شرکت غیر بادشاہ تھا۔ غور عام طور سے ایک زراعتی خطہ تھا جہاں قدرت نے اسے وسائل سے مالا مال کیا تھا یہاں لوہا کافی مقدار میں پایا جاتا تھا لہٰذا یہاں کے لوگ اسلحہ سازی میں بھی بہت مشہور تھے نیز بڑے پیمانے پر اسلحی جات کو غور سے کابل اور پھر شام کے بازاروں میں بیچا جاتا تھا، یہی اس خطہ کو وجود بخشنے کی وجہ تھی اور اکثر بادشاہ اسے اپنی سلطنت کے ماتحت رکھنا چاہتے تھے چنانچہ 1020ء میں سلطان مسعود غزنوی نے یہاں حملہ کیا اور صلح کے طور پر غور کی بنی ہوئی تلواریں اور ڈھال لیں اسی طرح 12 ویں صدی کے اوائل میں سلطان سنجر کو جب خراج کا سامان بھیجا تو اس میں بڑی تعداد اسلحوں کی تھی جس میں خصوصی طور پر زرہ بکتر، آہنی خود اور دیگر جنگی سامان شامل تھے۔

غور میں اسلامی سیاسی اور ثقافتی اثرات کا آغاز محمود غزنوی کے زمانہ میں ہوا۔ محمود نے 1011 میں غور کی مہم کے بعد وہاں معلمین کی تقرری کی تاکہ وہ انہیں دین کی تعلیم دیں۔ چونکہ یہ بات واضح ہے کہ غور کے لوگ کرامی فرقہ کے ماننے والے تھے اور انہیں بدھ مت اور اسلام کے درمیان بیچ کی کڑی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ فرقہ بہت بااثر تھا اور اکثر بادشاہ بھی انہی کرامیوں کی دلجوئی کے لئے اپنا مذہب بدل لیا کرتے تھے۔ اسی تاریخی حقیقت کو ختم کرنے کے لئے سلطان علاء الدین جہاں سوز نے غور کے حدود میں اسمٰعیلی کو دعوت و تبلیغ کی چھوٹ دے دی تھی تاکہ اس کے ذریعہ ان کرامیوں کے اثر و رسوخ کو کم کیا جاسکے۔ لیکن اس کے بیٹے نے باپ کی وفات کے بعد اس کام کو بند کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس خطہ میں حنفی اور شافعی مکتب فکر کی اشاعت ہوئی اور عوام کے ساتھ ساتھ بادشاہ وقت نے بھی اسی مذہب کو اختیار کرنے میں اپنی بھلائی سمجھی۔

ہندوستان میں غوری حکمرانوں کا جد امجد قطب الدین حسن بن محمد بن عباس ہے جس کی حکومت پر غزنوی سلاطین نے قبضہ کرلیا تھااور اس کے بیٹوں میں سے ایک نے ہندوستان کی طرف راہ فرار اختیار کرلی تھی۔اور پھر آگے چل کر اسی نسل میں غیاث الدین اور شہاب الدین غوری جیسے فرماں روا پیدا ہوئے جنہوں نے غوری خاندان کی حکومت میں چار چاند لگادیے۔

5.4 سلطان معزالدین کے اقدامات

سلطان معزالدین (جو کہ شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہے) نے ہندوستان کی جانب پیش قدمی میں پہلی فوجی کاروائی 1175 میں ملتان کے قرامطہ فرقہ کی حکومت کے خلاف کی اس کے بعد اچھ کو اپنی مہم کی آماج گاہ بنایااور اسے مسخر کرتے ہوئے نہر والا تک پہنچ گئے یہاں اس کی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا چونکہ وہ محمود غزنوی کی تاریخ رقم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اس لئے اس نے از سرنو اپنی فوج کو منظم کیا اور پھر پیشاور کو فتح کرتا ہوا لاہور اور اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ شہاب الدین غوری نے 1181 میں لاہور پر قبضہ کرلیا اور پھر 1182 میں دیبل کی طرف کوچ کیا اور سمندر تک کا پورا علاقہ اپنی ماتحتی میں شامل کرلیا۔ معزالدین کے یہ اقدامات ترائن کی جانب پیش قدمی تھی اور اس کے لئے اسے سیالکوٹ کو اپنے گرفت میں لینا ضروری تھا کیونکہ اس کے بعد لاہور سے پیشاور اور دیبل سے سیالکوٹ کا سارا علاقہ معزالدین کی فوجی چھاؤنی کی طرز پر کام کر رہا تھا۔ معزالدین ہندوستان میں راجپوت حکومت پر حملہ آور ہونے سے پہلے سندھ و پنجاب میں اپنی مضبوط حکومت قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ دوران فوج کشی اسے کسی طرح کی پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے لئے معزالدین نے بھٹنڈا کے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور مکمل انتظام کرنے کے بعد وہ ایک وقت مقرر تک آئندہ کی تیاری کے لئے واپسی کا سفر اختیار کیا اور ابھی کچھ ہی دور پہنچا تھا کہ اس کو معلوم ہوا کہ پرتھوی راج سوم نے معزالدین کی فوج کے خلاف پیش قدمی کرنے کے ارادے سے دہلی سے بھٹنڈا کی طرف کوچ کر گیا ہے۔ معزالدین کو مجبوراً واپس آنا پڑا کیونکہ وہ راجپوت حکمرانوں کے خلاف بڑی جنگ کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن چاروناکار اسے جنگ کرنی پڑی نتیجہ شکست کی شکل میں سامنے آیا۔ اس جنگ میں معزالدین کی فوج کے ساتھ ساتھ خود بادشاہ کو بہت سی مصیبتوں سے گزرنا پڑا لیکن وہ اس شکست کو زیادہ دنوں تک اپنے لئے ناامیدی کی وجہ نہیں بننے دے سکتا تھا اس لئے غور پہنچنے کے بعد وہ پرتھوی راج سوم سے دوبارہ جنگ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ اس نے جنگ سے بھاگے ہوئے امیروں کو سخت سے سخت سزا دی اور پھر معاف کردیا تاکہ وہ اس کے ساتھ مل کر اپنے اوپر لگے ہوئے داغ کو مٹا سکیں۔

5.4.1 ترائن کی دوسری جنگ

ترائن کی پہلی جنگ 1191ء میں شکست کے بعد معزالدین سخت غمگین اور شرمسار تھا یہاں تک کہ اس نے کھانا پینا بھی ترک کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس نے ایک عظیم لشکر تیار کرلیا اور اچانک ہندوستان کی طرف رخت سفر باندھا۔ 1192ء میں پرتھوی راج کے خلاف فوج کشی کی۔ جنگ سے قبل ہندوستانی راجاؤں کی طرف سے ایک خط معزالدین کو بھیجا گیا جس میں اپنی تعداد کی دھمکی اور اپنی طاقت کا دھونس دکھایا جس کے جواب میں معزالدین نے انہیں اپنی کمزوری و بے سروسامانی سے آگاہ کیا لیکن اگلی صبح

وہ ان راجپوت افواج پر پل پڑا پچھلی جنگ میں اس کے جو سپاہی جنگ سے منھ موڑ لیا تھا اور وہ سپہ سالاران جنہیں معزالدین نے سزائیں دی تھیں ان لوگوں نے اس بار اپنی جانوں کی بازی لگادی اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان غوریوں کا ہو گیا پر تھوی راج نے راہ فرار اختیار کی لیکن وہ گرفتار ہوئے اور انہیں بعد میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح معزالدین نے اپنی شکست کا بدلہ بھی لے لیا اور ہندوستان میں اپنی حکومت کے قیام کے لئے راستہ بھی ہموار کر دیا۔

5.5 دہلی سلطنت کا قیام

5.5.1 قطب الدین ایبک کے ابتدائی اقدام

ترائن کی کامیابی کے بعد معزالدین نے ہندوستان کے دوسرے خطوں پر بھی چڑھائی کی اور ان کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا جن میں ہانسی، کہرام، سرستی، کول قنوج وغیرہ شامل ہیں۔ ان مہمات میں جس شخص نے سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا تھا اور جس کی بدولت ہندوستان میں ترکوں کی حکومت قائم ہوئی وہ ذات قطب الدین ایبک کی تھی۔

قطب الدین ترکوں کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن میں ہی نیشاپور میں غلاموں کی منڈی میں بیچ دیا گیا اسے قاضی فخر الدین کوفی نے خریدا اور اس کے ساتھ بڑی شفقت کا برتاؤ کیا۔ اپنے بچوں کے ساتھ اس کی تعلیم و تعلم کا انتظام کیا قطب الدین نہایت ذہین و فطین تھا اس نے جلد ہی دماغی و جسمانی فنون میں مہارت حاصل کر لی تیر اندازی، شہسواری اور تلوار بازی میں اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن کسی بنا پر قاضی صاحب کے بچوں نے اسے بیچ دیا اور وہ فروخت ہو کر معزالدین بمعروف معزالدین غوری نے اسے خرید لیا اور یہیں سے قطب الدین کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ معزالدین کی سرپرستی میں قطب الدین کو خوب پھولنے کا موقع ملا وہ فطری طور پر کشادہ دل اور ذہین واقع ہوا تھا لہٰذا چند سالوں میں ہی اس نے معزالدین کے مزاج میں اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور امیر خرد کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ ترائن کی جنگ میں وہ ایک گروہ کا سپہ سالار متعین ہوا اور اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان میں اس کی سیاسی زندگی کا آغاز 1192ء سے ہوتا ہے جب وہ شہاب الدین کی طرف سے مامور ہو کر ہندوستان کی سر زمین میں قدم رنجہ ہوا تھا اور پھر ترائن کی اہم جنگ میں اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ ہم اس کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ (1192ء سے 1206ء تک کا ہے جس میں وہ شمالی ہندوستان میں ایک آفیسر اور انچارج کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دی) دوسرا حصہ (1206ء سے 1208ء تک کا ہے جس میں وہ معزالدین کی ہندوستانی املاک کا غیر رسمی طور پر سپہ سالار رہا جس کا رقبہ اکثر دہلی اور لاہور کے درمیان تھا) اور تیسرا حصہ (1208ء سے 1210ء تک کا ہے جس میں وہ ایک آزاد ہندوستانی سلطنت کا خود مختار حکمراں رہا)۔ شمالی ہندوستان کی فتح میں جس قدر حصہ معزالدین کے عزم کا ہے اسی حد تک حصہ قطب الدین کی وفاداری کا بھی رہا۔ کھکھروں میں معزالدین کی وفات کے بعد جب پوری غوری سلطنت طوائف الملوکی میں ملوث تھی صرف ایبک ہی تھا جس نے شمالی ہندوستان کی معزالدین کی املاک کا نہ صرف محافظ بنا رہا بلکہ اس کی مستقل توسیع میں کامیاب بھی رہا۔ اس کامیابی کے پیچھے اس کے انصاف اور وسعت قلبی کو بڑا دخل ہے۔

قطب الدین ایبک ہندوستان میں معزالدین کا جانشین تھا اور جب بھی بادشاہ معزالدین کو ایبک کی ضرورت محسوس ہوئی ایبک نے لبیک کہا۔ ہندوستان میں معزالدین کی توسیعی فتوحات میں ایبک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں نہر والہ، اجمیر، گجرات، کالنجر، مہوہ اور بدایوں وغیرہ پر قبضہ کر کے اپنا حصہ پیش کیا نیز بنارس کی مہم میں معزالدین کے ہم رکاب رہا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ جس کے نتیجہ میں اسے خلعت ملی اور اعزاز واکرام سے نوازا گیا۔

اپریل 1206 میں معزالدین کی شہادت کے بعد غزنیں میں سلطان محمود بن غیاث الدین تخت کا وارث بنا تو اس نے قطب الدین کو سلطان کا لقب، امارت بادشاہی اور آزادی کا فرمان بھیجا جس کے بعد جون 1206ء میں ایبک نے خود مختاری کا اعلان کر دیا، ایبک نے پہلے دہلی کو اپنی سلطنت کا مرکز بنایا لیکن جلد ہی وہ لاہور منتقل ہو گیا اور اسے اپنا پایہ تخت بنالیا۔ قطب الدین ایبک نے حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے نئے خطوں میں فوجی مہمات کو رواں رکھنے کے بجائے اپنے ماتحت علاقوں پر بہتر انتظام قائم کرنا زیادہ اہم سمجھتا تھا اس لئے ایبک نے اس امور پر اپنی توجہ مبذول رکھی۔ اس طرح دہلی سلطنت کی بنیاد پڑی اور آگے چل کر اس کے جانشینوں نے اسے اپنے وقت کی سب سے مضبوط حکومت میں تبدیل کر دیا۔ دہلی سلطنت کے پہلے بادشاہ کا تعلق ایک غلام خاندان سے تھا اور تاریخ میں اسے مملوک خاندان کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہی خاندان دہلی سلطنت کی بنا ہے جس کے تین اہم بادشاہوں ایبک، التمش اور بلبن نے اس حکومت کی داغ بیل ڈالی اور اسے مستحکم کیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے خلجی، تغلق، سید اور لودھی خاندانوں نے حکومت کی۔ ان کی حکومت تقریباً تیس سو سالوں تک قائم رہی۔

ایبک نے چار سالوں تک حکومت کی اس کی حکومت مختصر مدتی رہی لیکن اس کم مدت میں بھی اس نے اپنے مقبوضات میں بہترین نظم ونسق قائم کر دیا تھا جس میں اس کی دور اندیش ذہن کا خاصہ دخل تھا۔ اس نے کچھ کڑے اقدامات کئے اور اپنے منصفانہ فیصلوں کی وجہ سے ملک میں امن وامان قائم کر دیا۔ ڈاکہ زنی، لوٹ مار کا خاتمہ ہو گیا۔ مظلوموں کی دادرسی اور انصاف کا قیام اپنا فرض منصبی سمجھ کر عمل پیرا رہا۔ اپنی فیاضی کی وجہ سے لکھ بخش مشہور ہو گیا تھا۔ ایبک نے قاضی فخر الدین کوفی کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی تھیں جس کا اثر اس کی زندگی کے مختلف الجہت نظریات میں راسخ العقیدہ رہا۔ مذہب کا بہت احترام اور شریعت کا نفاذ اس کا مطمح نظر تھا اس نے اپنی تخت نشینی کے بعد غیر شرعی وصولی بند کروادی، نیز مسلمانوں کی زندگی کو شرعی نہج پر لانے کی کوشش کی، اتباع سنت کا ماحول بنایا اور ملک میں رائج تمام مشروع بدعتیں بند کرادیں۔

ایبک، جو غیر متوقع طور پر دنیا سے رخصت ہو گیا، نے ظاہری طور پر اپنی بادشاہت کے لئے کوئی وارث مقرر نہیں کیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد امراء سلطنت وارا کین مجلس نے آرام شاہ کو اس کا جانشین منتخب کر دیا۔ لیکن حکومت کے لئے یہ حسن انتخاب زیادہ موزوں نہ تھا اور ہر طرف سے بغاوت کی آوازیں بلند ہونے لگیں ایسے حالات میں آرام شاہ کا فوجی کمانڈر امیر علی اسمٰعیل نے بدایوں کے گورنر التمش کو دعوت سلطنت دی کہ وہ آئے اور دہلی کی حکومت پر قابض ہو جائے۔ التمش کے انتخاب میں ملک کے متعدد امراء وعمائدین کی آراء شامل تھیں باوجود اس کے وہ ایبک کا منہ بولا بیٹا تھا اس میں تمام ذاتی خوبیاں بھی موجود تھیں۔ ایبک نے 1197 میں انہلواڑہ کی فتح کے کچھ عرصہ

بعد التمش کو خرید لیا تھا۔ چنانچہ امرا نے التمش کو آرام شاہ کا جانشین مقرر کیا اور ایبک کی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ آرام شاہ نے تخت پر التمش کے دعوے کو چیلنج کیا لیکن فیصلہ کن شکست ہوئی اور ایک فوجی تصادم کے بعد مارا گیا۔ التمش نے باغی گورنروں کو زیر کیا اور ہندوستان کے اس کمزور اور ناتواں خطہ کو طاقتور دہلی سلطنت میں تبدیل کر دیا۔

5.5.2 شمس الدین التمش

آرام شاہ کے بعد عمائدین دہلی نے التمش کو دہلی سلطنت پر مامور کر دیا۔ التمش ترکوں کے البری قبیلہ کا فرد تھا۔ وہ ایک متمول اور صاحب اقتدار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس کی پرورش اور پرداخت اچھے اور اعلیٰ علمی ماحول میں ہوئی ساتھ ہی وہ ذہانت و فطانت میں طاق تھا جس نے اس کے بھائیوں میں حسد و جلن پیدا کر دی اور انہوں نے التمش کو ایک بازار میں لے جا کر بیچ ڈالا۔ التمش کے بقیہ ایام تاجروں کے رحم و کرم پر گزارنا پڑا۔ اسے دوبارہ بخارا کے بازار میں صدر جہاں کے کسی عزیز کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا۔ یہاں التمش کے جوہر کھلے کیوں کہ یہ ایک شریف خاندان تھا اور التمش کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا گیا۔ اس کے بعد التمش متعدد بار بخارا اور دیگر بازاروں میں تاجروں کے ذریعہ خرید و فروخت کا شکار رہا اور پھر آخر کار بغداد پہنچا جہاں اس نے اپنی زندگی کے چند لمحات شہاب الدین سہر وردی، شیخ واحد الدین کرمانی اور دیگر صوفی بزرگوں کے ساتھ گزارے۔ جس سے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا جس کا اثر التمش کی حکومتی پالیسیوں پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔

التمش جب جمال الدین چست قبا کا غلام بن کر غزنی کے بازار میں لایا گیا تو معز الدین نے اسے ایک ہزار دینار میں خریدنا چاہا لیکن جمال الدین نے کم رقم میں اسے بیچنے سے منع کر دیا جس کے بعد معز الدین نے غزنی کے بازار میں ان غلاموں کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کر دی لہٰذا اسے تین سالوں تک اسی قید و بند کی زندگی گزارنی پڑی اور بالآخر جس قطب الدین ایبک گجرات کی کامیابی کے بعد جب غزنی پہنچا تو اس نے التمش میں جوہر نمایاں دیکھ کر خریدنے کی اجازت طلب کی اجازت ملنے پر اسے دہلی کے بازار میں لا کر خریدا گیا۔ ایبک نے التمش کو جلد ہی سر جاندار کے عہدے پر فائز کر دیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایبک التمش کی غیر معمولی صلاحیت کا معترف تھا اور اس نے جوہر دیکھ کر ہی اسے یہ ذمہ داری سونپی تھی جو کہ کسی نئے غلام کے لئے ایک خواب جیسی تھی۔ ایبک نے اسے یکے بعد دیگرے متعدد عہدوں پر فائز کیا یہاں تک کہ اسے امیر شکار کے عہدے پر معمور کر دیا اور پھر جب گوالیار کی فتح ہوئی تو شہر کا امیر بنا دیا گیا۔ صرف چار سال کی مدت میں التمش نے حکومت کے اہم منصب حاصل کر لئے۔ اس کے بعد اسے باران اور پھر بدایوں کے اقطاع بھی اس کے سپرد کر دئے جو کہ سلطنت دہلی کا سب سے بڑا اقطاع تھا۔ ان اقطاع میں التمش نے بڑے حسن و خوبی کے ساتھ نظم حکومت قائم کیا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہوئے قطب الدین ایبک کے دل میں ایک خاص مقام و درک حاصل کر لیا۔

التمش نے جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت اسے خانہ جنگی اور بیرونی دونوں طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک طرف معزی امراء اور ترکی غلام افسران کی مشکلات تھیں تو دوسری طرف غزنی میں یلدوز، ملتان میں قباچہ اور لکھنوتی میں علی مردان میدان جنگ میں دعوت دے رہے تھے۔ التمش کے لئے ان سے سمجھوتا کرنا دہلی حکومت کے خاتمہ کو دعوت دینا تھا اور دوسری طرف ان

سے نبرد آزماں ہونے کے لئے ایک محتاط اور منظم پروگرام کی ضرورت تھی۔ اسی وقت رنتھمبور اور جالور کے ہندو سرداروں نے دہلی حکومت کی ماتحتی کا طوق اتار پھینکا تھا۔ جس سے ملک کے دیگر علاقوں میں بھی دہلی کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ ایسے حالات میں یلدوز کی جانب سے التمش کو ایک چھتر اور ایک درباش کا تحفہ ملا جو التمش کو یلدوز کی ماتحتی کے علامت کے طور پر بھیجے گئے تھے التمش نے ان تحائف کو بخوشی قبول کر لیا جس سے یلدوز کی طرف سے آنے والی مصیبت کچھ دیر کے لئے ملتوی ہوگئی اسی اثناء میں التمش نے اپنی فوجیں مستحکم کر لیں اور اپنے حریفوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے پوری تیاری میں مصروف ہو گیا۔

5.5.3 دہلی سلطنت کے استحکام کی طرف پیش قدمی

مجموعی طور پر التمش نے 26 سال تک حکومت کی ہے اور اس کے دور حکومت کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے جس سے اس کے طرز حکومت اور دہلی سلطنت کے از سرِ نو قیام و استحکام کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اس کا پہلا دور 1210 تا 1220ء کا ہے جس میں وہ پورے انہماک کے ساتھ اپنے مخالفین سے جنگ میں مصروف رہا۔ دوسرا دور 1221ء تا 1227ء تک کا ہے اس دور میں التمش نے اپنی حکومت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو ہلاکو خاں کے حملوں سے محفوظ کرنے میں خرچ کیا اور تیسرے دور 1228ء تا 1236ء میں وہ دہلی سلطنت کو مستحکم کرنے میں لگا رہا۔ التمش ابھی اپنی تیاریوں میں ہی مصروف تھا کہ خارزمیوں نے یلدوز کو غزنی سے کھدیڑ دیا اور اسے مجبوری میں لاہور کی طرح بھاگنا پڑا، لاہور میں قباچہ کے حکومت تھی یلدوز نے اس کے حکومت پر قبضہ کر لیا یلدوز نے لاہور کے ساتھ ساتھ اپنی سرحد کو پنجاب کے تھانیسر تک بڑھا دیا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب التمش نے یلدوز پر حملہ کرنے کے پلاننگ کو عملی جامہ پہنانا چاہا کیوں کہ اگر وہ ایسا نا کرتا تو بہت ممکن تھا کہ دہلی سلطنت بھی یلدوز کے حملوں سے محفوظ نہ رہتی۔ پنجاب کے تھانیسر کے علاقے سے اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے یلدوز نے التمش کے پاس سے ایک خط بھیجا جس میں اس نے دعوی کیا کہ دہلی سلطنت کا حقیقی جانشین وہ خود ہے التمش نے اس کے جواب میں یلدوز کو یہ پیغام دیا کہ یہ نیا دور ہے غزنی اور غوریوں کے ساتھ کیا ہوا موروثی جانشینی کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور التمش نے اس جواب میں یلدوز کو اس بات کا یقین دلایا کہ التمش آسانی سے دہلی کی حکومت اس کے ماتحتی میں دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بہر حال التمش اور یلدوز کی گفتگو ہوتی رہی اور یلدوز نے التمش نے صلح کی بات کی لیکن یلدوز نے اس کی بات نہ مان کر جنگ کا فیصلہ کیا اور ترائن کے تاریخی میدان میں 1215 اور 16ء میں دونوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں یلدوز شکست کھا گیا اور عصامی نے لکھا ہے کہ یلدوز شکست کھانے کے بعد ہانسی کی طرف بھاگ نکلا لیکن یلدوز کو شکست دینے کے بعد التمش نے لاہور اور پنجاب کے علاقوں کو قباچہ کے سپرد کر دیا تھا۔ قباچہ کے ارادے التمش کی سوچ اور برداشت سے کہیں زیادہ آگے تھے قباچہ اپنے اختیارات کو سرہند تک وسیع کرنے کی کوششیں میں تھا اور دوسری طرف التمش پنجاب کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا اس نے اس سلسلے میں فوری اقدام کا فیصلہ کیا اور 1217ء میں قباچہ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ بادشاہ قباچہ التمش کے فوجی کاروائیوں سے بھاگ نکلا اور دریائے چناب پر منصورہ کے نزدیک اسے دوبارہ جنگ کرنی پڑی جس میں التمش کی فوج نے قباچہ کو ذلت آمیز شکست کا منہ دکھا دیا التمش نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کے حوالے کر دیا۔

جیسا کہ اوپر لکھا ہے کہ التمش کے حکومتی دور کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے اور اس کا دوسرا دور جو 1221 سے 1227 کے درمیان کا ہے اس میں اس نے ہندوستان اور خاص کر اپنی حکومت کو چنگیزی حملوں سے محفوظ رکھا۔ التمش جس وقت وادی سندھ میں چنگیزوں اور دیگر دشمنان سے الجھا ہوا تھا بنگال کے سیاست میں الٹ پھیر چل رہی تھی اور علی مردان کو اس کے افسران نے قتل کر دیا اور اس کے بعد سلطان غیاث الدین کو بنگال کی حکومت پر مامور کیا گیا التمش کے مصروفیات سے فائدہ اٹھا کر غیاث الدین نے اپنے اختیارات بہار تک وسیع کر لیے اور اس نے جاج نگر، تربت، بنگ اور کامروپ کی ریاستوں سے مال گزاری وصول کئے۔ سندھ سے فرصت حاصل کرنے کے بعد التمش نے مشرقی علاقوں کی طرف توجہ کی اور اس نے دریائے گنگا کے جنوب میں بہار کے تمام ضلعوں پر قبضہ کر لیا اور وہاں اپنے گورنر کی تقرری کر دی اور اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے بعد 1225 میں گنگا کے کنارے آگے بڑھنے لگا اسی اثناء میں غیاث الدین اپنی راجدانی سے التمش کے پیش قدمی روکنے کی غرض سے روانہ ہوا لیکن بالاخر اس نے مطیع ہو جانے کا فیصلہ کیا اس نے دہلی کی فرمانروائی کو تسلیم کرتے ہوئے ایک کثیر زر تاوان ادا کیا۔

التمش نے بہار پر ملک جانی کو گورنر مقرر کیا تھا لیکن اس کے واپسی کے فوراً بعد ہی غیاث الدین نے پھر سے بغاوت کا علم بلند کر دیا اور گورنر بہار کو بے دخل کر کے ایک آزاد اور خود مختار کی حیثیت حاصل کر لی۔ التمش نے فوراً انتقامی کاروائی نہ کی بلکہ اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کو جو اس وقت لکھناوتی کا گورنر تھا مشرقی حالات کا جائزہ لیتے رہنے اور مناسب وقت پر حملہ کرنے کے لیے تیاری کا مشورہ دیا التمش کے جوابی کاروائی میں تاخیر نے غیاث الدین کو غلط فہمی کا شکار بنا دیا اور جیسے ہی غیاث الدین نے مشرق کی طرف پیش قدمی کی ناصر الدین محمود نے فوراً اس کے دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا اور غیاث الدین کو اپنی راجدھانی کی حفاظت کے لیے واپس لوٹنا پڑا لیکن اسے اس جنگ میں شکست ہوئی اور ہار کا سامنا کرنا پڑا۔

التمش نے 1210 سے 1228 کے درمیان اپنی حکومتیں اور ملکی نظم و نسق کو اس بہتر انداز سے انجام دیا تھا کہ 1229 میں خلیفہ بغداد کی طرف سے خلعت عطاء کی گئی اگرچہ یہ اعزاز محض ایک رسمی نوعیت کا تھا پھر بھی التمش کی ایک طویل المدت آرزو کی تکمیل تھی ساتھ ہی ایک مسلم حقیقت کی تصدیق بھی تھی کہ سلطنت دہلی بحیثیت ایک آزاد مملکت ہے اور یہ التمش کے لیے ایک کامیابی تھی کہ اب وہ معزالدین کے ہندوستانی ورثے کا تنہا مالک تھا جو مجموعی طور پر دہلی حکومت کے اقتدار کو مستحکم اور منظم بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

التمش نے اپنی تخت نشینی کے بعد جالوار پر لشکر کشی تاج الدین یلدوز سے جنگ کی معزالدین قباچہ کے ساتھ معرکے خوارزم شاہ کے ساتھ معرکے اور پھر لکھناوتی اور بہار پر لشکر کشی اس کے بعد رنتھنبور کی فتح، فتح گوالیار وغیرہ جیسے بڑے کارنامے انجام دیے تھے اور وہ اس ہندوستان کے ان ممتاز ترین حکمرانوں میں سے ایک تھا جو ایک صاحب رائے، محتاط دور اندیش سیاست داں تھے اس نے ہندوستانی تاریخ کے صفحات پر ایک مستقل نشان چھوڑا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی خود مختاری کا آغاز اگر بجا طور پر کہا جائے تو اسی کے زمانے سے ہوتا ہے یہ التمش ہی تھا جس نے ملک کو ایک راجدھانی ایک آزاد ریاست ایک شاہی حکومت اور ایک حکمران طبقہ دیا۔ اپنی بے تکان طاقت و قوت اور اپنے محتاط طریقے پر منتخب مقاصد کی انجام دہی کے بنا پر اس نے ہندوستان میں غوری املاک کے غیر مرتب اور پیوند لگے ٹکڑوں کو بہتر طریقے

پر مربوط کیا اور انہیں ایک مستحکم ریاست سلطنت دہلی میں تبدیل کر دیا۔

التمش نے 26 سالہ سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کے بعد جب اپنی موت کے وقت انکھیں بند کیں تو اس وقت سلطنت دہلی اپنے صاف اور واضح حدود کے ساتھ نمودار ہو چکی تھی ایک شاہی خاندان مستحکم طور پر قائم ہو چکا تھا اور موروثی جانشینی کے اصول نے عوام کے سیاسی شعور اور حکمران طبقے میں ایسے گہری جڑیں پکڑلی تھی کہ اس کی موت کے بعد 30 سالوں تک یہی تصور رہا تھا کہ صرف اس کے ورثاہی تخت پر بیٹھنے کے حقدار تھے۔

التمش عہد وسطیٰ کے شہر دہلی کا حقیقی معمار تھا جو چند وقفوں کو چھوڑ کر 1857 تک برابر اہل وسطیٰ کی سیاست کا مرکز بنا رہا اس شہر کے مینار، مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں اور تالاب اس کے دور حکومت میں اپنے عروج پر پہنچ گئے اور اس نے ایک ایسا ثقافتی اور تمدنی ماحول بنایا جس نے مسلمانوں کے جوہر صلاحیت کو جو عجم کے ابتر حالات کی بنا پر منتشر اور پست ہو چکی تھی اپنی طرف مائل کر کے جذب کر لیا۔

اس نے دہلی میں لوگوں کو دنیا کے مختلف گوشوں سے اکٹھا کیا یہ شہر عطیات کی بڑی تعداد اور متقی بادشاہ کی بے پایاں فیاضیوں کے باعث دنیا کے مختلف گوشوں کے تعلیم یافتہ معالج اور بہترین اشخاص کی ایک پناہ گاہ اور آرام کی جگہ بن گیا اور ان لوگوں نے جو خدا کے رحم و کرم سے ان مصائب ومشکلات سے جن سے عجم کے شہر اور صوبے دوچار تھے نیز غیر مسلم منگولوں کے حملے کی وجہ سے پیدا ہونے والی آفات سے بچ نکلے تھے انہوں نے اس خود مختار راجدھانی کو اپنا ٹھکانہ جائے پناہ آرام کی جگہ اور تحفظ کا مقام بنایا۔

التمش نے حقیقت میں دہلی کو محض ہندوستان میں ترکی مملکت کا ایک سیاسی اور انتظامی مرکز ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے ثقافتی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بھی تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ سلطان کے زمانے کے تصنیفات میں کبھی بھی دہلی کا حوالہ صرف اس کے نام سے نہیں دیا گیا بلکہ اسے یا تو حضرت دہلی یا شہر کہہ کر پکارا گیا۔

سلطنت دہلی کے بانی کی حیثیت سے التمش نے انتظامی اداروں کے ارتقا میں ٹھوس کام انجام دیے مرکزی ایشیائی سیاست میں مستقل دخل اندازیوں کے باعث معزالدین کو ہندوستان میں ایک نہایت مناسب نظام حکومت کے تشکیل کا موقع نہ مل سکا جبکہ ایک آزاد و حکمراں کی حیثیت سے قطب الدین ایبک کی مدت حکومت اتنی مختصر تھی کہ حکومت کی مشنری چلانے کے لیے وقتی انتظامات سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ التمش نے سلطنت دہلی کے حکومتی ڈھانچے کو ایک شکل دی اور مواد مہیا کیا اس نے اقطاع، فوج اور سکوں کا انتظام کیا جو تینوں ہی سلطنت دہلی کے نظام شہنشاہی کے اہم عضویات تھے۔

التمش کو بہت سے ادھورے کام اپنے آقا سے ورثے میں ملے تھے اس نے ان تمام انتظامی تعمیراتی اور سیاسی کاموں کو نہ صرف مکمل کیا بلکہ خود اپنی پالیسیاں بھی بنائیں۔ اس کی حقیقت پسندانہ تشخیص، محتاط منصوبہ بندی اور چوتھائی صدی تک اپنی حکومتی نظم و نسق کی راہ میں پیدا ہونے والے تمام حالات سے دانشمندانہ طور پر نمٹنے کی صلاحیت اس کی کامیابی کی ضامن بنی۔ چنگیز خان اور جلال الدین منکبرنی کے ساتھ وہ جس طرح نمٹا وہ اس کی انتہائی سیاسی شعور اور قابل تعریف سفارتی مہارت کا مظہر ہیں۔ ایبک نے سلطنت دہلی کا محض ایک خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا تھا التمش نے اس خاکہ کو انفرادیت، بلند درجہ اور قوت ارادی عطا کی اور اس کی رہنمائی کی اور اس کے لیے ایک نظامی

حکومت اور حکمران طبقہ تیار کیا۔

التمش کو لگاتار جنگوں اور اسفار نے اس کے جسمانی صحت کو متاثر کر دیا تھا آخر کار وہ جلد بیمار پڑ گیا اور اس کی بیماری نے طول پکڑا یہاں تک کہ التمش بستر مرگ پر لیٹ گیا۔ اس کی حالت دن بدن اور خراب ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ 20 شعبان 633 ہجری بمطابق 1236ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

التمش کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہوں نے حکومت کی جو اس کے خاندان سے متعلق تھے ان کا دور حکومت 1236ء سے 1265ء تک کے زمانے پر محیط ہے ان بادشاہوں میں رکن الدین فیروز شاہ، رضیہ سلطانہ، معزالدین بہرام، علاؤالدین مسعود، اور ناصر الدین محمود شاہ وغیرہ شامل ہیں۔

5.5.4 غیاث الدین بلبن

ناصر الدین محمود شاہ کے زمانے میں الغ خان جو کہ غیاث الدین بلبن کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے نے بہت اثر ورسوخ حاصل کر لیے تھے اس نے ناصر الدین محمود کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ شاہی چھتر اس کے حوالے کر دے اور اس عہدے کو حاصل کرنے کے لیے اس نے تمام درباریوں کے سامنے ملک قطب الدین غوری کو قتل کرا دیا۔ دراصل یہ حکومت سے متعلق لوگوں کو اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کے مقاصد بہت واضح اور صاف ہیں اور اس میں کسی کی دخل اندازی موت کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہ بات نہ صرف سیاست دانوں تک ہی محدود تھی بلکہ اس وقت کے علماء اور صوفیا بھی اس بات سے بہت حد تک واقفیت رکھتے تھے۔ اسی ضمن میں سلطان ناصر الدین محمود کے قتل کا سامان کیا گیا عہد وسطی کی متعدد تاریخی کتب سے یہ بات معلوم پڑتی ہے کہ ناصر الدین محمود کو غیاث الدین بلبن کے لوگوں نے زہر دے کر مار دیا تھا اور یہ بات دہلی شہر کے تمام امراء اور عوام میں مشہور تھی لیکن اس کے باوجود بھی بلبن کی سختی، اس کی حکمت عملی اور اس کے سیاسی اور مدبرانہ انتظام نے عوام کے زبان پر تالہ لگا رکھا تھا۔

ہندوستان میں دہلی سلطنت کے قیام کو مضبوط و مستحکم بنانے میں غیاث الدین بلبن کا اہم کردار رہا ہے اس نے سلطنت کے حصول کے لیے جو اقدامات کیے چاہے وہ غلط اور نازیبا رہے ہوں لیکن ناصر الدین محمود کی کمزور پالیسیوں نے ہی الغ خان بمعروف غیاث الدین بلبن کو وہ مواقع فراہم کیے جس سے اس کے دل میں سلطان بننے کی چاہت اور مضبوط ہو گئی۔ بلبن نے عباسی حکمرانوں ابو عباس السفاح اور ابو جعفر منصور کے نقش قدم پر چلتے ہوئے التمش کے خاندان کے بقیہ شہزادوں اور دیگر افراد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرا دیا تاکہ اس کی تخت نشینی میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے اور اس طرح الغ خان غیاث الدین بلبن کے خطاب کے ساتھ 1266ء میں مسند نشیں ہو گیا۔

اپنی تخت نشینی کے بعد بلبن کو بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑا، اس میں نظم وضبط کو بہتر بنانا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ناصر الدین محمود کے دور میں مملکت کے نائب کی حیثیت سے امن وامان قائم کرنے کی اس کی کوشش غیر مرتب انداز میں قتل وغارت گری کے ذریعے کی گئی تھی۔ لہذا وہ اس بات کو بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ پرسکون فضا قائم کرنے کے لیے ایک مستحکم اور منظم اصول کا انتظام اور اس کے نفاذ

کے لیے عسکری اور پولیس کے عملے کا تعین ضروری ہے مگر بلبن کے لیے ان امور کی انجام دہی میں کبھی منگولوں کا حملہ یا پھر کسی صوبے کی بغاوتیں مانع رہیں۔

نظم و ضبط کے اعتبار سے بلبن کے لیے چار علاقے مشکلات کا باعث تھے جس میں مضافات دہلی، دوآب، تجارتی راستے جن میں اودھ کا راستہ سب سے زیادہ پر خطر تھا اور روہیل کھنڈ کے باغی۔ بلبن کے سامنے اپنی حکومت انتظامات کو بہتر کرنے کے لیے سب سے پہلا ہدف اطراف دہلی کے جنگلوں کی کٹائی اور وہاں بسے ہوئے لوگوں کا خاتمہ تھا اس نے اپنی بادشاہت کے پہلے سال میں شہر سے باہر نکل کر فوجی خیمے نصب کیے اور میو نسل کے خاتمے کو اہم ترین ریاستی مہم قرار دیا۔ التمش کی جانشینوں کی نااہلی اور سلطان ناصر الدین محمود کی کمزوریوں کے باعث دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں میو نسل کو کافی طاقت حاصل ہو گئی تھی، ان کی تعداد میں بھی مزید اضافہ ہو گیا تھا اور وہ لوگ رات کے اندھیرے میں دہلی شہر کے اندر گھس کر لوگوں کو لوٹتے اور حراساں کرتے تھے دہلی کے عوام میں خوف وہراس اور نا امیدی پیدا ہو چکی تھی، ان لوگوں نے دہلی کے قرب و جوار کے تمام مسافر خانوں کو بھی لوٹ لیا تھا۔ بلبن نے ان لوگوں سے نپٹنے کے لیے گوپال گیر میں ایک قلعہ بنایا اور بہت سی فوجی چھاؤنیاں قائم کی اور ان علاقوں کو افغانوں کے حوالے کر دیا۔ ان علاقے میں آراضی کو جو اخراجات پورے کرنے کے لیے دی گئی تھی ٹیکس سے بری کر دیا گیا۔

اسی طرح بلبن کے حکم سے دوآب شہر اور اس کے اقطاع ایسے لوگوں کے حوالے کر دیے گئے جو بڑی بڑی فوجوں کے سربراہ تھے اور انہیں یہ حکم تھا کہ شر پسندوں کا خاتمہ کر کے جنگلات کی صفائی کرادی جائے اور مال واسباب پر قبضہ کر کے سرکاری خزانہ میں داخل کر دیا جائے۔ اس کے بعد بلبن نے اودھ کے راستے پر کیے جانے والے ڈاکہ زنی ولوٹ مار کو روکنے کے لیے خود شہر دہلی سے باہر آیا اور پانچ چھ ماہ کے قیام کے دوران تمام رہزنوں اور باغیوں کو تہ تیغ کر دیا جس سے دہلی سے اودھ جانے میں کسی تجارتی قافلے کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا۔

اودھ کے راستے کو مکمل گزرگاہ بن جانے کے بعد بلبن روہیل کھنڈ کے باغیوں کی طرف متوجہ ہوا اس وقت تک باغیوں نے اپنی طاقت کو بہت بڑا لیا تھا وہ لوگ گاؤں میں گھس کر لوٹ مار کرتے اور عوام کو نقصان پہنچاتے تھے ان کی طاقت کے زور کی وجہ سے بدایوں اور امروہہ کے افتادار بھی کچھ نہ کر سکتے تھے اس لیے بلبن نے وہاں کا رخ کیا اور چند دن قیام کر کے شر پسندوں سے ان علاقوں کو محفوظ کرایا شر پسند عناصروں کو قتل اور پھر قید میں ڈال دیا گیا ان تمام مسائل کا خاتمہ کرنے کے بعد بلبن جب دہلی واپس ایا تو اس کے سامنے حکومت کی توسیع اور استحکام حکومت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا اس نے حکومت کو مستحکم کرنے پر اپنی توجہ مبذول رکھی۔

بلبن نے حکومتی انتظام کو چلانے کے لیے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے ان نظریات کو نظریہ بادشاہی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بلبن نے اپنے دربار کو ایرانی طرز پر منظم کیا تھا جس میں بادشاہ کی حیثیت مثل زمین پر خدا کے نائب کی تھی۔ استحکام حکومت کے لیے فوج کی تنظیم کی اشد ضرورت تھی اس لیے بلبن نے فوج کی تعداد میں اضافہ کیا تنخواہوں میں بھی گراں قدر اضافے ہوئے نیز انہی جاگیریں واقطاع دیے گئے۔ فوج کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے فوج کی ورزش پر زور دیا گیا۔ فوج کی نگرانی کے لیے نہایت ایماندار اور

مخلص لوگوں کو متعین کیا گیا۔

5.5.5 بلبن کے انتظامی اقدامات اور حکومت کی تنظیم

عہد وسطیٰ کی متعدد حکومتوں کی طرح بلبن کی حکومت نیم دیوانی اور نیم فوجی تھی اور یہ وقت کے تقاضے کی وجہ سے تھا۔ بلبن کی تخت نشینی کے وقت دہلی اتھل پتھل کا شکار تھی، انتظامی حالات بگڑے ہوئے تھے بلبن نے ایسے حالات کا بہتر انداز میں مقابلہ کیا اور تمام اہل عہدیداروں و حکام کو اپنا مطیع بنالیا۔ بلبن نے اپنی حکومت میں انتظامی معاملات، نظم وضبط کا ایسا منظم انداز اختیار کیا کہ تمام انتشاری رجحانات ختم ہو گئے جو سیاسی طور پر پورے ملک میں چھائے ہوئے تھے۔ اس نے سیاسی اختیارات کی مرکزیت کو دوبارہ زندہ کر دیا اور وہ خود بیشتر سرکاری تقرریوں میں شامل ہوتا اور معمولی سے معمولی تقرری بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے حکومتی نظام کو مستحکم بنانے کے لیے سرحدی صوبوں ملتان اور لکھناوتی میں اپنے فرزندوں کو معمور کیا تاکہ کسی گورنر یا امیر کو اس بات کا موقع فراہم نہ کیا جائے جہاں وہ مملکت کے کسی زور اثر علاقے میں اپنی حالت مستحکم کر سکے۔

بلبن کبھی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی ایک افسر یا امیر کے پاس بہت سے اختیارات جمع ہو جائیں اس لیے اس نے وزیر مملکت سے عسکری اور مالی اختیارات لے کر اس کی اہمیت کم کر دی جس سے حکومت کے اقتدار کے غصب ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ بلبن نے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی طرح حکومتی انتظام کو بہتر بنانے کے لیے جاسوسی نظام کی بنیاد ڈالی۔ جاسوس اس کو ملک کے ہر معاملات سے باخبر رکھتے تھے جس سے حکومتی امور کی انجام دہی میں آسانی پیدا ہوئی اس نے مخبر افسروں کی تقرری میں خاص توجہ دکھائی۔ اس عہدے کی تقرری میں اس شخص کا کردار، حسب و نسب، اخلاق و معاملات، دیانتداری وغیرہ کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

بلبن نے اپنی حکومت کو از سر نو مضبوط و مستحکم کر لیا تھا اور اب وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں تھا اپنے بڑے بیٹے سلطان محمد کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن اس کی موت نے بلبن کو بہت کمزور بنا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ محمد کی موت کے بعد بادشاہت اس کے خاندان میں باقی نہیں رہ سکتی کیونکہ بغرا خان میں وہ صلاحیتیں نہ تھیں کہ وہ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکے اور اس کے پوتے کیخسرو اور کیقباد بچے اور ناتجربہ کار تھے۔ بلبن نے اپنے بڑے بیٹے سلطان محمد کے بیٹے کے کیخسرو کو اپنا جانشین منتخب کیا لیکن کوتوالوں اور امرائے سلطنت نے کیخسرو کے بجائے محمود بغرا خان کے بیٹے کیقباد کو معزالدین کے خطاب کے ساتھ تخت نشین کر دیا۔

5.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- سلطنت دہلی کے بانی کی حیثیت سے التمش نے انتظامی اداروں کے ارتقا میں ٹھوس کام انجام دیے مرکزی ایشیائی سیاست میں مستقل دخل اندازیوں کے باعث معزالدین کو ہندوستان میں ایک نہایت مناسب نظام حکومت کے تشکیل کا موقع نہ مل سکا جبکہ ایک آزاد و حکمراں کی حیثیت سے قطب الدین ایبک کی مدت حکومت اتنی مختصر تھی کہ حکومت کی مشنری چلانے کے لیے وقت

انتظامات سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ التمش نے سلطنت دہلی کے حکومتی ڈھانچے کو ایک شکل دی اور مواد مہیا کیا اس نے اقطاع، فوج اور سکوں کا انتظام کیا جو تینوں ہی سلطنت دہلی کے نظام شہنشاہی کے اہم عضویات تھے۔

- ہندوستان میں دہلی سلطنت کے قیام کو مضبوط و مستحکم بنانے میں غیاث الدین بلبن کا اہم کردار رہا ہے اس نے سلطنت کے حصول کے لیے جو اقدامات کیے چاہے وہ غلط اور ناز یبا رہے ہوں لیکن ناصر الدین محمود کی کمزور پالیسیوں نے ہی الغ خان بمعروف غیاث الدین بلبن کو وہ مواقع فراہم کیے جس سے اس کے دل میں سلطان بننے کی چاہت اور مضبوط ہو گئی۔

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. شہاب الدین غوری کا اصل نام بتایئے؟

(a). معزالدین (b). غیاث الدین (c). عزیزالدین (d). کریم الدین

2. مشہور مورخ ضیاءالدین برنی کس حکومت سے متعلق تھے؟

(a). مغل (b). بہمنی (c). دہلی (d). اودھی

3. التمش کا دور حکومت بتایئے؟

(a). 1210 تا 1228 (b). 1208 تا 1230 (c). 1210 تا 1236 (d). 1210 تا 1226

4. قطب مینار کس نے تعمیر کرایا؟

(a). ایبک (b). معزالدین (c). التمش (d). بلبن

5. التمش کس ترکی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا؟

(a). البری قبیلہ (b). اغوز قبیلہ (c). ضحاک قبیلہ (d). خلجی قبیلہ

6. ترائن کی دوسری جنگ کس سن عیسوی میں ہوئی؟

(a). 1191ء (b). 1193ء (c). 1192ء (d). 1190ء

7. معزالدین نے ترائن کی جنگ میں کس راجپوت راجہ کو شکست دی تھی؟

(a). پرتھوی راج سوم (b). پرتھوی راج دوم (c). پرتھوی راج اول (d). راجہ داہر

8. دہلی حکومت کے قیام میں ایک خاتون سلطان نے حکومت کی اس کا نام بتایئے؟

(a) ملکہ زبیدہ (b) شجرۃ الدر (c) رضیہ سلطانہ (d) سلطان جہاں

9. امیر آخور کس عہدے کے لئے مستعمل تھا؟

(a). شاہی اصطبل کا داروغہ (b). امیر الامراء (c). سپہ سالار (d). خزانچی

10. غیاث الدین بلبن کا دور حکومت کب سے کب تک رہا۔

(a).1265 تا1278 (b).1256 تا1287 (c).1266 تا1287 (d).1287 تا1297

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. دہلی سلطنت کے قیام سے پہلے ہندوستان کی سیاسی حالات کا جائزہ لیجیے۔
2. غوری حکومت کے ہندوستان میں ابتدائی اقدامات پر روشنی ڈالیے۔
3. معزالدین غوری کی مہمات کا خاکہ پیش کیجیے۔
4. سلطان قطب الدین ایبک کے حالات بیان کیجیے۔
5. ترائن کی جنگ پر نوٹ لکھیے۔

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں دہلی سلطنت کے قیام میں قطب الدین ایبک کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
2. قیام سلطنت واستحکام میں التمش کے کردار سے بحث کیجیے۔
3. دہلی سلطنت کو استحکام بخشنے میں غیاث الدین بلبن کی خدمات کا تعارف کرائیے۔

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. جامع تاریخ ہند : محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی
2. تاریخ فرشتہ حصہ اول : محمد قاسم فرشتہ ترجمہ عبدالحیٔ خواجہ
3. عہد قسطیٰ کا ہندوستان : ستیش چندر، ترجمہ عزیزالدین حسین
4. آب کوثر : شیخ محمد اکرام، فرید بک ڈپو
5. بزم مملوکیہ : سید صباح الدین عبدالرحمٰن، شبلی اکیڈمی۔
6. مختصر تاریخ ہند : سید ابو ظفر ندوی، شبلی اکیڈمی۔

اکائی 6: دہلی سلطنت (خاندان حکومتیں-1)

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 خلجی خاندان (1290-1320ء)

6.2.1 سلطان جلال الدین خلجی

6.2.2 سلطان علاء الدین خلجی

6.2.3 خلجی خاندان کا خاتمہ

6.3 تغلق خاندان (1320-1413ء)

6.3.1 غیاث الدین تغلق

6.3.2 محمد شاہ تغلق

6.3.3 فیروز شاہ تغلق

6.3.4 تغلق خاندان کا خاتمہ

6.4 اکتسابی نتائج

6.5 نمونہ امتحانی سوالات

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

ہندوستان میں پہلی باضابطہ مسلم حکومت ''دہلی سلطنت'' کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ 1206ء میں اس کی بنیاد پڑی اور خاتمہ 1526ء میں ہوا۔ اس حکومت میں مختلف خاندانوں کی حکمرانی رہی جن میں 'خاندان غلاماں' (1206-1290ء)، 'خلجی خاندان' (1290-1320ء)، 'تغلق خاندان' (1320-1413ء)، 'سید خاندان' (1414-1451ء)، اور 'لودھی خاندان' (1451-1526ء) شامل ہیں۔ اس حکومت کو ''دہلی سلطنت'' اس لئے کہتے ہیں کہ ان خاندانوں کا پایہ تخت اکثر اوقات میں 'دہلی' رہی، اور دہلی کو مرکز حکومت بنا کر ان خاندانوں نے حکومت کی۔ اِس اکائی کے مطالعہ سے پہلے آپ نے دہلی سلطنت کے قیام واستحکام کے حالات پڑھ چکے ہیں، جس میں خاندان غلاماں کا تذکرہ آچکا ہے۔ اب اِس اکائی میں آپ خلجی اور تغلق خاندان کے حکمرانوں کے حالات کے ساتھ ساتھ اس دور کے تہذیبی، ثقافتی، تعلیمی اور مذہبی حالات کا مختصر تذکرہ بھی آپ کے مطالعہ میں آئے گے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد دہلی سلطنت میں حکومت کرنے والے دو خاندانوں خلجی اور تغلق کے اہم حکمرانوں کے دور کا مطالعہ کرنا ہے۔ ان کے ذاتی احوال کے ساتھ ساتھ ان کے طرز حکمرانی سے بھی آگاہ ہونا اس اکائی کا ایک مقصد ہے۔ پھر اس دور کے تعلیمی ومذہبی اور فلاحی سرگرمیوں سے واقف ہونا بھی اس اکائی کے مطالعہ کے پیش نظر ہے۔

6.2 خلجی خاندان (1290-1320ء)

خاندان غلاماں کے بعد خلجی خاندان نے تخت حکومت سنبھالا۔ خاندان غلاماں کا آخری حکمراں معزالدین کیقباد تھا جو غیاث الدین بلبن (1266-1286) کا پوتا تھا۔ وہ جہاں ایک جانب بڑا سخی اور کریم بادشاہ تھا وہیں عیاشی اور شراب نوشی کا بھی بڑا دلدادہ تھا، اور یہی چیز اس کے خاتمہ کا سبب بنی۔ اس دور کے بااثر امراء نے اس کا خاتمہ کر کے نائب السلطنت امیر ملک جلال الدین فیروز خلجی کو تخت حکومت پر متمکن کر دیا۔ اس طرح 1290ء میں خاندان غلاماں کی حکومت کا خاتمہ اور خلجی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اس خاندان میں 1320ء تک حکومت رہی۔

6.2.1 سلطان جلال الدین خلجی

شائستہ خان جلال الدین فیروز خلجی تخت نشین ہونے سے پہلے پنجاب کا گورنر تھا۔ ستر سال کی عمر میں 688ھ مطابق 1290ء میں دہلی کے متصل علاقہ کیلوگڑھی میں معزالدین کیقباد کے نامکمل محل میں بادشاہ بنایا گیا۔ ابتداءًیہی مقام جلال الدین خلجی کا پایہ تخت رہا۔ عام طور پر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ جلال الدین خلجی نے اس مقام کو اپنا پایہ تخت اس لئے بنایا تھا کہ اسے اپنی جان کا خطرہ تھا، لیکن اس بابت ایک دوسری رائے بھی ہے جو زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ یہ دراصل ایک سیاسی چال تھی۔ جلال الدین خلجی اپنی جان کی امان کے ساتھ

ساتھ لوگوں کا اعتماد بھی حاصل کرنا چاہتا تھا، اس کے علاوہ دہلی میں حریف امراء وحکام کو بھی رام کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ وہ دہلی سے دور رہ کر اپنی رحم دلی، انصاف پسندی اور مصالحانہ مزاج سے بہت جلد اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ البتہ جب سلطان کی اس صفت رحم دلی کی شہرت عام ہوئی تو اس سے مملکت کے چور اور ڈاکوؤں کو بڑی ہمت ملی، اور انہوں نے چوری اور ڈاکوں کا بازار گرم کر دیا۔ جب وہ پکڑے جاتے تو سلطان انہیں وعظ ونصیحت کرتا، چوری اور ڈاکہ کی شناعت وقباحت بیان کرتا اور پھر انہیں توبہ کرا کر آزاد کر دیتا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد وہ لوگ پھر سے انہی کاموں میں لگ جاتے تھے۔

اس زمانہ میں جو اہم واقعات پیش آئے ان میں درویش "سیدی مولہ" کا قتل ہے۔ سیدی مولہ، شیخ فرید الدین گنج شکر کے مریدین میں سے تھے، اور انہیں کی اجازت سے دہلی میں مقیم ہو کر لوگوں کی اصلاح وتربیت کرتے تھے۔ ان کے مریدین اور معتقدین میں خاندان غلاماں کے کئی اہم امراء کے علاوہ سلطان جلال الدین خلجی کا بڑا صاحبزادہ خان خاناں بھی شامل تھا۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ یہ لوگ تاج وتخت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ یہ بات سلطان تک بھی پہنچی۔ اس نے سیدی مولہ اور اس کے مریدین کو بلا کر بازپرس کیا، لیکن ان کی صفائی دینے سے سلطان کو اطمینان نہیں ہوا، اور نتیجہ کار کے طور پر مریدین میں سے بہتوں کو سزاؤں سے دوچار ہونا پڑا، کچھ کو شہر بدر کر دیا گیا اور سیدی مولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس زمانہ میں 691ھ مطابق 1293ء میں منگول ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ پنجاب کے علاقہ میں حملہ آور ہوئے تھے۔ سلطان نے بھاری فوج اور توپ خانوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ صلح پر ختم ہوا۔ ان کی بڑی تعداد مسلمان ہو گئی۔ سلطان نے مہربانی کرتے ہوئے ان کے ایک سردار الغو خان جو چنگیز خان کا نواسہ یا پوتا تھا کا نکاح اپنی بیٹی سے کر دیا۔ عنایت پور یا غیاث پورہ نامی مقام ان کے مسکن کے طور پر مقرر ہوا تھا۔ بعد میں یہ جگہ مغل پورہ کہی جانے لگی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اب حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار ہے۔ مغلوں کو نو مسلم کے طور پر جانا جانے لگا تھا۔

اگست 1290ء میں سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجہ ملک چھجو کی بغاوت جلال الدین خلجی کے دور کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جلال الدین خلجی جب سلطان ہوا تو ملک چھجو کٹرہ مانک پور کی جاگیر میں چلا گیا تھا، وہیں اس نے بعض امراء کے تعاون سے جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنایا، لیکن بغاوت کی آگ پورے طور پر بھڑکنے سے پہلے ہی اسے فرو کر کے ملک چھجو کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن پھر جلال الدین خلجی نے اپنی رحمدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا اور اسے ملتان کی جاگیر عطا کر دی، تا کہ وہ اور اس کے گھر والے اس جگہ بہتر طریقہ پر اپنی زندگی گزار سکیں۔

جلال الدین خلجی کے بعد دہلی سلطنت کا حکمراں علاء الدین خلجی ہوا، وہ اس کا بھتیجا اور داماد تھا۔ جب کٹرہ مانک پور سے ملک چھجو کی گرفتاری ہوئی اور اسے ملتان بھیج دیا گیا تو اس کی جگہ جلال الدین خلجی نے علاء الدین خلجی کو کٹرہ مانک پور کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ کٹرہ میں اپنے پاؤں جما لینے کے بعد علاء الدین خلجی نے ایک نئی فوج تیار کی اور بادشاہ سے چندیری پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کیا۔ اجازت مل جانے کے بعد وہ بجائے چندیری کے ایلچ پور ہوتا ہوا دیوگیر (دولت آباد) کے راستہ پر روانہ ہو گیا، اور وہاں سے فتحیاب ہو کر بہت سارا مال غنیمت،

ہزاروں کی تعداد میں ہاتھی اور گھوڑے، تحائف اور سازوسامان لے کر کڑہ واپس ہوا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من لعل، یاقوت، الماس اور زمرد، ایک ہزار من چاندی، چار ہزار ریشمی کپڑے کے تھان اور بہت بڑی مقدار میں غلہ وغیرہ دیوگیر سے علاء الدین کو حاصل ہوئے تھے۔ یہ واقعہ 693ھ مطابق 1294ء کا ہے۔

سلطان جلال الدین خلجی کے خاتمہ کی سازش

کڑہ واپس آجانے کے بعد علاء الدین خلجی نے بادشاہ کو بہت سے خطوط لکھے اور بغیر اجازت دیوگیر پر حملہ اس نے اپنی غلطی اور پشیمانی کا بھی اظہار کیا، ساتھ ہی بہت سے ہاتھی، گھوڑے اور تحائف بھیجنے کا وعدہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی لکھا کہ اگر کبھی بادشاہ اسے طلب کرے تو وہ فوراً اس کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔ لیکن جب بادشاہ نے اسے طلب کیا تو اس نے اپنے بھائی الماس بیگ کو جو دہلی میں تھا لکھا کہ چونکہ اس نے دیوگیر پر بادشاہ کی اجازت کے بغیر حملہ کیا تھا اس لئے اس کے مخالفین نے بادشاہ کو اس سے بد ظن کر دیا ہے، حالانکہ وہ اب بھی بادشاہ کا فرمانبردار فرزند ہے۔ لہٰذا اگر بادشاہ خود اسے لینے کے لئے آئے تو وہ فوراً چلنے کے لئے تیار ہے، لیکن اگر بادشاہ کو اس پر اعتماد نہیں ہے تو پھر اسے جہاں جائے قرار مل سکے گا، وہ حکومت کو خیرباد کہہ کر اس جانب نکل جائے گا۔ بھائی الماس بیگ نے یہ باتیں بادشاہ کے سامنے عرض کر دیں۔ بادشاہ علاء الدین سے دلی محبت رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ ان باتوں سے پریشان ہوا اور الماس کو علاء الدین کے پاس اس کی دلبستگی کے لئے بھیج دیا کہ تم چلو میں تمہارے پیچھے اسے لینے آتا ہوں۔ الماس نے جب کڑہ پہنچ کر علاء الدین کو حالات سے باخبر کیا تو اس نے بادشاہ کا کام تمام کرنے اور تخت سلطنت پر قابض ہونے کا خطرناک منصوبہ بنایا۔ ادھر بادشاہ اپنے مخصوص سرداروں کو لیکر ایک ہزار سواروں کے ساتھ کڑہ کی جانب کوچ کیا۔

دراصل بادشاہ کے خلاف یہ سرگرمیاں بہت ہی خاموشی کے ساتھ بہت پہلے ہی سے چل رہی تھیں، اور اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ اس کی پہلی وجہ سسرالی رشتہ کی وہ تلخیاں تھیں جن کا اسے اپنی بیوی اور ساس کی جانب سے سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اس کے علاوہ مخالف امراء کی نکتہ چینیوں سے وہ شدید نالاں تھا۔ پھر جب وہ کڑہ میں تھا تو اسے ملک چھجو کے وہ ساتھی اور حمایتی بھی مل گئے جو بادشاہ جلال الدین خلجی کا تختہ پلٹنا چاہتے تھے۔ لیکن اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، جس کے حصول کے لئے اس نے دکن پر فوج کشی کی اور بہت بڑی مقدار میں مال واسباب حاصل کر کے وہاں سے واپس ہوا تھا۔ ان کے علاوہ علاء الدین کے ساتھ وہ امراء بھی ہو گئے تھے جو بادشاہ کی نرمی اور رحم دلی سے خوش نہیں تھے۔

پھر جب بادشاہ کڑہ کے قریب پہنچا تو درمیان میں گنگا ندی حائل تھی۔ علاء الدین نے بھائی الماس کو بھیجا کہ وہ کسی طرح بادشاہ کو تنہا کڑہ لے آئے۔ الماس اس کوشش میں کامیاب رہا۔ گنگا عبور کر لینے کے بعد جب بادشاہ جلال الدین خلجی اور علاء الدین خلجی محو گفتگو تھے، اسی دوران علاء الدین نے بادشاہ پر حملہ کر دیا اور پھر علاء الدین کا ایک پروردہ اختیار الدین کے ہاتھوں اس کا کام تمام ہوا۔ اس کے بعد بادشاہ کے ساتھ جتنے لوگ تھے ان سب کو بھی قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ 16/ یا 17/ رمضان 695ھ مطابق 19/ یا 20/ جولائی 1296ء کا ہے۔

دوسری جانب بادشاہ کے مشیر خاص اور خیر خواہ ملک احمد چپ کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو اس نے اور بادشاہ کی بیگم ملکہ جہاں نے چھوٹے شہزادہ قدر خان کو سلطان رکن الدین ابراہیم کا خطاب دے کر تخت پر بیٹھا دیا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے حامی تمام امراء ووزراء نے بھی اس کی اطاعت قبول کرلی۔ لیکن جب علاء الدین خلجی کی دہلی آمد ہوئی اور ان دونوں کا مقابلہ ہوا تو سلطان رکن الدین ابراہیم اس سے مقابلہ کی تاب نہ لاکر اپنے بڑے بھائی ارکلی خان کے پاس ملتان چلا گیا، اور اس کے تمام امراء ووزراء علاء الدین سے جاکر مل گئے۔

سلطان جلال الدین خلجی کا دور عدل وانصاف اور نرم دلی کی وجہ سے مشہور ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ساتھ ہی اس کے دور میں شعر وشاعری کا بھی خوب دور دورہ رہا۔ بادشاہ خود اچھے اشعار کہا کرتا تھا۔ اس دور کے ممتاز شعراء میں سرفہرست امیر خسرو ہے جو غلام خاندان کے آخری بادشاہ معزالدین کے قتل ہونے کے بعد سلطان جلال الدین نے اسے اپنے دربار سے وابستہ کرلیا تھا۔ امیر خسرو کے علاوہ سلطان کے دیگر علمی ندیموں میں امیر حسن، مؤید حاجی، امیر ارسلان کاتبی، سعد منطقی، قاضی خطیب، تاج الدین عراقی، محمد شاہ چنگی، فتوخاں، نصیر خاں اور بھرو وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

6.2.2 سلطان علاء الدین خلجی

علاء الدین خلجی اپنے چچا جلال الدین خلجی کی طرح نمازیں باجماعت پڑھنے والا اور روزوں کی پابندی کرنے والا مسلمان نہ تھا، اور نہ ہی علماء واولیاء سے اسے کوئی سروکار تھا، وہ اپنے زمانہ کے صرف ایک ولی شیخ نظام الدین اولیاء کی جاہ ومنزلت کا قائل تھا۔ وہ اپنے چچا کے برعکس انتہائی سخت مزاج اور عبرتناک سزائیں دینے والا تھا۔ لیکن اس کے باوجود علاء الدین خلجی کا زمانہ اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے معاملات کو طے کرنے سے پہلے اپنے امراء اور بہی خواہوں سے مشورہ کرتا تھا، اور ان کے مفید مشوروں سے بھرپور مستفید ہوتا تھا۔ چنانچہ جب کوئی اسے کسی معاملہ میں مشورہ دیتا تو اگرچہ وہ اس کے مزاج اور مفاد کے بھی خلاف ہوتا، لیکن اسے وہ بغور سنتا، پھر اگر کوئی مشورہ اس کے مزاج ومفاد کے خلاف بھی ہوتا لیکن انتظامی وسیاسی اور حالات کے پیش نظر درست اور مناسب ہوتا تو وہ اسے ضرور اختیار کرتا تھا۔ اور بہتر مشوروں پر اپنے مشیرین کو انعامات سے بھی نوازا کرتا تھا۔

جلال الدین خلجی کے خاتمہ کے بعد جب وہ کٹرہ سے دہلی کے لئے روانہ ہوا تو راستہ بھر وہ لوگوں پر دولت لٹاتا ہوا آیا تھا۔ جب دہلی کے قریب پہنچا اور اس کے مقابلہ کے لئے مرکز سے فوج آئی تو انہیں بھی دولت کے زور پر ہی اپنا حامی بنالینے میں کامیاب رہا۔ دہلی پر قبضہ حاصل ہوجانے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ جن کی جانب سے بغاوت یا حکومت کے دعویٰ کا اندیشہ تھا انہیں تہہ تیغ کردیا۔ چنانچہ اس نے بھائی الماس بیگ کو چالیس ہزار کی فوج دے کر ملتان بھیجا۔ وہاں دو مہینے کے محاصرہ کے بعد سلطان جلال الدین خلجی کے دونوں بیٹوں ارکلی خان اور رکن الدین نے خود کو الماس بیگ کے حوالہ کردیا۔ جلال الدین خلجی کے اِن دونوں بیٹوں اور داماد الغو خان کی آنکھوں میں لوہے کی سلائیاں پھیر کر ہانسی کے قلعہ میں قید کردیا گیا۔ اردکلی خان کے دونوں بیٹوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جلال الدین خلجی کی بہو بیٹیوں اور بیویوں کو دہلی کے قید خانہ میں مقید کردیا گیا۔

انتظامی اور سیاسی نقطہ نظر سے علاء الدین نے سابقہ امراء ورؤساء کے متعلق ابتداءً یہ طے کیا تھا کہ انہیں ان کے عہدوں پر باقی

رکھا جائے، بلکہ انہیں انعامات اور خلعتوں سے بھی نوازا جائے۔ پھر جب اس نے دہلی میں اپنے قدم جمالئے، اور حکومت کے ممکنہ دعوے داروں اور باغیوں کا استیصال کر دیا تو پھر ان امراء کی جانب متوجہ جنہوں نے مال و دولت اور انعام و اکرام کے لالچ میں سلطان جلال الدین خلجی کی اولاد کے ساتھ بے وفائی کی تھی اور علاء الدین خلجی کا ساتھ دیا تھا۔ محمد قاسم فرشتہ نے ایسے امراء کے انجام پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"ایسے تمام نمک حرام امیروں کو گرفتار کیا گیا، بیشتر کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں پھیریں گئیں اور بہت سوں کو مختلف قلعوں میں قید کر دیا گیا۔ ان تمام امیروں کے مال و دولت پر قبضہ کر کے تقریباً ایک کروڑ روپیہ شاہی خزانے میں جمع کیا گیا"۔

عہد علائی کی فوجی مہمات

سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں فتوحات کا آغاز سلطان جلال الدین خلجی کے اہل خانہ کی سرکوبی سے ہوا، جس کا تذکرہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ 696ھ مطابق 1298ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے بھائی الغ خان اور نصرت خان کو گجرات فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس وقت وہاں کا حکمراں راجہ کرن رائے تھا۔ دہلی سلطنت کی فوجوں نے جب گجرات پر حملہ کیا تو کرن رائے بھاگ کر دیوگیر کے راجہ رام دیو کی پناہ میں چلا گیا تھا۔ اس طرح الغ خان اور نصرت خان کو گجرات پر فتح حاصل ہوئی، اور مال غنیمت کے طور پر رانیاں، شہزادیاں، خزانہ اور بہت سے ہاتھی ہاتھ آئے تھے۔ ان رانیوں میں سب سے معزز رانی کنولا دیوی تھی۔ ان میں ہندوؤں کا ایک معزز و محترم بت بھی تھا جسے سومنات بت کے ہم مرتبہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس بت کو بھی دہلی اٹھالایا گیا تھا۔

گجرات کے بعد سلطانی فوجوں نے کھمبائیت پر حملہ کیا اور اس پر بھی قبضہ حاصل ہو گیا۔ وہاں کے مالدار تاجروں اور ساہوکاروں سے بہت سارا مال و اسباب، جواہر و نوادر حاصل ہوئے۔ یہاں انہیں ایک تاجر کے پاس کافور نامی ایک ہزار دیناری غلام بھی ملا تھا جسے گرفتار کر کے مال غنیمت کے ساتھ دہلی بھیج دیا گیا تھا۔ کھمبائیت پر یہ فوج کشی نصرت خان کی سپہ سالاری میں کی گئی تھی۔ جب یہ مال غنیمت سلطان علاء الدین خلجی کے پاس دہلی پہنچا، اور اس کی نظر رانی کنولا دیوی پر پڑی تو اس نے اسے اپنے حرم میں شامل کر لیا، اور کافور بھی سلطان کے منظور نظر ہوا، اور بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا نائب ملک کے عہدہ پر فائز ہو گیا تھا اور سلطان نے ملک نائب کا خطاب دے دیا تھا۔

سیوستان جو دہلی سلطنت کے تحت تھا، اس پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا اسے سر کرنے کے لئے اسی سال یعنی 1298ء میں سلطان نے ظفر خان کو ایک فوج دے کر بھیجا۔ ظفر خان سیوستان پہنچا اور قلعہ کا محاصرہ کر کے ان پر فتح حاصل کر لی۔ قلعہ میں محصور مغلوں کی تعداد سترہ سو تھی، وہ سب گرفتار کئے گئے، ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی قید کر لیا گیا اور سب کو دہلی روانہ کر دیا گیا۔

گجرات میں فتح حاصل ہونے کے بعد 699ھ مطابق 1301ء میں الغ خان رنتھمبور اور جھابن پر حملہ آور ہوا۔ وہاں کے راجہ ہمیر دیو نے قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا لیکن شکست سے دوچار ہوا اور مجبوراً قلعہ میں محصور ہو جانا پڑا۔ جب الغ خان نے اس کے تفصیلی حالات سلطان کو لکھے، تو سلطان اس قلعہ کو فتح کرنے کے لئے خود ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ سلطان نے فوج کشی کر کے اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ یہاں سے بہت بڑی مقدار میں دفینے اور ذخیرے حاصل ہوئے۔ اس کے بعد سلطانی لشکر نے چتوڑ کی جانب رخ کیا اور اسے فتح کر کے اس کا

نام خضر آباد تجویز کر دیا۔

دیو گیر کا راجہ رام دیو نے تین سالوں سے دہلی سلطنت کو خراج نہیں ادا کیا تھا۔ چنانچہ 706ھ مطابق 1307ء میں اس کی سر کوبی کے لئے سلطان نے ملک کافور کو روانہ کیا۔ ساتھ ہی نائب عرض ممالک خواجہ حاجی، حاکم مالوہ عین الملک ملتانی اور حاکم گجرات الغ خان کو اس کو ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے بھیجا۔ ملک کافور نے دیو گیر پر بلا مزاحمت فتح حاصل کر لی۔ راجہ کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا گیا۔ سلطان نے اس کی بہت عزت افزائی کی، کیونکہ یہ وہی راجہ تھا جس کی بے پناہ دولت کی بدولت اسے دہلی کی سلطنت حاصل ہوئی تھی۔ سلطان نے نہ صرف راجہ بلکہ اس کے بیٹوں اور تمام عزیز واقارب کو رہا کر دیا اور بطور انعام گجرات کے ایک قطعہ سے بھی نوازا۔ سلطان نے ملک کافور کو دوسری مرتبہ 709ھ مطابق 1310ء میں دکن کی مہم پر بھیجا۔ اس بار تلنگانہ کے راجہ لدر دیو کو زیر کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ جب سلطانی فوج نے اس پر حملہ کیا تو تین سو ہاتھی، سات ہزار گھوڑے اور بہت سا سونا اور چاندی کا نذرانہ پیش کر کے اس نے اپنی شکست قبول کر لی، اور ساتھ ہی خراج دینے کا بھی وعدہ کیا۔ تیسری مرتبہ جب ملک کافور دکن کی مہم پر تھا تو اس نے کرناٹک، مالا بار اور راس کماری تک کے علاقوں کو دہلی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پھر اس نے کارومنڈل کی جانب پیش قدمی کی اور اس علاقے کے راجاؤں کو زیر کر کے اطاعت پر مجبور کر دیا۔

ان کے علاوہ راجستھان کی جانب بھی توجہ کی گئی اور 1305 میں مانڈو اور 1312ء میں جالور کو فتح کر لیا گیا۔ اس طرح راجستھان کا بڑا علاقہ دہلی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

منگولوں کے حملے

دہلی سلطنت میں منگولوں کے حملوں کا آغاز سلطان التمش کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔ سلطان علاء الدین کے دور میں مغلوں سے پانچ مقابلے ہوئے جن میں سلطانی فوجوں نے ان کا کامیاب دفاع کیا۔ منگولوں کے خلاف جو جنگیں ہوئیں ان میں پہلی جنگ 698ھ / 1297ء میں ہوئی تھی۔ مغل چتلدی نامی سردار کی سپہ سالاری میں سندھ کی جانب سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ الغ خان اور تغلق خان غازی کی سپہ سالاری میں سلطانی فوج نے ان کا مقابلہ عبارت منجھور نامی مقام پر کیا، جس میں مغلوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

منگولوں کا دوسرا حملہ قتلغ خواجہ ولد سلطان داؤد کی سپہ سالاری میں ہوا تھا۔ اس حملہ میں ان کا مقصد ہندوستان میں لوٹ مار کرنا نہ تھا بلکہ وہ یہاں حکومت کرنے کے ارادہ سے آئے تھے۔ لہٰذا وہ سرحدی علاقوں اور قصبات و مضافات میں کسی قسم کی غارت گری کے بغیر بہت تیزی کے ساتھ دہلی کی طرف پیش قدمی کی، اور دہلی کے قریب پہنچ کر آمدورفت کے تمام راستوں میں ناکہ بندی کر دی جس سے دہلی میں اسباب زندگی کی فراہمی میں بڑی گرانی ہو گئی۔ سلطان نے ان کے مقابلہ کے لئے الغ خان اور ظفر خان کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ بھیجا۔ کیلی کی سرحد پر سلطانی فوج نے منگولوں کو شکست دی۔ البتہ اس میں دہلی سلطنت کو یہ نقصان ہوا کہ اس کا ایک قابل سپہ سالار ظفر خان مارا گیا۔

ہندوستان پر ان کا تیسرا حملہ ماہر تیر انداز ترغی مغل کی سرکردگی میں ہوا تھا۔ ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ وہ کوہستانی علاقوں کو فتح کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے، اور حملہ کرتے ہوئے قصبہ برن تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں کا حاکم ملک فخر الدین

قلعہ بند ہو کر ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ ادھر سے سلطانی فوج ملک تغلق غازی الملک کی کمانڈری میں آ پہنچی۔ ان دونوں فوجوں نے متحدہ طور پر منگولوں کا مقابلہ کیا، اور انہیں مار بھگانے میں کامیاب رہے۔ ان کے کمانڈر کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

منگولوں نے محمد ترباق اور علی بیگ کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ یہ دونوں قائدین دراصل خراسان کے شہزادے تھے۔ یہ حملہ ہندوستان میں دو جانب ناگور اور سرمور کے پہاڑوں کو فتح کرتے ہوا تھا۔ سلطان نے ان سے مقابلہ کے لئے ملک نانک غلام اور ملک تغلق کو فوج دے کر بھیجا۔ ان کا مقابلہ اس وقت ہوا جب منگول رہب ندی عبور کر رہے تھے۔ سلطانی فوج نے ان پر اسی وقت فوج کشی کر کے زبردست خونریزی کرتے ہوئے انہیں شکست فاش دی۔ ان کے دونوں قائدین بھی مارے گئے۔ منگولوں کا پانچواں حملہ اپنے دونوں شہزادوں کے بدلہ کے لئے تھا۔ اس حملہ کا سپہ سالار وکیک نامی مغل سردار تھا۔ ان کا یہ حملہ ملتان کی جانب سے ہوا تھا۔ جب اس کی اطلاع دہلی پہنچی تو سلطان نے دوبارہ ملک مانک اور ملک تغلق کو ان کے مقابلہ پر مامور کیا۔ شاہی فوج نے عین اس وقت جب منگول ملتان میں لوٹ مار کا بازار گرم کر کے واپس ہو رہے تھے ان پر سخت ترین حملہ کر کے انہیں میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے سپہ سالار کے علاوہ بہت سے مغل سردار گرفتار کئے گئے۔

عہد علائی کی اصلاحی کوششیں

عہد علائی اپنی اصلاحی اور فلاحی کاموں کے اعتبار سے ایک ممتاز دور رہا ہے۔ ان میں سے بعض انتظامی نقطہ نظر سے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ آیئے انہیں کچھ تفصیل سے جانتے ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کا اس ضمن میں جو بڑا کارنامہ ہے وہ نرخ کی تعیین کے تعلق سے ہے۔ اس نے غلوں کے علاوہ کپڑوں، غلام، لونڈی، گھوڑے، گائے، بھینس، بکری گویا ہر ضروریات زندگی سے متعلق اشیاء کا نرخ متعین کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اشیائے خوردنی کی ارزانی ہو گئی تھی، اور لوگوں میں خوشحالی عام ہو گئی تھی۔ علاء الدین نے جو نرخ متعین کیا تھا اس کی چند مثالیں دیکھئے: ایک من گیہوں ساڑھے سات جیتل (ایک سکہ) میں، ایک من جو چار جیتل میں، ایک من چنا پانچ جیتل میں، ایک من دھان پانچ جیتل میں، ایک من ماش پانچ جیتل میں، ایک من موٹھ تین جیتل میں۔

بازار کا نرخ متعین کرنے کے لئے جو ضابطے بنائے گئے تھے ان میں اہم نکات یہ تھے کہ بازار کا نرخ متعین کرنے کا اختیار صرف سلطان کو ہو گا۔ سلطنت کے جو غلہ فروش تاجر تھے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ باہر سے غلہ لا کر سلطنت میں مقررہ نرخ پر فروخت کریں گے۔ اس کے علاوہ کسی شخص کے لئے اس بات کی اجازت نہیں ہو گی کہ وہ ایک وقت میں روزانہ خرچ کے علاوہ نصف من سے زیادہ غلہ بازار سے خریدے۔ علاوہ ازیں دیہاتوں کی مالگزاریاں غلے کی شکل میں وصول کی جاتی تھیں۔ انتظامی نقطہ نظر سے سلطان نے اس پر مزید یہ تدبیر اختیار کی کہ بازار اور اس کے نرخ کی نگرانی کے لئے داروغہ مقرر کر دیا۔ مزید یہ کہ جاسوسی نظام بھی تھا جو اسے وہاں کے حالات سے باخبر رکھتا تھا۔ بسا اوقات سلطان چھوٹے بچوں کو بھیج کر بھی حالات کا جائزہ لے لیا کرتا تھا۔

سلطان علاء الدین خلجی کا دوسرا اہم کارنامہ شراب کی پابندی سے متعلق ہے۔ اس اصلاح کا آغاز اس نے خود سے کیا۔ اس نے سب سے پہلے خود پر پابندی لگائی کہ وہ شراب نہیں پئے گا۔ پھر تمام مقبوضہ علاقوں میں سلطان کے اس فرمان کی تشہیر کی گئی کہ سلطان نے شراب

سے توبہ کرلی ہے، اب جو شخص شراب پئے گا یا بیچے گا اسے سلطان کی جانب سے سخت سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے گھروں سے شراب نکال کر سڑکوں پر بہادی۔ شہروں میں اس سے متعلق ناکہ بندی کر دی گئی تھی کہ شراب شہر کے اندر نہ آنے پائے۔ چنانچہ جب بھی کوئی شخص شہر کے اندر آتا تھا تو شہر کا چوکیدار سختی سے اس کی تلاشی لیتا تھا۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ چوری چھپے شراب شہر میں لانے میں کامیاب ہو ہی جاتے تھے اور اپنے گھروں میں شراب نوشی کیا کرتے تھے۔ جب یہ لوگ حکومت کی گرفت میں آتے تھے تو ان کی سرزنش کے لئے کنوؤں میں قید کر دیا جاتا تھا۔ جن کی بڑی تعداد وہیں اپنے انجام کو پہنچ جاتی تھی اور جو بچ جاتے تھے وہ سالوں سال کے علاج و معالجہ کے بعد روبہ صحت ہو پاتے تھے۔

جاسوسی اور خبر رسانی کا نظام علاء الدین کے پہلے سے قائم تھا لیکن عہد علائی میں یہ نظام اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ عوام اور دشمنوں کی خبریں سلطان تک تو پہنچتی ہی تھیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے خاص طور پر اپنے امراء اور وزراء کے پیچھے جاسوسوں کو لگا رکھا تھا۔ یہ نظام اتنا منظم اور مرتب تھا کہ امراء جو باتیں اپنے گھروں کے اندر اپنے اہل وعیال سے کرتے تھے ان کی اطلاع بھی سلطان کو ہوتی تھی۔ سلطان کی اس تدبیر سے بغاوتوں کا سلسلہ یکسر تھم گیا تھا اور سلطنت میں امن وامان قائم ہو گیا تھا۔

علاء الدین خلجی کی وفات

علاء الدین خلجی کو جو مسلسل فتوحات حاصل ہوئیں، بالخصوص دکن کے محاظ پر ملک کافور کے ذریعہ جو کامیابیاں ملی تھیں، پھر منگولوں کے خلاف بھی مسلسل میدان ہاتھ آتے رہنے سے وہ کافی خودسر ہو گیا تھا۔ پہلے جن کے مخلصانہ مشوروں پر عمل کر کے اس نے کامیابی کی منزلیں طے کی تھیں اب وہ ان کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ان مشیرین اور خیر خواہان کی جگہ اب اس کی خودسری اور مفاد پرست ملک کافور نے لے لی تھی، جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ اخیر عہد میں وہ ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ سخت تکلیف سے دو چار رہتا تھا۔ ایسے حالات میں وہ ملک کافور کی باتیں وہ آنکھیں بند کر کے ماننے لگا تھا۔ ملک کافور دل ہی دل میں بادشاہی کا خواب دیکھنے لگا تھا، جس کے لئے اس نے راہیں ہموار کرنی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ سلطان کی موجودگی ہی میں اس نے شہزادہ خضر خان اور شادی خان کو گوالیار کے قلعے میں محصور اور ملکہ جہاں کو پرانی دہلی میں نظر بند کروا دیا تھا۔ اسی طرح الغ خان جو شہزادوں کا خالو اور گجرات کا حاکم تھا اسے اور اس کے بھائی نظام الدین جو جالور کا حاکم تھا دونوں کو قتل کروا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے حامیوں نے سلطنت کے مختلف علاقوں میں علم بغاوت بلند کر دی، بالخصوص گجرات کی فوج کی بغاوت بہت سخت تھی۔ چنانچہ جب سلطان نے ملک کافور کے مشورے سے انہیں قابو کرنے کے لئے سید کمال الدین کرک کو بھیجا تو گجرات کی فوج اور اہل گجرات نے اس کی فوج کی بری طرح پٹائی کی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جیتپور میں بھی بغاوت ہوئی اور اس کے حاکم نے شاہی ملازموں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر قلعوں کے نیچے پھینک دیا۔ دکن کے راجہ ہرپال دیو نے کئی شاہی تھانوں کو تباہ وبرباد کر دیا۔ ان خبروں سے سلطان سخت ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گیا، جس نے اس کی بیماری اور تکلیف میں اضافہ کر دیا اور بالآخر 6/ شوال 716ھ مطابق 29/ دسمبر 1316ء کو اس کی وفات ہو گئی۔ اس کے انتقال کی بابت بعضوں کی رائے یہ بھی ہے کہ ملک کافور نے اسے اپنے راستہ سے ہٹانے کے لئے زہر دے دیا تھا۔

6.2.3 خلجی خاندان کا خاتمہ

علاء الدین خلجی کی وفات کے دوسرے ہی دن ملک کافور نے امرائے سلطنت کو جمع کر کے سلطان کی وصیت سے آگاہ کیا کہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو ولی عہد مقرر کیا ہے۔ ملک کافور نے وصیت کے مطابق شہاب الدین کو تخت حکومت پر بیٹھا دیا، اور چونکہ وہ بہت کم عمر محض چھ یا سات سالوں کا تھا اور وہ خود ملک نائب تھا، لہٰذا اس نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اختیارات ہاتھ میں آنے کے بعد ملک کافور نے دونوں شہزادوں خضر خان اور شادی خان کو اندھا کر دیا اور ملکہ جہاں کو جو پرانی دہلی میں نظر بند تھی قید میں ڈال دیا۔ ملک کافور نے شہزادہ مبارک خان کو بھی راستہ سے ہٹانے کے لئے خواجہ سراؤں کو تیار کیا۔ لیکن بد قسمتی سے ان خواجہ سراؤں پر علاء الدین خلجی کے احسانات تھے، چنانچہ جب یہ مبارک شاہ کو قتل کرنے پہنچے تو اس نے انہیں اپنے باپ کی مہربانیاں یاد دلائیں، جس پر وہ بہت نادم ہوئے، اور اپنے سرداروں کے ساتھ مل کر انہوں نے سلطان کے احسانات چکانے کے لئے ملک کافور کے خاتمہ کا منصوبہ بنایا، اور اسی رات کو اپنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ملک کافور کا خاتمہ کر دیا۔

بعد ازاں مبارک شاہ کو خواجہ سراؤں اور امراء وحکام نے شہاب الدین کا نائب بنا دیا۔ یہ نیابت دو مہینوں تک جاری رہی، پھر مبارک شاہ نے اراکین سلطنت کے مشورے سے شہاب الدین کو معزول کر کے خود قطب الدین مبارک شاہ کے نام سے سلطان بن گیا۔ اس کے بعد اپنے حامی امراء کو مختلف عہدوں پر فائز کیا، خطابات والقابات سے نوازا، جاگیریں عطا کیں، اور انعامات بھی دیئے۔ تقریباً ستر (70) ہزار قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ جلال الدین خلجی کی جو اولاد سلطنت میں منتشر تھیں انہیں بلا کر ہدایا و تحائف سے نوازا، ان کے لئے وظیفے مقرر کئے۔ ملازمین کو چھ مہینوں کی تنخواہ بطور انعام دے دی۔ عہد علائی میں بازار کا جو نرخ مقرر کیا گیا تھا اس نے کالعدم قرار دے دیا۔ شراب نوشی بھی عام ہو گئی۔ اس نے شہزادہ خضر خان، شادی خان اور ملک شہاب الدین کو قتل کرا دیا۔

ایک جانب سلطنت میں یہ سیاسی اتھل پتھل تھی، ایک ہنگامہ برپا تھا، اور دوسری جانب سلطان قطب الدین مبارک شاہ کو ملک کافور جیسا ایک غلام خسرو خان مل گیا تھا، جو اسے ہر دلعزیز تھا، اور اسے ترقی دیتے ہوئے وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچا دیا تھا، اور اس کی ہر بات اور ہر مشورہ پر اپنا سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔ یہ شخص اصلاً ایک ہندو تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے حامی ہندوؤں کو سلطنت کے تمام اہم اور بڑے عہدوں پر مقرر کر دیا تھا، ساتھ ہی ہندوؤں پر مشتمل ایک بڑی فوج تیار کر لی تھی، اور ایک ایسی رات جب مسلمانوں کی فوج دہلی سے باہر تھی انہوں نے سلطان کے محل پر حملہ کر دیا اور سلطان کے ساتھ ساتھ ہر اس بچے، بوڑھے، جوان مرد و عورت کو جن کا تعلق شاہی گھرانے سے تھا قتل کر ڈالا۔ اس طرح 761ھ مطابق 1320ء کو خلجی خاندان سے نہ صرف حکومت کا خاتمہ ہوا بلکہ ان کا نام ونشان مٹ گیا۔ اس کے بعد خسرو خان خود تخت حکومت پر بیٹھ گیا۔

6.3 تغلق خاندان (1320-1413ء)

تغلق خاندان میں حکومت 93 سالوں تک رہی، اور اس میں کل سات حکمراں ہوئے۔ اسی دور میں پایہ تخت دہلی سے منتقل کر کے

دولت آباد کو بنالیا گیا تھا، لیکن پھر بعد میں دہلی کو دوبارہ پایہ تخت بنالیا گیا تھا۔ اس دور کی خاص بات یہ بھی رہی کہ اس میں کئی ریاستوں نے خود مختاری اختیار کرلی اور ان میں مسلمانوں کی شاندار حکومتیں قائم ہوئیں، مثلاً دکن میں بہمنی حکومت، گجرات کی حکومت، بنگال کی حکومت، جونپور کی شرقی حکومت وغیرہ۔

خسرو خان نے تخت نشین ہونے کے پہلے ہی احتیاطی تدبیر کے طور پر امرائے سلطنت کے عزیزوں اور بیٹوں کو کسی نہ بہانے سے دہلی بلاکر محصور کرلیا تھا جس کی وجہ سے جب وہ تخت نشین ہوا تو امرائے سلطنت اس کے خلاف ذرا بھی مزاحمت نہ کرسکے۔ اس کے علاوہ خسرو خان کی فوج کا دہلی پر قابض ہونا بھی ایک وجہ تھی۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ دیپالپور کے حاکم غازی ملک تغلق سے تھا، جس نے منگولوں کے خلاف فوج کشی میں انہیں پے درپے شکستیں دے کر بڑا نام کمایا تھا۔ لیکن خسرو خان کو اس کی جانب سے بھی یک گونہ اطمینان تھا کہ اس کا بھی ایک بیٹا ملک جونا خان تغلق اس کی یرغمالی میں تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے دیپالپور میں خسرو خان کے خلاف پوری تیاری کررکھی تھی۔ اسے یہ موقع جلد ہی مل گیا۔ تقریباً دو مہینوں کے بعد غازی ملک کا بیٹا کسی طرح وہاں سے فرار ہو کر اپنے باپ کے پاس پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹے نے خسرو خان کے خلاف فوج کشی کردی۔ ان دونوں کا مقابلہ ہوا اور خسرو خان کو بری طرح شکست ہوئی۔ خسرو خان نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے گرفتار کر کے قتل کردیا گیا۔ اس طرح خسرو خان کی زیادتیوں کا خاتمہ ہوا۔ بعد ازاں امرائے سلطنت کے اصرار پر غازی ملک تغلق، غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین ہو گیا، اور تغلق خاندان کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔

6.3.1 غیاث الدین تغلق

تخت نشین ہونے کے بعد غیاث الدین تغلق نے بہت جلد ہی دہلی کی بدانتظامی پر قابو پالیا اور اس کا انتظام وانصرام کو منظم اور مرتب کرنے کی کامیاب کوشش کی، قابل امراء کو اہم عہدوں پر مقرر کیا، پولیس اور عدلیہ کا نظام درست کیا۔ پھر ان لوگوں کو سزائیں دینے کے درپے ہوا جنہوں نے خلجی کے شاہی گھرانے پر ظلم وزیادتی کرنے میں خسرو خان کا ساتھ دیا تھا، انہیں عبرتناک سزاؤں سے دوچار کیا۔

سلطنت میں گذشتہ بدانتظامی کے سبب ورنگل (تلنگانہ) کی حکومت باغی ہو گئی تھی۔ غیاث الدین تغلق نے اپنے صاحبزادہ اور ولی عہد ملک جونا تغلق کو ایک بڑی فوج دے کر اس کی سرزنش کے لئے بھیجا۔ ملک جونا بیدر کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھا، اور ورنگل پر حملہ آور ہوا۔ 1323ء میں وہاں فتح پانے کے بعد مال غنیمت اور راجہ کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔ پھر آگے بڑھ کر جاج نگر کو بھی فتح کرلیا۔ اس کے بعد سلطان تغلق بنگال کی جانب متوجہ ہوا جہاں تخت کے بہت سے دعوے دار پیدا ہو گئے تھے اور ان کے درمیان خانہ جنگی کی کیفیت پیدا تھی۔ سلطان تغلق نے خود ان پر فوج کشی کر کے اسے تسخیر کرلیا۔ بعد ازاں ترہٹ کو فتح کرتے ہوئے سلطان دہلی واپس آ گیا۔ بنگال کا یہ محاذ 25-1324ء مطابق 25-724ھ میں پیش آیا۔ واپسی میں سلطان کے استقبال کے لئے ملک جونا خان نے دہلی کے باہر ایک عارضی خیمہ بنوایا تھا جہاں سلطان کھانا وغیرہ سے فارغ ہو کر ہاتھیوں کا کھیل دیکھ رہا تھا کہ اچانک خیمہ گر گیا اور وہیں دب کر سلطان کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ 1325ء میں واقع ہوا۔

غیاث الدین تغلق انتظامی امور کا ماہر اور ایک انصاف پسند بادشاہ تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک دین وشریعت پر عامل شخص بھی تھا۔ اس کے انتقال سے سلطنت کو بڑا نقصان ہوا۔

6.3.2 محمد شاہ تغلق

غیاث الدین تغلق کے بعد ولی عہد ملک جونا تغلق، محمد شاہ تغلق کے نام سے تخت شاہی پر متمکن ہوا۔ وہ ذہنی اور فطری طور پر ایک انصاف پسند اور دیندار سلطان تھا، انتہائی ذہین وفطین، انتہائی تعلیم یافتہ، حافظ قرآن، شعر وشاعری کا ماہر، بحث ومباحثہ پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جدت طبع کا بھی مالک تھا۔ اس نے حکومت کے نظم ونسق اور معاشی وفوجی اصلاحات کے پیش نظر بہت سے نئے نئے تجربات کئے لیکن ان میں سے بہت سے ناکام ہوئے اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

محمد شاہ تغلق جب دہلی سلطنت پر تخت نشین ہوا تھا تو اسے ایک خوشحال اور فارغ البال حکومت ملی تھی۔ پھر اس نے اس کی معاشی اصلاح کی جانب توجہ کرتے ہوئے اس کے لئے ایک مستقل شعبہ قائم کر دیا۔ انہوں نے کسانوں کو قرض دیئے تاکہ وہ زرخیز علاقوں میں اچھی فصل اگائیں اور حکومت کو ٹیکس کی شکل میں زیادہ منافع حاصل ہوا، لیکن پھر شدید قحط پڑا اور خاطر خواہ پیداوار نہ ہو سکی۔ باوجود اس کے حکومت کی جانب سے پہلے سے طے کردہ ٹیکس کا کسانوں سے سختی سے مطالبہ کیا گیا، جس کے نتیجہ میں کسان حکومت مخالف ہو گئے۔

پھر منگولوں سے تحفظ اور پوری سلطنت میں قریب سے نظر رکھنے کے پیش نظر اس نے اپنا پایہ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کرنا چاہا اور اس پر اتنی سختی سے عمل آور ہوا کہ دہلی کے تمام باشندوں کو وہاں منتقل ہو جانے کا حکم جاری کر دیا، جس سے بے شمار جانی ومالی نقصان ہوا۔ پھر جب اس کے لئے یہ بات واضح ہوئی کہ پایہ تخت کی یہ منتقلی حکومت کے حق میں درست اور مناسب ثابت نہیں ہوئی ہے تو اس نے دوبارہ پایہ تخت دہلی منتقل کرنے کا حکم جاری کر دیا، اور اس پر بھی وہی پہلے جیسی سختی کی جس سے دوبارہ جانی ومالی نقصانات ہوئے۔

پہلے قحط اور پھر پایہ تخت کی منتقلی کی وجہ سے سلطان کے پاس اسباب ووسائل کی کمی ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے شمالی علاقوں میں اس کی گرفت کمزور ہو رہی تھی۔ پھر اسباب ووسائل کی فراہمی کے لئے اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ کرنسی کے طور پر پہلے سے جو سونے اور چاندی کے سکے جاری تھے انہیں تبدیل کر کے تانبے کے سکے جاری کر دیئے، اور سونے وچاندی کے سکوں کو اپنی تحویل میں لینا شروع کر دیا۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ لوگ اپنے گھروں میں تانبے کے سکے ڈھالنے لگے اور نقلی سکے بازار میں بہت بڑی تعداد میں گردش کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے معیشت کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا، اور سلطان کو مجبوراً دوبارہ سونے اور چاندی کے سکے جاری کرنے پڑے۔

بغاوتیں

اس دور میں بغاوتوں کا ایک طویل سلسلہ رہا۔ اس کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا تھا جب سلطان قحط سالی، پایہ تخت کی منتقلی اور کرنسی کے سکوں کو جاری کرنے اور بند کرنے میں لگا ہوا تھا، تو اس کی پکڑ سلطنت کے دور کے صوبوں میں بالخصوص ڈھیلی ہو گئی تھی۔ چنانچہ 739ھ میں محمد شاہ تغلق کے بھانجہ گرشاسپ نے مالوہ میں بغاوت کی۔ سلطان نے اس بغاوت کو خواجہ جہاں کے سپہ سالاری میں فرو کرایا اور جب گرشاسپ گرفتار کر کے لایا گیا تو سلطان کے حکم سے اس کی کھال کھینچ لی گئی۔ ملتان میں غیاث الدین تغلق کا منہ بولا بھائی ملک بہرام حاکم تھا۔

اس نے بغاوت کی تھی۔ سلطان نے خود اس بغاوت کو ختم کیا اور ملک بہرام قتل کیا گیا۔ ملیبار میں شریف جلال الدین شاہ معبر کا حاکم باغی ہو گیا تھا۔ اس کی سرکوبی کے لئے بھی سلطان خود گیا تھا لیکن لشکر میں وبا پھیلنے اور بڑی تعداد میں سپاہیوں کے جانی نقصان ہو جانے کی وجہ سے وہ اس مہم میں ناکام رہا۔ 740ھ مطابق 1340ء میں بنگال (جو سنار گاؤں، چٹ گاؤں اور لکھنوتی پر مشتمل تھا) میں ملک فخر الدین نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس علاقہ کو سلطان ملک فخر الدین سے واپس نہ لے سکا۔ دیوگیر میں بھی وہاں کے سرداروں اور امراء نے بغاوت برپا کر دی تھی، اور جو شاہی عمال اور امراء کو قتل کر رہے تھے۔ چنانچہ خود سلطان نے اسے فرو کیا اور احمد ایاز کو یہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ اسی طرح لاہور، ملتان، گھکڑوں، تلنگانہ، کرناٹک، کٹرہ مانک پور، بیدر، گلبرگہ اور اودھ وغیرہ میں بغاوتوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

ان بغاوتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ سلطان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس کی حکومت دور دراز علاقوں تک قائم رہے اور اس کی مملکت وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔ چنانچہ اس نے نہایت دور دراز علاقوں تبت وچین اور خراسان وماوراء النہر کو فتح کرنے کے لئے فوجیں بھیجیں۔ جو نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں بلکہ دشوار گذار راستوں اور برسات کی شدت کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں جانی ومالی نقصانات کے ساتھ فوج کی بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔

مسلسل بغاوتوں اور سلطنت میں پھیلی بے چینی وبے اطمینانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض صوبے خود مختار ہو گئے۔ جن میں کچھ کو زیر کر کے دوبارہ دہلی سلطنت میں شامل کر لیا گیا، کچھ خود مختار باقی رہے، اور ان میں مستقل حکومتیں قائم ہو گئیں، جیسا کہ آپ اوپر مطالعہ کر چکے ہیں۔

سندھ میں بھی بغاوت ہوئی تھی، جسے فرو کرنے کے لئے سلطان خود گیا ہوا تھا۔ جب وہ ٹھٹھ کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اسی دوران آب وہوا کی ناسازگی کی وجہ سے وہ بیمار ہو گیا اور اسی بیماری کی وجہ سے 752ھ مطابق 1351ء میں اس کی وفات ہو گئی۔

6.3.3 فیروز شاہ تغلق

محمد شاہ تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔ وہ غیاث الدین تغلق کا پروردہ تھا، اور محمد شاہ تغلق کے دور میں بہت سے انتظامی معاملات میں وہ اس کے ساتھ شریک رہا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کا دور انتظامی اعتبار سے بہت سے امن وامان اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اس نے اپنی حکمرانی کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ جن صوبوں نے محمد شاہ تغلق کے دور میں خود مختاری اختیار کر لی تھی، انہیں دوبارہ دہلی سلطنت میں شامل کر لینے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔

جن علاقوں اور صوبوں میں دہلی سلطنت قائم تھی ان کے انتظام وانصرام پر اس نے خصوصی توجہ دی۔ اس نے عوام کی فلاح وبہبود کے لئے بہت سے کام کئے۔ غریبوں اور نوجوانوں کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کئے، بلکہ اس نے کوتوال محلہ کو حکم دے رکھا تھا کہ جب کوئی شخص بیکار نظر آئے تو اس کے حالات کی تحقیق کر کے اسے سلطان کے روبرو پیش کر دیا جائے، پھر سلطان اس کے مناسب کسی کام میں لگا دیتا تھا۔ علوم ومعارف کی اشاعت کے لئے کوششیں کیں، جس کے لئے اس نے بہت سے تعلیمی ادارے قائم کئے، ان میں مقرر

ہونے والے اساتذہ اور طلباء کے مشاہرے اور وظیفے مقرر کئے۔ ان تعلیمی اداروں میں مدرسہ فیروز شاہی کافی مشہور ہے۔ علماء وفضلاء اور شعراء ومشائخ کو اپنے دربار سے وابستہ رکھا، ان کی سرپرستی کی اور ان کے مشاہرے مقرر کئے۔ اس دور کے جو علمی شاہکار ہیں ان میں خاص طور پر فتاویٰ فیروز شاہی، فتاویٰ تاتارخانیہ، تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی)، تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عفیف) قابل ذکر ہیں۔

کاشتکاری پر محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں جو بھاری ٹیکس عائد کیا گیا تھا ان میں تخفیف کر دی، بلکہ اچھی کاشتکاری کے لئے بہت بڑی تعداد میں کنویں اور نہریں کھدوائیں، جس کی وجہ سے زرعی زمینوں میں اضافہ ہوا اور نتیجتاً فصلوں میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ بہت بڑی تعداد میں دہلی اور اس کے اطراف میں باغات لگائے۔ ان باغوں کی تعداد بارہ سو سے زائد تھی، جن سے آمدنی میں بھی اضافہ ہوا اور مملکت کے اندر غلہ اور میوہ جات کی ارزانی بھی ہو گئی۔ اگر کبھی قحط سالی ہوتی اور بارش نہ ہوتی تب بھی یہ ارزانی باقی رہتی۔ اس کے علاوہ اس نے کسانوں اور مزدوروں کے لئے چھوٹے سکے مثلاً نصف اور چوتھائی سکے بھی ڈھلوائے، تاکہ انہیں لین دین میں آسانی ہو۔ جو لوگ محمد شاہ تغلق کے دور میں جیلوں میں ڈالے گئے تھے انہیں آزاد کر دیا، اس دور میں جو لوگ ناحق قتل کر دیئے گئے تھے ان کے پسماندگان کو خون بہا ادا کیا، بہت سی ایسی سزائیں جو ظالمانہ نوعیت کی تھیں انہیں ختم کر دیا۔ جن لوگوں کی زمینیں چھین کر سرکاری تحویل میں لے لی گئی تھیں انہیں واپس کر دی گئی، مزید یہ کہ یہ عام اعلان کرا دیا گیا کہ جن لوگوں کی زمینیں اور دوسری جائیداد سرکاری تحویل میں ہیں اگر وہ کسی بھی طرح عدالت میں ثابت کر سکیں تو وہ انہیں واپس کر دی جائیں گی۔

غلاموں سے متعلق اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کی بڑی تعداد کو سلطنت کے مختلف علاقوں میں بھیج دیا اور وہاں ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔ جو غلام دہلی میں رہ گئے ان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ یہ تعلیم ان کی طبیعت کے میلان اور ذاتی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے دی جاتی تھی، چنانچہ بعضوں نے قرآن کی تعلیم حاصل کی، بعض علم تفسیر سے بہرہ ور ہوئے، بعضوں نے علم حدیث کو اپنا میدان بنایا، اسی طرح بعض لوگوں نے صنعت وحرفت کو اپنا میدان عمل بنا کر ان میں مہارت حاصل کی۔

سلطان کو تعمیرات اور نئی آبادکاری کا بھی بڑا شوق تھا۔ چنانچہ اس کے دور میں جو نئے شہر آباد ہوئے ان میں فیروز آباد، فیروز آباد ہارنی کھیڑا، تغلق پور کاسنہ، تغلق پور ملوک مکوت اور جونپور شامل ہیں۔ اسی طرح اس کے دور میں جو محلات تعمیر ہوئے ان میں فیروز کوشک، نزول کوشک، مہندواری، کوشک حصار فیروزہ، کوشک فتح آباد، کوشک جونپور، کوشک شکار، کوشک بند فتح خاں، کوشک سامورہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں بند بھی تعمیر ہوئے جن میں بند فتح خان، بند مالجا، بند مہاپالپور، بند شکر خاں، بند سالورہ، بند وزیر آباد اہمیت کے حامل ہیں۔ دہلی اور فیروز آباد کی خانقاہوں اور سراؤں کی تعداد ایک سو بیس تک پہنچی ہوئی تھی، جن میں مسافر اور ضرورتمند بھرے رہتے تھے۔ ان میں کھانے اور دیگر مصارف حکومت کی جانب سے پورے کئے جاتے تھے۔

فیروز شاہ تغلق کی اسی انتظامی قابلیت کی بناء پر اس نے چالیس سالوں تک حکومت کی لیکن اس دوران کسی بڑی بغاوت کی کوئی شکایت نہ آئی، اور مملکت میں امن وامان قائم رہا۔ اس کی وفات 90/ سال کی عمر میں 18/ رمضان 790ھ مطابق 1388ء کو ہوئی۔

6.3.4 تغلق خاندان کا خاتمہ

فیروز شاہ تغلق کے بعد غیاث الدین تغلق شاہ ثانی بن فتح خان بن فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔ لیکن اسے ملکی انتظام وانصرام سے کوئی لگاؤ نہ تھا، وہ اپنے جوانی کے نشہ میں اور عیش و عشرت میں ڈوبا رہتا تھا۔ بالآخر امرائے سلطنت کے ہاتھوں وہ تقریباً پانچ مہینے حکومت کر کے 791ھ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ابو بکر شاہ بن ظفر خان بن فیروز شاہ تغلق کو سلطان بنایا گیا۔ اس نے ایک سال چھ ماہ حکومت کی، اور یہ بھی امرائے سلطنت کے ہاتھوں ہی 792ھ میں اپنے انجام کو پہنچا۔ بعد ازاں ناصر الدین محمد بن سلطان فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔ یہ علالت میں مبتلا ہو کر 796ھ کو راہی ملک عدم ہوا۔ پھر سکندر شاہ بن ناصر الدین محمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ محض ڈیڑھ مہینے کے اندر وہ بھی بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ بالآخر ناصر الدین محمود شاہ بن ناصر الدین محمد کو سلطان بنایا گیا۔ اس نے تقریباً دس سال حکومت کی۔ اس کے دور کی اہم بات یہ رہی کہ اس دور میں (1398ء / 800ھ میں) دہلی میں تیمور کا حملہ ہوا جس میں دہلی کی عظمت و تقدس اور تمدن تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ وہ یہاں سے مال و دولت لوٹ کر ویران کرتا ہوا چلا گیا۔ اس آخری سلطان کی بھی علالت میں وفات ہوئی۔ اس طرح یہاں تغلق خاندان سے حکمرانی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

6.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جب جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا تو اس نے بہت ہی زبردست سیاسی چال چلتے ہوئے اپنا پایہ تخت کیلو گڑھی میں رکھا، تا کہ اپنے مخالفین کو اعتماد میں لیا جا سکے۔
- جلال الدین خلجی اگرچہ ایک بہت ہی رحم دل اور انصاف پرور سلطان تھا لیکن اس کے باوجود اس کے دور میں 'سیدی مولہ' جیسے درویش صفت انسان کا قتل ہوا تھا۔
- 1293ء میں جلال الدین خلجی کے عہد میں منگولوں کا جو حملہ ہوا تھا اس میں منگول کی بڑی تعداد مسلمان ہو گئی تھی اور انہیں غیاث پورہ نامی جگہ رہنے کے لئے دی گئی تھی۔
- سلطان علاء الدین خلجی، سلطان جلال الدین خلجی کا بھتیجہ اور داماد تھا لیکن اس نے دھوکے سے اپنے چچا کو قتل کر کے اس کی جگہ تخت نشین ہو گیا تھا۔
- عہد علائی میں بہت زبردست فوجی مہمات رہی، اور مملکت کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس سے پہلے اتنا وسیع کبھی نہیں ہوا تھا، اور پھر بعد میں بھی اتنی وسعت باقی نہیں رہی تھی۔
- عہد علائی میں منگولوں نے ہندوستان پر پانچ حملے کئے جن میں انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔
- علاء الدین خلجی نے تمام ضروریات زندگی کی اشیاء کا نرخ متعین کر دیا تھا، اور اس کے نفاذ کے لئے زبردست ضابطے بنائے تھے۔

اس نے شراب پر بھی پابندی لگائی تھی جس پر وہ بہت سختی کے ساتھ روک تھام کرتا تھا۔ خبر رسائی اور جاسوسی کا نظام بھی اس دور میں بہت منظم اور مرتب ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے بغاوتیں یکسر تھم گئی تھیں۔

- تغلق خاندان کی حکومت کے قیام کے شروع میں خسرو خان کی بدعنوانیوں کی وجہ کافی خلفشار رہا، جسے غیاث الدین تغلق نے اپنے حسن انتظام سے بہت جلد قابو میں کر لیا۔
- محمد شاہ تغلق کے دور میں پایہ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کیا گیا تھا، جس میں بے شمار جانی ومالی نقصان ہوا۔ پھر قحط سالی کی وجہ سے بھی اسباب ووسائل کی کمی ہوئی، پھر حکومت کی جانب سے بھاری ٹیکس کی وجہ سے مختلف جگہوں پر بغاوتیں پھوٹ پڑی تھیں۔ انہی بغاوتوں کے نتیجہ میں بہت سی نئی علاقائی حکومتیں بھی قائم ہو گئی تھیں۔

6.5 نمونہ امتحانی سوالات

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں پہلی باضابطہ مسلم حکومت کون سی تھی؟

(a). دہلی سلطنت (b). مغل حکومت (c). بہمنی حکومت (d). غزنوی حکومت

2. دہلی سلطنت میں خلجی خاندان سے پہلے کس خاندان نے حکومت کی تھی؟

(a). تغلق خاندان (b). غلام خاندان (c). سید خاندان (d). لودھی خاندان

3. سلطان جلال الدین خلجی دہلی سلطنت کا حکمراں ہونے سے پہلے کہاں کا حاکم تھا؟

(a). بنگال (b). گجرات (c). پنجاب (d). دکن

4. سلطان جلال الدین خلجی کے دور میں کس صوفی کا قتل ہوا تھا؟

(a). شیخ نظام الدین اولیاء (b). شیخ فرید الدین گنج شکر (c). خواجہ نصیر الدین چراغ (d). سیدی مولہ

5. سلطان جلال الدین خلجی کے قتل کی سازش کو انجام دینے میں کس نے سب سے زیادہ علاء الدین کا ساتھ دیا تھا؟

(a). ارکلی خان (b). ملک خسرو (c). ملک احمد چپ (d). الماس بیگ

6. سلاطین دہلی میں سے کس نے اشیاء کا نرخ متعین کیا تھا؟

(a). جلال الدین خلجی (b). علاء الدین خلجی (c). محمد شاہ تغلق (d). فیروز شاہ تغلق

7. ملک کافور کو کس نے نائب ملک کے عہدہ پر فائز کیا تھا؟

(a). مبارک شاہ (b). علاء الدین خلجی (c). محمد شاہ تغلق (d). شہاب الدین

8. خلجی خاندان کے آخری حکمراں کا نام بتائیے؟

(a). قطب الدین مبارک شاہ (b). شہاب الدین (c). فیروز شاہ (d). ملک چھجو

9. سلاطین دہلی میں سے حافظ قرآن کون تھا؟

(a). غیاث الدین تغلق (b). فیروز شاہ تغلق (c). محمد شاہ تغلق (d). علاء الدین خلجی

10. سلاطین دہلی میں سے کس نے پایہ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کرنے کی کوشش کی تھی؟

(a). غیاث الدین تغلق (b). فیروز شاہ تغلق (c). محمد شاہ تغلق (d). علاء الدین خلجی

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. خلجی خاندان کی حکومت کے قیام واستحکام میں جلال الدین خلجی کے رول کو نمایاں کیجیے۔
2. عہد علائی کی فوجی مہمات پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. خلجی خاندان سے حکومت کے خاتمہ کے اسباب کا جائزہ لیجیے۔
4. محمد شاہ تغلق کے دور کے اہم واقعات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیجیے۔
5. فیروز شاہ تغلق نے اپنی مملکت میں امن وامان قائم کرنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی تھی؟ تحریر کیجیے۔

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عہد علائی پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے۔
2. عہد خلجی کی اصلاحی کوششوں پر گفتگو کیجیے۔
3. تغلق خاندان میں حکومت کا قیام واستحکام کیسے ہوا؟ مفصل بیان کیجیے۔

6.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. منتخب التواریخ : ملا عبد القادر بدایونی
2. جامع تاریخ ہند : محمد حبیب۔ خلیق احمد نظامی
3. تاریخ ہندوستان (دوم) : محمد ذکاء اللہ دہلوی
4. تاریخ فرشتہ (اول) : محمد قاسم فرشتہ
5. آب کوثر : شیخ محمد اکرام

اکائی 7: دہلی سلطنت (خاندانی حکومتیں-2)

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 سید خاندان (1414-1451ء)
7.2.1 خضر خان
7.2.2 مبارک شاہ
7.2.3 محمد شاہ
7.2.4 علاء الدین
7.3 لودھی خاندان (1451-1526)
7.3.1 بہلول خان لودھی
7.3.2 نظام خان سکندر لودھی
7.3.3 ابراہیم لودھی
7.4 اکتسابی نتائج
7.5 نمونہ امتحانی سوالات
7.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

اِس اکائی سے پہلے آپ نے دہلی سلطنت کے قیام واستحکام اور اس ضمن میں غلام خاندان کے حالات کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد خلجی خاندان اور تغلق خاندان کی حکومت سے بھی آپ واقف ہو چکے ہیں۔ اِس اکائی میں دہلی سلطنت کے تحت سید اور لودھی خاندانوں میں حکومت کے حالات آپ کے مطالعہ میں آئیں گے۔

7.1 مقاصد

دہلی سلطنت میں سید اور لودھی خاندان کی حکومتیں دورزوال کی حکومتیں ہیں۔ سید خاندان میں مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں، بہت سے خود مختار صوبے بھی وجود میں آ گئے تھے، جنہیں وہ ختم کرنے اور اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کی ناکام کوشش کرتے رہے تھے۔ پھر لودھی خاندان میں نسبتاً سلطنت کے حالات بہتر ہوئے تھے لیکن بہت جلد ہی ان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام حالات کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے۔ حکمرانوں کے طرز حکمرانی، انتظام وانصرام، امن وامان کے قیام کی کوششیں، اصلاحی کوششیں، بغاوتوں کی وجوہات اور ان کو فرو کرنے کے اقدامات وغیرہ سے آگاہ ہونا ہے۔

7.2 سید خاندان (1414-1451ء)

سید خاندان کا پہلا حکمراں خضر خان ہوا۔ وہ پہلے ملتان کا حاکم تھا، لیکن 798ھ مطابق 1396ء میں سارنگ خان نے اس پر حملہ کر کے ملتان، لاہور اور دیپالپور پر قبضہ کر لیا تھا۔

ناصر الدین محمود شاہ کے دور میں ہندوستان پر تیمور کا حملہ 800ھ مطابق 1398ء میں سندھ کی جانب سے ہوا تھا۔ پھر وہ ملتان کے راستہ لوٹ مار کا بازار گرم کرتے ہوئے دہلی پہنچا، اور پندرہ دنوں تک اسے خوب لوٹا، ظلم وبربریت کا خوب خوب مظاہرہ ہوا۔ پھر میرٹھ، درہ کوپلہ (ہردوار)، سوالک، نگر کوٹ، جموں کشمیر اور آخر میں لاہور میں لوٹ مار کرتے ہوئے 801ھ مطابق 1399ء میں وہ ہندوستان سے واپس ہو گیا۔

جب تیمور ہندوستان سے واپس ہونے لگا تو اس نے خضر خان کو ان تمام علاقوں کا اپنا نائب بنا دیا جو اس کے حملہ کی زد میں آکر فتح ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ اس وقت ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں طاعون اور قحط زوروں پر تھا۔ اس لئے تیمور کی واپسی کے بعد خضر خان نے خود کو ملتان، لاہور اور دیپال پور تک محدود کر لیا اور انہی علاقوں کو مستحکم کرنے میں مصروف رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال خان ملو نے اپنی کوششوں سے دہلی اور اطراف کے بعض اضلاع میں اپنی اقتدار قائم کر لی، پھر بعد میں سلطان ناصر الدین محمود شاہ تغلق نے جو تیمور کے دہلی پر حملے کے دوران گجرات اور مالوہ کے حکمرانوں کی پناہ میں چلا گیا تھا، وہاں آکر شاہی مسند پر متمکن ہو گیا۔ اس کے بعد 808ھ مطابق 1405ء میں اقبال خان نے خضر خان کے خلاف فوج کشی کی، لیکن اجودھیان میں دھنداندی کے کنارے ایک جنگل میں اسے شکست ہوئی،

اور وہ مارا گیا۔

814ھ مطابق 1412ء میں خضر خان روہتک، نارنول، میوات، تجارہ کے راستے دہلی آیا اور اس کا محاصرہ کر لیا، لیکن قحط کی وجہ سے اسے یہ محاصرہ اٹھالینا پڑا۔ اس محاصرہ کے محض ایک سال بعد یعنی 815ھ مطابق 1413ء میں سلطان محمود شاہ کی طبیعت خراب ہوئی اور اسی میں وہ فوت ہو گیا۔ اس کے بعد امرائے سلطنت نے باہمی مشورے سے دولت خان لودھی کو تخت شاہی پر بیٹھا دیا، جو محض ایک سال حکمراں رہا۔ بعد ازاں خضر خان نے دہلی کا محاصرہ دوبارہ کر لیا، اور دہلی فتح کر لی گئی۔ دولت خان لودھی کو قید کر لیا گیا اور دہلی سلطنت پر 817ھ مطابق 1414ء میں خضر خان کا قبضہ ہو گیا۔

خضر خان کو ان علاقوں میں نائب مقرر کرنے میں دراصل تیمور کے پیش نظر دو باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ سید خاندان کا بڑا قدرداں تھا، اور چونکہ خضر خان سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ تیمور نے اسے دوسروں پر ترجیح دیتے ہوئے اپنا نائب بنایا تھا۔ پھر دوسری وجہ سیاسی نوعیت کی تھی کہ اس نے ہندوستان میں اپنا ایک نائب مقرر کر دیا تاکہ جب آئندہ وہ یہاں آئے تو وہ اس کی راہیں ہموار کرنے میں معاون ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خضر خان جب دہلی سلطنت پر قابض ہوا اور بعد میں اس کے خاندان کے لوگ حکمراں بنے تو اسے سید خاندان کی حکومت کہا گیا۔

7.2.1 خضر خان

خضر خان جب تخت نشیں ہوا تو اس نے خود کے لئے نہ ہی سلطان کا لقب اختیار کیا اور نہ ہی خطبوں میں اپنا نام شامل کیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے نام کے سکے بھی جاری نہیں کئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو بجائے سلطان کے امیر تیمور کا نائب سمجھتا رہا تھا۔ البتہ آخری عہد میں اس نے خطبوں میں اپنا نام شامل کرا لیا تھا، اور ساتھ ہی اپنے نام کے سکے بھی جاری کر دیئے تھے۔ تخت نشیں ہونے کے بعد اس نے اپنے معتمدین کو اہم عہدوں پر فائز کیا، مثلاً ملک الشرق ملک تحفہ کو تاج الملک کا خطاب دے کر وزیر اعظیم مقرر کیا، سید سالم سید سادات کو سہارنپور کا حکم، ملک سلیمان کو ملتان اور فتح پور کا حاکم، اور ملک سردار کو شہر کا کوتوال متعین کیا، اور ملک خیر الدین کو اپنی غیبوبت کے اوقات کے لئے اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ پھر ان بغاوتوں کی جانب متوجہ ہوا جو تسلسل کے ساتھ پوری سلطنت میں ہو رہی تھیں۔ ان بغاوتوں کا آغاز تغلق خاندان کی حکمرانی کے اخیر دور ہی میں ہو گیا تھا۔ پھر تیمور کے حملہ کے بعد صوبائی حکام یکے بعد دیگرے اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے چلے گئے تھے۔ خضر خان کی پوری کوشش رہی کہ کسی طرح سلطنت میں امن وامان قائم ہو جائے، لیکن اس کا پورا عہد حکومت ان بغاوتوں کو فرو کرنے ہی میں گزر گیا۔ صورتحال یہ تھی کہ وہ کسی ایک جگہ کی بغاوت فرو کر کے دوسری جگہ جاتا، تو پہلی جگہ کے لوگ دوبارہ باغی ہو جاتے تھے۔ اس نے سات سالوں سے کچھ زائد مدت حکومت کی لیکن ہمیشہ وہ ان بغاوتوں کو دبانے ہی میں مصروف رہا۔

اس کے ان کاموں میں سب سے بڑا معاون ومددگار اس کا وزیر اعظم ملک تاج الملک تھا جس کا انتقال 824ھ مطابق 1421ء میں ہو گیا، جس کی وجہ سے گویا اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ تاج الملک کے بعد اس کے صاحبزادہ ملک الشرق ملک سکندر کو وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز کیا گیا لیکن اس سے سلطان کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ اسی سال وہ گوالیار اور اٹاوہ کی بغاوتیں فرو کرنے گیا ہوا تھا۔ دوران سفر اس کی طبیعت

خراب ہو گئی۔ پھر بتدریج اس کی طبیعت اس قدر بگڑی کہ پھر نہ سنبھلی اور بالآخر اسی میں اس کی وفات ہو گئی۔

7.2.2 مبارک شاہ

خضر خان نے اپنی وفات سے پہلے ہی اپنے صاحبزادہ مبارک خان کو فیروز پور اور سرہند کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ پھر اپنی موت سے محض تین دنوں قبل اسے اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کی وفات کے تیسرے دن امراء و وزراء کے اتفاق رائے سے وہ جمادی الاول 824ھ مطابق 1421ء کو معز الدین ابو الفتح مبارک شاہ کے نام سے تخت حکومت پر بیٹھا۔ وہ ایک نیک بادشاہ تھا، اور انتظام وانصرام کو درست کرنے اور امن وامان قائم کرنے کی اس نے بڑی کوششیں کیں۔ تاہم مبارک شاہ کا دور حکومت بھی خضر خان کے دور کی طرح بغاوتوں اور شورشوں سے پُر رہا۔ اس کا پورا عہد ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں گزر گیا، اور کوشش کے باوجود اس کی مملکت میں امن وامان کا قیام عمل میں نہیں لایا جا سکا۔

اس عہد میں جو بغاوتیں ہوئیں ان میں پنجاب کی بغاوت خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا سرغنہ جسرت گھکڑ تھا۔ اس کا آغاز خضر خان کے دور سے ہی ابتدائی شورش کی شکل میں ہو گیا تھا۔ پھر جب خضر خان کا انتقال ہوا تو اس نے بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جسرت گھکڑ دل ہی دل میں بادشاہی کا خواب دیکھا کرتا تھا، لیکن وہ کبھی کھل کر حکومت کے مقابلہ میں میدان میں نہیں لڑا۔ وہ عام طور پر شاہی کاروانوں کو لوٹ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ لاہور، پنجاب اور ان کے اطراف کے علاقے اس کی لوٹ مار اور تباہ کاریوں کا نشانہ بنتے تھے۔ ان کی شرارتوں سے پریشان ہو کر ان علاقوں کے باشندے نقل مکانی کر کے دوسرے علاقوں میں آباد ہونے لگے تھے۔ جب سلطان مبارک شاہ نے اس کی سرکوبی کرنی چاہی تو جسرت گھکڑ اور اس کے لوگ پہاڑوں میں جا کر چھپ جاتے تھے، اور جب سلطانی فوج واپس ہوتی وہ دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ اس طرح تین مرتبہ مبارک شاہ نے ان کی سرکوبی کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

اسی دوران کابل کے حاکم امیر شیخ علی نے پنجاب اور ملتان کے علاقوں پر حملہ کر دیا اور ان میں خوب لوٹ مار کا بازار گرم گیا۔ جسرت گھکڑ اور اس کے لوگوں نے اس کا خوب خوب ساتھ دیا۔ سلطان مبارک شاہ نے اس کے مقابلہ کے لئے عماد الملک کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی جنہوں نے بہت بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا اور وہ اپنے مال واسباب تک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر جسرت گھکڑ کی تحریک پر وہ دوبارہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ان دونوں نے پھر سے پنجاب اور ملتان کے علاقوں میں لوٹ مار مچایا۔ اس مرتبہ ان کے مقابلہ کے لئے سلطان مبارک شاہ خود میدان میں آیا اور وہ لوگ سلطان کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

اس دور میں جو بغاوتیں ہوئیں ان میں کھیڑا، اٹاوہ، گوالیار، میوات اور بیانہ وغیرہ کی بغاوتیں شامل ہیں۔ ان میں پے در پے بغاوتیں ہوتی رہیں اور سلطان انہیں فرو کرنے اور امن وامان قائم کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔

اپنی حکومت کے آخری دنوں میں وہ جمنا ندی کے کنارے اپنے نام پر ایک شہر مبارک آباد بسانے کے لئے کوشاں تھا، اور اس کے تعمیری کاموں کا خود ہی جائزہ لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ وہاں عمارتوں کے معائنہ کے لئے گیا ہوا تھا، وہ جمعہ کا دن تھا، وہ نماز پڑھ رہا تھا،

اسی دوران وزیر ملک سرور الملک (سرور الملک سلطان مبارک شاہ کے عہد میں وزارت سے متعلق کاموں کو انجام دیتا تھا، لیکن چونکہ وزارت کے تمام کام انجام دینا اس کے لئے بار گراں ہو رہا تھا اس لئے محاسبہ کا شعبہ اس سے لے کر کمال الملک کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے دیپالپور کا اقطاع بھی اس سے لے لیا گیا تھا جس کا اسے شدید غصہ تھا۔ چنانچہ اس نے سلطان کے بعض غداروں اور حلیفوں کو اپنے ساتھ ملا کر اس کے خاتمہ کا منصوبہ بنایا، جسے مبارک آباد میں 837ھ مطابق 1433ء کو انجام دیا گیا) کے اشارہ پر اس پر قاتلانہ حملہ ہوا اور اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ یہ واقعہ رجب 837ھ مطابق 1434ء کا ہے۔ اس نے تیرہ سال سے کچھ زائد مدت حکومت کی۔

7.2.3 محمد شاہ

مبارک شاہ کے قتل کے بعد محمد شاہ کو تخت سلطانی پر بیٹھا دیا گیا۔ وہ مبارک شاہ کا متبنیٰ تھا۔ اس کی تخت نشینی میں سب سے بڑا ہاتھ سرور الملک کا تھا۔ محمد شاہ کو سلطان بنانے کے پیچھے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ برائے نام سلطان رہے اور سارے اختیارات اس کے پاس آجائیں۔ چنانچہ اس نے سارا خزانہ اور سارے اہم شعبہ جات کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔

جب وہ اپنے اس پہلے مرحلہ کی کوشش میں کامیاب ہو گیا تو پھر اس نے اپنے ان تمام معاونین اور حلیفوں کو جنہوں نے مبارک شاہ کے قتل میں کسی بھی طرح اس کے ساتھ تعاون کیا تھا، انہیں اس نے بھرپور طریقہ پر نوازا۔ جنہوں نے مبارک شاہ کے قتل میں کلیدی کردار ادا کیا تھا انہیں مختلف علاقوں کا حاکم بنایا، بعضوں پر جاگیروں کی شکل میں نوازشیں ہوئیں، بعض لوگوں پر انعام واکرام، خلعتیں اور خطابات کی عطا ہوئی۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے کسی بھی طرح مبارک شاہ کے قتل کی مخالفت کی تھی انہیں دھوکہ سے بلا کر یا تو قتل کرا دیا یا قید میں ڈال دیا۔ اس طرح سرور الملک اپنے ہاتھ میں اختیارات لئے ہوئے من مانیاں کرتا رہا۔

جو لوگ سرور الملک کے خلاف اور سلطان مبارک شاہ کے حامی و مددگار تھے ان میں سرفہرست کمال الملک کا نام آتا ہے۔ چنانچہ اس نے مبارک شاہ کے حامی امراء کی مدد سے سرور الملک کے خلاف ایک فوج تیار کر کے دہلی پر حملہ کر دیا۔ وہ قلعہ میں بند ہو کر تین مہینوں تک مقابلہ کرتا رہا۔ پھر اسے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ سلطان محمد شاہ کو ختم کر دیا جائے جس کا رجحان اور میلان کمال الملک کی جانب ہے۔ چنانچہ وہ اپنے خاص آدمیوں کو لے کر سلطان کے محل کی جانب بڑھا، لیکن جب سلطان کے حفاظتی دستوں کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوا تو اسی میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ جب اس باغی سے سلطان کو نجات ملی تو اس نے کمال الملک کو کمال خان کے خطاب کے ساتھ وزیر اعظم کی ذمہ داری تفویض کی، اور جن لوگوں نے باغیوں کے خاتمہ میں کمال الملک کے ساتھ فوج کی تیاری میں ساتھ دیا تھا ان تمام کو انعامات واکرامات سے نوازا، بہتوں کو جاگیریں دیں اور بعضوں کو مختلف علاقوں کا حاکم بھی بنایا گیا۔ ان ابتدائی انتظامی اقدامات سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے حکومت کے انتظام وانصرام سے اپنا پلہ جھاڑ لیا اور عملی طور پر سارے کام اپنے امیروں اور وزیروں کے سپرد کر دیا، اور وہ تفریح اور عیش وعشرت میں اپنی صبح وشام گزارنے لگا۔

سلطان نے اپنی عیش وعشرت کے نتیجہ میں بہت سے غلط فیصلے بھی لئے۔ مثلاً سرہند کا حاکم ملک بہلول خان تھا، اس نے باغی ہو کر دیپالپور اور لاہور پر قبضہ کر لیا تھا۔ سلطان نے اس بغاوت کو ختم کرنے اور امن وامان قائم کرنے کے لئے حسام خان کو بھیجا لیکن حسام خان کو

شکست ہو گئی۔ پھر سلطان نے چاہا کہ وہ بہلول خان سے صلح کر لے، لیکن بہلول خان نے یہ شرط رکھی کہ حسام خان کو قتل کر دیا جائے اور اس کے آدمی حمید خان کو وزارت کے عہدہ پر فائز کر دیا جائے۔ سلطان نے بہلول خان کی یہ شرط منظور کر لی اور حسام خان کو قتل کر کے حمید خان کو وزارت کا عہدہ سپرد کر دیا۔ اسی طرح ایک دوسرا واقعہ 844ھ مطابق 1440ء میں پیش آیا جب ملاوہ کا حکمران سلطان محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کیا تو اس نے بہلول خان سے مدد مانگی۔ پھر جب بہلول خان اس کی مدد کے لئے آ گیا اور دونوں فوجوں میں مقابلہ ہو رہا تھا کہ اس نے خاموشی سے اپنا ایک قاصد بھیج کر محمود خلجی سے صلح کر لی۔

اپنی حکومت کے آخری دنوں میں وہ بیمار پڑا اور اسی بیماری میں وہ 849ھ مطابق 1445ء میں فوت ہو گیا۔ اس نے بارہ سالوں سے کچھ اوپر حکومت کی۔

7.2.4 علاء الدین

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین 849ھ مطابق 1445ء میں تخت نشین ہوا۔ دہلی کا یہ سلطان مستقل مزاج نہ تھا، بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت جلد گھبرا جاتا تھا، احمقانہ فیصلے کر بیٹھتا تھا۔ چنانچہ تخت نشینی کے ایک سال بعد 850ھ مطابق 1446ء میں جب وہ بیانہ فتح کرنے کے لئے رواں دواں تھا تو کہیں سے یہ غلط خبر گردش کرنے لگی کہ جونپور کا حاکم دہلی کی تسخیر کے لئے آ رہا۔ اس خبر کے اس کے کانوں پر پڑتے ہی آناً فاناً میں بیانہ پر حملہ کا ارادہ ترک کر کے اس نے دہلی کی جانب واپسی کا حکم دے دیا۔

بغاوتوں کا سلسلہ پہلے ہی سے چلا آ رہا تھا، جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ اِس دور میں چونکہ سلطان کو مملکت کے کاموں سے کچھ خاص لگاؤ نہ تھا اس لئے دہلی سلطنت کے جو صوبے پہلے باغی تھے وہ اب مستقل طور پر اپنی خود مختاری کے دعوے کرنے لگے۔ چنانچہ گجرات، سندھ، مالوہ، ملتان، پنجاب، دکن، بنگال، جونپور، گوالیار، دھولپور، بھدورا، سنبھل، نارنول، بیانہ، اودھ، بہار وغیرہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں دہلی کے بہت ہی محدود اطراف میں دہلی سلطنت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر داخلی طور پر بھی ایسے لوگ موجود تھے جو اپنی مفاد کے خاطر کچھ بھی کر گزرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں سلطان کا ایک قریبی امیر رائے پرتاپ تھا، جسے وزیر اعظم حمید خان سے سخت دشمنی تھی، کیونکہ اس کے والد نے رائے پرتاپ کے ملک پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا اور ساتھ ہی اس کی بیوی کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ چنانچہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے وزیر اعظم کے خلاف سلطان کے کان بھرنے شروع کئے کہ ان بغاوتوں کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک کہ حمید خان کو وزارت عظمیٰ کے منصب سے ہٹا نہ دیا جائے اور اسے قید کر دیا جائے۔ چنانچہ سلطان نے اپنے اس قریبی عزیز کی بات پر عمل کرتے ہوئے پہلے حمید خان کو وزارت کے عہدہ سے معزول کیا پھر اسے قید کر دیا۔ لیکن جب رائے پرتاپ کو اس پر بھی تشفی نہ ہوئی تو اس نے سلطان کو یہ کہنا شروع کیا کہ حمید خان کے قید کر دینے سے تو بغاوتیں نہیں رکیں، لیکن اگر اسے قتل کر دیا جائے تو اس بات کا پختہ یقین ہے کہ ساری بغاوتیں ختم ہو جائیں گی اور سب مطیع و فرمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ سلطان نے حمید خان کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔ لیکن جب اس کی اطلاع حمید خان کے بھائیوں اور اس کے ساتھیوں کو ہوئی تو انہوں نے حملہ کر کے حمید خان کو قید سے آزاد کرا لیا۔ آزاد ہونے کے بعد اس نے اپنے

حامیوں کے ساتھ حرم شاہی میں حملہ کر دیا اور انہیں بہت بے عزت ورسوا کر کے وہاں سے نکال باہر کیا، ساتھ ہی شاہی خزانے پر بھی اس نے قبضہ کر لیا۔ اس پر مزید اس نے یہ کیا کہ ملک بہلول خان کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دے دی۔

اس دور میں جو واقعات رونما ہوئے ان میں ملک بہلول کا دہلی پر حملہ خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ دہلی کی کمزور حکومت اور انتظام وانصرام کے سلسلہ میں سلطان کی بے توجہی کو جب اس نے دیکھا تو 851ھ مطابق 1447ء میں دہلی پر اس وقت اس نے پہلا حملہ کیا، جب سلطان اپنی خاص پسندیدہ جگہ بدایوں گیا ہوا تھا، اور کافی دنوں تک وہیں مقیم رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ملک بہلول دہلی فتح کر لینے میں ناکام رہا۔ پھر اس کا دوسرا حملہ اس وقت ہوا جب سلطان دوبارہ بدایوں چلا گیا تھا اور وہیں مقیم ہو گیا تھا۔ اس کا واقعہ یوں ہوا کہ چونکہ بدایوں سلطان کو بے حد پسند تھا، اس لئے اس کی خواہش تھی کہ دہلی کے بجائے بدایوں کو پایہ تخت بنالیا جائے۔ لیکن امراءنے جب اس کی مخالفت کی تو وہ ناراض ہو کر اپنی بیوی کے ساتھ بدایوں چلا گیا اور مستقل طور پر وہیں رہنے لگا تھا۔ پھر حمید خان نے بھی اسے دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ 854ھ مطابق 1450ء میں اس نے دہلی پر حملہ کر دیا اور اس پر قابض ہو گیا۔ پھر وہاں اپنے بیٹے بایزید کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے خود اپنی طاقت کو مضبوط و مستحکم کرنے کی غرض سے پنجاب اور دیپالپور چلا تھا۔ جب واپس آیا تو اسے ایک خط ملا جس میں اسے سلطان علاء الدین کی جانب سے دہلی سلطنت پیش کی گئی تھی اور سلطان نے لکھا تھا کہ چونکہ میرے والد نے تمہیں اپنا بیٹا بنایا تھا اس لئے تم میرے بڑے بھائی ہوئے اور اسی لئے میں تمہیں دہلی کی حکومت دیتا ہوں اور میں خود بدایوں پر قناعت کروں گا۔

اس خط کے بعد ملک بہلول خان نے 855ھ مطابق 1451ء میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سید خاندان سے دہلی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور لودھی خاندان میں حکومت کا آغاز ہوا۔ سلطان علاء الدین مستقل طور پر بدایوں میں اقامت اختیار کئے رہا۔ 883ھ مطابق 1478ء تک وہ زندہ رہا اور اس کی وفات وہیں بدایوں ہی میں ہوئی۔ یہ سید خاندان کا آخری سلطان تھا جس نے دہلی سلطنت پر سات سال سے کچھ زائد مدت تک حکومت کی۔

7.3 لودھی خاندان (1451-1526)

855ھ مطابق 1451ء میں بہلول لودھی کی تخت نشینی سے دہلی سلطنت میں سید خاندان کے بعد لودھی خاندان کی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ اس خاندان کے صرف تین افراد نے حکومت کی، لیکن ان کی مدت حکومت 75 سالوں پر محیط ہے۔ لودھی خاندان اصلاً افغانی ترک تھے جو تجارتی مقاصد کے تحت ہندوستان آتے رہتے تھے، پھر ان میں سے اکثر فوجی ملازمت بھی اختیار کر کے یہیں آباد ہو جاتے تھے۔ بہلول لودھی کا دادا ملک بہرام نے فیروز شاہ تغلق کے دور میں ملتان میں آباد ہو کر ملتان کے حاکم کے یہاں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بہلول لودھی کے والد اس کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے، اور اس کی والدہ پر مکان کی چھت گر جانے کی وجہ سے اس کی پیدائش سے کچھ وقت پہلے موت ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے چچا اسلام خان نے اس کی پرورش وپرداخت کی ذمہ داری سنبھالی۔ چچا کی نگرانی میں وہ ایک بڑا ہی لائق فوجی بن کر تیار ہوا، پھر بعد میں اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے چچا نے اپنی لڑکی سے اس کی شادی بھی کرادی، اور اپنے بعد

اسے سرہند کا اپنا جانشین بھی مقرر کر دیا۔ لیکن جب اسلام خان کی وفات ہوئی تو اس کے اور چچازاد بھائیوں کے درمیان مسلسل خانہ جنگی ہوتی رہی، اور کسی کو بھی اسلام خان کی ذمہ داریاں انجام دینے کا موقع نہ ملا۔ بالآخر بہلول خان نے اپنے حمایتیوں کی ایک بڑی فوج جمع کر کے سرہند پر قبضہ کر لیا، جس کے بعد چچا اسلام خان کی اولاد بھی اس کی اطاعت میں آ گئی۔ اس کے بعد دہلی سلطنت کے ساتھ اس کی جو چپقلش تھی اس کی تفصیل آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔

7.3.1 بہلول خان لودھی

بہلول لودھی جب تخت شاہی پر متمکن ہوا تو اس نے سابقہ بغاوتوں کو فرو کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی، ساتھ ہی اس نے دہلی سلطنت میں توسیع بھی کی۔ دہلی سلطنت کی بد انتظامی سے فائدہ اٹھا کر جن صوبوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا ان میں جونپور کی شرقی حکومت خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس نے خاصی طاقت اختیار کر لی تھی۔ جب بہلول لودھی حکمران ہوا اس وقت اس کا حکمران محمود شاہ شرقی تھا، جو سید خاندان کے حکمران علاء الدین کا داماد تھا، جس کی وجہ سے دہلی سلطنت کا زیادہ مستحق وہ خود کو سمجھتا تھا۔ پھر جو لوگ بہلول لودھی کے مخالفین تھے وہ بھی اس کے ساتھ مل گئے تھے اور مسلسل اسے دہلی پر حملہ کرنے اور قبضہ کر لینے پر ابھارتے رہتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں محمود شاہ شرقی نے دہلی پر حملہ کی تیاری کی اور ایک ہزار ہاتھی اور ایک بہت بڑی فوج تیار کر کے دہلی پر ایک ایسے وقت میں حملہ آور ہوا جبکہ بہلول لودھی خود دہلی میں موجود نہ تھا وہ دیپالپور گیا ہوا تھا۔ چنانچہ بہلول لودھی کا بیٹا خواجہ بایزید قلعہ بند ہو کر اس کا مقابلہ کرتا رہا اور چونکہ قلعہ کے اندر مرد کم تھے اس لئے عورتیں بھی اس نازک موقع پر مردانہ لباس زیب تن کر کے اندر سے ان کا مقابلہ کرتی رہیں۔ پھر جب اس کی اطلاع بہلول خان لودھی کو ہوئی تو وہ ایک بڑی فوج تیار کر کے دہلی کی جانب لپکا۔ جب محمود شاہ شرقی کو اس کی خبر ہوئی تو اس کا راستہ روکنے کے لئے اس نے ایک فوج بھیجی لیکن پانی پت کے قریب اسے شکست ہوئی اور بالآخر اسے بھی دہلی کا محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور ہو جانا پڑا۔

پھر کچھ دنوں بعد ان دونوں کے درمیان اٹاوہ اور شمس آباد میں مقابلے ہوئے لیکن دونوں کا خاتمہ صلح پر ہوا۔ البتہ شمس آباد میں مقابلہ کے دوران محمود شاہ شرقی کی طبیعت خراب ہوئی اور اسی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ شرقی اس کا جانشین ہوا، اور ان دونوں کے درمیان پرگنہ راپری کے قریب پھر سے جنگ ہوئی۔ اس جنگ کے دوران ہی جونپور میں محمد شاہ شرقی کے بھائیوں کے درمیان محمود شاہ شرقی کی جانشینی کے سلسلہ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اس لئے محمد شاہ شرقی کو میدان چھوڑ کر جانا پڑا اور اس طرح میدان بہلول خان لودھی کے ہاتھ رہا۔

محمد شاہ شرقی جب جونپور پہنچا تو اس کا بھائی حسین خان کو بادشاہ بنایا جا چکا تھا۔ چنانچہ حسین خان نے گرفتار کرا کر اس کا کام تمام کرا دیا، اور بہلول خان لودھی سے تین سالوں کے لئے جنگ بندی پر صلح کر لیا۔ یہ تین سال امن و امان کے ساتھ گذرے اور بہلول لودھی مملکت کے انتظام وانصرام میں مصروف رہا۔ لیکن اس مدت کے گذرتے ہی حسین شاہ نے دہلی پر حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ ادھر جب بہلول لودھی کو اس کی اطلاع ملی کہ حسین شاہ دہلی پر حملہ کے لئے ایک بڑی فوج لے کر آ رہا ہے، وہ پنجاب اور ملتان کے انتظامات میں

مصروف تھا، اس نے ایک فوج تیار کر کے دہلی کی جانب کوچ کیا اور پھر ان دونوں کا چندوار کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ سات دنوں تک چلا، پھر تین سالوں کی جنگ بندی پر صلح کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوا۔

دوسری صلح کے بعد پھر سے حسین شاہ نے دہلی پر حملہ کرنا چاہا، اور اٹاوہ کے راستہ دہلی کی جانب پیش قدمی کی، لیکن امرائے سلطنت نے ان کے درمیان پھر سے صلح کرادی۔ لیکن پھر بھی ان کے درمیان جنگیں ہوتی رہیں۔ ایک جنگ سنکرہ میں ہوئی جس کا خاتمہ بھی صلح پر ہوا۔ 883ھ میں حسین شاہ نے دہلی پر ایک اور حملہ کیا، لیکن اسے ناکامی ہی ہاتھ لگی، بلکہ بہلول خان لودھی نے آگے بڑھ کر جونپور کی شرقی حکومت کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بھی ان کے درمیان مقابلے ہوتے رہے۔ لیکن ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہلول خان لودھی کامیاب ہوتا گیا اور جونپور کے علاقے ایک ایک کر کے دہلی سلطنت میں شامل ہوتے گئے، اور بالآخر 883ھ مطابق 1478ء میں بہلول خان لودھی جونپور کو فتح کر کے دہلی سلطنت میں شامل کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ جنگیں تقریباً 26 سالوں تک چلتی رہیں۔

جب مملکت کے بڑے حصے میں امن وامان قائم ہو گیا اور جونپور بھی فتح کر لیا گیا تو بہلول خان لودھی کو یہ خیال آیا کہ حکومت کو اپنے تمام صاحبزادوں اور عزیزوں کے درمیان تقسیم کر دینا چاہئے، تاکہ حکومت سے کوئی محروم نہ رہے۔ چنانچہ جونپور کا علاقہ بڑے بیٹے شہزادہ باربک کو، شہزادہ عالم خان کو کڑہ مانک پور، بھانجہ شیخ محمد فرملی کو بہرائچ، پوتا اعظم ہمایوں بن خواجہ بایزید کو لکھنؤ وکالپی، معتمد امراء خان جہاں کو بدایوں، اور شہزادہ نظام خان (سکندر لودھی) کو دہلی اور دوآبہ کا بڑا علاقہ دینے کے ساتھ ساتھ اسے اپنا جانشین متعین کر دیا۔ حالانکہ امرائے سلطنت کی رائے یہ تھی کہ سکندر لودھی کے بجائے پوتا اعظم ہمایوں کو ولی عہد مقرر کیا جائے۔ چنانچہ 894ھ مطابق 1488ء میں جب سلطان بہلول لودھی اٹاوہ کے سفر میں تھا، اس کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے امراء نے اس پر زور ڈالا کہ ولی عہد تبدیل کر کے اعظم ہمایوں کو منتخب کر دیا جائے، جس کے لئے وہ تیار بھی ہو گیا تھا لیکن وقت نے اسے اس کی مہلت نہ دی اور بھدالی کے قریب ضلع سکیت میں اس کی وفات ہو گئی۔

سلطان بہلول خان لودھی بہت ہی اچھے اخلاق وکردار کا حامل شخص تھا۔ وہ اسلامی تعلیمات پر بھی عمل آوری کی پابندی کرتا تھا۔ حکومت کے انتظامی معاملات میں وہ بڑا مستقل مزاج تھا، جب اس کے دل میں کوئی ایک بات بیٹھ جاتی تو اسے انجام دے کر ہی مانتا تھا۔ اس کے امراء وحکام میں اکثریت افغانوں کی تھی۔ جب وہ اس کے پاس آتے تو وہ ان کے برابر جا کر بیٹھ جاتا تاکہ چھوٹے بڑے کا فرق ختم ہو جائے۔ پھر اگر کوئی امیر یا حاکم اس سے ناراض ہوتا تو اس کی ناراضگی دور کرنے کی بھی کوشش کرتا تھا۔

7.3.2 نظام خان سکندر لودھی

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ سلطان بہلول نے اپنا ولی عہد شہزادہ نظام خان کو منتخب کیا تھا، حالانکہ امراء کی رائے یہ تھی کہ نظام خان کے بجائے اعظم ہمایوں کو ولی عہد بنایا جائے، جس کے لئے انہوں نے سلطان بہلول کی وفات کے وقت کوششیں بھی کی تھیں، اور سلطان نے ان کی رائے کے احترام میں ولی عہد تبدیل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن عملی طور پر وہ اسے انجام نہیں دے سکا تھا۔ چنانچہ جب اس کی وفات ہوئی تو نئے سلطان کے انتخاب میں امرائے سلطنت کے تین گروہ بن گئے، جن میں ایک گروہ اعظم ہمایوں کی تائید میں تھا۔ ان کا یہ

کہنا تھا کہ چونکہ سلطان بہلول اپنا ولی عہد تبدیل کر کے اعظم ہمایوں کو منتخب کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اس لئے وہی جانشینی کا صحیح حقدار ہے۔ دوسرا اگروہ نظام خان کی حمایت میں تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ گرچہ سلطان نے اپنا ولی عہد تبدیل کرنے کا من بنا چکا تھا لیکن اس نے اسے عملی جامہ نہیں پہنایا تھا، لہٰذا تخت حکومت پر بیٹھنے کا زیادہ مستحق وہ ہے جسے عملی طور پر سلطان نے منتخب کر دیا تھا۔ پھر امراء کا تیسرا گروہ سلطان کے بڑے صاحبزادہ باربک شاہ کے ساتھ تھا۔ اس دوران سلطان بہلول کا چچازاد بھائی عیسیٰ خان اور ایک طاقتور امیر خان خاناں قرملی کے درمیان سخت قسم کی بحث ہو گئی۔ عیسیٰ خان باربک شاہ کی حمایت میں تھا۔ وہ اس خیال کا حامل تھا کہ (چونکہ نظام خان کی والدہ ایک سنار کی بیٹی تھی اس لئے) ایک سنار کی بیٹی کا بیٹا تخت شاہی پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہے، اور یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے، پھر اس نے نظام خان کی والدہ کی شان میں اور امیر خان خاناں کی بھی گستاخی کی۔ یہ سب دیکھ کر امیر خان خاناں قرملی کو بڑا غصہ آیا اور اس نے نہ صرف نظام خان کی حمایت کی بلکہ اس کی والدہ کی گستاخی کرنے پر اسے سخت سست کہا۔ پھر وہ ہم خیال امراء کو اپنے ساتھ لے کر قصبہ جلالی چلا گیا جہاں اس نے نظام خان کو بلا کر دریائے بیاس کے کنارے کوشک سلطان فیروز نامی مقام پر سلطان سکندر لودھی کے نام سے شعبان 894ھ مطابق 1488ء کو تخت حکومت پر بیٹھا دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے عیسیٰ خان کی جانب توجہ کی، اور اس کے خلاف فوج کشی کرتے ہوئے اس پر فتح حاصل کر لی اور پھر اسے معاف بھی کر دیا۔

تخت نشینی کے ساتھ ہی سلطان سکندر لودھی ان بغاوتوں اور خود مختار ہونے والے امراء اور عزیزوں کی جانب متوجہ ہوا جنہوں نے سلطان بہلول لودھی کی وفات کا فائدہ اٹھا کر بغاوتیں کی تھیں یا اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کا بڑا بھائی باربک شاہ نے جونپور میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا، چنانچہ اس نے 895ھ مطابق 1489ء میں اس کے خلاف فوج کشی کی اور اس پر فتح حاصل کر کے اسے جونپور کا حاکم باقی رکھا۔ سلطان حسین شاہ شرقی جسے سلطان بہلول نے کئی مرتبہ شکست دے کر جونپور کی شرقی حکومت کو زیر کر لیا تھا، اور جونپور دہلی سلطنت کے تحت آ گیا تھا۔ جب سکندر لودھی سلطان بنا تو اس نے دوبارہ سر اٹھانے کی کوششیں کیں اور اس کے خلاف کئی جنگیں ہوئیں، ان تمام ہی میں اسے شکست ہوتی رہی، اور سکندر لودھی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہار تک اپنی مملکت کی سرحدیں وسیع کر دی تھیں۔ ان بغاوتوں کے ساتھ ساتھ سکندر لودھی کی کئی جنگیں مملکت کی توسیع کے لئے بھی ہوئیں۔ جن علاقوں کی بغاوتیں فرو کی گئیں، یا جن پر فوج کشی کر کے دہلی سلطنت میں شامل کر لیا گیا ان میں بیانہ، اودھ، بیدر، دھولپور، چندیری، گوالیار، پنجاب، دوآبہ، ترہت وغیرہ شامل ہیں۔ بہلول لودھی اور سکندر لودھی کے ادوار میں بغاوتوں کو جس بڑے پیمانے پر فرو کیا گیا اور خود مختار علاقوں کو دہلی سلطنت میں شامل کیا گیا، اور انتظام وانصرام کو جس بہتر طریقہ پر انجام دینے کی کوشش کی گئی اس سے خلجی اور تغلق خاندان کے عہد حکومت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لودھی خاندان کی مملکت کی وسعت اتنی تو نہ ہو سکی جتنی اُن ادوار میں تھی لیکن جن بغاوتوں کا سلسلہ تغلق خاندان کے آخری عہد میں شروع ہوا تھا اور سید خاندان کے پورے عہد میں جاری رہا، انہیں بہت تیزی کے ساتھ اِس دور میں فرو کر لیا گیا، ساتھ ہی اُن ادوار میں جن صوبوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا، ان میں سے بہتوں کو زیر کر کے دہلی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

آگرہ شہر سکندر لودھی کی یادگار ہے۔ یہ شہر اسی کا بسایا ہوا ہے، جس کی بنیاد اس نے 911ھ مطابق 1505ء میں رکھی تھی، اور

جس کے لئے جمنا ندی کے کنارے کا ایک ٹیلہ منتخب کیا گیا تھا۔ اسی شہر میں 923ھ مطابق 1517ء میں وہ بیمار پڑا اور اسی سال انتقال ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھائیس سال چند مہینے حکومت کی۔

سکندر لودھی ایک دیندار اور شریعت کا پابند حکمران تھا۔ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے بہت سارا سونا علماء اور غرباء میں تقسیم کر دیا تھا، تاکہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ اسے بدعات اور توہمات سے شدید نفرت تھی، وہ تعزیہ داری کا بھی سخت مخالف تھا، اس نے مزارات پر عورتوں کی حاضری پر روک لگا دی تھی، اس دور میں ان غیر مسلموں کو بھی سخت ترین سزاؤں سے دوچار ہونا پڑا تھا جو شدھی تحریک کے علمبردار تھے۔ اس نے غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے مستقل ایک شعبہ قائم کر رکھا تھا، تاکہ ان کا ہر طرح سے مالی تعاون کیا جا سکے۔ وہ مساجد کی تعمیر کا بھی بڑا شوقین تھا، چنانچہ اس کے زمانہ میں بہت بڑی تعداد میں مساجد تعمیر ہوئیں۔

والد کی طرح اس کے بھی امراء وحکام کی اکثریت افغانوں پر مشتمل تھی، جن کے ساتھ وہ نہایت ہی دوستانہ سلوک روا رکھتا تھا، اور ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک عدل پرور بادشاہ تھا۔ اس کی یہ کوشش رہتی تھی کہ اس کی رعایا میں سے کسی کے ساتھ بھی ناانصافی نہ ہو اور نہ ہی اس کے امراء وحکام میں سے کوئی کسی عام شہری پر ظلم وزیادتی کر سکیں۔

سکندر لودھی علم وعلماء کا بھی بڑا قدر داں تھا۔ اس نے طب کے موضوع پر "طب سکندری" کے نام سے ایک کتاب مرتب کروائی تھی، جو اس دور میں بہت ہی مستند اور ماخذ کی حیثیت کی حامل کتاب تصور کی جاتی تھی۔ اس کتاب کو ہندوستان اور سیستان کے ماہرین طب نے ترتیب دیا تھا۔ اس دور میں سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ بھی کیا گیا تھا۔ پھر اسی دور میں سلطان نے غیر مسلموں پر زور ڈال کر فارسی پڑھانا شروع کیا تھا۔ دراصل سلطان کی یہ خواہش تھی کہ سرکاری دفاتر میں مسلمان اور ہندو دونوں دوش بدوش کام کریں، لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس زمانہ میں دفتری زبان فارسی تھی اور ہندوؤں کو یہ زبان نہیں آتی تھی۔ لہٰذا سلطان نے انہیں بلا کر زور ڈالا کہ وہ فارسی سیکھیں اور سرکاری دفاتر میں کام کریں۔ چنانچہ انہوں نے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور ان میں فارسی جاننے والے بڑے بڑے علماء وفضلاء پیدا ہوئے، اور محض اپنی فارسی دانی کی بنیاد پر وہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز بھی ہوئے۔

7.3.3 ابراہیم لودھی

سکندر لودھی کا جب انتقال ہوا تو امرائے سلطنت نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا کہ سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور جن میں سے پہلے کا پایہ تخت دہلی ہو اور اس پر سکندر لودھی کا صاحبزادہ ابراہیم لودھی بیٹھے، جبکہ دوسرے حصہ کا مرکز جونپور ہو جس کا حکمراں سکندر لودھی کا دوسرا بیٹا جلال خان لودھی ہو۔ چنانچہ اسی مشورے پر عمل کرتے ہوئے 923ھ مطابق 1517ء کو ان کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی، اور جلال خان کو سلطان جلال الدین کا خطاب دے کر اس کے حامیوں پر مشتمل ایک لشکر دے جونپور روانہ کر دیا گیا، تاکہ وہ وہاں کا اقتدار سنبھال لے۔

حکومت کی یہ تقسیم ابراہیم لودھی کو پسند نہیں تھی، لیکن وہ خاموش رہا کیونکہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں امرائے سلطنت اسے تخت حکومت سے یکسر محروم ہی نہ کر دیں۔ پھر جب اس کی تخت نشینی کا عمل انجام پا گیا، تو اس نے بغیر وقت ضائع کئے اس بات کے لئے

کوشاں ہوا کہ سلطان جلال الدین کے حامیوں اور اس کے درباری امراء کو اپنا حامی بنالیا جائے اور جلال الدین کے خلاف کھڑا کر دیا جائے۔ چنانچہ جلال الدین کے امراء آہستہ آہستہ ابراہیم لودھی کی حمایت میں چلے اور پھر کھلے طور پر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ جب اس نے یہ صورت حال دیکھی تو اس نے اعظم ہمایوں کو ملا کر ایک فوج تیار کر لی، اور پھر سب سے پہلے ابراہیم لودھی کے ان حامیوں کو کچلا جو اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ پھر ابراہیم لودھی کے خلاف فوج کشی کے لئے قنوج کے راستہ سے آگرہ کی جانب بڑھا۔ ادھر ابراہیم لودھی نے بھی ایک بڑی فوج اس کے مقابلہ کے لئے کالپی کے راستہ سے بھیجا۔ اس دوران جلال الدین اور اعظم ہمایوں کے درمیان کچھ رنجش ہو گئی جس کی وجہ سے اعظم ہمایوں اسے چھوڑ کر ابراہیم لودھی سے جا ملا جس سے اس کی فوج مزید مضبوط و مستحکم ہو گئی۔ پھر جب ان دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، اور قریب تھا کہ جلال الدین کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑتا، اس نے بڑھ کر ابراہیم لودھی کے سپہ سالار ملک آدم سے صلح کر لیا۔

لیکن جب اس صلح کی اطلاع ابراہیم لودھی کو ہوئی تو اس نے اس صلح کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خود ایک فوج لے کر اس کے مقابلہ کے لئے نکل پڑا۔ جلال الدین مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا اور گوالیار کے راجہ کی پناہ میں چلا گیا۔ لیکن ابراہیم لودھی نے گوالیار پر بھی حملہ کر دیا، جس میں اسے فتح حاصل ہوئی، اور جلال الدین کو قید کر لیا گیا، پھر بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ابراہیم لودھی نے اپنے بھائیوں اسماعیل خان، حسین خان، محمود خان اور دولت خان کو بھی قید کرا دیا۔ اس طرح گویا اس نے حکومت کے تمام دعوے داروں کو اپنے راستہ سے ہٹا دیا۔

جب پوری مملکت پر ابراہیم لودھی کا قبضہ ہو گیا تو اس کے ذہن ودماغ نے عجیب پلٹا کھایا۔ جن افغانی سرداروں، امراء اور حکام کو بہلول لودھی اور سکندر لودھی بہت عزیز رکھتے تھے، اور انہیں اپنے برابر بیٹھاتے تھے کہ انہیں کے بل بوتے انہیں حکومت کرنے موقع ملا تھا، بغاوتوں کو وہ فرو کر سکے تھے اور مملکت میں امن وامان قائم ہوا۔ ابراہیم لودھی اس کے برعکس ان کے ساتھ ادنیٰ غلاموں جیسا سلوک کیا، انہیں دربار میں دست بستہ کھڑے رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ سکندر لودھی کے زمانہ کے امرائے سلطنت کو ایک مکان میں جمع کر کے دھوکے سے انہیں بارود لگا کر اڑا دیا گیا۔ اعظم ہمایوں جس نے جلال الدین کے خلاف محاذ آرائی میں اس کا بھرپور تعاون کیا تھا اسے بھی ابراہیم لودھی نے پہلے قید پھر قتل کروا دیا۔ اسی طرح اس نے اپنے امراء کو بھی نشانہ بنایا جن سے ذرا سی بات پر ناراضگی ہو جاتی تھی۔ ان امراء کو قید میں ڈال کر سخت ترین سزائیں دیتا تھا، بسا اوقات انہیں جان سے بھی مار دیتا تھا۔ اس قسم کی ظلم وزیادتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا امن وامان ختم ہونے لگا اور جو افغانی ہمیشہ لودھی خاندان کے حامی وناصر رہے تھے وہ بغاوتیں کرنے لگے، اور ابراہیم لودھی کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ بعض افغانی سردار چتوڑ کے والی رانا سنگا جو سلطان کا دشمن تھا اس کے ساتھ مل کر سلطان کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ پھر ان دونوں نے مل کر ایک فوج تیار کی اور سلطان کے خلاف فوج کشی کر دی، لیکن انہیں بری طرح شکست ہوئی اور میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

اسی طرح ایک بغاوت بہار میں ہوئی جس کی قیادت بہادر خان کر رہا تھا۔ سلطان نے اس بغاوت کو ختم کرنے کی بھرپور کوششیں کیں، لیکن وہ ناکام رہا، یہاں تک کہ یہ صوبہ سلطان کے قبضہ سے نکل گیا۔

ایک مرتبہ پنجاب کے حاکم دولت خان کو لودھی سے کسی بات پر خفگی ہو گئی۔ اس نے دولت خان کو دہلی حاضر ہونے کا حکم دیا۔ دولت خان کو وہاں کے حالات کا علم تھا کہ کس طرح سلطان اپنے امیروں سے ناراضگی کی صورت میں انہیں سزاؤں سے دوچار کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے بجائے ابراہیم لودھی کے حکم کی تعمیل کرنے کے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور ساتھ ہی اس نے اپنے بیٹے دلاور خان کو شاہ کابل ظہیر الدین بابر کے پاس مدد مانگنے کے لئے بھیج دیا کہ وہ ابراہیم لودھی پر حملہ کر کے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دے اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس کے ظلم وزیادتی سے نجات دلائے۔

اس کے ساتھ ہی ابراہیم لودھی کا چچازاد بھائی عالم خان بھی بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دینے گیا تھا۔ اس نے ابراہیم لودھی کے ظلم وزیادتی کی داستان تفصیل سے بابر کو بتایا کہ کس طرح اس نے سکندر لودھی کے دور کے امراء کو موت کے گھاٹ اتار دیا، حکومت کے دعوے داروں کو تہہ تیغ کر دیا، ذراسی ناراضگی پر امراء وحکام کو کس قسم کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ ان مظالم سے تنگ آکر امرائے سلطنت نے اسے اپنا نمائندہ بنا کر اس کے پاس مدد مانگنے کے لئے بھیجا ہے۔ ان دو کے علاوہ چتوڑ کے راجہ رانا سنگا نے بھی اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی اور اسے یقین دلایا تھا کہ جب وہ ہندوستان پر حملہ کرے گا تو مال ودولت اور فوج کی فراہمی میں وہ ہر طرح سے اس کی مدد کرے گا۔

چونکہ بابر خود بھی ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس نے عالم خان کے ہمراہ اپنے سرداروں کو ایک فوج دے کر آگے روانہ کیا تاکہ وہ دہلی کا راستہ ہموار کریں۔ یہ فوج راہیں ہموار کرتے ہوئے لاہور کے راستہ آگے بڑھی۔ ادھر دولت خان نے بھی دہلی پر حملہ کی زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ پھر بعد میں بابر کی فوج بھی آگئی۔ 933ھ مطابق 1526ء میں بابر، دولت خان اور عالم خان کی متحدہ فوج اور ابراہیم لودھی کے درمیان پانی پت میں زبردست جنگ ہوئی، جس میں بابر فتح یاب ہوا اور سلطان ابراہیم لودھی مارا گیا۔ اس طرح بابر کے ہاتھوں نہ صرف لودھی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا بلکہ دہلی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

7.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دہلی سلطنت میں جس چوتھے خاندان نے حکومت کی تھی وہ سید خاندان تھے، جن کی مدت حکومت 37 سالوں پر محیط ہے۔ اس کے پہلے حکمراں خضر خان کو تیمور نے ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔
- سید خاندان کے پورے دور حکومت میں بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا، جن کا آغاز تغلق خاندان کے آخری عہد ہی میں ہو گیا تھا۔ ان بغاوتوں کو اس خاندان کے سلاطین نے فرو کرنے کی کوششیں کیں، لیکن انتظام سلطنت اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ جب وہ کسی ایک جگہ کی بغاوت ختم کر کے دوسری جگہ جاتے تھے تو پہلی جگہ کے لوگ دوبارہ باغی ہو جاتے تھے۔ اسی طرح دہلی سلطنت کے بہت صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان کو بھی ان کے سلاطین نے زیر کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

- لودھی خاندان جب حکمراں ہوا تو وہ نہ صرف ان بغاوتوں کو دبانے میں کامیاب ہوئے، بلکہ بہت سے خود مختار صوبوں کو دہلی سلطنت میں شامل کر لینے میں کامیاب بھی ہوئے۔
- لودھی خاندان کے ابتدائی دو حکمراں بہلول لودھی اور سکندر لودھی بڑے دیندار اور انصاف پسند بادشاہ تھے۔ وہ اپنے امراء و حکام کے ساتھ بھی برابری کا سلوک کرتے تھے جو ہمیشہ سلطنت میں انتظام و انصرام کے قیام میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔
- سابقہ دونوں حکمرانوں کے برعکس ابراہیم لودھی بڑا ہی ظالم و جابر بادشاہ تھا۔ اس نے بہت سے افغانی امراء کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اپنے امراء سے ناراض ہو کر انہیں سخت ترین سزاؤں سے دوچار کرتا تھا۔ ساتھ ہی اس نے حکومت کے تمام ممکنہ دعوے داروں کو ختم کر دیا تھا۔ اس کے انہی ظلم و جبر کی وجہ سے مجبور ہو کر امرائے سلطنت نے اور اس کا دشمن حکمراں رانا سنگا نے بھی بابر کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی تھی جس کے نتیجہ میں دہلی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

7.5 نمونہ امتحانی سوالات

7.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. خضر خان کو کس نے ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کیا تھا؟

(a). دولت خان (b). محمود شاہ (c). بابر (d). تیمور

2. خضر خان کے دور میں وزیر اعظم کون تھا؟

(a). ملک سلیمان (b). ملک سردار (c). ملک تاج الملک (d). ملک خیر الدین

3. کابل کے حاکم امیر شیخ علی نے پنجاب اور ملتان کے علاقوں پر کس سلطان کے دور میں حملہ کیا تھا؟

(a). خضر خان (b). مبارک شاہ (c). محمد شاہ (d). علاءالدین شاہ

4. سید خاندان کا حکمراں محمد شاہ کس کا متبنیٰ تھا؟

(a). مبارک شاہ (b). علاءالدین شاہ (c). دولت خان (d). سرور الملک

5. ملک بہلول خان کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت کس نے دی تھی؟

(a). حمید خان (b). امیر رائے پرتاپ (c). حسام خان (d). کمال خان

6. بہلول خان لودھی نے جونپور کی شرقی حکومت کے کس حکمراں کے ساتھ تین سالوں کی جنگ بندی پر صلح کی تھی؟

(a). محمد شاہ شرقی (b). حسین خان شرقی (c). محمود شاہ شرقی (d). سب غلط

7. کس دور کی عورتوں نے مردوں کے کپڑے زیب تن کر کے دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا؟

(a). سکندر لودھی (b). ابراہیم لودھی (c). بہلول خان لودھی (d). علاءالدین شاہ

8. بہلول خان لودھی کے امرائے سلطنت نظام خان کی جگہ اپنا سلطان کسے بنانا چاہتے تھے؟

(a). خان جہاں (b). شیخ محمد فرملی (c). عالم خان (d). اعظم ہمایوں

9. آگرہ شہر کس سلطان کی یادگار ہے؟

(a). بہلول خان لودھی (b). ابراہیم لودھی (c). سکندر لودھی (d). مبارک شاہ

10. کس سلطان کے دور میں غیر مسلموں پر فارسی سیکھنے پر زور ڈالا گیا تھا؟

(a). بہلول خان لودھی (b). سکندر لودھی (c). ابراہیم لودھی (d). مبارک شاہ

7.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سلطان محمد شاہ کے دور پر تبصرہ کیجیے۔
2. سید اور لودھی خاندانوں میں سلطان کے انتخاب کے طریقہ کار پر گفتگو کیجیے۔
3. سید اور لودھی خاندانوں میں اپنے ماتحتوں میں حکومت کو تقسیم کرنے کی پالیسی سے متعلق اپنے مطالعہ کا خلاصہ پیش کیجیے۔
4. بہلول خان لودھی اور سکندر لودھی کے ادوار میں امن وامان کے قیام کی کوششوں پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔
5. دہلی سلطنت کے خاتمہ کے اسباب کو نمایاں کیجیے۔

7.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سید خاندان میں حکومت کے قیام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے خضر خان کے عہد پر روشنی ڈالیے۔
2. سید خاندان کے عہد کی بغاوتوں اور خود مختار ہو جانے والے صوبوں کے سلسلہ میں سید خاندان کی فوجی سرگرمیوں کا جائزہ لیجیے۔
3. لودھی خاندان کے طرز حکمرانی پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے۔

7.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. منتخب التواریخ : ملا عبد القادر بدایونی
2. جامع تاریخ ہند : محمد حبیب۔ خلیق احمد نظامی
3. تاریخ ہندوستان (دوم) : محمد ذکاء اللہ دہلوی
4. تاریخ فرشتہ (اول) : محمد قاسم فرشتہ
5. آب کوثر : شیخ محمد اکرام

اکائی 8: دہلی سلطنت (نظم ونسق)

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 دہلی سلطنت کا مجموعی خاکہ

8.3 سلطان

8.4 وزراء

8.5 حکومت کا نظم ونسق

8.5.1 فوج

8.5.2 مالی نظام

8.6 نظام عدل

8.6.1 پولیس اور جاسوسی کا نظم

8.6.2 ڈاک

8.7 کلیدی الفاظ

8.8 اکتسابی نتائج

8.9 نمونہ امتحانی سوالات

8.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

بہتر سیاسی نظام کی بنیاد طاقت و قوت پر نہیں بلکہ ریاست کے بہتر نظم و نسق پر مبنی ہوتا ہے۔ حکومت چلانے کا دستور ہمیشہ یکساں نہیں رہتا بلکہ بدلتے وقت وحالات کے حساب سے اس میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ دہلی سلاطین ہندوستان پر جنگ میں فتح حاصل کر کے آئے لیکن مفتوحین سے میل جول بڑھاتے رہے اور دونوں میں ایک اچھے تعلقات پیدا ہو گیے۔ مسلم حکمراں نے اس بات کی پوری کوشش کی نظم ونسق کو کیسے بہتر بنایا جائے تاکہ عوام کو کم پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ پورے سلطنت دور کا مطالعہ کریں اس عہد کے سلاطین نے نظم ونسق کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے اور اس میں تبدیلیاں بھی کیں۔ غیاث الدین بلبن نے سلطنت کو تاتاریوں کی تباہی وبربادی سے بچایا اور باغی گورنروں کو شکست دی۔ اس نے عدل وانصاف کی جو روایت شروع کی بعد کے سلاطین اسی کے پابند رہے۔ عہد سلطنت میں قانون کی رو سے چھوٹے بڑے سب برابر تھے۔ علاء الدین خلجی نے جو تبدیلیاں کیں اس سے حکومت کے نظم ونسق میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ جو پالیسی علاءالدین نے اپنائی تھی اس کو غیاث الدین تغلق نے قائم ودائم رکھا اور محمد تغلق نے اپنے عہد میں اس کو فروغ دیا۔ فیروز شاہ تغلق اور سکندر لودھی کے دور میں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جانیں دہلی سلاطین نے کس طریقے سے نظم ونسق قائم کیا اور عوام کو خوشحال کیا۔ دہلی سلاطین نے حکومت میں بہت ساری اصلاحات کیں اور ایک بہتر مثالی ریاست قائم کی۔ آپ یہ بھی جانیں گے کہ سلطان کی ذات مرکزی شخصیت ہوتی تھی لیکن اس کے ساتھ امراء اور صوبہ کے سربراہان، وزراء اور مختلف عہدے داروں کے اختیارات کی بھی کافی اہمیت تھی۔

8.2 دہلی سلطنت کا مجموعی خاکہ

تاریخ ہندوستان میں دہلی سلطنت کی شروعات 1193ء میں جب غوری کی قیادت میں فتح کیا اور قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام بنا کر واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک نے 1206ء میں باقاعدہ طور پر سلطنت دہلی کا پہلا آزاد سلطان بن گیا۔ اس کے بعد ترک، سید اور افغان حکومت میں آئے۔ قطب الدین ایبک نے جن علاقوں میں فتح حاصل کی تھی اس کا انتظام جیسے چل رہا تھا اسی طرح اخذ کر لیا۔ سلطان التمش جب بادشاہ بنا تو اس نے فخر الدین عصامی کو وزیر بنایا کیوں کہ عصامی کے پاس بغداد میں وزرات کا تجربہ تھا۔ اس کے بعد اس کی جگہ محمد جنیدی نے لے لی جسے نظام الملک کا خطاب بھی دیا گیا۔ التمش کی وفات کے بعد مرکزی اقتدار میں کمزوری پیدا ہو گئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے "چہل گان یا خواجہ تاش" افراد نے حکومت کی طاقت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ شمس الدین کے چالیس غلاموں کی ٹیم تھی ان کی طاقت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بادشاہ کے انتخاب وتعین میں ان کا عمل دخل ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی پالیسی یہ تھی کہ اقتدار اپنے ہاتھوں میں رکھا جائے اور جو طاقت اس کی مخالفت کرے اس سے مقابلہ کیا جائے۔ بلبن بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ بادشاہ امرا میں نہ شمار کیا جائے بلکہ ان سے بلند ہو۔ بلبن جب تخت نشین ہوا تو اس نے اس قوت کا خاتمہ کیا اور مرکزی طاقت کو پھر سے بحال

کیا۔ بلبن نے ایرانی آداب و رسوم کو فروغ دیا اور سلطنت کو وقار حاصل ہوا۔ اس دور میں دہلی شہرت یافتہ شہر بن گیا۔ بلبن نے مملکت کے دفاع اور نظم و نسق کی طرف توجہ دی۔ بلبن کا سب سے اہم کارنامہ منگولوں کو روکنا تھا کیوں کہ اس سے پہلے منگول کئی بار لاہور کے علاقے کو تباہ و برباد کر چکے تھے۔ بلبن نے حکومت کی توسیع کے بجائے اس کو استحکام بخشنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اسے جب بھی فوج کشی کا مشورہ دیا جاتا تو وہ کہتا کہ ''میں نہیں چاہتا کہ میں یہاں سے جاؤں تو دہلی کا بھی وہی حال ہو جو بغداد کا حال ہوا ہے۔'' بلبن نے عدل و انصاف کو قائم کیا اور وہ سختی سے اس کا اہتمام کرتا تھا۔ صرف بلبن ہی ایسا سلطان تھا وہ جو چاہے کرتا تھا اس کے علاوہ تمام حکمراں یہاں تک کہ التمش بھی امرا کے مشوروں کے مطابق ہی چلتا تھا۔ معزالدین کیقباد اس سلطنت کو نہ سنبھال پایا اور خلجیوں نے غلاموں کا خاتمہ کر کے اپنی سلطنت کا آغاز کیا۔

خلجی خاندان کی بنیاد جلال الدین خلجی نے رکھی۔ مزاج میں نرمی کے باعث نظم و نسق میں کوئی اصلاحات نہ کی، اسی نرمی کی وجہ سے ملک میں فتنہ فساد بھی شروع ہوا، ملک کے ماحول کو بگڑتا دیکھ کر امرا اس کے خلاف سازشیں رچنے لگے اور اس پر اتفاق کیا کہ جلال الدین خلجی کو معزول کر کے کوئی موزوں شخص کو تخت پر بٹھایا جائے۔ علاء الدین سلطان جلال الدین خلجی کا داماد اور بھتیجا تھا، دھوکے سے جلال الدین خلجی کا قتل کروا کے تخت پر بیٹھا۔ علاء الدین خلجی طبعیتاً جلال کے بالکل مختلف تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بادشاہ کی نرم مزاجی کیسے ملک کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ علاء الدین نے دشمنوں اور باغیوں کو سخت سزائیں دینی شروع کی، لیکن امن پسند عوام کے لیے اس کا وجود باعث رحمت تھا۔ علاء الدین ایک بہتر سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ نظم و نسق پر بھی توجہ دی۔ علاء الدین نے ملکی نظم و نسق میں اصلاحات بھی کیں۔ علاء الدین نے معاشی زندگی کی دیکھ بھال قاعدے سے کی اور جو تبدیلی مناسب سمجھا اس کو بروئے کار لایا۔ بعد کے سلطان اس استحکام کو باقی نہ رکھ سکے جو علاء الدین کے دور میں تھا۔ غرض تغلق خاندان نے خلجی کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت قائم کی۔

غازی ملک فخر الدین جونا جس سے تغلق خاندان کی شروعات ہوئی تھی، غازی ملک جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ غیاث الدین نے اپنے عہد حکومت میں سلطنت کے انتظام کو بحسن و خوبی نبھایا اور مفید اصلاحات بھی کیں۔ غیاث الدین کے بعد جب محمد تغلق نے دہلی کی سلطنت سنبھالی تو حکومت میں بغاوت شروع ہو گئی اور کئی ریاستیں دہلی سے آزاد ہونی شروع ہو گئیں۔ محمد تغلق کی طبیعت جدت پسند تھی جو بات اس کے دل میں بیٹھ جاتی اس کو پورا کرنے کے لیے حدوں کو بھی پار کر دیتا۔ تغلق نے دہلی کو چھوڑ دولت آباد کو دارالخلافہ بنایا اور اس کے لیے اس نے دہلی کے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ دولت آباد منتقل ہوں۔ تغلق کی وفات کے بعد فیروز شاہ جب سلطنت پر بیٹھا تو ایک چھوٹی سلطنت پر ہی صبر کرنا پڑا۔ اس نے حکومت کے نظم و نسق پھر سے ترتیب دیا اور سلطنت کو مضبوطی فراہم کی۔ فیروز شاہ کی وفات کے بعد تخت کے لیے گھریلو اختلاف پروان چڑھے، جو جانشین ہوئے وہ اس بڑی ذمہ داری اٹھانے کے اہل نہ تھے۔ جس سے دہلی حکومت کا اقتدار دن بہ دن کم ہوتا چلا گیا اور رہا سہا اقتدار تیمور کے حملے نے ختم کر دیا۔

تغلق کے خاتمے کے بعد سادات خاندان نے حکومت سنبھالی، اس خاندان نے تقریباً چالیس سال تک حکومت کی۔ اس دور میں دہلی کی بادشاہت ایک صوبے دار سے زیادہ نہ تھی۔ غرض بہلول لودھی نے اس حکومت کا خاتمہ کر کے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ بہلول نے دہلی

کے اقتدار کو بڑھایا، آس پاس کے علاقے جو آزاد ہو چکے تھے ان علاقوں کو واپس دہلی سلطنت کا حصہ بنایا۔ بہلول کی وفات کے بعد سکندر لودھی تخت نشین ہوا تو اس نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔

8.3 سلطان

دہلی سلطنت میں انتظامی ڈھانچہ بنیادی طور پر عباسی خلافت، غزنوی اور سلجوقیوں کے نظام حکومت پر قائم تھا۔ جس میں ایرانی انتظامیہ اور ہندوستان کے حالات وروایات کا رسوخ تھا۔ ان علاقوں میں آزاد بادشاہوں کی پرانی روایت چلی آرہی تھی، اس میں وزیروں کی ایک ٹیم بادشاہ کی نظم ونسق کو بہتر بنانے میں مدد کرتی تھی۔ سلطنت کے نظم وضبط کو قائم رکھنے کے لیے قانون کا ہونا بہت ضروری ہے، اسلامی ریاست میں سیاسی نظریے کے مطابق قانون مذہب اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ جس کے تحت حتمی شکل قرآن وسنت ہے۔ خلیفہ یا دنیاوی بادشاہ، سلطان سب اس نظام کے ماتحت ہوتے ہیں اور آزادانہ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ خدا کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں خلیفہ کا قانونی نمائندہ سلطان تصور کیا جاتا تھا، جسے اپنی سلطنت میں خلیفہ کے پورے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ ہندوستانی سلاطین اتنی دوری اور طاقتور ہونے کے باعث خلیفہ کے لیے ان کے معاملات میں دخل دینا آسان نہ تھا۔ اس بات کو بھی خیال میں رکھنا ہوگا کہ ہندوستان میں جب سلطنت کا آغاز ہورہا تھا تو عباسی خلافت زوال پذیر تھی۔ برائے نام ان کی خلافت کا وجود تھا اس لیے وہ اپنے ماتحت حکمرانوں کے معاملات میں دخل اندازی ترک کر چکے تھے۔ اس لیے دہلی سلطنت میں قانون کے نفاذ میں سب سے بڑی شخصیت سلطان کی ہی تھی۔ سلطان تمام رعایا کا غیر مذہبی حکمراں ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کا مذہبی رہنما بھی تصور کیا جاتا۔ دہلی سلطنت میں جب بادشاہ آزاد ہوتا تو اسے خلیفہ سے منظوری لینی پڑتی تھی اور وہ اپنے آپ کو اس کا ولی کہلاتا تھا۔ دہلی سلطنت کا مطالعہ کریں تو یہ بات بالکل عیاں ہے کہ سلاطین دہلی نے ہمیشہ عالم اسلام کے ساتھ رسمی تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی۔

ہندوستان کے بہت سارے سلاطین نے اپنے لیے عباسی خلافت سے اپنے نام کا لیٹر جاری کروا کے اپنی حکومت کو قبول کروالیا۔ باضابطہ طور عباسی خلیفہ کا نام جمعہ کے خطبے میں بھی شامل رہتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قانونی طور پر خلیفہ حکمراں بن گیا۔ بلکہ اس کا مقام صرف اخلاقی ہوتا تھا اور سماج میں عباسی خلافت سے پروانہ ملنے کے بعد ان کی عزت ووقعت میں اضافہ ہوجاتا۔ سلطان کا دفتر سب سے اہم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی، عسکری اور عدل وانصاف قائم رکھنے کی ذمہ داری سلطان کی ہوتی تھی۔ ان ذمہ داریوں پر سلطان کی طرف سے لوگوں کو مقرر کیا جاتا تھا۔ اس لیے سلطان ان عہدوں کا سربراہ سمجھا جاتا تھا اور اسی کی ذات عدل وانصاف کا سرچشمہ تصور کی جاتی تھی۔ انصاف کی فراہمی کسی بھی ریاست کے لیے سب سے اہم کام سمجھا جاتا ہے۔ سلطان اپنے فیصلے میں مطلق العنان ہوتا اور اس کے ساتھ وہ ایک مجلس شوریٰ بھی رکھتا۔

دہلی سلاطین میں بلبن پہلا بادشاہ ہے جس نے اس بات کی کوشش کی سلطان کی طاقت کو مزید وسعت دی جائے اور سلطنت کی زیادہ تر قوت کو سلطان کے ہاتھوں میں دے کر اس کو مضبوط کیا جائے۔ اسی ارادے سے اس نے ایرانی نظریہ بادشاہت کی طرف توجہ دی۔

ایرانی نظریہ کے تحت بادشاہ الوہی یا نصف الوہی کا کردار رکھتا ہے اور وہ صرف خالق (اللہ) کو ہی جواب دینے کا پابند ہے اس کے علاوہ کسی مذہبی رہنما یا دیگر لوگوں کو نہیں۔ اسی نظریہ کے تحت اس نے سلطان "ظل اللہ" اللہ کا سایہ ہے۔ جو بھی دربار میں اس کے سامنے آئے وہ سلطان کے سامنے سجدہ یا سر تسلیم خم کرے حالانکہ یہ عمل مذہبی رہنماؤں کے مطابق صرف اللہ کے لیے مختص ہے۔ غرض بلبن کے سلطان بننے کے بعد سخت قوانین اور حتمی فیصلوں نے تمام چھوٹے اور بڑے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی طاقت کے آگے سر خم کر دیں۔ بلبن کے عہد میں دیکھتے ہیں کہ انصاف کے معاملے میں وہ رشتہ داروں یا افسران کو بھی نہیں بخشتا تھا اور ہر کسی کے ساتھ یکساں سلوک کرتا تھا۔ سلطان کو قانون سازی کا مکمل اختیار ہوتا تھا لیکن فیصلے میں اجماع امت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطان اپنے فیصلوں میں اکثریت کے فیصلوں کا احترام کرتا تھا، سلطان ان معاملوں میں آزاد ہوتا جس مسئلے پر علما و فقہا کے درمیان اختلاف پایا جاتا۔ سلطان اپنی رعایا کی مذہبی و شخصی آزادی میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے کیوں کہ ہندو مسلم دونوں قانونی نظام رکھتے تھے۔ سلطان کو احساس تھا اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض سلطان کچھ رسومات ناپسند ہونے کے باوجود خاموشی اختیار کرتے اور اس میں دست درازی نہ کرتے تھے۔ ہندوستان کے شاہی اختیارات میں امرا کا بڑا عمل دخل تھا۔ پھر علماء، صلحاء اور فقہاء کا تعاون حاصل رہتا کیوں عوام پر ان لوگوں کا بڑا اثر ہوتا۔ امرا اس وقت تک بادشاہ کی اطاعت بجا لاتے جب تک وہ سلطنت کے امور کو افضل طریقے سے بجا لاتا لیکن سلطان کے لاپرواہی برتتے ہی یہ امرا بغاوت میں بھی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی امرا خود غرضانہ مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا کرنے سے گریز کرتے تھے۔ دہلی سلاطین کے انتخاب کو دیکھیں تو ایک ظاہری شکل کو قائم و دائم رکھا۔ امرا و اثر رکھنے والے علما کسی ایک شخص پر اتفاق کر لیتے تو اسے سلطنت سونپ دیتے۔ اس کی وہ بیعت کرتے اور پھر عام بیعت ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی یہ انتخاب برائے نام ہوتا تھا۔ کیوں کہ امیدوار جنگ یا اپنی قوت سے اس مقام تک پہنچ چکا ہوتا لیکن اس مرحلے کا فائدہ یہ ہوتا کہ وہ قانونی حیثیت رکھتا۔ امرا و علما نے ہمیشہ حقوق وراثت کو ملحوظ نہیں رکھا لیکن اس بات کی کوشش کی کہ ان کے خاندان سے کوئی بہتر شخص اس عہدے کے لیے مل جائے۔ امرا کی ناراضگی بسا اوقات سلطنت پر برے اثرات مرتب کرتی کیوں کہ ان میں کچھ لوگ قبیلوں کے سردار تھے اور اپنے پیچھے ایک فوج ہمیشہ رکھتے کسی سلطان کی یہ مجال نہیں تھی کہ کوئی بات زبردستی منوالے۔ دہلی سلطنت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو شاہی خاندان کا اثر بہت کم نظر آتا ہے، گرچہ ان کو قدر و منزلت حاصل تھی۔ بڑی شاہ بیگم کو "ملکہ جہاں" اور سلطان کی ماں کو "خداوندہ جہاں" یا "مخدومہ جہاں" کہا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو پس پردہ کتنے اختیار حاصل تھے اس پر مورخین نے بیان نہیں کیا ہے۔ رضیہ سلطانہ کو چھوڑ دیں تو دو عورتوں کی سلطنت کی کاروائی میں دلچسپی دکھائی دیتی ہے۔ رکن الدین فیروز کی ماں "شاہ ترکان" جو علمی سرپرستی اور نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ اس کے علاوہ سیاست میں حصہ لیتے ہوئے انہوں نے رکن الدین کو تخت پر بٹھایا۔ اسی طرح محمد بن تغلق کی والدہ اپنے کریمانہ اور حسن سلوک کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور تھی۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو دہلی سلطنت عورتوں کی شر انگیزی اور کشمکش سے مکمل طور پر مامون و محفوظ رہا۔ مختلف پیچیدگیوں کے باوجود بھی دہلی سلطنت میں حکومت کا مرکز و محور سلطان کی ہی ذات رہی۔

8.4 وزراء

اسلام میں مشورے کی اہمیت بہت واضح ہے اسی بنا پر شروعاتی دور سے ہی اسلامی عہد میں مشوروں کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ وزیر کے معنی ہیں بادشاہ کے ساتھ کام کرنے والا یا مشیر سلطان۔ یہ لفظ ایرانی ہے اور اسلامی تاریخ میں اس عہدے سے عباسی خلافت نے روشناس کرایا۔ اس عہدے کو ہر عہد میں بڑی اہمیت دی گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ وزیر عوام اور سلطان کے درمیان رہتا تھا۔ یہ عہدہ قانوناً سلطان یا خلیفہ کا نائب تصور کیا جاتا ہے۔ دہلی سلطنت قائم ہونے کے بعد سلطان کے آس پاس دانش مند اور تجربہ کار لوگوں کا ایک ہجوم رہتا تھا جس سے مشورے طلب کیے جاتے۔ مرکزی حکومت کے تمام وزراء کو سلطان مقرر کرتا، وزیر سلطان کے لیے کام کرتے اور وہ اس کے سامنے جواب دہ ہوتے لیکن ان کے پاس بھی حقیقی اختیار ہوتا تھا۔ ان کی حیثیت اچھی طرح واضح ہوتی اس لیے ان کا احترام بھی کیا جاتا۔ وزیر کا فرض ہے کہ اپنی نقل و حرکت سے سلطان کو اطلاع دیتا رہے اس کے علاوہ وہ سلطان کے مقرر کیے ہوئے عہدے داروں کو بنا اجازت کے تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ دہلی سلطنت میں اکثر وزیر مخصوص اور محدود اختیارات کے مالک تھے۔ جس کو مکمل اختیارات دیے جاتے وہ سلطان کے نام سے ریاست میں حکومت کرتا لیکن ایسا صرف کمزور سلاطین کے عہد میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

مرکز میں چار وزیر ہوتے، وزیر، عارض ممالک، دیوان انشاء اور دیوان رسالت۔

1. وزیر

وزیر دراصل وزیر اعظم تھا جس کی ذمہ داری آمدنی اور مالیات کی دیکھ ریکھ کے ساتھ تمام وزراء کی نگرانی کرنا ہوتا تھا۔ اگر وہ فوج سے تعلق نہیں رکھتا تو بھی اس کو ضرورت پڑنے پر فوج کشی کرنی پڑتی۔ لشکروں کی ماہانہ اجرت پر نظر رکھتا اور اس دفتر میں اس کا معاون نائب ہوتا۔ وزیر کے اختیارات علاء الدین خلجی کے عہد تک زوال پذیر رہے۔ خواجہ خاطر جو بلبن کے دور میں نائب وزیر تھا۔ علاء الدین خلجی نے اسے وزیر مقرر کیا لیکن تھوڑے ہی وقفے کے بعد اس کی جگہ نصرت خاں نے لے لی۔ نصرت خاں کی وفات کے بعد یہ عہدہ ملک کافور کو دیا گیا۔ تغلق عہد میں محمد بن تغلق نے احمد ایاز کو خان جہاں کے لقب کے ساتھ اپنا وزیر مقرر کیا۔ فیروز تغلق نے اپنا وزیر خان جہاں مقبول کو مامور کیا۔ مقبول نے اس عہدے پر تقریباً اٹھارہ سال تک اپنی خدمات انجام دی، اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے جوناخاں کو یہ عہدہ دیا گیا۔ اس عہد میں وزیروں کی اہمیت بہت زیادہ تھی اس کے علاوہ ان کی تنخواہوں میں بھی بہت اضافہ ہو گیا تھا۔

2. عارض الممالک

عارض الممالک یا دیوان عرض جو وزیر فوج ہوتا۔ اس کی ذمہ داری لشکریوں کی بھرتی کرنا اور دیکھ بھال کے ساتھ ان کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھنا۔ اس دفتر کے ذمہ داری تنخواہیں، سازوسامان اور اسلحہ کی حفاظت وغیرہ۔ عارض کو فوجیوں کا خیر اندیش اور ہمدرد تصور کیا جاتا تھا اور امید کی جاتی تھی کہ وہ ان سے اپنی اولادوں کی طرح سلوک کرے۔ غالباً التتمش کے عہد میں بھی یہ عہدہ موجود تھا۔ برنی کا بیان ہے کہ احمد ایاز "روات عرض" جس کا تقرر عارض ممالک کی حیثیت سے بلبن نے کیا تھا، بلبن اس عہدے کو وزیر سے زیادہ اہم مانتا تھا۔

میر حاجب شاہی اصطبل کا سپرنٹنڈنٹ اس عہدے پر رضیہ سلطانہ کے عہد میں ملک یاقوت تعینات تھا اور داروغہ فیل یعنی ہاتھیوں کے اصطبل کا نگراں۔ یہ دونوں عہدے بہت اہم شمار کیے جاتے تھے لیکن عارض محکمہ جب پوری طرح منظم ہو گیا تو اس کی ضرورت ختم ہو گئی۔ علاء الدین خلجی نے اپنے عہد میں اس محکمے کی ذمہ داریاں طے کیں۔ عارض کا عہدہ بہت اہمیت کا حامل تھا غرض یہ عہدہ وزیر کے عہدوں کو بھی کسی حد تک محدود کرتا تھا۔

3. دیوان انشاء

اس ڈیپارٹمنٹ کے ذمہ سلطانوں کے آرڈر اور ان احکامات کو لکھنا تھا۔ اس دفتر میں بہت سارے سکریٹری اور ماہر کاتبین رہتے تھے جو ہمہ وقت سلطان کے پاس رہتے اور سلطان کی باتوں کو لکھتے رہتے تھے۔ اس عہدے کے فرائض میں تھا کہ وہ پڑوسی ملکوں کے حالات پر مسلسل اپنی نگاہ کو بنائے رکھے اور اس سے سلطان کو باخبر کرتا رہے۔ پڑوسی حکمراں اور شہروں کو شاہی خطوط بھیجتے تھے مثلاً تخت نشینی، یا کسی اہم واقعے یا فتح کی خوشخبری دی جاتی۔ یہ رقعات اور تحریریں بڑے اہتمام سے ادبی انداز میں تیار کیے جاتے تھے اور نقلوں کو محفوظ رکھا جاتا جن کو دیوان انشاء بھیجتا تھا۔

4. دیوان رسالت

دیوان رسالت کے ذمہ بیرونی ممالک سے خط و کتابت کے علاوہ سفیروں اور ایلچیوں کی دیکھ بھال ہوتی تھی۔ لیکن اس عہدے کے فرائض کے متعلق مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ اسے امور خارجہ کا ڈیپارٹمنٹ گردانتے ہیں اور کچھ لوگ اسے قیمتوں اور عوام کی اخلاقی معاملات میں گرفت رکھنے والا محکمہ شمار کرتے ہیں۔ کچھ مورخین عوام کی شکایت سننے والا اور دینی یا مذہبی معاملات سے گردانتے ہیں۔ اس کے نگراں کو صدر جہاں یا وکیل جہاں ہوتا تھا جس کو رسول دار بھی کہا جاتا تھا۔ علاء الدین خلجی نے اپنے دور میں بازار کو کنٹرول کرنے کی جب کوشش کی تو اس نے بازاروں کو قابو میں رکھنے کے لیے شحنہ مقرر کیا اور ان کے کاموں کی دیکھ بھال کے لیے ایک بڑے امیر کو مقرر کیا۔ جو دیوان رسالت کہلاتا تھا۔ اسی طریقے سے فیروز تغلق نے عوام کی شکایت سننے کے لیے ایک ڈیپارٹمنٹ قائم کیا اور اس کو دیوان رسالت کا نام دیا۔ غرض دیوان رسالت کے فرائض و ذمہ داریاں مختلف حکمرانوں کے دور میں بدلتی رہی ہیں۔

8.5 حکومت کا نظم و نسق

اس دور کے صوبے اقطاع کہلاتے اور اس کے حاکموں کو مقطع کہا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت گورنر کی ہوتی تھی اور اس کے اختیارات بہت وسیع ہوتے، لیکن تمام صوبے اپنے حلقہ اور حیثیت میں الگ الگ ہوتے تھے اس لیے مقطع کو طاقت بھی اسی حساب سے حاصل ہوتی اور وہ اس علاقے میں مقامی روایات کا خیال کرتے ہوئے نظم و نسق کا انتظام کرتے۔ محاصل کو وصول کرکے وہ صوبے کے اخراجات کو پورا کرتے اور جو بچ جاتا اسے سلطنت بھیج دیا جاتا تھا۔ مالی معاملات میں مرکز کو جانچ کرنے کا پورا اختیار ہوتا تھا۔ مقطع کا فریضہ تھا کہ صوبے میں امن وسکون قائم رہے اور سلطان کے فرمان کی تعمیل ہو۔ اس کے علاوہ سلطان کو جب کبھی فوج کی ضرورت ہو تو وہ مہیا کرائے۔ حکومت کی بنیاد

جاگیر دارانہ نظام پر مبنی تھی۔ پوری سلطنت صوبوں میں منقسم تھی اور ہر صوبہ میں نائب سلطان ہوتا جس کی تنخواہ اس صوبے کے محصولات سے پوری کی جاتی اور نظم و نسق کی تکمیل کے بعد جو رقم بچ جاتی وہ دارالخلافہ بھیج دی جاتی۔ مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نائب سلطان کا تقرر بہت لمبے عرصے کے لیے نہیں کیا جاتا اور سلطان جب چاہتا ان کو واپس بلا لیتا۔ ہر نائب کی نگرانی میں ایک لشکر موجود رہتا اس کے اخراجات یہیں سے پورے کیے جاتے اور ضرورت کے وقت نائب کو مرکز فوج بھیجنا پڑتا تھا۔ برنی کے مطابق جب تک جنوبی علاقہ شامل نہیں تھا کل بیس صوبے تھے۔

8.5.1 فوج

شروعاتی دور میں مرکز میں فوج کا کوئی دستہ موجود نہیں ہوتا تھا حالانکہ نظم و نسق کے لحاظ سے فوج کا شعبہ اہمیت کا حامل تھا۔ صرف سلطان کی حفاظت پر کچھ محافظ مامور رہتے، دھیرے دھیرے شاہی محافظوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ایک بڑی فوج کی شکل اختیار کرلی۔ علاء الدین خلجی کی فوج تقریباً تین لاکھ پر مشتمل تھی اس کے بعد محمد بن تغلق کے دور میں فوج میں کافی اضافہ ہوا۔ عہد سلطنت میں علاءالدین نے فوجی اصلاحات کی طرف توجہ دی اس کے عہد میں فوج کے دو خاص حصے مشہور تھے (1) سوار (2) پیدل۔ اس کے علاوہ ہاتھی کا استعمال بھی میدان جنگ میں ہوتا۔ سلطان نے گھوڑوں کے داغنے کا طریقے شروع کیا تاکہ مشاہدے میں اس گھوڑے کو دوبارہ نہ دکھایا جاسکے۔ علاءالدین فوجی سازو سامان کا معائنہ بہت سختی سے کرتا تھا۔ سپاہیوں کی بھرتی براہ راست اپنی نگرانی میں کرتا۔ فوجیوں کی نقدی تنخواہ کا رواج شروع کیا۔ فوج کا ایک دستہ ہمیشہ تیار رہتا، علاء الدین فوج کو بہت بڑی تنخواہیں نہیں دیتا تھا اور نہ ان کو جاگیریں عطا کرتا۔ اسی وجہ سے اس نے مالی اصلاحات کی تاکہ زندگی گزارنا آسان رہے۔ محمد شاہ تغلق کے پاس شاہی فوج میں نوے ہزار سوار تھے ان میں سے کچھ سلطان کے پاس رہتے اور کچھ صوبوں میں تعینات رہتے۔ تین ہزار ہاتھی جن کے ہودج پر چھ سے دس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ بیس ہزار ترک مملوک تھے جو سلطان کے ساتھ رہتے اور جنگ کے میدان میں سلطان کے آگے رہتے۔ اس کے علاوہ دس ہزار خواجہ سرا، ایک ہزار نیزہ بار اور دولاکھ غلام تھے۔ سب سے بڑا فوجی عہدہ خان ہوتا اس کے ماتحت دس ہزار سوار ہوتے، اس کے نیچے ملک ان کے پاس ایک ہزار سوار ہوتے، اس کے بعد امیر جس کے ماتحت سو سوار ہوتے، پھر سپہ سالار اور جند ہوتے تھے۔ فوج کی بھرتی یا تربیت کے متعلق ابن بطوطہ فرماتے ہیں: "جب کوئی ملتان کے گورنر کی فوج میں تیر انداز کے طور پر بھرتی ہونا چاہتا تھا تو مختلف قسم کی سخت کمانیں دے کر اس کی طاقت کی جانچ کی جاتی تھی۔ اگر اسے سوار کے طور پر بھرتی ہونا ہوتا تھا تو ایک نشانہ لگا دیا جاتا تھا جسے اسے اپنے نیزے سے اٹھانا ہوتا تھا اور سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار زمین پر رکھے ایک چھلے کو اپنے نیزے سے اٹھانا ہوتا تھا۔ گھوڑ سوار اپنے تیر انداز کو اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک گیند کو نشانہ بنانا ہوتا تھا۔" یہ ایک طریقہ تھا لیکن بھرتی کے بعد ان کی باقاعدہ تربیت کی جاتی تھی۔

8.5.2 مالی نظام

سلطنت کی آمدنی حسب ذیل ذرائع سے ہوتی تھی۔ 1۔ خراج: جو کہ کاشت کاروں سے لیا جاتا تھا۔ 2۔ عشر: مسلمان کاشت کاروں سے پیداوار کا دسواں حصہ لیا جاتا۔ 3۔ جزیہ: غیر مسلموں سے لیا جاتا لیکن اس میں بچے، عورتیں فقراء و مساکین کو الگ رکھا جاتا۔ 4۔ خمس:

جنگ میں فتح حاصل ہونے کے بعد جو مال ملتا۔5۔ زکوۃ: یہ صرف مسلمانوں سے لی جاتی تھی۔ سلطان پوری آمدنی کا مالک ہوتا لیکن ان آمدنیوں کو سلطنت کی ترقی اور ضروریات کے مطابق خرچ کرتا۔

محکمہ مال

علاء الدین دہلی سلطنت میں پہلا سلطان ہے جس نے محکمہ مال کے رواج میں تبدیلی کی۔ اس سے پہلے کے سلاطین نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی اور نہ اتنی ہمت کر پائے تھے کہ اس پیچیدہ نظام میں کوئی تبدیلی کر سکیں اس لیے پرانے نظام کو قائم و دائم رکھا۔ علاء الدین نے جب اصلاحات کیں تو یہ اصلاح زمین دار اور امرا کو قطعاً پسند نہیں آئی۔ ملک کو اندرونی و بیرونی خطرات سے مامون رکھنے کے لیے علاء الدین نے امرا کی قوت پر چوٹ پہنچائی اور ان سے شاہی جاگیریں واپس لے لیں۔ علاء الدین کا یہ ماننا تھا کہ دولت ہی سازش اور بغاوت کی جڑ ہوتی ہے۔ علاء الدین زمین کی پیائش کرا کے اس پر لگان لگایا اور اس کے ساتھ وصولی کا نظم کیا۔ اس سے پہلے انعام یا دیگر مواقع پر جو جاگیریں امراء، زمین دار کو دی گئیں تھی، علاء الدین نے سب کو واپس لے لیا جب اس طریقے کے ساری زمینیں ضبط کر لی گئیں تو زندگی گزارنے کے لیے سب کو کمانا کھانا پڑا جس کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں بغاوت کا مطلق خیال نہ آیا۔ غرض اس طریقے سے علاء الدین وقتاً فوقتاً سبھی طبقات سے اس طریقے کی زمینیں واپس لے لیں۔ علاء الدین نے زمین کی پیائش کرا کر پچاس فیصد مال گزاری مقرر کی۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے زمین دار کسانوں کے برابر ہو گیے۔ اس نے تمام اشیائے خوردنی کی قیمت مقرر کی اور ذخیرہ اندوزی پر قدغن لگائی۔ غلے کے علاوہ کپڑوں اور مویشیوں، روٹی، سبزی اور گوشت کی بھی قیمت مقرر کی۔ سلطان وقتاً فوقتاً اپنے غلاموں کو بھیج کر ان چیزوں کی قیمتوں کا پتہ کرواتا کہ متعین کیے ہوئے داموں میں چیزیں بیچی جا رہی ہیں یا نہیں۔ ذخیرہ اندوزی اور نفع خوروں کے خلاف سخت کاروائی کی جاتی۔ اس کے علاوہ علاء الدین نے معاشی اور معاشرتی اصلاحات کی طرف بھی توجہ دی، نشہ آور چیزوں پر پابندی، عصمت فروشی پر روک، زانیوں کے لیے سخت سزائیں وغیرہ۔ برنی کے مطابق علاء الدین خلجی نے دہلی میں تین طرح کے بازار قائم کیے۔ پہلا اناج کے لیے، دوسرا تمام قسم کے کپڑوں اور مہنگی چیزیں مثلاً گھی، تیل، خشک میوے وغیرہ۔ تیسرا گھوڑوں، جانوروں اور غلاموں کے لیے۔ ان بازاروں کے نظم ونسق کے لیے باقاعدہ ضابطے تیار کیے گیے۔

محمد شاہ تغلق کے عہد میں جب سلطنت قحط سالی کا شکار ہوئی تو سلطان نے اس سلسلے میں کئی اہم اقدامات کیے۔ کسانوں کو قرض دیے گیے، کنویں کھدوائے گیے، بنجر زمینوں کو کاشت کاری کے لیے ہموار کیا گیا اور ایک محکمہ زراعت قائم کیا جو پیداوار کی نشو نما کی نگرانی کر سکے۔ زراعت کے لیے ایک خاص محکمہ دیوان کا قیام عمل میں آیا جس کو دیوان امیر کہا جاتا تھا۔

محکمہ مال کے عمال

اس محکمہ میں مختلف مرتبے کے عہدیدار ہوتے۔ سلطان علاء الدین کے وزیر شرف قائی نے اس محکمے کو بحسن وخوبی سے چلایا۔ اس نے اس محکمے کی ساری باتوں کا جائزہ لے کر اس کی کمیوں کو دور کیا۔ لگان وصول کرنے کے لیے دیانت دار لوگوں کا انتخاب کیا گیا اور رشوت کی روک تھام کے لیے کوششیں کی گئیں۔ اس کے لیے عاملوں کے مشاہرے میں بھی اضافہ کیا گیا تا کہ وہ عزت وراحت کے ساتھ زندگی

گزاریں۔ علاء الدین نے ایک نیا محکمہ دیوان مستخراج قائم کیا اور اس کے ذمہ لگان کے بقایا کا حساب و کتاب اور جانچ پڑتال و سزا کا اختیار دیا۔

8.6 نظام عدل

عدل و انصاف کی ذات سلطان کی تھی جو اپنے فیصلے میں بالکل غیر جانب داری برتتے۔ سلطان بھی مقدمات کی سنوائی کرتے اور فیصلے دیتے۔ سلطان کی ذات سب سے بڑی عدالت ہوتی اور سلطان کبھی ابتدائی مراحل کے مقدمے بھی سنتا۔ مذہبی معاملات کے مقدمے ہوتے تو سلطان صدر الصدور اور قاضی القضاۃ کی مدد لیتا۔ اس محکمہ میں سلطان کی ذات کے بعد سب سے بڑا عہدہ قاضی القضاۃ کا تھا اور انہی کے ذریعہ صوبوں میں قاضیوں کا تقرر ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے مقدمات ان کی ہی پنچایتوں میں طے ہوتے اور اگر کسی معاملے میں ہندو مسلمان دونوں ساتھ ہوتے تو ایسے معاملات قاضی کے پاس حل ہوتے۔ شہروں اور دیہاتوں میں پولیس و مجسٹریٹ ہوتے جو جرائم کی روک تھام کرتے تھے۔ دہلی سلاطین کی یہ پالیسی رہی کہ گاؤں کے لوگوں کی زندگی میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے اور ان کے معاملات جیسے پہلے سے چلے آرہے تھے اسی طریقے پر قائم رکھا۔ امیر داد ایک اہم عہدہ ہوتا اس کی حیثیت موجودہ دور کے مجسٹریٹ کی ہوتی۔ یہ لوگ قاضی کے سامنے ایسے امرا کو پیش کرتے جن پر کچھ الزام ہوتا اور وہ قاضی کی رسائی سے باہر ہوتے۔ قاضی کا اتنا احترام ہوتا تھا کہ وہ سلطنت کے بڑے سے بڑے امرا کے جرم کی سزا کا تعین کرتا تھا۔ سلطان علاء الدین نے اپنے عہد میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ قاضی سے غیر اخلاقی حرکت سرزد نہ ہونے پائے۔ اس نے ایک قاضی کو شراب پینے کے جرم میں موت کی سزا دی تھی۔ پولیس اور جاسوس کے چاق و چوبند ہونے کی وجہ سے عہدیدار جرائم میں ملوث سے اجتناب کرتے تھے اور اگر کوئی پکڑا جاتا تو سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ دہلی سلاطین نے جرائم کی سخت سزائیں متعین کر رکھی تھی اور ان سزاؤں سے امرا، فضلاء اور اصحاب اقتدار کوئی مستثنیٰ نہیں تھا۔ شراب کے استعمال حتیٰ کہ درآمد برآمد پر بھی علاؤالدین اندھے کنویں میں ڈلوا دیتا۔ ابھی تک باقاعدہ جیل نہیں تھا تو قیدیوں کو پرانے قلعوں میں رکھا جاتا۔ قیدیوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی کیوں کہ سزا یافتہ مجرم یا تو قتل کیے جاتے یا پھانسی پر لٹکا دیے جاتے۔

8.6.1 پولیس اور جاسوسی کا نظم

دہلی سلطنت میں علاء الدین خلجی نے اپنے عہد میں اس نظم کو اور بہتر بنایا تھا۔ پولیس کا بڑا عہدہ کوتوال تھا، جس کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے اور ان کی ذمہ داری بھی اتنی ہی بڑی ہوتی۔ وہ سلطنت میں امن اور قانون کی پابندی کو لازم کرتے۔ کوتوال اہم معاملات میں سلطان کو اپنی رائے بھی دیتا اور اس کی غیر موجودگی میں حرم سرا کا نگراں بھی ہوتا۔ علاء الدین کے عہد میں پہلے کوتوال نصرت خاں سے عوام بہت ڈرتی تھی۔ اس عہد کے ایک کوتوال علاء الملک جو سلطان کو بلا خوف و خطر مشورے دیا کرتا تھا۔ اس سے عہدے کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس محکمہ میں علاء الدین نے اصلاحات کیں اور کئی نئے عہدے قائم کیے۔ تاجروں کی دیکھ بھال کے لیے دیوان ریاست کا تقرر کیا، اخلاق عامہ کی نگرانی کے لیے محتسب کو رکھا جو ناپ تول پر کڑی نگاہ رکھتے۔ پولیس سماج میں طور طریقے اور اعمال کو صحیح کرانے کی کوشش کرتی۔ اس دور میں لوگ جاسوس سے بہت زیادہ ڈرے رہتے تھے۔ دہلی سلطنت میں جاسوسی کا نظام پہلے سے تھا لیکن علاء الدین اس

نظام کو بہت فروغ دیا۔ جاسوس کو سرکاری زبان میں مُنہی کہتے تھے، ان لوگوں کا کام چھوٹے بڑے سبھی لوگوں کی خبر سلطان کو پہونچانا تھا۔ ان کو اتنا اختیار تھا کہ گھروں کے اندر داخل ہو کر لوگوں سے باز پرس کر سکتے تھے۔ برنی کے بیان کے مطابق ”یہ نظام اتنا سخت تھا کہ سلطان کے خلاف کوئی دم نہیں مار سکتا تھا اور امراء، ملوک اور اکابر سلطنت کے یہاں جو کچھ بھی ہوتا۔ مُنہی اس کی خبر سلطان کو دیتے رہتے۔“ امراء کے خوف کا یہ حال تھا کہ وہ جلدی کسی سے بات نہیں کرتے تھے بلکہ اشاروں کنایوں میں اپنا کام چلاتے تھے۔ غرض سبھی طبقے کے افراد مُنہی سے لرزاں رہتے۔

8.6.2 ڈاک

دہلی سلطنت کا بہتر نظم ونسق ڈاک کے بہتر طریقے پر ہی منحصر تھا۔ علاء الدین اسی ڈاک کے ذریعہ پوری سلطنت کے معاملات سے باخبر رہتا۔ دارالسلطنت سے جب فوج نکلتی جب تک منزل پر نہ پہنچ جاتی ان راستوں پر برابر ڈاکیہ کا انتظام رہتا اور وہ بادشاہ کو اطلاع دیتے رہتے۔ غیاث الدین تغلق کے عہد میں اس نظام پر بارش کی وجہ سے بہت اثر پڑا جس کی وجہ سے اس کی وفات کی خبر باہر نہ بھیجی جا سکی۔ ڈاک کو برید کہا جاتا تھا اور جو ڈاک بذریعہ گھوڑے جاتی اسے الاغ کہتے اور جو پیدل جاتی وہ دھاوہ کہلاتے۔ حکومت ان ڈاکیوں کو گھوڑے فراہم کراتی جو ہر چار میل پر تبدیل کیے جاتے۔ بقول ابن بطوطہ ”پیدلوں کی ڈاک کا یہ انتظام ہے کہ ایک میل میں جس کو کروہ کہا جاتا ہے تین چوکیاں ہرکاروں کی ہوتی ہیں اس چوکی کو دادہ کہتے ہیں۔ ہر ایک تہائی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہرکاروں کے لیے برجیاں بنی ہوتی ہیں۔ ہر ایک برجی میں ہرکارے کمر کسے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر ایک ہرکارہ کے پاس ایک چھڑی دو گز لمبی ہوتی ہیں جس کے سر پر تانبے کے گھنگرو بندھے ہوئے ہوتے ہیں، جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو وہ ایک ہاتھ میں لفافہ رکھ لیتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی اور تمام طاقت خرچ کر کے دوڑتا ہے۔ دوسرا ہرکارہ اس کے گھنگروؤں کی آواز سن کر تیار ہو جاتا ہے اور لفافہ لے کر دوڑتا ہے اس طرح جہاں کہیں خط پہنچانا ہوتا ہے پہنچا دیتے ہیں۔ محمد تغلق نے اپنے عہد میں اس نظام کو اور فروغ دیا۔

8.7 کلیدی الفاظ

قیادت : رہبری، رہنمائی

دخل اندازی : مداخلت، روک ٹوک

مطلق العنان : مختار کل، آزاد، خود مختار

ظل اللہ : اللہ کا سایہ

قانون سازی : قانون بنانے کا کام

دست درازی : مداخلت، چھیڑ چھاڑ

8.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- تاریخ ہندوستان میں دہلی سلطنت کی شروعات 1193ء میں جب غوری کی قیادت میں فتح کیا اور قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام بنا کر واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک نے 1206ء میں باقاعدہ طور پر سلطنت دہلی کا پہلا آزاد سلطان بن گیا۔ اس کے بعد ترک، سید اور افغان حکومت میں آئے۔ قطب الدین ایبک نے جن علاقوں میں فتح حاصل کی تھی اس کا انتظام جیسے چل رہا تھا اسی طرح اخذ کر لیا۔ سلطان التمش جب بادشاہ بنا تو اس نے فخر الدین عصامی کو وزیر بنایا کیوں کہ عصامی کے پاس بغداد میں وزرات کا تجربہ تھا۔ اس کے بعد اس کی جگہ محمد جنیدی نے لے لی جسے نظام الملک کا خطاب بھی دیا گیا۔
- علاء الدین ایک بہتر سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ نظم ونسق پر بھی توجہ دی۔ علاء الدین نے ملکی نظم ونسق میں اصلاحات بھی کیں۔ علاء الدین نے معاشی زندگی کی دیکھ بھال قاعدے سے کی اور جو تبدیلی مناسب سمجھا اس کو بروئے کار لایا۔ بعد کے سلطان اس استحکام کو باقی نہ رکھ سکے جو علاء الدین کے دور میں تھا۔
- دہلی سلطنت میں انتظامی ڈھانچہ بنیادی طور پر عباسی خلافت، غزنوی اور سلجوقیوں کے نظام حکومت پر قائم تھا۔ جس میں ایرانی انتظامیہ اور ہندوستان کے حالات وروایات کا رسوخ تھا۔ ان علاقوں میں آزاد بادشاہوں کی پرانی روایت چلی آرہی تھی، اس میں وزیروں کی ایک ٹیم بادشاہ کی نظم ونسق کو بہتر بنانے میں مدد کرتی تھی۔ سلطنت کے نظم وضبط کو قائم رکھنے کے لیے قانون کا ہونا بہت ضروری ہے، اسلامی ریاست میں سیاسی نظریے کے مطابق قانون مذہب اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہے۔
- اسلام میں مشورے کی اہمیت بہت واضح ہے اسی بنا پر شروعاتی دور سے ہی اسلامی عہد میں مشوروں کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ وزیر کے معنی ہیں بادشاہ کے ساتھ کام کرنے والا یا مشیر سلطان۔ یہ لفظ ایرانی ہے اور اسلامی تاریخ میں اس عہدے سے عباسی خلافت نے روشناس کرایا۔ اس عہدے کو ہر عہد میں بڑی اہمیت دی گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ وزیر عوام اور سلطان کے درمیان رہتا تھا۔ یہ عہدہ قانوناً سلطان یا خلیفہ کا نائب تصور کیا جاتا ہے۔ دہلی سلطنت قائم ہونے کے بعد سلطان کے آس پاس دانش مند اور تجربہ کار لوگوں کا ایک ہجوم رہتا تھا جس سے مشورے طلب کیے جاتے۔

8.9 نمونہ امتحانی سوالات

8.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. 1206ء میں باقاعدہ طور پر سلطنت دہلی کا پہلا آزاد سلطان کون بنا؟

(a). قطب الدین ایبک (b). التمش (c). محمود غزنوی (d). علاء الدین خلجی

2. کس سلطان نے کوشش کی سلطان کی طاقت کو مزید وسعت دی جائے اور سلطنت کی زیادہ تر قوت کو سلطان کے ہاتھوں میں دے کر اس کو مضبوط کیا جائے؟

(a). بلبن (b). التمش (c). سکندر لودھی (d). جلال الدین خلجی

3. "خداوندہ جہاں" یا "مخدومہ جہاں" کسے کہا جاتا تھا؟

(a). سلطان کی ماں (b). سلطان کی بیوی (c). سلطان کی بہن (d). تمام غلط

4. سلطان التمش نے فخر الدین عصامی کو کون سا عہدہ دیا تھا؟

(a). وزیر (b). صوبہ کی گورنری (c). پولیس (d). جاسوس

5. خواجہ خاطر کس عہد میں نائب وزیر تھے؟

(a). بلبن (b). علاء الدین خلجی (c). قطب الدین (d). محمد بن تغلق

6. دہلی سلطنت میں کس سلطان نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ شروع کیا؟

(a). علاء الدین خلجی (b). بلبن (c). سکندر لودھی (d). التمش

7. "دیوان مستخرج" کس نے قائم کیا؟

(a). بلبن (b). علاء الدین (c). محمد بن تغلق (d). التمش

8. جاسوس کو سرکاری زبان میں کیا کہتے تھے؟

(a). مُنہی (b). اعلان کرنے والا (c). عریض الممالک (d). تمام غلط

9. کس سلطان نے دہلی کو چھوڑ کر دولت آباد کو دارالخلافہ بنایا؟

(a). محمد بن تغلق (b). علاء الدین خلجی (c). التمش (d). سکندر لودھی

10. دہلی سلطنت میں جو ڈاک بذریعہ گھوڑے جاتی اسے کیا کہا جاتا تھا؟

(a). الاغ (b). دھاوہ (c). کروہ (d). سب صحیح

8.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سلطنت دہلی میں پولیس اور جاسوس کے نظام پر نوٹ لکھیے۔
2. نظم ونسق پر اپنی معلومات بیان کیجیے۔
3. مالی نظام اور اس میں اصلاحات کا ذکر کیجیے۔
4. فوج اور علاء الدین خلجی کی اصلاحات پر روشنی ڈالیے۔

5. ڈاک کے نظام پر روشنی ڈالیے۔

8.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. دہلی سلطنت کا مجموعی خاکے پر تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔
2. دہلی سلطنت میں سلطان کی حیثیت کو واضح کیجیے۔
3. محکمہ وزراء اور ان کی ذمہ داریوں کو بیان کیجیے۔

8.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک: مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن، معارف پریس، اعظم گڈھ، طبع دوم 1981
2. سلطنت دہلی کا نظم حکومت، تصنیف اشتیاق حسین قریشی، مترجم ہلال احمد زبیری، ٹائمز پریس، کراچی، طباعت اول، 1971
3. عہد وسطیٰ کا ہندوستان، حصہ اول، پروفیسر ستیش چندر، مترجم پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2003

اکائی 9: دہلی سلطنت (علمی خدمات)

اکائی کے اجزا:

9.0 تمہید
9.1 مقاصد
9.2 ہندوستان میں مسلمانوں کے علوم وفنون کا آغاز
9.3 عہد سلطنت میں عہد بہ عہد علمی پیش رفت
9.3.1 مملوک عہد
9.3.2 خلجی عہد
9.3.3 تغلق عہد
9.3.4 سید شاہی عہد
9.3.5 لودھی عہد
9.4 عہد سلطنت کے ہندوستان میں اسلامی علوم کا ارتقا
9.4.1 علم قرأت کا ارتقا
9.4.2 علم قرآن کا ارتقاء
9.4.3 علم حدیث کا ارتقاء
9.4.4 علم فقہ کا ارتقاء
9.5 اکتسابی نتائج
9.6 نمونہ امتحانی سوالات
9.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخیں بہت لکھی گئی ہیں لیکن علمی تاریخ پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ شاید اسی لئے ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی کارنامے بہت ماند اور کم معلوم ہوتے ہیں۔ خاص طور عہد سلطنت پر اس سلسلے میں بہت کم تحریریں سامنے آسکی ہیں۔ جب کہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں علمی خدمات اور کارناموں کی تاریخ بھی نہایت تابناک ہے۔ اور عہد سلطنت میں بھی اس میدان میں اچھی خاصی پیش رفت اور سرگرمیاں نظر آتی ہیں۔ اس اکائی میں اس عہد کی ان علمی سرگرمیوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ دہلی سلطنت کے عہد کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرسکیں اور اس بات سے آداہی حاصل کرسکیں کہ دہلی سلاطین نے علم اور اہل علم کی سرپرستی میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ نیز اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ دہلی سلططنت میں ارتقاء پانے والے مختلف علوم پر گفتگو کرسکیں گے اور اس دور میں لکھی گئی تصنیفات پر بھی تبصرہ کرسکیں گے۔

9.2 ہندوستان میں مسلمانوں کے علوم وفنون کا آغاز

ملک ہندوستان کے عربوں کے ساتھ دیرینہ تعلقات رہے ہیں۔ ہندوستان ہمیشہ سے بڑی تجارتی منڈی رہا ہے۔ چوں کہ عرب تجارت پیشہ قوم تھی، اس لئے ہندوستان میں عربوں کا آنا جانا، تعلقات کا قائم ہونا اور انہیں استوار رکھنا، یہ ایک امر واقعی تھا۔ چوں کہ اس عہد میں تجارت بالعموم پانی کے راستے ساحل کے علاقوں میں ہوتی تھی، اس لئے عرب مسلمانوں کی تجارت غیر منقسم ہندوستان کے ساحلی علاقوں جیسے سندھ، بلوچستان، گجرات اور مالابار وغیرہ سے وابستہ تھی۔ شاید اس لئے بعض روایات کے مطابق 25 صحابہ کرام کی ہندوستان میں آمد ثابت ہوتی ہے۔ لیکن شمالی ہند میں عرب مسلمانوں کی آمد فتوحات کے ذریعہ ہوئی جس کا راستہ سندھ تھا۔ ان فاتحین عرب مسلمانوں کی بہ دولت ہی اسلام اور علوم اسلامی ہندوستان کے شمالی خطے میں پہنچے اور یہاں علمی روایات کے قیام کی بنیادیں رکھی گئیں۔ لیکن سندھ سے عرب مسلمانوں کا سیاسی تسلط بہت جلد ختم ہوگیا اور ان کی جگہ وسط ایشیا کے مسلم حکمرانوں نے لے لی۔ ان میں سب سے پہلا نام محمود غزنوی کا ہے۔ اور اس کے بعد پھر غوری سلاطین کا ہے۔ غوری سلاطین میں محمد غوری کے ذریعے شمالی ہند میں مسلم حکومت کا آغاز ہوا۔ سلطان غوری اپنے غلام قطب الدین ایبک کو دہلی کا نظم وانصرام حوالے کرکے خود وطن واپس چلا گیا۔ قطب الدین نے دہلی میں مملوک سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تاریخ میں اسے عہد سلطنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو مغلیہ عہد حکومت سے قبل دہلی واطراف کی سبھی سلطنتوں کو محیط ہے، جن مین زمام سلطنت یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی۔

اگر محمود غزنوی کے عہد کی بات کی جائے تو اس وقت کے ہندوستان میں فردوسی اور البیرونی دو اہم نام نظر آتے ہیں جن میں اول الذکر کا تعلق ہندوستان سے برائے نام اور ثانی الذکر کا تعلق بہت گہرا رہا ہے۔ فردوسی کی خدمات شعر و ادب کے میدان میں غیر معمولی رہی ہیں۔ فردوسی کا پورا نام حکیم ابو القاسم علی طوسی ہے۔ دسویں صدی عیسوی مطابق چوتھی صدی ہجری کا یہ عظیم شاعر ایران کے علاقے خراسان کے شہر طوس میں 640ء / 329ھ پیدا ہوا اور وہیں 1020ء مطابق 410ھ میں 80 برس کی عمر میں وفات پائی۔ بعض روایات میں اس کی وفات 1025ء / 416 میں ہوئی۔ اس اعتبار سے اس کی عمر 85 برس قرار پاتی ہے۔ فردوسی اپنے شعری ادب کے شاہکار "شاہنامہ" سے جانا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے اس شاہکار کے ذریعہ ہی دنیائے شعر و ادب میں ایک لازوال مقام پیدا کیا۔

عہد غزنوی میں ایک دوسرا بڑا نام البیرونی کا ہے۔ البیرونی کا پورا نام ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی ہے۔ البیرونی کی پیدائش 973ء 362ھ میں خوارزم کے مضافات میں ایک گاؤں "بیرون" میں ہوئی۔ مقام پیدائش کی وجہ سے "البیرونی" کی نسبت اس کے نام حصہ بنی اور اسی سے اسے شہرت ملی۔ خوارزم موجودہ دور میں ازبکستان کے خطے میں واقع ہے۔ بیرونی نے فلسفہ، کیمیا، جغرافیہ، فلکیات، طبعیات اور انسانیات و لسانیات میں مہارت حاصل کی۔ وہ ابن سینا کا معاصر تھا۔ اس نے ہندوستان میں رہ کر یہاں کے دانشوروں سے ہندی علوم سیکھے اور یہاں کے معاشرے پر ایک اہم کتاب تصنیف کی۔ جس کا نام "کتاب الھند" ہے۔ اپنی اس تاریخی معاشرتی معلومات سے بھرپور کتاب کی وجہ سے البیرونی پورے بھارت میں معروف و مشہور ہے۔

لیکن باقاعدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا قیام عہد غوری سے ہوتا ہے اس لئے اس عہد کے بعد کی علمی خدمات ہی موضوع کا اہم حصہ ہے۔

9.3 عہد سلطنت میں عہد بہ عہد علمی پیش رفت

9.3.1 مملوک عہد

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ محمد غوری نے خود ہندوستان میں فتوحات کے بعد قیام کرنا پسند نہیں کیا بلکہ یہاں کی حکومت اور نظم و انصرام کو اپنے غلام اور نائب، قطب الدین ایبک، کے حوالے کر کے اپنے وطن واپس لوٹ گیا۔ قطب الدین ایبک پہلا باقاعدہ مسلم سلطان ہے جس نے ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد 1206ء میں رکھی۔ قطب الدین ایبک نے قطب مینار بنوایا۔ اس بنیاد پر فن تعمیرات میں اس کی خدمات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن علوم و فنون اور شعر و ادب کے میدان میں اس کے عہد میں بہت زیادہ پیش رفت نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد سلطان التتمش جو قطب الدین کا داماد بھی تھا اور نسلاً ترکی غلام تھا۔ اس نے قطب مینار کی تکمیل بھی کروائی۔ اس کے علاوہ کچھ اور فن تعمیر کے نمونے اس کے عہد میں وجود میں آئے، جن میں بدایوں کی جامع مسجد خاص طور پر قابل ذکر ہے جہاں وہ ایک زمانے تک گورنر کی حیثیت سے مامور رہا۔ التمش ایک روشن خیال حاکم تھا۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اس نے اپنے بعد حکومت و سلطنت کی قدیم روایات سے ہٹ کر دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیٹی رضیہ سلطانہ کو اپنے بیٹوں کے بجائے اپنا جانشین مقرر کیا۔ اگرچہ سلطان

التتمش اپنی سیاسی مصروفیات کی کثرت کی وجہ سے علم کی حوصلہ افزائی میں زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ تاہم اس کے عہد میں دہلی اہل علم کی پسند کا مقام بنا رہا۔ وہ علمی پیش رفت کے سلسلے میں فیاض اور بے تعصب واقع ہوا تھا۔ اس کے عہد میں چنگیز خان کا ستم رسیدہ معروف شاعر و فلسفی امیر کوہانی بخارا سے آکر دہلی میں اس کے دربار میں پناہ گزیں رہا۔ اور اپنے قیام کے دوران بہت سی نظمیں لکھیں۔ اس کے علاوہ مورخ ناصر الدین بھی دربار سے وابستہ تھا۔ سلطان التتمش نے اس کی خوب سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔ خلیفۂ بغداد کے تیس سالہ وزیر، فخر الملک، کی سلطان التتمش کے دربار میں وزیر اعظم کی حیثیت سے وابستگی بھی سلطان کی علم دوستی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ فخر الملک اپنی علمیت اور دانش مندی کے لئے بہت مشہور تھا۔ سلطان التتمش نے دہلی میں ایک مدرسہ بھی بنوایا، جو بعد میں خستگی کا شکار ہوا اور اسے دوبارہ سلطان فیروز شاہ نے شروع کیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان التتمش نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لئے ایک مدرسے کا علیحدہ انتظام لونی نامی جگہ پر کیا تھا۔ شاید اسی مناسبت سے دہلی کے مضافات کا وہ علاقہ جو غازی آباد سے متصل ہے 'لونی' کہلاتا ہے۔

سلطان التتمش کے بعد اس کی بیٹی رضیہ سلطانہ تخت پر بیٹھی۔ اس کے عہد حکومت میں ایک مدرسے کا تذکرہ ملتا ہے جسے 'معزی' مدرسہ کہا جاتا تھا۔ اس مدرسہ کے حوالے سے تفصیلات نہیں ملتی۔ رضیہ سلطانہ کے بعد بہرام مسعود کا دور آیا۔ لیکن ان دونوں کے عہد میں کوئی قابل ذکر علمی پیش رفت نظر نہیں آتی ہے سوائے اس کے کہ دربار شاہی سے مشہور مورخ قاضی منہاج سراج جوزجانی کی سرپرستی کی گئی۔ قاضی منہاج سراج 'طبقات ناصری' جو تاریخ کی ایک مشہور کتاب ہے، کے مصنف اور مدرسہ 'ناصریہ' کے سربراہ اور اوقاف کے منتظم تھے۔ کتاب 'طبقات ناصری' کا نام قاضی منہاج سراج نے اپنے محسن، سلطان ناصر الدین محمود کی نسبت سے رکھا۔

سلطان ناصر الدین ادبی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ وہ خود بھی بڑا صاحب علم اور علم دوست تھا۔ اس نے اپنے بیس سالہ دور حکومت میں تعلیم کو خوب فروغ دیا۔ سلطان ناصر الدین فن خطاطی کا بھی ماہر تھا اور اسی کے ذریعہ سے اپنی ذاتی ضروریات پوری کرتا تھا۔ اس نے علم اور علماء کی بڑے پیمانے پر عزت اور حوصلہ افزائی کی۔ اس کے عہد میں جالندھر میں بھی ایک مدرسے کا پتا چلتا ہے۔

ناصر الدین کے بعد بلبن بادشاہ ہوا۔ سلطان بلبن بھی بڑا ادب نواز اور علم دوست بادشاہ تھا۔ چنگیز خان کے مظالم سے بھاگ کر جب اہل علم و حرفت دہلی میں پناہ گزیں ہوئے تو اس نے ان کی خوب مدد کی، ان کے لئے وظائف مقرر کئے، محل عطا کئے۔ اس طرح اس کا دربار علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ بلبن کے عہد میں ادبی انجمنوں کی بہتات تھی۔ سلطان کا بیٹا، شہزادہ محمد، ان ادبی انجمنوں اور محفلوں میں خوب دلچسپی لیتا تھا۔ خود اس نے بیس ہزار اشعار کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ مشہور شاعر امیر خسرو اس کے استاد تھے اور شہزادہ کی ادبی انجمنوں کی صدارت فرماتے تھے۔ ایک دوسری علمی و ادبی انجمن کا افتتاح بلبن کے دوسرے بیٹے، کراخان بغرا، نے کیا۔ اس کی انجمن کے اراکین میں بہت سے موسیقار، رقاص، اور قصہ گو تھے۔ ان شہزادوں کی تقلید میں بلبن کے دربار کے امراء نے دیگر بہت سے انجمنیں قائم کیں، لہٰذا دہلی میں بے شمار علمی و ادبی اور ثقافتی انجمنیں وجود میں آگئیں۔ شہزادہ محمد ادبی دنیا میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اس کے مصاحبین اسے فردوسی کا شاہ نامہ، دیوان سنائی، دیوان خاقانی اور شیخ نظامی گنجوی کی خمسہ، جو پنج گنج کے نام سے بھی مشہور ہے، سناتے تھے۔ علم و ادب کے ماہرین و دانشور اس کی موجودگی میں شاعروں کی خوبیوں پر بحث کرتے تھے۔

امیر خسرو دہلوی کے علاوہ امیر حسن سجزی مؤلف فوائد الفواد، اور لاہور کے شیخ عثمان ترمذی سے بھی شہزادہ محمد کی نیازمندانہ وابستگی تھی۔ اور اسی شہزادہ نے ہندوستانی مدارس میں فارسی کے نصاب میں پڑھائی جانے والی مشہور کتابیں، گلستان اور بوستان کے مصنف شیخ سعدی شیرازی کو بھی ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، لیکن شیخ اپنی عمر رسیدگی کی وجہ سے اس دعوت کو قبول نہ کر سکے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سلطان بلبن کے عہد میں علمی و ادبی پیش رفت خاصی تیز نظر آتی ہے۔ اس کے عہد میں بہت سے ذی عزت اور اہل علم کو دہلی میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ جن میں مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ بہاء الدین، ان کے فرزند غزنی کے فلسفی شیخ بدر الدین عارف، مشہور صوفی بزرگ و عالم قطب الدین بختیار کاکی، سِدی مولا کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان مشہور لوگوں کے علاوہ دوسرے بہت سے سائنس و ادب کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم سلطان بلبن کے زمانے میں دہلی میں موجود تھے۔ سِدی مولا نے دہلی میں ایک علمی درسگاہ اور خیرات خانہ بھی قائم کیا تھا۔ بلبن کے بیٹے کیقباد کے دوسالہ عہد حکومت میں علم و ادب کی سرپرستی کا یہ معیار قائم نہ رہ سکا۔ اور بلبن کی علم دوستی پر مبنی وراثت اس کی عیش پسند طبیعت کی نذر ہو گئی۔

9.3.2 خلجی عہد

1290 میں غلام کے بعد سلاطین خلجی کا دور آیا۔ اس خاندان کا سب سے اہم حکمراں جلال الدین خلجی تھا۔ جو اس خاندان کی حکومت کا بانی بھی ہے۔ وہ نمایاں ادبی ذوق کا مالک تھا۔ اس کے عہد میں دربار کا ماحول خاصا ادبی بن گیا۔ امیر خسرو دہلوی، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن معید دیوانہ، امیر ارسلان قلی، اختیار الدین یاغی اور باقی خاطر اس کے دربار اور اس کی مجلسوں کے اہم ارکان تھے۔ ان تمام اہل علم کا شمار اپنے عہد کے اہم مصنفین میں ہوتا ہے، جنہوں نے فن شاعری، تاریخ اور مختلف سائنس و علوم میں اپنی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ جلال الدین خلجی کی مجلسوں میں اعلیٰ درجے کے موسیقار جیسے امیر خاصہ، حمید راجا، سازندے جیسے محمد جنگی، فتوحا، ناصر خان اور بہروز وغیرہ کافی معروف تھے۔

جلال الدین خلجی کے علمی ذوق کا نتیجہ تھا کہ اس نے شاہی کتب خانے کا مہتمم اعلیٰ امیر خسرو کو منتخب کیا جو بڑی عزت کا حامل عہدہ تھا۔ جلال الدین خلجی کے بعد علاء الدین خلجی اس کا جانشین ہوا۔ وہ ایک مختلف قسم کا انسان تھا۔ ان پڑھ اور بددماغ بھی تھا۔ اس کے عہد میں جلال الدین کا قائم کردہ دربار کا علمی ماحول بہت متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ خود علاء الدین کے بیٹوں کی مناسب تعلیم نہ ہو سکی۔ لیکن جب علاء الدین پر ناخواندگی کے منفی اثرات ظاہر ہوئے تو اس نے علمی مباحث میں شرکت کرنا اور انہیں سمجھنا شروع کر دیا اور ایک بار پھر دربار سلطانی سے علمی و ادبی مجلسوں کی سرپرستی ہونے لگی۔

سلطان علاء الدین کی سرپرستی میں علم و ادب کو ملنے والے فروغ کے حوالے سے دو اہم نام خاص طور پر ذکر کئے جاتے ہیں: قاضی مولانا کہرامی اور قاضی مغیث الدین۔ ان دونوں پر سلطان علاء الدین نے عنایات و الطاف کی بارشیں کیں۔ بعد میں اس کے دربار سے فیض یافتگان لوگوں میں امیر خسرو، امیر حسن سجزی (سعدی ہند)، صدر الدین علی، فخر الدین خواص، حمید الدین راجہ، مولانا عارف، عبدالحکیم، شہاب الدین صدر نشیں اور اس وقت کے متعدد مورخین و سوانح نگار تھے۔ شمس الملک سلطان علاء الدین کا وزیر اعظم خود نہایت عالم و

فاضل شخص تھا۔ اس کے عہد میں بعض اہل علم و ادب ایسے بھی تھے جو بادشاہ کے سایۂ عاطفت سے محروم اور بے نیاز رہ کر علم و ادب اور فلسفہ کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہے تھے۔ ایسے لوگوں میں سید تاج الدین، سید رکن الدین، برادران سید مغیث الدین اور منتجاب الدین اور صاحب علم و معرفت اور نیک طینت بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء کے نام نہایت مشہور اور قابل ذکر ہیں۔ برنی نے ایسے علماء کی ایک بڑی تعداد پیش کی ہے جو اس عہد میں دہلی میں مقیم رہ کر شاہی دربار سے وابستہ ہو کر یا بے نیازی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کر رہے تھے۔

اس عہد کے اہم مورخ کے طور پر امیر ارسلان کا نام بہت معروف ہے، جب کہ کبیر الدین اپنی خطابت اور عام ادبی نگارشات میں مہارت کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ طب کے میدان میں بدر الدین دمشقی، صدر الدین اور علیم الدین وغیرہ نے خوب شہرت حاصل کی۔

سلطان علاء الدین اگرچہ بہت ظالم، اور غیر تعلیم یافتہ حکمراں تھا لیکن وہ ایک بہترین منتظم تھا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ مشہور کوہ نور ہیرا وہی شمالی ہند سے لے کر آیا تھا۔ اس نے نظام سلطنت کی بہتری کے لئے بہت سے ایسے اقدامات کئے جن کی بعد میں شیر شاہ سوری اور اکبر جیسے عظیم حکمرانوں نے پیروی کی۔ اس کے بعد اس کے جانشین مبارک خلجی کا عہد ادبی تاریخ میں انحطاط کے دور سے عبارت ہے۔

9.3.3 تغلق عہد

خلجی عہد کے بعد 1320ء میں تغلق خاندان کی حکومت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس خاندان کا پہلا حکمراں غیاث الدین تغلق تھا۔ اس کا عہد امن، اور نظام حکومت کی بہتری کے لئے مشہور ہے۔ ساتھ ہی اس حکمراں نے تعلیم کو فروغ دینے کے لئے تحریک و ترغیب پر بھی توجہ کی۔ سلطان غیاث الدین ایک نہایت ذہین اور علم پسند شخص تھا اور علماء کی قدر کیا کرتا تھا۔ وہ خود تاریخ، شعر و ادب، سائنس، خطاطی، مابعد الطبعیات جیسے علوم کا ماہر تھا اور ان علوم کے ماہرین سے مستقل تبادلۂ خیال کرتا ہے۔ اس نے علماء و مشائخ کی خوب سرپرستی کی۔ لیکن اس کے باوجود سلطان غیاث الدین اپنے پیشرو، مبارک خلجی، کی انحطاط پذیر کیفیت کو اپنے مختصر سے دور حکومت میں پوری طور سے ختم نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد محمد تغلق اس کا جانشین ہوا۔ محمد تغلق ابتدائی عہد میں علم اور علماء سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن بعد کے عہد میں حالات یکسر مختلف ہو گئے تھے۔ دہلی کی مرکزی ادبی و علمی حیثیت اس کے آخری عہد میں بالکل برباد ہو گئی۔ اس انحطاط و بربادی کا تذکرہ اس وقت ہندوستان آئے مشہور مسلم سیاح، ابن بطوطہ، کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ البتہ محمد تغلق کے ابتدائی دور حکومت میں ابو العباس احمد کے بقول دہلی کے شاہی دربار میں ایک ہزار شاعر تھے جو عربی، فارسی اور ہندوستانی، تینوں زبانوں میں سے کم سے کم کسی ایک زبان میں شعر کہنے کی قدرت رکھتے تھے۔ اسی دربار میں بارہ سو طبیب بھی تھے۔ خود سلطان اپنے دستر خوان پر دو سو فقہاء کو روزانہ مدعو کرتا تھا۔ اور علمی مباحث چھیڑ کر اس میں خود بھی حصہ لیتا تھا۔ محمد تغلق کے اس ابتدائی عہد کے دربار سے وابستہ اہم علماء میں نصیر الدین، عبد العزیز، شمس الدین، عز الدین، مجد الدین اور برہان الدین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

محمد تغلق کے بعد اس کا جانشین فیروز تغلق ہوا۔ یہ سلطان نہایت علم دوست، ادب نواز اور اہل علم و ادب کا قدردان تھا۔ اس نے تین محل تعمیر کروائے جن میں ایک محل کا نام انگوروں کا محل تھا۔ یہ محل ممتاز اہل علم و دانشوروں کے استقبال کے لئے مختص تھا۔ وہ عالموں

کی حوصلہ افزائی کے لئے 136 لاکھ تنکہ خرچ کرتا تھا جن میں سے 36 لاکھ کی رقم صرف عالموں اور مذہبی لوگوں کے لئے مختص تھی۔

عوام میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے جو کوششیں سلطان فیروز شاہ نے کیں شاید کسی اور بادشاہ نے نہیں کیں۔ اس نے جو تعمیری کام کئے ان میں مساجد اور مساجد سے متصل مدرسوں کی تعمیر بہت اہم ہے۔ اس نے سلطان التتمش کا تعمیر کردہ مدرسہ دوبارہ بنوایا اور اس میں تعلیم کا نظام شروع کیا۔ ایک مدرسہ فیروزآباد میں بھی قائم کیا گیا، جو مدرسہ کے شاہی سرپرست کی نسبت کی وجہ سے مدرسہ فیروز شاہی کہلاتا تھا۔ برنی کے بیان کے مطابق، اس مدرسے کے تعلیمی نظام کی شہرت اور تعمیراتی حسن نے ہندوستان کے سبھی مدارس کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس مدرسے کے اہم اساتذہ میں مولانا جمال الدین رومی تھے جو دینیات، فقہ اور تفسیر کے استاد تھے۔ ایک دوسرے استاذ کا ذکر بھی ملتا ہے جو مذہبی علوم کے ماہر تھے اور سمرقند سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ مدرسہ اقامتی نوعیت کا تھا جہاں طلبہ واساتذہ کے قیام کا انتظام ہوتا تھا۔

فیروز تغلق کے اس تابناک دور کے بعد غیاث الدین دوم، ابو بکر، ناصر الدین اور پھر محمود تغلق کا تاریک دور آیا جس میں اس تعلیمی و علمی پیش رفت کو زبردست نقصان پہنچا۔ اور دہلی کا شاہی دربار تقریباً نصف صدی تک تہذیب و ادب کے مرکز ہونے کے اعجاز سے محروم رہا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ محمود تغلق کے عہد میں تیموری حملے نے سب کچھ برباد کر دیا لیکن تیمور نے بھی لونی کے قصبے کے محاصرے کے دوران یہ حکم دیا کہ وہاں کے سیدوں، شیخوں اور اہل علم مسلمانوں کے گھروں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

9.3.4 سید شاہی عہد

اس کے بعد 1414ء میں سید شاہی خاندان کی حکومت کا دور آیا۔ اس کے ابتدائی دو حکمراں، خضر خاں اور مبارک کا دور کچھ خاص قابل ذکر نہیں ہے۔ البتہ آخری سلطان سید علاء الدین تقریبا تیس سال بدایوں میں رہا، جہاں اس نے بہلول لودھی کی باتوں میں اپنا اقتدار گنوادیا۔ قیام بدایوں کے دوران، سید علاء الدین نے بہت سے مدارس و مساجد اور مقبروں کی تعمیر کی، جن کے کھنڈرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس طرح سید علاء الدین کی بدولت دہلی سے 100 میل کے اندر تعلیم کو پھیلانے کا ایک اور مرکز پیدا ہو گیا تھا۔ جس میں بڑی تعداد میں مدرسے قائم کئے گئے تھے، جو دہلی اور فیروزآباد کے تعلیماتی کام میں اضافہ کار رہے تھے۔

9.3.5 لودھی عہد

سید علاء الدین کے بعد 1451ء میں بہلول لودھی نے لودھی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بہلول لودھی اگرچہ ادبیات کا دلدادہ نہیں تھا لیکن اہل علم کی صحبت میں دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے علم وادب کی خوب سرپرستی کی اور اہل علم کے لئے وظائف مقرر کئے۔ مآثر رحیمی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ مدرسے بھی تعمیر کروائے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا، سکندر لودھی، تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں آگرہ دارالسلطنت بنا تو علمی دنیا کا مرکز بھی دہلی سے وہیں منتقل ہو گیا۔ سکندر لودھی خود شعر وادب میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ادبی ذوق اور شعر گوئی کا مذاق رکھتا تھا۔ وہ اپنے اشعار کی اصلاح سیر العارفین کے مصنف شیخ جمال سے لیتا تھا۔ اس کا دیوان آٹھ یا نو ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ سکندر لودھی نے آگرہ میں ایک مدرسہ بنوایا۔ تاریخی روایات کے مطابق اس نے بہت سے دیگر مذہبی اداروں کو مدرسوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسے مذہبی مباحث اور اختلافی مسائل کی علمی بحثوں میں خصوصی دلچسپی تھی۔ سکندر لودھی نے بہت سے اہل علم کو متعدد کتابوں کے ترجمے کرنے اور مختلف

علوم وفنون کی کتابیں تصنیف کرنے پر مامور کیا۔ ان تراجم وتصانیف کا تعلق ویدک علم وادویات سے تھا۔ سکندر لودھی کی علم دوستی کا شہرہ ایسا بلند ہوا کہ عرب، فارس، بخارا، وغیرہ کے مشہور علماء آگرہ میں آکر بس گئے۔ یہ شہر اس کا دارالسلطنت تھا اور علم وادب کا ایک عظیم مرکز بن چکا تھا۔ سلطان ادبی نگارشات کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

نتیجے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عہد سلطنت کے ابتدائی عہد میں علوم وفنون کا فروغ دہلی اور دوسرے مقامات پر سکونت اختیار کرنے والے بیرونی علماء کا مرہون منت رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ ہند نژاد تعلیم یافتہ مسلمان بھی اس لائق ہو گئے کہ انہوں نے تدریسی و تصنیفی کاموں میں حصہ لیا۔ ان علماء کی علمی خدمات کسی خاص دائرہ تک محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے علوم نقلیہ وعقلیہ دونوں ہی میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ آگے کے صفحات میں مختلف علوم میں مسلم علماء کی خدمات کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

9.4 عہد سلطنت کے ہندوستان میں اسلامی علوم کا ارتقا

9.4.1 علم قرأت کا ارتقا

قرآن کریم ہمیشہ سے ہی مسلمانوں کے علم اور تعلیم کا مرکز رہی ہے۔ مسلمانوں کے ذریعہ پرورش پانے والے نقلی اور عقلی علوم دونوں نے ہی قرآن سے بالواسطہ اور بلاواسطہ استفادہ کیا ہے۔ بذات خود قرآن کریم کا تعلق کتابت اور قرأت سے ہے۔ قرآن کریم کی قرأت سے مراد قرآن مجید پڑھنے کے وہ اصول وضوابط ہیں جن کی مدد سے صحت مخارج کی ادائیگی کے ذریعہ صوتی حسن نمایاں ہوتا ہے اور اسی کو فن قرأت کہتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، دوسرے مسلم ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی سلاطین دہلی ہر دور میں مدارس قائم کرتے رہے ہیں۔ ان مدارس میں قرآن پڑھانے کے لئے باضابطہ ایسے اساتذہ کا تقرر ہوتا تھا جنہیں فن قرأت میں مہارت حاصل ہوتی تھی اور انہیں 'مقری' کہتے تھے۔ عہد سلطنت کے متعدد علماء کے لئے یہ لقب استعمال ہوا ہے۔ خود مدرسہ فیروز شاہی کے صدر مولانا جلال الدین رومی قرأت کے مختلف معروف طریقوں پر مہارت بلکہ سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس عہد میں 'قرآن خواں' اور 'خوش خواں' کی اصطلاحیں بھی حسن قرأت کا مظاہرہ کرنے والے اہل فن کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ بعض سلاطین وامراء سلطنت بھی 'قرآن خواں' کے لقب سے مشہور تھے۔ تاریخی کتب اور تذکروں سے اس بات کے وافر ثبوت ملتے ہیں کہ اس دور میں فن قرأت کے سیکھنے اور سکھانے میں کافی دلچسپی پائی جاتی تھی۔ مکاتب ومدارس کے علاوہ خانقاہوں میں مشائخ اپنی تعلیمی وتربیت کی مجالس میں بھی اس فن کو سکھانے کا اہتمام کرتے تھے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کے زمانے میں ہندوستان کا سفر کیا۔ جنوبی ہند کے ایک مقام ہنور کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ یہاں 36 مدارس ہیں جن میں سے 13 لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مختص ہیں اور اس علاقے کی عورتوں میں حفظ قرآن کا عام رواج ہے۔ پندرہویں صدی میں مالوہ کے علاقے میں خلجی خاندان کی ایک آزاد ریاست قائم تھی۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق اس ریاست کے حکمراں غیاث الدین کے محل میں ہزاروں کنیزیں حفظ قرآن کی دولت سے مالامال تھیں۔ اس جگہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس عہد

میں حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ عام طور پر قرأت سکھانے یا تجوید کی مشق کرانے کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ اس لئے مدارس، انفرادی مراکز یا جہاں بھی حفظ کا نظم قائم تھا، ان سے لازمی طور پر علم قرأت کو بھی ترویج ملتی تھی۔

عہد سلطنت میں تذکیر و تلقین کی مجلسوں کا عام رواج تھا۔ صوفیاء کی خانقاہوں اور واعظین کی محفلوں سے خوش الحان قاری وابستہ ہوتے تھے اور حاضرین کو اپنی قرأت سے محظوظ کرتے تھے۔ ان مجالس اور محافل کے تذکروں میں فن قرأت کے ماہرین کے نام کثرت سے ملتے ہیں۔ بلبن کے عہد میں شیخ نظام الدین ابو المویدکی مجلسوں میں ان کے مرید قاری قاسم المقری قرأت کرتے تھے۔ خود شیخ نظام الدین اولیاء کے ارادت مندوں میں شہاب الدین مقری کا نام ملتا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ان کی قرأت لحن داؤدی کا اثر رکھتی ہے۔ جب وہ امامت کرتے تو ان کی قرأت سن کر نظام الدین اولیاء پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ ان مشائخ و واعظین کے علاوہ عہد سلطنت میں سید نور الدین مبارک غزنوی، مولانا ضیاء الدین سنامی، شیخ بدر الدین اودھی، مولانا شہاب الدین خلیل، شیخ جلال الدین دہلوی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، شیخ علاء الدین نیلی اودھی اور سید جلال بخاری مخدوم جہانیان بھی وعظ و تذکیر کے لئے مشہور تھے۔ ان کی مجالس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے تھے اور قاری کی خوش الحانی سے محظوظ ہوتے تھے۔ اس طرح ان مجالس سے علم قرأت کی ترویج ہوتی تھی۔

مدارس اور وعظ کی مجلسوں کے علاوہ صوفیاء کی خانقاہیں بھی علوم دین کے فروغ کا مرکز تھیں۔ صوفیاء کے تذکروں اور ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خانقاہوں میں علم قرأت سیکھنے کا اہتمام ہوتا تھا۔ شیخ فرید الدین گنج شکر کے بارے میں صراحت سے ملتا ہے کہ اپنے مریدوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور قرأت کے اصول وضوابط بھی سکھاتے تھے۔ نظام الدین اولیاء، جنہوں نے بچپن میں شادی مقری سے قرأت کی تعلیم حاصل کی تھی، وہ ان کے شیخ یعنی فرید الدین گنج شکر کے لئے ناکافی تھی۔ لہذا انہوں نے نظام الدین کو دوبارہ سے قرأت کی تعلیم فرمائی۔ اس روایت کو نظام الدین نے اپنی خانقاہ میں باقی رکھا۔ نظام الدین اپنے مریدین کو تاکید کرتے تھے کہ قرآن کو ترتیل اور تدویر کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ سے مولانا علاء الدین نیلی اور شیخ شہاب الدین دہلوی جیسے متعدد خوش الحان قاری وابستہ تھے جن کی قرأت سن کر لوگوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

علماء و مشائخ کے ساتھ ساتھ سلاطین اور ان کے درباری امراء بھی فن قرأت کی اشاعت میں دلچسپی لیتے تھے۔ بعض سلاطین نے اس علم کے ماہرین کو اپنے دربار سے منسلک کیا اور ان کی قدر افزائی کی۔ سلطان قطب الدین ایبک نے ایک فرمان کے ذریعے علم فقہ و قرأت کے لئے وظائف مقرر کئے جنہیں بعد کے زمانے میں نہ صرف یہ کہ برقرار رکھا گیا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا گیا۔ قطب الدین ایبک خود بھی قرآن شریف بہت اچھا پڑھتا تھا اور اسی لئے اسے 'قرآن خواں' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ عہد فیروز شاہی کے ایک ممتاز امیر و اہم عہدہ دار ملک قبول کے لئے بھی بعض مآخذ میں 'قرآن خواں' کا لقب استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے وہ بھی بہت اچھی آواز سے قرآن پڑھتے تھے اور اسی مناسبت سے ان کے ایما پر ترتیب دئے جانے والے فتاوی کا مجموعہ 'فتاوی قرآن خوانی' کے نام سے مشہور ہوا۔ سلطانہ رضیہ کے بارے میں تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ وہ قرآن پڑھنے میں قرأت کے اصول و آداب کو ملحوظ رکھتی تھیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں علم قرأت کی ترویج میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے عہد سلطنت کے مآخذ میں قاریوں کا

حوالہ سب سے زیادہ اسی دور میں ملتا ہے۔ عہد علائی کے معاصر مورخوں نے دہلی کے قاریوں کے بارے میں یہ تاثر پیش کیا ہے کہ وہ اپنے فن میں ایسے منفرد و ممتاز تھے کہ عراق و خراسان میں بھی ان کی ہمسری کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ عہد فیروز شاہی میں ایسے ماہرین قرأت گذرے ہیں کہ جن سے حجاز کے قاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، ان میں ایک نام شیخ محمد بن محمد دمراجی معروف بہ نجیب الدین ہندی تھے جو دہلی سے مکہ مکرمہ گئے۔ آپ نے قاری حرم شیخ عفیف دلاصی کے سامنے قرأت کی جس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔

لودھی اور سید خاندان کی حکومتوں کا زمانہ سیاسی افراتفری کا زمانہ ہے اور اس زمانہ میں علمی خدمات پر بہت زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں لیکن تاریخ کی کتابوں میں بعض ایسے ماہرین قرأت کے نام ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں بھی فن قرأت کی ترویج و اشاعت مسلسل ہوتی رہی۔ ان میں محمد بن محمود مقری، راجح بن داؤد احمد آبادی وغیرہ شامل ہیں۔ ایک دوسرے قاری سلیمان بن عفان مندوی نے چشتی صابری سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ عبد القدوس گنگوہی کو قرأت کی تعلیم دی۔ ان کے بارے میں صاحب اخبار الاخیار لکھتے ہیں کہ وہ اس فن میں یکتائے زمانہ تھے۔

9.4.2 علم قرآن کا ارتقاء

عہد سلطنت میں جن علوم کی ترویج و اشاعت ہوئی ان میں علوم قرآنی بھی شامل ہیں۔ علوم قرآنی سے متعلق ایک فن خطاطی ہے۔ قرآن سے محبت وعقیدت کی بنا پر یہ علم مسلمانوں میں خوب پھیلا۔ بعض لوگ جن میں علماء، سلاطین اور امراء سب شامل ہیں، صرف برکت کے لئے قرآن کی کتابت کرتے تھے، اور نہایت ہی کم قیمت میں اپنے تیار کردہ نسخوں کو فروخت کرتے تھے۔ محمد بن تغلق کے عہد کے ایک نامور عالم شیخ فخر الدین مروزی تھے، انہوں نے قرآن کی کتابت کو اپنا مشغلہ بنایا ہوا تھا۔ سلطان ناصر الدین محمود کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ وہ انیس سال تک قرآن کی کتابت کرتا رہا اور اسی مشغلہ کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ جب وہ اپنے نسخے بازار میں بھیجتا تھا تو کاتب کا نام پوشیدہ رکھتا تھا تاکہ لوگ یہ سوچ کر کہ اسے بادشاہ نے لکھا ہے زیادہ قیمت نہ دے دیں۔ یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ قرآن کی کتابت کے لئے عام طرز کی کتابت اختیار نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس میں کتابت کے اعلی نمونے اور فن خطاطی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ اور بعض نسخوں پر سونے اور چاندی کے پانی سے نقاشی بھی کی جاتی تھی۔ ماہر خطاطوں کے نسخوں کو لوگ بڑی بڑی قیمتیں ادا کرکے خریدتے تھے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جلال الدین مانکپوری کی کتابت اس قدر خوبصورت اور معیاری تھی کہ ان کے کتابت کردہ قرآن کے نسخے دہلی میں بآسانی پانچ سو تنکہ، جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی ہدیہ میں فروخت ہوتے تھے۔

عہد سلطنت میں مدارس میں جو تعلیم کا نصاب پڑھایا جاتا تھا اس کے بارے میں لوگوں کا عام خیال ہے کہ اس میں فقہ کا عنصر غالب تھا، لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ تفسیر کا نصاب فقہ کے نصاب سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس عہد کے مدارس میں علم تفسیر سے متعلق تین اہم کتابیں رائج تھیں جن کے نام ہیں: تفسیر مدارک، بیضاوی اور کشاف۔ ان تینوں میں کشاف کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیات کریمہ کی ترجمانی و تشریح کے ضمن میں الفاظ کی لغوی تحقیق، وجوہ اعراب اور علم بیان و معانی کے مسائل سے جس انداز سے اس میں بحث کی گئی ہے وہ دوسری تفسیروں میں نہیں ملتی۔ کشاف کا مطالعہ طلبہ میں لغوی ولسانیاتی تحقیق کے ساتھ فہم قرآن کا مادہ پیدا کرنے

کے لئے بہت معاون و مفید سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس عہد کے ممتاز علماء مثلاً فرید الدین شافعی، نصیر الدین محمود بن یحی اودھی، شمس الدین یحی اودھی، سید محمد کرمانی، قاضی عبد المقتدر وغیرہ کی درسیات میں یہ کتاب ہمیشہ شامل رہتی تھی۔ خود ہندوستانی مشائخ میں بھی اس کتاب کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ نظام الدین اولیاء اور ان کے مریدوں کے ضمن میں متعدد بار اس کتاب کا ذکر آتا ہے۔ رکن الدین چغمر جو نظام الدین اولیاء کے مرید اور مشہور خطاط تھے انہوں نے کشاف کا ایک خوش خط نسخہ اپنے پیر کی خدمت میں پیش کیا تھا جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

عہد سلطنت میں نہ صرف یہ کہ قرآن کی تشریح و تفسیر پر زور دیا جاتا تھا اور وہ درسی نصاب کا ایک لازمی جز تھا بلکہ اس نصاب کے پروردہ علماء کی ایک کثیر تعداد ایسی پیدا ہو گئی تھی جن کے ذریعہ علم تفسیر کو ہندوستان میں فروغ حاصل ہوتا رہا۔ ان علماء میں ہندوستانی نژاد کے علماء بھی شامل تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی عہد کے ایک عالم سید محمد اسمٰعیل بخاری تھے۔ ان کا تعلق محمود غزنوی کے زمانہ سے تھا۔ یہ لاہور میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے بارے عام اتفاق ہے کہ علم تفسیر و حدیث میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، اور لاہور میں ان علوم کی اشاعت ان ہی کی مرہون منت تھے۔ سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں سید مرتضی کوفی کو ان علوم کے حوالے سے خصوصی شہرت حاصل تھی۔ دیگر مسلم ممالک سے جو علماء ہندوستان آئے ان میں مولانا نجم الدین دمشقی بھی تھے۔ آپ سلطان بلبن کے معاصر علماء میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ برنی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مشہور فلسفی و متکلم اور تفسیر کبیر کے مصنف امام فخر الدین رازی کے شاگرد تھے، اور خود علم تفسیر میں مہارت رکھتے تھے۔

عہد علاء الدین خلجی کے زمانے کے علماء میں مولانا ضیاء الدین سنامی، شہاب الدین خلیل، فرید الدین شافعی اودھی وغیرہ کے نام علم تفسیر کے حوالے سے خاص طور پر ذکر کئے جاتے ہیں۔ مولانا ضیاء الدین اور مولانا شہاب الدین اپنی علمی مجلسوں میں قرآن کی تفسیر سے متعلق درس دیا کرتے تھے۔ مولانا ضیاء الدین کی کتاب 'نصاب الاحتساب' میں جا بجا قرآن و حدیث کے حوالے ملتے ہیں۔ صاحب نزھۃ الخواطر مولانا ضیاء الدین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہیں قرآن کی تفسیر اور اس کے رموز کی تشریح میں ید بیضا حاصل تھا۔ فرید الدین شافعی اودھ کے شیخ الاسلام تھے اور کشاف پر ان کے دروس کا عام شہرہ تھا۔ اودھ کے متعدد معاصر علماء نے ان سے اس علم میں اکتساب فیض کیا۔

خلجیوں کے مثل سلاطین تغلق کے زمانے میں بھی اس علم کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اس حوالے سے مولانا شمس الدین محمد بن یحیٰ، شیخ علاء الدین نیلی اور شیخ نصیر الدین محمود بن یحیٰ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ تغلق خاندان کے بعد سید اور لودھی خاندان کے سلطانوں نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس کے عہد میں بھی بعض اہم نام علم تفسیر کے حوالے سے تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان علماء میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور شیخ حسام الدین مانک پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ذیل میں اس پورے عہد میں لکھی جانے والی اہم تفسیروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں تفسیر پر لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب کا تعلق 13 ویں صدی عیسوی سے ہے۔ اس کا نام کاشف الحقائق و

قاموس الد قائق ہے جسے محمد بن احمد ماریکلی دہلوی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ محمد بن احمد صاحب مشارق الانوار کے شاگرد اور نظام الدین اولیا ءکے استادوں میں سے تھے۔ یہ تفسیر عربی زبان میں لکھی گئی ہے اور صوفیانہ مکتب فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس دور کی اولین تفسیروں میں 'غرایب القرآن' کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مولف حسن بن محمد تھے جو نظام نیشاپوری کے نام سے بھی مشہور تھے اور محمد بن تغلق کے معاصر تھے۔ ابو حفص عمر بن اسحاق سراج الہندی ہندی الاصل تھے اور 'تفسیر سراج الھند' کے مصنف تھے۔ انہوں نے بعد میں مصر میں جا کر سکونت اختیار کی اور جامعہ ازہر کے قاضی القضاۃ کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔

خالص ہندوستانی تفسیروں میں اہم تفسیر 'لطائف التفسیر' ہے جس کے مصنف قاسم بن عمر دہلوی تھے۔ آپ نظام الدین اولیاء کے بھانجے تھے۔ اس تفسیر میں مصنف نے قرآن کے اسرار و نکات کی وضاحت اس سادہ انداز میں کی ہے کہ خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ 14 ویں صدی عیسوی میں عہد فیروز شاہی کے ممتاز و مشہور وزیر امیر تاتار خاں کے ایما پر جس تفسیر کو مرتب کیا گیا وہ اپنی اہمیت اور نوعیت کے لحاظ سے بہت منفرد ہے۔ اس تفسیری مجموعے کا نام 'تفسیر تاتار خانی' رکھا گیا۔ امیر تاتار خان نے علماء کی ایک جماعت کو مامور کر کے اس مجموعے کو مرتب کروایا اور اس میں پچھلی تفسیروں میں مصنفین کی اختلافی آراء کو خاص طور پر جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ تفسیر 'نور بخشیہ' 15 ویں صدی کے ایک مشہور صوفی عالم سید اشرف جہانگیر سمنانی کی تصنیف ہے۔ وہ محمد بن تغلق کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے اور کچھوچھہ کے مقام کو اپنا مسکن بنایا۔ اسی عہد میں مولانا خواجگی نے 'بحر المعانی' تصنیف کی۔ گرچہ یہ ایک مختصر تفسیر ہے لیکن اس میں علم کلام کے مسائل پر جا بجا بحث کی گئی ہے۔ متصوفانہ انداز میں لکھی جانے والی تفسیروں میں سید محمد بن یوسف الحسنی معروف بہ گیسو دراز کی تصنیف 'تفسیر القرآن الکریم' خصوصیت کی حامل ہے۔ فن تفسیر سے متعلق گیسو دراز سے تقریباً تین کتابیں منسوب کی جاتی ہیں۔ مذکورہ بالا تفسیر کے علاوہ انہوں نے کشاف کے طرز پر بھی کتاب تصنیف کی۔ شیخ علی بن احمد مہائمی کی تفسیر 'تبصیر الرحمن وتیسیر المنان' جو تفسیر رحمانی یا تفسیر مہائمی کے نام سے بھی معروف ہے، اس اعتبار سے خصوصیت کی حامل ہے کہ یہ ہندوستان کی پہلی تفسیر ہے جس میں قرآن کی ترجمانی اور تشریح میں آیات کے ربط کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کی اس خصوصیت کا اعتراف نظم قرآن کے مشہور شارح علامہ حمید الدین فراہی نے بھی کیا ہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تین جلدوں میں لکھی تفسیر 'بحر مواج' کو فارسی تفسیروں اور عہد سلطنت میں لکھی جانے والی تفسیروں میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ آخر میں 15 ویں صدی میں لکھی جانے والی تفسیروں میں 'تفسیر نور النبی' اور حاجی عبد الوہاب بخاری کی تفسیر کا ذکر اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ تفسیر نور النبی کے مولف خواجہ حسن ناگوری تھے۔ مصنف نے قرآن کے ہر جز کی علاحدہ تفسیر لکھی ہے۔ قرآنی آیات کی شرح و بسط کے ساتھ وضاحت، لغوی و لسانیاتی تحقیق، اور انداز بیان کی سادگی اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں۔ حاجی عبد الوہاب بخاری کی تفسیر کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے قرآن کریم کی ہر ایک آیت سے نبی کریم علیہ السلام کی نعت و منقبت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ صاحب تفسیر کا خیال ہے کہ پورا قرآن مجید نعت نبوی سے عبارت ہے۔

9.4.3 علم حدیث کا ارتقاء

سلاطین دہلی کے عہد میں علم حدیث کے عروج ارتقاء کے حوالے سے پچھلی کچھ دہائیوں تک یہ رائے رہی ہے کہ اس دور میں علم

حدیث کو دوسرے علموں کے مقابلے میں کم ترقی ہوئی یا پھر اسے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ سید سلیمان ندوی اور 'علم حدیث میں بر صغیر کا حصہ' کے مصنف نے بھی اسی طرح کے خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس غلط فہمی کے در آنے کی ایک وجہ یہ رہی ہے کہ ماضی قریب تک عہد سلاطین میں مسلمانوں کے ذریعہ قائم کردہ درسگاہوں پر باضابطہ مطالعہ نہیں ہو سکا۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد اول اول سندھ کے علاقے میں علم حدیث کو رواج ملا جس کا سہرا ابو معشر سندھی کے سر جاتا ہے۔ آپ حدیث کے علاوہ سیر و مغازی کے بھی بڑے عالم تھے۔ سندھ کے بعد لاہور علم حدیث کا مرکز ہوا۔ اس کے بعد ملک کے دوسرے حصوں میں حدیث کی ترویج و اشاعت کے مراکز وجود میں آئے جن میں بطور خاص اچھ، ملتان، دہلی، بہار و کشمیر کافی مشہور ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس عہد میں "مشارق الانوار" اور "مصابیح السنہ" علم حدیث پر بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ لیکن ان کے علاوہ حدیث کی اور بہت سی کتابوں کا ذکر مختلف ذرائع سے مثلاً درس و تدریس، تصنیف و تالیف، شروحات، مخطوطات کی تیاری وغیرہ، معاصر کتب تاریخ میں ملتا ہے۔ عہد سلطنت میں حدیث کی جن کتابوں کے حوالے تاریخ و تذکروں میں ملتے ہیں ان میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، فتح الباری، شرح نووی، سنن ابی داؤد، مشکوۃ المصابیح، مصابیح السنہ، سنن بیہقی، متدرک حاکم، جیسی اہم کتابوں کے نام شامل ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ کتابیں اس عہد کے علماء و مشائخ کے مطالعہ میں رہتی تھیں اور درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ذیل میں واقعات کے ذریعے اس پر مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔

شیخ مظفر حسین بلخی چودھویں صدی عیسوی کے مشہور عالم اور شیخ شرف الدین یحی منیری کے خلفاء میں سے تھے۔ وہ دہلی کے مدرسہ 'کوشک لعل' میں استاد تھے۔ انہوں نے خاص طور سے اپنے بھتیجے کو صحیحین کا درس دیا تھا جس کا ذکر اس کی سند میں بھی موجود ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ نظام الدین اولیاء نے اپنے استاد شیخ کمال زاہد سے مشارق الانوار کا درس لیا تھا۔ لیکن ان کی مجالس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صحیحین نہ صرف یہ کہ ان کے مطالعے میں رہتی تھی بلکہ ان دونوں کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی اور مذاکرہ کے دوران وہ ان کتابوں کا حوالہ بھی دیتے تھے۔ عہد سلاطین دہلی میں صحیحین کی دستیابی سے متعلق ایک دلچسپ روایت سیر الاولیاء میں منقول ہے جس کے مطابق شہر کے ایک بڑے عالم کے پاس صحیحین کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ اس عہد میں کتابوں کو ہدیہ دینے کا بھی عام رواج تھا۔ اور کتب حدیث میں صحیح مسلم کے ہدیہ دئے جانے کے متعدد واقعات کتابوں میں درج ملتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ چودھویں صدی کے ایک شیخ زین الدین سے متعلق ہے انہوں نے صحیح مسلم کا ایک عمدہ نسخہ تیار کر کے اپنے شیخ یحی منیری کو تحفے میں دیا تھا۔ پندرہویں صدی کے ایک مشہور عالم شیخ الاسلام شیخ معز بہاری کے پاس بھی صحیح مسلم کا ایک قیمتی نسخہ تھا جسے انہوں نے اپنے صاحبزادہ شیخ حسین کو مرحمت کیا تھا۔ صحیحین کے علاوہ صحاح ستہ میں موجود دوسری کتابوں کا ذکر بھی اس عہد میں ملتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی جو مدرسہ فیروز شاہی کے صدر اور ممتاز اساتذہ میں سے تھے ان کے متعلق یہ روایت موجود ہے کہ وہ پنج سنن، یعنی سنن ترمزی، سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن نسائی، اور سنن بیہقی کے شارح تھے۔ معاصر تاریخی مآخذ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ماہر اساتذہ نے درس حدیث کے حلقے قائم کئے ہوئے تھے۔

علم حدیث کی اشاعت میں جہاں ایک طرف سلاطین دہلی نے علماء اور درسگاہوں کی سرپرستی کی وہیں دوسری طرف علمائے وقت نے اس علم میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے اس علم کے اکتساب و فروغ میں کافی مشقتیں برداشت کیں اور ہندوستان کے علمائے حدیث سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ بیرون ملک عرب ممالک کے بھی دور دراز سفر اسی غرض سے کئے۔ خود صاحب مشارق الانوار شیخ رضی الدین حسن صغانی نے بغداد کے علماء سے استفادہ کیا۔ شیخ بہاء الدین زکریا کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے اعلی تعلیم کے لئے بخارا و خراسان کے سفر کئے اور آخر میں علم حدیث کی طلب انہیں حرمین شریفین لے گئی جہاں انہوں نے شیخ کمال الدین یمنی محدث کی درسگاہ سے استفادہ کیا اور واپس آکر ایک زمانے تک درس حدیث میں مشغول رہے۔

عہد سلطنت میں حدیث کی تعلیم اور اس پر عالمانہ بحثوں اور ناقدانہ تبصروں کے علاوہ تدوین و تالیف کا کام بھی جاری رہا۔ رضی الدین حسن صغانی اپنی کتاب مشارق الانوار کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں روایت ملتی ہے کہ انہوں نے صحیح بخاری کی شرح بھی تیار کی تھی۔ 'کتاب فی اسماء شروح البخاری' کو بھی ان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ چودہویں صدی کے ایک معروف عالم سراج الدین ابو حفص عمر بن اسحق غزنوی دولت آبادی نے 'التوضیح' کے نام سے صحیح بخاری کی شرح کئی جلدوں میں مرتب کی تھی۔ اس کے جلد سوم کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں موجود ہے۔ اسی زمانہ میں 'شرح آثار النیرین فی اخبار الصحیحین' کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کے مصنف مولانا کمال الدین زاہد کے استاد اور شیخ حسن صغانی کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ علی متقی برہان پوری صاحب کنز العمال اور محمد طاہر پٹنی (جنہوں نے اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ عہد سلطنت میں گزارا) صاحب مجمع البحار کے نام بھی خدمت حدیث کے لئے عہد سلطنت میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

عہد سلطنت کے علماء کے حدیث کی بابت کارنامے اگرچہ بہت زیادہ عظیم نہیں ہیں تاہم چند خصوصیات کی وجہ سے وہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً انہوں نے عربی کے علاوہ فارسی زبان میں بھی اس علم میں کتابیں لکھیں۔ حدیث کی کتابوں کی تالیف کے لئے انہوں نے مختلف مناہج اختیار کئے اور مروجہ درسی کتب کی تشریحات لکھنے پر خاص توجہ دی۔ مزید یہ کہ انہوں نے مختصر حدیثی مجموعوں کی ترتیب میں بھی دلچسپی دکھائی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے بعض محدثین کی خدمات کو نہایت ہی اعتبار حاصل رہا ہے اور ان کی تالیفات کی قدر و قیمت بعد کے ادوار میں مسلم رہی ہے۔

9.4.4 علم فقہ کا ارتقاء

اسلامی علوم میں فقہ ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ اس کا دائرہ دوسرے علوم کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے جو انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے مثلاً مذہبی، سیاسی، معاشی اور سیاسی، کا احاطہ کرتا ہے۔ فقہ اسلامی کا مقصد زندگی کے ان شعبہ جات میں اسلام کا نقطہ نظر معلوم کرنا ہوتا ہے۔ یہ علم اصلاً اسلام کے دور اول میں ہی وجود میں آ گیا تھا اور بعد میں مسلم حکمرانوں کی سرپرستی میں تمام ممالک اسلامی میں پروان چڑھتا رہا۔ ہندوستان میں جب دہلی سلطنت قائم ہوئی تو یہاں بھی ہندوستان میں بسنے والے علماء کے ذریعہ اس علم کی اشاعت عمل میں آئی۔ چونکہ علم فقہ کے ماہرین اسلام کے قانونی نقطہ نظر کے ماہر ہوتے ہیں، سلاطین دہلی ملکی انتظامات میں ان سے مدد لیتے تھے اور انہیں شیخ

الاسلام، قاضی، مفتی، محتسب وغیرہ جیسے اہم عہدوں پر مقرر کیا جاتا تھا۔ حکومت کے زیر اہتمام جو مدارس چلتے تھے ان میں بھی اس علم کی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان مدارس میں فقہ حنفی کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ چونکہ دہلی سلطنت اوراس کے ماتحت معاشرے کی ساخت اسلامی اصولوں پر قائم تھی، سلاطین دہلی حکومتی سطح پر قانونی نوعیت کے مسائل پر فقہا سے تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ اس کی نوعیت انفرادی اور جماعتی دونوں سطح کی ہوتی تھی۔ اس طرح کی بعض خاص مجلسوں کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس ضمن میں سلطان علاء الدین کے ساتھ قاضی مغیث کا مکالمہ اور سلطان محمد بن تغلق وفیروز شاہ تغلق کے معاصر علماء سے استفسارات بہت مشہور ہیں۔ کسی مسئلے پر جب علماء کی متفقہ رائے کی ضرورت ہوتی تھی تو سلاطین علماء کی مجلسیں منعقد کرتے تھے جنہیں 'محضر' کہا جاتا تھا۔ ان مجالس میں علماء کے علاوہ مشائخ کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔

عہد سلاطین دہلی کے ہر دور میں یوں تو فقہ کی تعلیم فروغ حاصل ہوا لیکن تغلق سلاطین کا عہد اس حوالے سے کافی مشہور ہے۔ سلطان محمد بن تغلق نے سمرقند کے معروف فقیہ برہان الدین اور شیراز کے فقیہ قاضی مجد الدین کو ہندوستان لانے کے لئے اپنے سفیر بھیجے اور اس سفر پر ایک بڑی رقم خرچ کی۔ مزید برآں اس نے بیرونی ممالک سے فقہ کی نادر واہم کتابوں کو بھی منگوانے کا اہتمام کیا۔ القلقشندی جو سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا، لکھتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ایک ہزار مدارس تھے جن میں سوائے ایک کے سب میں فقہ حنفی کے مطابق تعلیم ہوتی ہے۔ محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق نے اپنی ذاتی دلچسپیوں کے سبب اس علم کو فروغ دیا۔ سیرت فیروز شاہی کے مطابق یہ سلطان چاروں مکاتب فقہ کے نقطۂ نظر سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنی تخت نشینی کے بعد سے ہی فقہی قوانین کو اپنی ریاست میں نافذ رکھا۔ علم فقہ میں سلطان کی دلچسپی اور قوانین شریعت کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیروز شاہ کے عہد حکومت میں فقہی علوم کی خوب خوب اشاعت ہوئی، اور درس وتدریس، تصنیف وتالیف، اور بحث ومباحثہ کے ذریعہ اس علم کو فروغ حاصل ہوا۔

علم فقہ میں تصنیفات کے حوالے سے عہد سلطنت کی تاریخ اسلامی تاریخ کے ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی شروعات محمود غزنوی کے زمانے سے ہی ہوگئی تھی۔ بعض روایات کے مطابق محمود غزنوی کی خواہش پر فقہ کی ایک کتاب 'مجموع سلطانی' تصنیف کی گئی تاکہ سلطان زندگی کے روزمرہ مسائل میں اسلامی نقطہ نظر کو سمجھنے میں اس کتاب سے رہنمائی حاصل کرسکے۔ اس کے بعد ایسی کتابوں کی متعدد مثالیں سلاطین دہلی کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ ان کتابوں کی نوعیت شرح وحواشی سے لیکر باضابطہ تصنیف کی ہوتی تھی۔ انہیں موضوعات کے اعتبار سے مختلف ابواب میں بانٹا جاتا تھا۔ علماء کی ذاتی تصانیف کے علاوہ سلاطین وامراء کی ایما پر جو فقہی مجموعے تیار ہوئے ان کی ایک لمبی فہرست ہے، ذیل میں مختصراً انہیں بیان کیا جاتا ہے۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں داؤد بن یوسف الخطیب البغدادی نے فتاوی غیاثیہ کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ یہ مجموعہ فتاوی اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ یہ عہد سلطنت کا پہلا مجموعۂ فتاوی ہے۔ اس کے مصنف کے بارے میں کچھ تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس میں فقہ حنفی کے مختلف مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے اور مصنف نے اس کے مجموعہ میں ان مراجع کا اختصار یہ بھی پیش کیا گیا ہے جن کے حوالے متن کے اندر دیئے گئے ہیں۔

فتاوی فیروز شاہی بھی علم فقہ میں اس عہد کی اہم تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ سے اس کتاب کا سبب تالیف معلوم چلتا ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ جو معاشرت و حکومت کے مختلف معاملات میں احکام شریعت کے نفاذ کا خواہاں تھا فارسی میں فقہ کی ایک ایسی جامع کتاب مرتب کرانا چاہتا تھا جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مسائل کی وضاحت پر حاوی ہو اور جو عوام و خواص سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہو۔ اس مجموعے میں صدر الدین یعقوب مظفر کہرامی کے جمع کردہ فتاوی کو علماء کی ایک جماعت نے تصحیح و تنقیح کے بعد کیا تھا۔ فیروز شاہ کے ہی عہد میں ایک دوسری اور اہم فقہی تصنیف 'فتاوی تاتارخانی ہے۔ اس کتاب کو اس عہد کے بااثر امیر خان اعظم تاتار خان کے ایما پر تیار کیا گیا۔ اس امیر نے علماء کی ایک کمیٹی مرتب کی جس کے سربراہ اس زمانے کے مشہور فقیہ عام بن علاء الحنفی تھے۔ یہ فقہی شاہکار تیس جلدوں میں ہے۔ اگرچہ اس مجموعے میں فقہی مسائل کو حنفی فقہ کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے لیکن دیگر فقہا کی آرا و اختلاف کو بھی اہتمام کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔

ان اہم مجموعوں کے علاوہ علم فقہ میں دیگر اہم تصنیفات بھی اس عہد میں وجود میں آئیں۔ ان میں اہم نام نصاب الاحتساب، فتاوی ابراہیم شاہی، مطالب المومنین، فوائد فیروز شاہی، تحفۃ نصائح وغیر شامل ہیں۔ یہ تمام کتابیں مجموعوں یا ذاتی تصانیف کی نوعیت کی ہیں جنہیں سلاطین و امرا کی خواہش پر تصنیف کیا گیا یا پھر عوام کی تعلیم کے لئے لکھا گیا۔ اس عہد میں علم فقہ پر لکھی جانے والی متعدد کتابوں اور سلاطین و عوام میں اس علم سے متعلق ہمہ گیر دلچسپی نے علم فقہ کے ارتقاء و فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ فقہ و اصول فقہ پر لکھی جانے والی ان کتابوں کے مطالعے سے ماہرین یہ اہم نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس عہد کے علماء نے جن فقہی مسائل پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے وہ صرف تقلیدی نوعیت کی نہیں تھیں بلکہ عصری مسائل کے حوالے سے ان کی آراء مجتہدانہ استدلال پایا جاتا ہے۔

9.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- یہ بات غلط فہمی پر مبنی ہے کہ عہد سلطنت علمی خدمات انجام نہیں دی گئیں۔
- مختلف علوم و فنون میں نہ صرف سلاطین نے علماء و ماہرین کی سرپرستی کی بلکہ خود کئی سلاطین ان علوم کے ماہر تھے۔
- علوم نقلیہ کے ساتھ ساتھ بہت سے فنون لطیفہ کے فروغ کے سلسلے میں بھی اس عہد میں خاصی پیش رفت نظر آتی ہے۔
- فروغ علم کے لئے مدارس کے قیام کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رہا۔
- مدرسے بالعموم مساجد کے صحنوں میں علماء کی مجالس کی شکل میں قائم تھے۔ جہاں ان کے قیام و طعام کا نظم بھی ہوتا تھا۔
- بعض مستقل مدارس کے قیام کا تذکرہ بھی تاریخوں میں ملتا ہے۔ جہاں طلبہ و اساتذہ کے قیام و طعام اور بنیادی ضرورتوں کی ساری سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔
- سلاطین کے علاوہ اس علمی پیش رفت میں اپنی اپنی سطح پر بہت سے امراء اور عہدہ داران مملکت نے خدمات انجام دیں۔

- صرف بیرون ہند سے علماء وماہرین کو بلانے اور جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ خود ہندوستانی علماء کی بھی خاصی بڑی تعداد علمی سرگرمیوں میں پیش پیش نظر آتی ہے۔

9.6 نمونہ امتحانی سوالات

9.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. وہ کون سا مملوک سلطان ہے جسے "قرآن خواں" کہا جاتا تھا؟

(a). قطب الدین ایبک (b). بلبن (c). محمد بن تغلق (d). سکندر لودھی

2. عہد سلطنت میں فن قرأت میں مہارت رکھنے والا کیا کہلاتا تھا؟

(a). مقری (b). فقیہ (c). محدث (d). سائنس داں

3. چشتیہ صابریہ سلسلے کے بزرگ شیخ عبد القدوس گنگوہی کے فن قرأت میں استاد کون تھے؟

(a). سلیمان بن عفان مندوی (b). فخر الدین مروزی (c). سید محمد کرمانی (d). قاضی عبد المقتدر

4. عہد سلطنت میں کون سی تین تفاسیر بالعموم شامل نصاب تھیں؟

(a). تفسیر مدارک (b). کشاف (c). بیضاوی (d). سب صحیح

5. سلطان بلبن کے عہد میں مفسر قرآن امام فخر الدین رازی کے کون سے شاگرد ہندوستان تشریف لائے؟

(a). نجم الدین دمشقی (b). ضیاء الدین سنامی (c). سید محمد کرمانی (d). تمام غلط

6. ہندوستان میں فن تفسیر پر سب سے پہلی کتاب کس صدی میں لکھی گئی؟

(a). دسویں صدی عیسوی (b). بارہویں صدی عیسوی (c). پندرہویں صدی عیسوی (d). ساتویں صدی عیسوی

7. طبقات ناصری کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a). قاضی منہاج سراج (b). امیر کوہانی (c). قاضی عبد المقتدر (d). شیخ بہاء الدین

8. سندھ میں علم حدیث کے فروغ کا اولین سہرا کس کے سر ہے؟

(a). ابو معشر سندھی (b). قاضی منہاج سراج (c). قاضی عبد المقتدر (d). شیخ بہاء الدین

9. "مشارق الانوار" کس کی تصنیف ہے؟

(a). رضی الدین حسن صغانی (b). سید علی کرمانی (c). قاضی عبد المقتدر (d). قاضی منہاج سراج

10. "فتاوی غیاثیہ" کا تعلق کس سلطان کے عہد سے ہے؟

(a). غیاث الدین بلبن (b). محمد بن تغلق (c). ناصر الدین محمود (d). سکندر لودھی

9.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. فن قرأت قرآن سے کیا مراد ہے؟ واضح کیجیے۔
2. علم قرآن کے ارتقا پر ایک مضمون تحریر کیجیے۔
3. "تفسیر نور النبی" اور "تفسیر حاجی عبد الوھاب بخاری" کی خصوصیات پر نوٹ لکھیے۔
4. عہد سلطنت میں علم حدیث کی خدمت کی خصوصیت کیا ہے؟ مضمون لکھیے۔
5. "فتاوی فیروز شاہی" کی وجہ تالیف پر روشنی ڈالیے۔

9.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عہد سلطنت میں علوم وفنون کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالیے۔
2. فن قرأت و قرآن کے سلسلے میں عہد سلطنت میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لیجیے۔
3. عہد سلطنت میں اسلامی علوم پر ایک تبصراتی مضمون تحریر کیجیے۔

9.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	تاریخ فرشتہ	:	محمد قاسم فرشتہ (م1620ء)
.2	تاج المآثر	:	حسن نظامی نیشاپوری (م1217ء)
.3	تاریخ فیروز شاہی	:	ضیاء الدین برنی (م1357ء)
.4	طبقات ناصری	:	منہاج سراج (م1260ء)
.5	مسلم حکومتوں کے دوران ہندوستان میں علم کا فروغ	:	نریندر ناتھ لا، اردو ترجمہ: سید مسرور علی اختر ہاشمی

اکائی 10:   دہلی سلطنت (مذہبی رواداری)

اکائی کے اجزا:

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری
10.3 سلاطین دہلی کی فکری نشو نما
10.4 قطب الدین ایبک
10.5 غیاث الدین بلبن
10.6 علاء الدین خلجی
10.7 محمد شاہ تغلق
10.8 محمد فیروز شاہ
10.9 سکندر لودھی
10.10 سلاطین دہلی پر ہندو مؤرخین کا تبصرہ
10.11 اکتسابی نتائج
10.12 نمونہ امتحانی سوالات
10.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
10.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
10.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

اسلامی معاشرے کی بنیاد اللہ کے احکام پر ہے جو قرآن و سنت نبوی کی شکل میں مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست میں عملی طور پر ظاہری معنیٰ میں نظر آتے ہیں۔ قرآن جس زندگی کو انسانیت کا باعث قرار دیتا ہے اس کی عملی شکل ریاست مدینہ کے عہد نبوی ﷺ میں نظر آتی ہے۔ قرآن میں بیان کردہ نظام حکومت کا یہی وہ منظر تھا جس کی بنیاد خود نبی کریم ﷺ نے رکھی اور اس کے بعد خلفاء راشدین نے اسی منہج سے فیض اٹھاتے ہوئے پائیدار ریاست، مختلف اقوام و ملل کے درمیان رواداری، اور امن عالم وفلاح انسانیت کے حصول کو اپنا بنیادی نصب العین اور ریاست کا بنیادی مقصد قرار دیا۔ خلافت راشدہ کے بعد متعدد مسلم حکومتوں نے مذہبی رواداری، انسانیت نوازی، ذمیوں کے بنیادی معاشرتی و قانونی حقوق کو نمایاں حیثیت دی۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ مسلم حکمرانوں نے غیر مسلم رعایا، محکوم قبائل اور معاہد اقوام کے ساتھ مذہبی رواداری، اور احترام انسانیت کی پاسداری کا پورا حق ادا کیا ہے اور اپنی ذمہ داری سے کبھی منھ نہیں پھیرا۔ بنوامیہ، بنوعباس، ترک سلاطین، سلاطین دہلی کے ساتھ ساتھ افریقہ و دیگر ممالک کے مسلم حکمرانوں نے رواداری کے فروغ کے لئے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جن کے حوالے غیر مسلم مصنفین کی کتابوں میں جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔

آج دنیا مادہ پرستی کا شکار ہے انسان نے ترقی کی جہد و سعی میں خوشی اور سکون اس کی زندگی سے ندارد ہے۔ ایسے حالات میں عالم انسانیت کو امن و سکون اور رواداری کی نہ صرف درس دینے کی اشد ضرورت ہے بلکہ اسے فروغ دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس کے لیے پوری اسلامی تاریخ سے رہنمائی حاصل کی جائے تو عالمی استحکام کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔

دہلی سلطنت ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ پہلی حکومت مانی جاتی ہے۔ اس سے قبل متعدد بادشاہوں نے یہاں کا قصد کیا لیکن وہ یہاں قیام نہ کر سکے جس کی متعدد وجوہات رہی ہیں۔ پہلی مسلم حکومت ہونے کے سبب سلاطین دہلی کو بہت سی دشواریوں کا سامنا بھی رہا لیکن انہوں نے اپنی اولوالعزمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک مستحکم اور منظم حکومت کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان مختلف اقوام و ملل کی آماج گاہ رہا ہے اور ایسے ملک میں نظام حکومت کا چلانا خاصہ دشوار گزار کام ہے۔ ایسے نازک اور پر خطر حالات میں کہ متعدد اقوام و مذاہب کے لوگوں کے درمیان امن وامان قائم رکھنا اور اسے مزید بہتر بنانے کی طرف گامزن رہنا یہ کوئی کرشمہ سے کم نہیں۔ یہ امر سلاطین دہلی نے بحسن خوبی انجام دیا ہے اور تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ان سلاطین نے اپنے دینی رجحان اور مذاق کو اس کے صحیح مقصد کے لئے استعمال کیا اور اس ملک میں مذہبی رواداری اور آپسی بھائی چارگی کا ایسا نظارہ پیش کیا کہ ہمارے ہندو مؤرخین بھی ان کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔ ان سلاطین میں قطب الدین ایبک، بلبن، علاء الدین، التمش، ناصر الدین محمود، محمد بن تغلق، فروز تغلق اور سکندر لودھی وغیرہ سرفہرست ہیں۔

10.1 مقاصد

ہندوستان کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی مسلم حکومت ہوئی ہے جس نے یہاں کے باشندگان کے ساتھ حسن سلوک، عدل و مساوات، اور رواداری کا نذرانہ نہ پیش کیا ہو۔ لیکن چند نام نہاد مصنفین نے اپنی ذمہ داری سے نظر چراتے ہوئے اس امن و سکون کے

گہوارے میں چنگاری لگانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس اکائی میں آپ ان تمام باتوں سے واقف ہوں گے کہ ہندوستان کی تاریخ میں سلاطین دہلی نے رواداری اور مذہبی بھائی چارگی کا کیسا نظم قائم کیا تھا اور ہندوستان کے سپوتوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا رہا نیز طلبہ ان باتوں سے بھی آگاہ ہوں گے کہ جن بادشاہوں پر کٹرواد کا الزام لگایا جاتا ہے اصل میں ہندو مؤرخین کی نظر میں وہ واقعات کس حد تک درست اور غیر جانبدار ہیں اور حقیقت میں ان کا دور مذہبی رواداری کے لئے کتنا اہمیت رکھتا ہے۔

10.2 سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری

چنانچہ عہد وسطی میں ہندوستان کے طول و عرض پر کم و بیش ساڑھے چھ سو سال تک متعدد مسلم خاندانوں (غلاماں، خلجی، تغلق، سید، لودھی اور تیموری) نے حکومت کی ہے۔ ان مسلم حکمرانوں نے اپنے عہد میں ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو بہتر سے بہتر بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، ہندوستان کی آبیاری اور ہمہ جہت ترقی و خوش حالی ان مسلم بادشاہوں کا طرہ امتیاز رہا ہے، انہوں نے پر امن بقائے باہم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا کو پروان چڑھایا، رواداری اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں مذہبی، لسانی اور نسلی کسی قسم کی تفریق و امتیاز کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ ان سلاطین نے یہاں گنگا جمنی تہذیب اور بھائی چارگی کے تصور کو فروغ دیا، نیز انہوں نے امن و سلامتی اور صلح و خیر سالگی کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس انداز کی حکومت کی کہ وہ ہندوستانی تاریخ کا ہی نہیں، بلکہ عالمی تاریخ کا بھی ایک روشن باب بن گئی۔ ان سلاطین نے اپنی پالیسی میں مذہبی رواداری کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کا اثر آنے والی نسلوں تک دکھائی پڑتا ہے۔ سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری پر مشہور مورخ خلیق احمد نظامی اپنی کتاب "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" میں رقم طراز ہیں: "ہندوؤں کو نہ صرف پوری مذہبی آزادی حاصل تھی، بلکہ ان کے رسوم وعقائد، فلسفہ وافکار کو نہایت ہی ہمدردانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی، بت پرستی پر طعنہ کے بجائے مسلمان ان کے جذبوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے"۔ (خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص74)

10.3 سلاطین دہلی کی فکری نشو نما

سلاطین دہلی کی رواداری اور تکثیری سماج سے متعلق ان کے نظریہ کو سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان سلاطین کی فکری نشو ونما اور اس دور کے مذہبی حالات کا جائزہ لیا جائے، جن میں ان کے نظریات نے پختگی حاصل کی اور ان حالات کو سمجھا جائے جس نے ان کے طرز حکومت اور فکر و نظر کے انداز متعین کیے۔ سلاطین دہلی کا مذہبی شعور سماج کے مختلف عناصر کے مثبت و منفی رجحانات سے بھی متاثر نظر آتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ایشیاء کے مختلف حصوں میں منگولوں نے قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا، ایسے پر خطر حالات سے بچ نکل کر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت شمالی ہندوستان میں پناہ گزیں کی حیثیت سے مقیم ہوئی، یہ لوگ جن علاقوں سے آئے تھے وہاں ظلم وجور اپنے انتہا پر تھا، جس نے ان لوگوں کو زندگی کے حقائق پر غور وفکر کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں دہلی حکومت کو مستحکم بنانے میں وقف کر دیں تاکہ دہلی کو ان خون آشام ہنگاموں سے بچایا جاسکے۔ (خلیق

احمد نظامی، ص18) اس کے علاوہ ایک گروہ نوجوان ترک فاتحین کا تھا جو جوش و خروش کے ساتھ اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے بے چین تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں کے متعدد طبقات تھے جن میں پہلا طبقہ وہ تھا جن کے ہاتھ سے زمام حکومت چھینی گئی تھی، جو ہر لمحہ سلاطین دہلی کی اینٹ گرانے میں لگے ہوئے تھے، دوسرا طبقہ ان کا تھا جو ہندو راجاؤں کے دور میں ذاتی وطبقاتی امتیازات کا شکار تھا، لیکن سلطنت دور میں ان کی حیثیت بدل گئی تھی اور ان کی سماجی پابندیاں ختم کر کے انہیں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے برابر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ (خلیق احمد نظامی، ص19) ان طبقات کی ذہنی کیفیت و نوعیت مختلف تھی اور سلاطین نہ چاہتے ہوئے بھی ان محرکات کے عمل اور رد عمل سے متاثر ہوتے تھے۔

سلاطین دہلی وامراء پر علماء کا بہت اثر رہا ہے، جس نے ان میں رواداری کی فکر کو بہت جلا بخشی۔ اس دور میں علماء کے دو طبقے تھے: ایک دیندار اور دوسرا علماء سو، پہلا طبقہ اپنے ضمیر و آزادی فکر کو قائم رکھنے کے لئے سیاست سے بے تعلق رہتا اور وقت کے لحاظ سے اپنی بے باک رائے رکھتا، تو دوسرا گروہ ان علماء کا تھا جو سلاطین وقت سے منسلک ہو کر حب جاہ میں ان کے ہر عمل پر مہر توثیق ثبت کرتا رہتا تھا۔ (خلیق احمد نظامی، ص21) چنانچہ ان میں منہاج السراج، نجم الدین صغری، حسام درویش وغیرہ وہ علماء تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی بادشاہ وقت کے حکم کی تعمیل کو بنالیا تھا اور فرائض سے کوسوں دور ہو گئے تھے۔ دوسری طرف علماء کا وہ گروہ تھا جو سلاطین کی غیر شرعی زندگی پر تنقید کرنے میں ذرہ برابر بھی جھجھک محسوس نہیں کرتا تھا، قاضی وجیہ الدین کاشانی، سید نور الدین مبارک، قاضی مغیث، مولانا عبد اللہ وغیرہم انہیں علماء میں شامل تھے۔

اسی طرح سلاطین دہلی کے مذہبی افکار پر مشائخ و صوفیاء کے اثرات بھی پڑے۔ ان بزرگان دین کی سادہ زندگی اور بے لوث خدمت خلق نے عوام کے ساتھ ساتھ سلاطین کو بھی متاثر کیا۔ یہ اثرات براہ راست بھی پہنچے، جیسا کہ التتمش اور بلبن نے اپنے دور کے مشائخ سے عقیدت مندانہ تعلقات رکھے اور ان کے اثرات بھی قبول کئے جس نے ان کے نظام حکمرانی میں مذہبی رواداری پر عمل پیرا ہونے میں مدد کی۔

ان سلاطین کا ہندوستان میں بود و باش اختیار کرنے کے بعد یہاں کی تہذیب و ثقافت اور سماجی و فکری حالات سے متاثر ہونا بھی ایک فطری امر تھا، کیونکہ نظام حکومت چلانے کے لئے ان کو یہاں کے مقامی باشندگان کے ساتھ اشتراک کی ضرورت تھی، چنانچہ ہم اس عہد کی عمارتوں اور سکوں میں ان کے نقوش دیکھ سکتے ہیں، مثال کے طور پر جب 1369ء میں قطب مینار کو آسمانی بجلی سے صدمہ پہنچا، تو فیروز شاہ نے اس کی مرمت کا کام تین ہندو معماروں ناہا، لوہا اور لشمند کو دیا۔ (آغائی مہدی حسین، تغلق دور کی ترقی و تنزلی، ص18)، اس کے علاوہ نظام حکومت، مالی انتظام ہو یا پھر مقدمات کا فیصلہ، ہر جگہ ہندوؤں نے مدد کی، جس کے نتیجہ میں ایک خوشگوار ماحول پیدا ہوا اور ایک نیا سماجی تانا بانا تیار ہوا، سلاطین دہلی کے خاندان کے افراد نے ہندو راجاؤں کی شہزادیوں سے ازدواجی تعلقات قائم کیے۔ سلاطین دہلی کے مذہبی افکار کی نشو و نما میں مسلم معاشرہ کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، سلاطین کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس سے عام مسلمانوں کے مذہبی رجحانات کو ٹھیس پہنچے، یہی وجہ ہے کہ علاء الدین خلجی نے جب ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنی چاہی، تو اس کو

مسلمانوں کی بے چینی واضطراب کے خطرے نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ ان تمام حالات کے نتیجہ میں سلاطین دہلی کے اندر رواداری و آپسی اتفاق کا پیدا ہونا بھی لازمی تھا جس نے اس دور کو ایک خوشگوار اور بہترین مثالی دور بنا دیا تھا۔

اس دور کے تاریخی ماٰخذ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی، وہ بلاخوف وخطر بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے، دریا میں غسل کرتے تھے اور ناقوس بجاتے تھے، یہ کام اکثر علماء وبادشاہوں کے محلات کے قریب کیے جاتے تھے، لیکن کبھی کسی نے مزاحمت نہیں کی، خلیق احمد نظامی اپنی کتاب "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" میں جلال الدین خلجی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "ہر روز ہندو پکھاوہ اور کرنا بجاتے ہوئے محل کے نیچے سے گزرتے ہیں اور دریائے جمنا پر آکر بت پرستی کرتے ہیں اور احکام شرک کو ہماری نظروں کے سامنے رواج دیتے ہیں"۔ (خلیق احمد نظامی، ص74) مسلم حکمراں وامراء کے علاوہ مسلمانوں کے مذہبی طبقے بھی ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالتے، اس طرح کا ایک واقعہ شیخ نظام الدین اولیاء سے متعلق خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ "ایک دن صبح کے وقت وہ اپنے جماعت خانہ کی چھت پر امیر خسرو کے ساتھ ٹہل رہے تھے، نیچے نظر پڑی تو دیکھا کہ دریا کے کنارے کچھ ہندو بتوں کی پوجا میں مصروف ہیں۔ تو فرمایا: "ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے" اس جملہ میں مذہبی رواداری کا بحر بیکراں جذبہ سمٹ آیا ہے۔ یہ بات ایک ایسے دور کی ہے جب مسلمانوں کا سیاسی اقتدار اپنے عروج پر تھا، ایسے میں ایک مذہبی پیشوا کا یہ ارشاد صرف مذہبی رواداری کا ہی نہیں، بلکہ ایک ایسی فکر کا آئینہ دار ہے جس نے ہندوستانی تہذیب کے ہزار رنگ کو سمجھ لیا ہو۔

ذیل کی سطروں میں سلاطین دہلی کے چند مشہور مسلم سلاطین کا تذکرہ تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، تاکہ ان سلاطین کی اپنے معاشرے کے باشندوں کے ساتھ رواداری کی صحیح تصویر سامنے آسکے۔

10.4 قطب الدین ایبک

دہلی پر فتح حاصل کرنے کے بعد پہلا شخص جو سریر آرائے سلطنت ہوا قطب الدین ایبک (1150ء تا 1210ء) تھا، سلطنت دور کی داغ بیل اسی کے ہاتھوں عمل میں آئی نیز انتظامی ڈھانچہ کا نقش بھی اسی کے تخلیقی ذہن کا رہین منت تھا۔ قطب الدین ایبک کے بارے میں متعصب غیر مسلم مصنفین اور خاص طور سے انگریزوں نے یہ پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ ایبک نے دہلی کی قوت الاسلام مسجد کی تعمیر کے لئے مندر کو منہدم کرادیا، لیکن یہ سراسر بہتان تراشی ہے، اس معاملہ پر تاریخی روشنی ڈالتے ہوئے محمد حفیظ اللہ نے اپنی کتاب "اسلام اور غیر مسلم" میں بارہویں صدی کے دو مستند مؤرخ سعید صفیری اور علامہ صدرالدین صدر کے حوالہ سے اس الزام کو غلط ثابت کیا ہے، سعید صفیری نے لکھا ہے کہ مسجد کی تعمیر کے لئے ہندو راجا نے سلطان کی مدد کی اور پتھر بہم پہنچائے جس کے بدلے ایبک نے انہیں انعام واکرام سے نوازا۔ (محمد حفیظ اللہ، اسلام اور غیر مسلم، ص189) دوسری طرف سید صدر الدین لکھتے ہیں کہ ایبک خوش تھا کہ اس نے ایک لمبی چوڑی مسجد تعمیر کروادی اور اس کے ہندو بادشاہوں نے اس کی ہر طرح مدد کی، یہ دونوں تاریخی تذکرے 1192ء سے 1260ء کے درمیانی عرصہ میں لکھے گئے ہیں جو اس وقت کے مستند ترین تاریخی تذکرے میں شامل ہیں، اس تاریخی حقائق سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے

مسلم سلاطین کی تاریخ لکھنے میں کس قدر تعصب سے کام لیا گیا ہے اور ایک خوش نماواقعہ کو بدنما کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔اس کے برخلاف ایسے شواہد کثرت سے ملتے ہیں جن سے ایبک کی مذہبی رواداری، عدل وانصاف، شجاعت وسخاوت وفیاضی کا پتہ چلتا ہے۔اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے ہندو بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ میں مذکور ہے کہ "ایبک نے اپنی سخاوت، کرم و بخشش سے ہزاروں آزاد انسانوں کو اپنا غلام بنالیا"۔ (خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص92)اس کے علاوہ اس نے ایک ایسے سماج کی تشکیل کی تھی جہاں اونچ نیچ کا کوئی تصور نہ تھا، لہٰذا ایسے سماجی نظام کو دفن کر دینے والے کے ساتھ محبت کا ہونا فطری عمل تھا۔

10.5 غیاث الدین بلبن

دوسری طرف غیاث الدین بلبن 1261ء تا 1287ء ہندوستان کا وہ پہلا حکمراں ہے جس نے اس سرزمین پر ایک مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی، بلبن میں فطرتاً آمرانہ صفت موجود تھی، لیکن اس کی اسی صفت کی بنا پر اس دور کی نراجی طاقتوں کا سدباب ہوسکا، جو التمش کے دور حکومت میں پروان چڑھے تھے، بلبن نے اپنی حکومت کی بنیاد انسانی تہذیب وثقافت پر رکھی تھی، اس کا زمانہ ملک کی ترقی وخوشحالی، مذہبی رواداری، ہندو مسلم بھائی چارگی اور قیام امن کے لحاظ سے مثالی دور قرار دیا جاتا ہے، اس کے دور میں رعایا پروری، رواداری اور عدل گستری اور ہندوؤں کے جذبات واحساسات کا اندازہ پالم میں سنسکرت زبان میں ملے اس کتبہ سے لگایا جاسکتا ہے جو 1280ء کا لکھا ہوا ہے اور بعد میں ایک کھدائی کے دوران پایا گیا اور وہ آج دہلی کے عجائب گھر میں موجود ہے، اس میں لکھا ہے کہ "جب سے اس سلطان ذیشان (بلبن) نے دنیا کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا ہے، لوگ گور سے لیکر غزنیں اور درویداسے رامیشورم تک خوش وفارغ البال ہیں۔اس کے حکومت میں لوگوں کو آرام وسکون میسر ہے، سلطان اپنی رعایا کی اس قدر خیر وخبر رکھتا ہے کہ دنیا کو سہارا رکھنے والے شیش ناگ دھرتی کے بوجھ سے سبکدوش ہو بیٹھے ہیں اور وشنو بھگوان نگہبانی کا خیال چھوڑ کر اطمینان سے دودھ کے سمندر پر محو استراحت ہے"(عبد اللہ یوسف علی، تاریخ ہند کے ازمنہ وسطی میں معاشرتی واقتصادی حالات، ص100) اس عبارت سے یہ بات ظاہر ہے کہ بلبن کے عہد میں غیر مسلم بھی خوش حال اور امن وسکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک بات قابل غور ہے کہ جس طرح ہندو راجاؤں اور عوام کا ذکر مغلوں کے عہد میں ملتا ہے، اس طرح سلاطین دہلی اور خاص کر بلبن کے عہد میں ان کا تذکرہ نہیں ملتا، اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس دور کے بعض مصنفین جیسے ضیاء الدین برنی اور قاضی مغیث الدین نے کبھی نہیں چاہا کہ سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری کا پہلو عوام کے سامنے آئے کیونکہ وہ لوگ اس کو برا سمجھتے تھے اور اسکا اثر عوام پر اور خاص کر مسلمانوں پر نہ پڑ جائے، اس لئے انہوں نے ہمیشہ اس امر خیر کو عوامی نظر سے دور رکھا، اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے جو مواد اور تاریخی کتب موجود ہیں، اس کا بھی صحیح ڈھنگ سے ابتک جائزہ نہیں لیا گیا ہے، جیسے بلبن کے بعد معز الدین کیقباد کے دربار کے ہندو معززین کا ذکر امیر خسرو نے اپنی کتاب قران السعدین میں کیا ہے۔:(امیر خسرو، قران السعدین، منشی نول کشور، ص28)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں خواندہ افراد کی ایک بڑی تعداد جن میں ذرا سا بھی سیاسی شعور ہے، بلبن کی حکومت کو اعتنا

کی نظر سے نہیں دیکھے گا، کیونکہ یہ بلبن ہی کا کارنامہ اور سیاسی تدبر و جہانبانی تھی کہ جس کی وجہ سے ہندوستان منگولوں کے جبر و تشدد، خون آشام ہنگاموں کی بھٹی بنتے بنتے رہ گیا، جس نے وسط ایشیا کا پوا نظام خاک کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ ایسے میں بلبن کی اپنے ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ مذہبی رواداری اور انسانیت کا بہترین ثبوت ہے۔

10.6 علاءالدین خلجی

علاءالدین خلجی (1266 تا 1361ء) کی حکومتی پالیسی پر جبر و تشدد کا الزام لگایا جاتا رہا ہے، لیکن اس کی حکومتی پالیسیاں صرف اس زمانے کے حالات کا نتیجہ تھیں، نہ کہ مذہبی رجحان کا، اگر وہ اپنی حکومت کے خلاف بغاوتوں اور سیاسی طاقتوں کا سختی سے مقابلہ نہ کرتا تو اس کی حکومت و بادشاہت کالعدم ہو جاتی علاءالدین خلجی کی اسی پالیسی کی وجہ سے ملک بھر میں امن و امان قائم ہوا، اس نے مساوات و برابری کے اصولوں کو نافذ کیا، اس نے مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ خانوں میں رکھا، اس کا یہ ماننا تھا کہ مذہب کا تعلق انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی سے ہے جب کہ سیاست کا تعلق حکومت اور بادشاہت سے ہے، سیاست کا کام حکومت کو صحیح راستہ پر چلانا اور اسے مضبوط بنانا ہے، جب کہ مذہب کا دباؤ حکومتی کاموں میں حرج پیدا کرتا ہے اور اس کی پالیسی اور آزادی میں رخنہ بھی ڈالتا ہے۔ (ایشور ناتھ ٹوپا، ہندی مسلمانون حکمرانوں کے سیاسی اصول، ص57) دوسری طرف ایک بڑا طبقہ علاء الدین خلجی کو ایک متعصب حکمراں سمجھتا رہا ہے، لیکن تاریخی کتب میں یہ بات وثوق کے ساتھ لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ اس نے ہندوں کے پیشواؤں کی بڑی عزت و توقیر کی، کہا جاتا ہے کہ فرقہ دیگمبر کے پیشوا پورناچندر راور سوئمبر یوگی کے رام چندر سوری کی پذیرائی سلطان کے یہاں بہت زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ دیوگیر کے راجہ رام دیو کے ساتھ علاءالدین خلجی کی رواداری بھی ضرب المثل ہے، اس کی مثال عصامی کی کتاب 'فتوح السلاطین' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ضیاءالدین برنی بھی اپنی کتاب میں رام دیو کے اوصاف کریمانہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"می گفتند کہ اصیل و اصیل زادہ را بر سرکاری کردن ہمیں بار آرد کہ از رامدیو معاینہ می شود"

اس کے علاوہ سید صباح الدین نے عصامی کی کتاب "فتوح السلاطین" کے حوالے سے لکھا ہے کہ رام دیو کی ایک لڑکی سلطان علاء الدین کے حرم میں بھی داخل ہوئی تھی، جس سے شہاب الدین خلجی پیدا ہوا۔ اسی طرح 1321ء میں شہزادہ خضر خان کی شادی کے جشن میں راجہ رام دیو اپنے دیگر ہندو راجاؤں کے ساتھ شریک ہوا ان اشعار میں اس کی آمد کا تذکرہ کرتے ہیں:

ز گجرات آمد الپ خاں زاد　　　بفرماں سہ سربہ حضرت نہاد

گجرات سے الپ خاں کا لڑکا آیا اور اس نے تینوں حکموں میں حضرت (بادشاہ) کی اطاعت کی

شنیدم کہ آور دبس برگ و ساز　　　پے کار دخت خود آں سرفراز

میں نے سنا ہے کہ وہ نیک آدمی اپنی بیٹی کے لئے بہت سارے ساز و سامان تحفے تحائف لایا

ہماں رام دیو آمد از دیوگیر   کہ مر شاہ را بود فرماں پذیر

وہیں دیوگیر سے رام دیو آیا، جو کہ شاہ کا خاص فرماں بردار تھا

یہ مثالیں سلاطین دہلی کے دور میں رواداری کی شہادت دیتی ہیں، لیکن ضیاء الدین برنی اور قاضی مغیث الدین نے انہیں کبھی صحیح سے پیش کرنے کی کوششیں نہیں کیں، کیونکہ وہ ہندوؤں کو اسلام کا دشمن سمجھتے تھے، ان کے اس عمل کی وجہ سے اس دور کی تاریخ بھی داغدار بنی اور مسلم حکمرانوں کی رواداری کا جو بہترین نقش کھینچا جانا چاہئے تھا وہ نہ ہو سکا۔

10.7 محمد شاہ تغلق

تغلق خاندان کا بادشاہ محمد شاہ تغلق (1290ء تا 1351ء) مختلف النوع صلاحیتوں کا مالک تھا، نیز وہ علم دوست اور عدل وانصاف میں ضرب المثل تھا، وہ اپنے عقیدہ میں سخت تھا، شریعت محمدیہ میں مداخلت اور مذہب اسلام کے معاملے میں کسی بھی مفاہمت کا روادار نہ تھا، مگر دوسرے مذاہب کے بارے میں متعصب بھی نہیں تھا، ایشور ناتھ ٹوپا اپنی کتاب "ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول" میں لکھتے ہیں کہ "محمد تغلق نے غیر مسلم سماج کے ادنی درجہ کے لوگوں کی سرپرستی کی اور ان کی صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر ان کو اونچے عہدوں پر معمور کیا، جس کی وجہ سے اس زمانہ کی Aristocracy نے تغلق کے اس رویہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اس کو بدنام بھی کیا گیا"۔ (ایشور ناتھ ٹوپا، ہندی مسلمانون حکمرانوں کے سیاسی اصول، ص64) دوسری طرف محمد حفیظ اللہ اپنی کتاب "اسلام اور غیر مسلم" میں ایشوری پرساد کے حوالے سے لکھتے ہیں: "محمد شاہ تغلق کے تعلقات ہندوں کے ساتھ بہت اچھے تھے"، اس کی ایک مثال تاریخ میں مذکور ہے کہ سلطان محمد تغلق کے خلاف ایک ہندو امیر نے عدالت میں دعوی کیا کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بلا سبب مارڈالا ہے، قاضی نے سلطان کو اپنی عدالت میں بلوایا، وہ بغیر کسی پندار کے قاضی کی عدالت میں پہنچا، جاکر سلام کیا، وہ قاضی کے سامنے ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہوا، قاضی نے حکم دیا کہ سلطان مدعی کو راضی کرے، ورنہ قصاص کا حکم ہوگا، سلطان نے مدعی کو راضی کیا، تو اس کی گلوخلاصی ہوئی۔ (محمد حفیظ اللہ، اسلام اور غیر مسلم، ص191) اس فیصلہ سے اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ مسلم فرمارواؤں نے اپنے عہد حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا۔

پروفیسر گارڈنر براؤن نے لکھاہے کہ "رہا ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ سوان پر سختی وسخت گیری کیسی؟ محمد شاہ تغلق نے تو اکبر سے پہلے ہی ایک طرف ستی کے رسم کو مسدود کرایا، تو دوسری طرف ہندو راجاؤں کو اعلی جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں کو اعلی ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کر دیا تھا، اس نے دولت مند ہندوؤں کی دولت وثروت میں مطلق دست اندازی نہیں کی، برنی کا زر فرضی پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے ہندوؤں کی دولت مندی وتونگری میں ترقی ہوتی رہی، محمد تغلق نے قدیم وجدید ہندو ریاستوں کو نیم خود مختاری کی حالت میں چھوڑے رکھا، اس کے طرز عمل کی دانش مندی سے وہ لوگ تو انکار کر ہی نہیں سکتے جو اکبر کے طرز حکومت کے مداح ہیں"، (پروفیسر گارڈبراان، مضمون: محمد تغلق کا دور حکومت، ماہنامہ معارف، ص46-47)

10.8 محمد فیروز شاہ

ملک کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سیاسی مفادات کی روٹی سینکنے کے لیے، چند متعصب مصنفین نے محمد فیروز شاہ (1309ء تا 1388ء) کی طرف نامناسب اور غیر حقیقی واقعات کا انتساب کیا ہے۔ غیر مسلموں سے مذہبی آزادی سلب کرنے، مندروں کو منہدم کرنے، مذہبی میلوں میں آمدورفت پر عام رعایا کی پابندی اور پوجاپاٹ میں رکاوٹیں ڈالنے کے من گھڑت واقعات حکمرانوں کی سیاسی پالیسی اور اس وقت کے حالات کا پس منظر اور پیش منظر پر غور نہ کرنے کا فطری نتیجہ ہے، چوں کہ بعض مندر اور مذہبی میلے اخلاقی بگاڑ، فتنوں اور فحاشی وعریانیت کا اڈہ اور ذریعہ بن گئے تھے، اس لیے اخلاقی تقاضوں کے پیش نظر ان پر پابندی لگانا مملکت کے نظم ونسق کے اعتبار سے بالکل مناسب فیصلہ تھا، چنانچہ ایشورناتھ ٹوپا اس بابت لکھتے ہیں کہ "محمد شاہ نے بحیثیت سرکاری پالیسی مندر نہیں توڑے، بلکہ کہیں شریعت کے تحت اور دوسری طرف عوام کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا جو اس وقت عقیدت ومذہبیت کے گھر کے بجائے شیطانیت کا اڈہ بن گئے تھے"۔(ایشورناتھ ٹوپا، ہندی مسلمانون حکمرانوں کے سیاسی اصول، ص89)

سلطان فیروز شاہ نے ہندوؤں کی اصلاح کی بہت کوششیں کیں، لیکن اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے اسے ہندوؤں کے عقائد کی اصلاح کا حق نہ تھا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی یہ خواہش تھی کہ غیر مسلم زیادہ سے زیادہ اسلام میں داخل ہوجائیں۔ اس امر کے لئے اس نے جبر کا راستہ اختیار نہیں کیا، فتوحات فیروز شاہی میں اس کا جملہ مذکور ہے کہ "میں نے اہل ذمہ کو دین کی رغبت دلائی اور اعلان کیا کہ ان میں سے جو کوئی توحید کا کلمہ پڑھے گا اور دین اسلام قبول کرے گا، اس کا جزیہ معاف ہوجائے گا اور بہت سے انعامات دیے جائیں گے، اس اعلان کے بعد بکثرت ہندو مسلمان ہوئے" فیروز شاہ کے حالات زندگی میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ 1361ء میں جب وہ ایک علاقہ نگر کوٹ میں پہنچا، تو وہاں ہندوؤں کے علوم سے متعلق متعدد کتابیں دیکھیں، ان کتابوں کے تراجم کی فرمائش کی اور پنڈتوں کو بلاکر ان سے یہ کام انجام دینے کی خواہش ظاہر کی، ان میں ایک کتاب فلسفہ، نجوم اور الٰہیات سے متعلق تھی، جس کو عزالدین خالد خانی نے فیروز شاہ کے حکم پر فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔ اسی طرح فیروز شاہ کے حکم پر علم نجوم پر سنسکرت کی ایک اہم کتاب "برہم سمستھا" کا ترجمہ شمس سراج نے کیا۔

10.9 سکندر لودھی

سلطان سکندر لودھی (1458ء تا1517ء) ہندو رعایا کا خصوصی خیال رکھتا تھا، ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ اہلکاران وعہدیداران میں ہندو نظر نہیں آتے، تو اس نے ہندوؤں کو ان کا یہ حق دینا چاہا، مگر معلوم ہوا کہ ہندو فارسی زبان سے بالکل ناواقف ہیں اور اس وقت کوئی ہندو بھی ایسا نہیں جو فارسی جانتا ہو، چنانچہ سلطان نے سب سے پہلے برہمنوں کو بلاکر ان سے فارسی پڑھنے کو کہا، انہوں نے اپنی مذہبی ضروریات اور مصروفیتوں کے پیش نظر انکار کردیا، پھر چھتریوں سے کہا، مگر یہ فوجی زندگی ہی کو اپنے لیے سربلندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے، انہوں نے بھی مجبوری کا اظہار کیا، ویش قوم کے لوگ تجارت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، یہ خدمت مذہباً ان پر فرض تھی وہ بھی اس ذمہ

داری کو قبول نہ کر سکے، اعلی قوموں میں کایستھوں نے فارسی کو اپنے عروج کا ذریعہ بنایا اور فارسی پڑھنے پر آمادہ ہوئے، چنانچہ انہوں نے فارسی زبان سیکھ کر مسلمانوں کے عہد سلطنت میں زبردست عروج حاصل کیا اور بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے، انہوں نے مسلمانوں کے علوم میں اتنی دستگاہ حاصل کی کہ ان علوم کا درس دینے لگے۔(انتظام اللہ شہابی، تاریخ ملت، ص609)

چوں کہ اس زمانہ تک سرکاری زبان فارسی ہوگئی تھی اور تمام دفتری کام اسی زبان میں انجام پاتے تھے، زبان کی ناواقفیت کی بنا پر غیر مسلم سرکاری عہدوں میں نہیں تھے، سلطان سکندر ایک کٹر مذہبی انسان ہونے کے باوجود اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ہندو بھی ہماری رعایا ہے، اس لیے زبان شناشی کے مسئلہ کو حل کرکے حکومت کے امور اور عہدے ان کے سپرد کیے جائیں۔ کسی بادشاہ وقت کو اپنی رعایا کے لیے اتنی فکر ہو، اسے کیوں کر فراموش کیا جانا چاہیے! اس رواداری کے باوجود اسے بھی ایک کٹر اور سنی مسلمان کے خانہ میں شامل کرکے اسے ہندو کش اور متعصب قرار دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے مندر مسمار کیے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی تخت نشینی سے پہلے ایک واقعہ پیش آیا کہ کروکشتر کے تالاب میں ہندو بکثرت جمع ہوتے اور غسل کرتے تھے، جس سے ایک طرح کی عریانیت اور بے حیائی پیدا ہوتی، سکندر نے چاہا کہ اس کنڈ کو تباہ کرکے اس اجتماع کو غسل کرنے سے روک دے، اس لئے اس نے اس زمانہ کے ایک عالم مولانا عبد اللہ اجودھنی سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ قدیم رسم کو روکنا اور قدیم بت خانہ کو منہدم کرنا بالکل جائز نہیں، اس جواب کے بعد سلطان نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔(۔ ایضا، ص606)

10.10 سلاطین دہلی پر ہندو مؤرخین کا تبصرہ

اوپر کی تحریر سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو گا کہ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی تاریخ صرف خون آشامی ہی کہ نہیں ہے، بلکہ اس میں رواداری، فراخ دلی، دل جوئی، اور انسانیت نوازی کے روشن پہلو بھی ہیں، جس کا اعتراف بعض ہندو مورخین نے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر تاراچند اپنی کتاب ہندوستانی کلچر پر اسلام کے اثرات میں رقم طراز ہیں:

> ”جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو انہوں نے ہندوؤں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرنا ضروری قرار دیا، محمود غزنوی کی فوج میں بھی بکثرت ہندو سپاہی تھے۔۔۔۔۔۔اور جب قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں رہ کر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ملکی نظام کو چلانے کے لئے ہندوؤں کو ہی مقرر کیا۔“(ڈاکٹر تاراچند، Influence of Islam on Indian Culture، ص136-137)

پروفیسر سری رام شرما اپنی مشہور کتاب ’دی کریسنٹ ان انڈیا میں لکھتے ہیں:

> ”سیاسی نظام کی اچھائی اور برائی کا انحصار غلبہ واقتدار کی قوت پر نہیں بلکہ ملک کے اچھے نظم ونسق پر ہے لیکن ملک کا نظم ونسق ہر زمانہ کے لئے یکساں نہیں ہو سکتا، بلکہ زمانہ وماحول کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے مغلوں سے پہلے سلاطین دہلی نے جو نظم قائم کیا اس کو اسی زمانہ کے معیار کے مطابق پرکھنا چاہیے، یہ سلاطین ہندوستان میں فاتح بن کر ضرور

داخل ہوئے لیکن مفتوحین سے ان کا میل جول جیسے جیسے بڑھتا گیا، ان دونوں کے جنگجویانہ جذبات مٹ کر خوشگوار تعلقات میں تبدیل ہو گئے، معاشرتی اور ثقافتی امتزاج کے ساتھ سیاسی تعلقات کا بہتر ہونا ضروری تھا، اس لئے مسلمان حکمراں سیاسی نظم ونسق کو جلد سے جلد بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہے، بلبن کے زمانہ سے بابر کے زمانہ تک ان فرماں رواؤں کی یہی کوشش رہی کہ حکومت کی سرحدوں کو توسیع کرنے کے ساتھ ملک کے عام نظم ونسق میں ترقی ہوتی رہے، اس نظام کا اچھا یا برا ہونا، سلاطین اور ان کے صوبے کے گورنروں کے ذاتی اوصاف اور کردار پر بھی منحصر تھا"۔(ایس آر شرما، The Crescent in India، ص189-190)

فیروز شاہ تغلق کی حکومت کے بارے میں ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا اپنی کتاب 'Politics in Pre- Mughal Times' میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فیروز شاہ کی حکومت کی اسپرٹ میں رعایا کی حفاظت مضمر تھی، وہ رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا اس کے اس جذبہ کا ایک بین ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس نے رعایا کو دو کروڑ ٹنکے کی معافی دی، سلطان محمد تغلق کے عہد میں ایک مرتبہ جب بڑی تباہی آئی تو حکومت کی طرف سے رعایا کو دو کروڑ تنکے دیے گیے۔ فیروز شاہ کے عہد میں جب اس قرض وصولی کا سوال اٹھا تو معلقم ہوا کہ اگر یہ قرض وصول کیا گیا تو رعایا کی زبوں حالی اور بے چارگی اور بڑھ جائے گی، اس لیے یہ کل قرض معاف کر دیا گیا اور رعایا کے اطمینان کے لئے قرض کے سارے کاغذات ان کے سامنے شاہراہ عام پر جلا کر خاکستر کر دیے گئے۔ عوام کے ساتھ انتہائی ہمدردی کے مظاہرہ کا عجیب وغریب طریقہ تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ فیروز شاہ میں عوام کو مطمئن اور خوشحالی بنانے کا کتنا غیر معمولی جذبہ موجود تھا، اس قسم کی شاہانہ نوازشوں سے رعایا کے دلوں میں بھی تشکر اور وفاداری کا صحیح جذبہ پیدا ہوتا تھا، جس سے دونوں کے تعلقات استوار رہتے تھے"

(ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا، Politics in Pre-Mughal Time، ص238)

ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں کہ ان ہندو مورخین نے سلاطین دہلی کی پالیسیوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے نظام حکومت میں ایسی کوئی پالیسی نہ تھی جس سے آپسی تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہو اور نہ ہی تکثیریت اور بھائی چارگی کی زندگی گزارنے میں کسی طرح کی رکاوٹ ہو۔ اس کے ساتھ ہی ان اقتباسات میں مذہبی رواداری کی جن بنیادوں اور اصولوں کو پیش کیا گیا ہے اس سے اس دور میں ہندو مسلم اتحاد ووفاداری کا خاکہ دیکھا جا سکتا ہے۔

10.11 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ہندوستان کے سلاطین کی تاریخ لکھنے میں قدر تعصب سے کام لیا گیا ہے اور ایک خوش نما واقعہ کو بدنما کر کے پیش کر دیا گیا

ہے۔اس کے بر خلاف ایسے شواہد کثرت سے ملتے ہیں جن سے ایبک کی مذ ہبی رواداری، عدل و انصاف، شجاعت و سخاوت وفیاضی کا پتہ چلتاہے۔اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے ہندو بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ میں مذکور ہے کہ "ایبک نے اپنی سخاوت، کرم و بخشش سے ہزاروں آزاد انسانوں کو اپناغلام بنالیا۔

- علاء الدین کی حکومتی پالیسیاں صرف اس زمانے کے حالات کا نتیجہ تھیں، نہ کہ مذ ہبی رجحان کا، اگر وہ اپنی حکومت کے خلاف بغاوتوں اور سیاسی طاقتوں کا سختی سے مقابلہ نہ کرتا تو اس کی حکومت و بادشاہت کالعدم ہو جاتی علاء الدین خلجی کی اسی پالیسی کی وجہ سے ملک بھر میں امن و امان قائم ہوا، اس نے مساوات و برابری کے اصولوں کو نافذ کیا، اس نے مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ خانوں میں رکھا، اس کا یہ ماننا تھا کہ مذہب کا تعلق انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی سے ہے جب کہ سیاست کا تعلق حکومت اور بادشاہت سے ہے، سیاست کا کام حکومت کو صحیح راستہ پر چلانا اور اسے مضبوط بنانا ہے، جب کہ مذہب کا دباؤ حکومتی کاموں میں حرج پیدا کرتا ہے اور اس کی پالیسی اور آزادی میں رخنہ بھی ڈالتا ہے۔
- محمد شاہ تغلق نے تو اکبر سے پہلے ہی ایک طرف ستی کے رسم کو مسدود کرایا، تو دوسری طرف ہندو راجاؤں کو اعلی جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں کو اعلی ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کر دیا تھا، اس نے دولت مند ہندوؤں کی دولت و ثروت میں مطلق دست اندازی نہیں کی۔
- سلطان فیروز شاہ نے ہندوؤں کی اصلاح کی بہت کوششیں کیں، لیکن اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے اسے ہندوؤں کے عقائد کی اصلاح کا حق نہ تھا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی یہ خواہش تھی کہ غیر مسلم زیادہ سے زیادہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔اس امر کے لئے اس نے جبر کا راستہ اختیار نہیں کیا۔
- ان ہندو مورخین نے سلاطین دہلی کے حکمرانوں کی پالیسیوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے نظام حکومت میں ایسی کوئی پالیسی نہ تھی جس سے آپسی تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہو اور نہ ہی تکثیریت اور بھائی چارگی کی زندگی گزارنے میں کسی طرح کی رکاوٹ ہوئی۔

10.12 نمونہ امتحانی سوالات

10.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. کس بادشاہ کو سلطان ذیشان کا لقب ملا؟

(a). غیاث الدین بلبن (b). فیروز شاہ تغلق (c). سکندر لودھی (d). اکبر اعظم

2. "قران السعدین" کے مصنف کون ہیں؟

(a). نظام الدین اولیاء (b). امیر خسرو (c). کبیر داس (d). ضیاء الدین برنی

3. قوت الاسلام مسجد کی تعمیر کس بادشاہ نے کرائی؟

(a). التمش (b). بلبن (c). فیروز شاہ (d). قطب الدین ایبک

4. تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کا نام بتایئے؟

(a). قاضی مغیث الدین (b)ضیاءالدین برنی (c). امیر خسرو (d). عزیز الدین خالد خانی

5. ضیاءالدین برنی کس دور کے مؤرخ ہیں؟

(a). مغل حکومت (b). دکن حکومت (c). نوابین اودھ (d). دہلی حکومت

6. "فتوح السلاطین" کے مصنف کا نام بتایئے؟

(a). عصامی (b). عبداللہ اجودھنی (c). قاضی مغیث الدین (d). نظام الدین اولیاء

10.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7. رواداری کی مثالوں میں سنکدر لودھی کے دور کا جائزہ لیجیے۔

8. محمد شاہ تغلق کے دور میں واقع رواداری کی مثالوں کو پیش کیجیے۔

9. علاءالدین خلجی کی حکومتی پالیسی پر ایک نوٹ لکھیے۔

10. ہندو مؤرخین کی تصانیف میں مسلم بادشاہوں کی رواداری پر روشنی ڈالیے۔

11. سلاطین دہلی کے نظریات کو پروان چڑھانے میں علماء کے کردار پر بحث کیجیے۔

10.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سلاطین دہلی کی فکری نشو نما میں سماجی اثرات کی وضاحت کیجیے۔

2. محمد فیروز شاہ تغلق کی مذہبی رواداری پر مضمون قلم بند کیجیے۔

3. مذہبی رواداری کے فروغ میں قطب الدین ایبک اور غیاث الدین بلبن کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

10.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، الجمیعہ پریس، دہلی، طبع اول : خلیق احمد نظامی

2. ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ : ایشور ناتھ ٹوپا

3. تاریخ ہند کے ازمنہ وسطی میں معاشرتی واقتصادی حالات : عبداللہ یوسف علی

4. قران السعدین، منشی نول کشور، لکھنؤ : امیر خسرو

5. ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دارالمصنفین، اعظم گڈھ :صباح الدین عبدالرحمٰن

اکائی 11: دہلی سلطنت کے تمدنی احوال

اکائی کے اجزا:

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 پس منظر

11.3 دہلی سلطنت میں فن تعمیر

11.3.1 نئے شہر، قصبے اور گاؤں

11.3.2 عبادت گاہیں۔ مساجد

11.3.3 مقبرے

11.3.4 قلعے اور محل

11.3.5 تعمیرات رفاہ عام

11.3.6 صوبائی یا علاقائی تعمیرات

11.3.7 ہند اسلامی فن تعمیر

11.3.8 فنون لطیفہ

11.4 اکتسابی نتائج

11.5 نمونہ امتحانی سوالات

11.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

11.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

11.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

'تہذیب، تمدّن اور ثقافت' تینوں عربی الاصل الفاظ ہیں، اپنے لفظی معنی میں فرق کے باوجود یہ الفاظ جُزوی طور پر مشترک ہیں جس بنا پر یہ ایک دوسرے کے مترادف بن جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہیں تو تمدّن کو تہذیب کے اور تہذیب کو ثقافت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات پتہ چلتی ہے کہ تہذیب اور تمدن دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تہذیب سے مراد زندگی گزارنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے، جو کسی خاص نظریے کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے، جبکہ تمدن ان مادی اشیاء کے مجموعے کو کہتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ یا تو بہتر ہوتی رہتی ہیں یا مکمل طور پر حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لہذا زندگی گزارنے کے مختلف نظریے رکھنے کے باوجود دو الگ تہذیب کے لوگوں میں تمدنی حوالے سے یکسانیت ممکن ہے۔ کسی بھی قوم کے تمدن، تہذیب و ثقافت کے بنیادی اجزاء کی تشکیل میں علمی و فکری احوال، مادی اعتبار سے فن تعمیر اور فنون لطیفہ، سماجی و ثقافتی آداب و عادات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

دہلی سلطنت کا ہندوستان میں حکومت کا دورانیہ تین سو سال رہا۔ یہ بیرون ہند سے ایک تہذیب، تمدن اور ثقافت کے ساتھ اس ملک میں آئے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان بھی ان معاملات میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا تھا۔ اس تناظر میں ہم جب سلطنت کے دور میں تمدنی احوال کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں دو طرح کے تمدن کے امتزاج سے رونما ہونے والا ایک منفرد تمدن نظر آتا ہے۔ اس دور میں ہندوستان میں ہمیں علمی، فکری و نظریاتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ فن تعمیر میں منفرد اور نفیس نمونے نظر آتے ہیں جو ان کے تمدنی ذوق کے عکاس ہیں۔ زیر نظر اکائی میں ہم اسی پہلو پر دہلی سلاطین کے مختلف خاندانی ادوار میں ان کے کارناموں کا مطالعہ کریں گے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ دہلی سلطنت کے تمدنی احوال سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ سلطنت کے مختلف خاندانوں کے دور میں تعمیر کی گئی عمارتوں کی تعمیری خصوصیات پر تبصرہ کر سکیں گے۔ مختلف خاندانی حکومتوں میں فن تعمیر کی سرپرستی اور کے حوالے سے تبادلہ خیال کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ مختصراً اس دور کے فنون لطیفہ پر بھی گفتگو کر سکیں گے۔

11.2 پس منظر

دہلی سلطنت کا تین سو سالہ دور فن تعمیر کے نمونوں کے اعتبار سے زرخیز اور شاہکار دور ہے۔ فن تعمیر کے میدان میں سلاطین کی شاندار خدمات آج بھی اپنے بچے کچے کھنڈرات اور بچی عمارتوں کے ذریعہ داستان شکوہ و عظمت سنا رہی ہیں' دہلی کا قطب مینار' مسجد قوۃ الاسلام' علائی دروازہ' حوض شمسی، بادشاہوں کے مقبرے' فیروز شاہی مدرسے' کیلوگھڑی' سیری اور تغلق آباد کے شہر کے قلعے اور بے شمار مساجد و مدرسے فن تعمیر کے میدان میں سلاطین دہلی کی جدت کاریوں' اور حسن و عظمت کے شاندار نمونے فراہم کرتے ہیں۔

دہلی سلطنت کے آغاز کے موقع پر عالم اسلام کے مختلف شہروں میں منگولوں کی جارحیت کی بنا پر بڑی تباہی اور قتل و غارت گری

مچی ہوئی تھی' اور ماہرین واہل کمال بے یار ومددگار ہو رہے تھے۔ اس موقع پر ہندوستان کے اندر دہلی سلطنت کا قیام اور وہاں علم واہل علم کی قدر دانی ان باکمالوں کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ اس دور کی تعمیرات میں سلاطین نے ہندوستانی کاریگروں سے بھی مدد لیتے ہوئے عربی طرز اور اسلامی ذوق کا استعمال کیا اور ایک نئے فن تعمیر کو وجود بخشا جو ہندوستانی فن تعمیر کہلایا۔

11.3 دہلی سلطنت میں فن تعمیر

دہلی سلطنت کے دور حکومت کا ایک اہم کارنامہ تعمیرات اور اس کا فن بھی ہے۔ مسلم سلاطین نے امن وامان' استحکام' عدل و انصاف' خوشحالی و فارغ البالی اور تعلیم و تمدن کے ساتھ تعمیرات سے بھی دلچسپی لی اور دہلی سلطنت کے پانچوں خاندانوں کی حکومتوں میں اس میدان میں نئے نئے تجربات کیے جاتے رہے۔ سلاطین دہلی کے یہ تعمیراتی نشانیاں آج بہت حد تک ختم ہو چکی ہیں۔ اس کا ایک سبب امیر تیمور کا ہندوستان پر حملہ بھی ہے جس نے تاریخی آثار پر کاری ضرب لگائی۔ لیکن جو کچھ باقی ہیں وہ اپنی عظمت و شوکت' نقش آرائی اور پختگی و حسن کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں' ان ہی نمونوں کو سامنے رکھ کر ہم عہد سلطنت کے فن تعمیر کے نقوش کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سلاطین دہلی نے اپنی ان تعمیرات کے تذکرے اپنی ذاتی تصنیفات اور اپنے مؤرخوں کی کتابوں میں درج کرائے ہیں۔ ان سے بھی عہد سلطنت کی تعمیرات اور ان کے طرز وصنعت کو جاننے میں بہت مدد ملتی ہے۔

دہلی سلطنت کے فن تعمیر میں خاص بات یہ ہے کہ پورے تین سو برس کی مدت میں یہ فن مسلسل ارتقاء پذیر رہا' ہر بعد والے دور میں پہلے کی بہ نسبت کچھ جدید خیالات' نئے نقش و نگار' طرز و انداز اور نادر اشیاء کے استعمال کو روبہ عمل لایا جاتا رہا۔ سلاطین اور ان کے امراء نے نہ صرف اپنے پیش روؤں کی خدمات کو سراہا اور ان کے نقش قدم پر چلے' بلکہ اپنے ذوق و اختراعی صلاحیتوں کا استعمال کر کے اپنی علاحدہ پہچان بھی بنائی۔

دہلی سلطنت کے دور کی تعمیرات مختلف مقاصد کے لیے کی گئی ہیں' انہوں نے مذہبی مقاصد کے لیے عبادت گاہوں اور خانقاہوں سے لے کر تعلیم گاہیں، مقبرے' فوجی اہمیت کے قلعے' محل' دروازے' منارے' شہر اور اس کی دیواریں' حوض، پل اور سرائے وغیرہ ہر قسم کی عمارتیں تعمیر کیں' گو کہ ان عمارتوں کے مقاصد استعمال مختلف تھے' لیکن انہوں نے ان سب میں اپنے طرز تعمیر کے منفرد نقوش ثبت کیے ہیں۔

جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا کہ یہ مسلم حکمراں جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ مختلف فنون کے ماہرین کو نہیں لائے تھے' چنانچہ ابتداء میں انہوں نے ہندوستانی ماہرین کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ فن تعمیر کے میدان میں بھی مستری اور کاریگر ہندوستانی تھے' جو ہندوستان کے فن تعمیر سے آشنا تھے' سلاطین دہلی نے انہیں کے ذریعہ اپنے اسلامی ذوق اور عربی انداز کی آمیزش کرتے ہوئے تعمیراتی کام انجام دیے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ عالم اسلام کے شہروں سے ماہرین فن بھی ہندوستان آنے لگے۔ بغداد و بخارا اور سمرقند کی تباہی سے بھی بہت سے اہل فن نے ہندوستان کا رخ کیا' ان علاقوں سے آنے والے شاہی خاندان کے شہزادوں کے ساتھ بھی ان سے وابستہ اہل کمال اور ماہرین

فن دہلی آئے' ان ماہرین اور اہل فن کے ذریعہ دہلی کے طرز تعمیر میں نئے نئے تجربات کیے گئے اور یوں فن تعمیر میں ارتقاء ہوتا رہا۔

11.3.1 نئے شہر، قصبے اور گاؤں

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں پر مشتمل تھا۔ شہر عموماً دارالحکومت کے علاوہ بہت کم ہوتے تھے۔ اور یہ شہر فوجی نقطے نظر سے قلعے کے اندر آباد کیے جاتے تھے۔ جب دہلی سلاطین نے باقاعدہ حکومت قائم کی تو فوجی اور صنعتی ضرورتوں کے اعتبار سے نئے شہر اور قصبے آباد کیے گئے۔ اسی طرح تجارتی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے اور بڑے شہر آباد ہونے لگے۔ چونکہ دہلی سلاطین کا دور بھی مہمات کا دور تھا جس میں سر فہرست منگولوں کے حملوں سے دفاع مقصود ہوتا تھا اس لیے اس دور میں جو شہر آباد کیے گئے ان میں اکثر قلعہ بند شہر آباد کیے گئے اور جو آبادیاں شہروں کے درمیان بس جاتی تھیں ان کے اطراف بھی شہر پناہ تعمیر کرنے کی مثالیں تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ دہلی سلطنت کے دور میں تعمیر کیے گئے شہروں میں سے اکثر شہر آج بھی بہت شہرت رکھتے ہیں اور بعض شہر دیہات اور قصبوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اس دور میں آباد کیے گئے شہر کی فہرست طویل ہے ہم یہاں تاریخی اعتبار سے چند اہم شہروں کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

رنگ پور کا شہر

دہلی سلطنت کے قیام کے بعد سب سے پہلے آباد کیے گئے شہروں میں رنگ پور کا نام آتا ہے یہ شہر لکھنوتی (قدیم بنگال کا پایہ تخت جو گور کے نام سے معروف تھا) کے علاقے کے پاس آباد کیا تھا۔ قطب الدین ایبک نے جب بختیار خلجی کو بہار اور لکھنوتی کا فرمان عطا کیا تو بنگالہ کا راجہ لکشمن ندیا میں راج کرتا تھا۔ بختیار خلجی نے اسے شکست دے کر دہلی سلطنت میں اس علاقے کو شامل کیا اور 602ھ میں رنگ پور کو بسایا اور لکھنوتی کو آباد کیا۔ یہ شہر آج بھی موجود ہے۔

اچ کا شہر

اچ کا شہر سلطان التتمش نے دریائے ستلج کے کنارے 607ھ میں آباد کیا گیا تھا۔ پہلے یہ علاقہ دیوگڑھ کے نام سے معروف تھا جسے سندھ کے راجہ چچ نے آباد کیا تھا بعد میں اس شہر کو محمود غزنوی اور غوری دور میں بھی از سر نو آباد کیا گیا، اس وقت یہ شہر بڑے بڑے علماء اور متمول لوگوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا تھا۔ آج اس علاقے کو بہاول پور (موجودہ پاکستان) کہا جاتا ہے جو ایک معروف شہر ہے۔

علاء الدین خلجی کے عہد سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے' بلبن کے زمانہ میں بیرونی حملوں کی روک تھام اور اندرونی استحکام پر زیادہ توجہ ہونے کی وجہ سے تعمیرات پر توجہ زیادہ نہ ہو سکی۔ علاء الدین خلجی کے دور میں اس میدان میں ترقیاں ہوئیں اور بہت زیادہ تعمیراتی کام ہوا۔ علاء الدین نے سیری میں اپنا پایہ تخت تعمیر کرایا جو قطب سے کچھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھا۔ اب اس کے نشان ناپید ہو چکے ہیں۔

تغلق آباد

تغلق آباد دلی کے اطراف میں بسایا گیا اس کی تعمیر غیاث الدین تغلق کے دور میں کی گئی تھی عجمی شہروں کی طرز پر اس شہر کے اطراف بھی فصیل بنائی گئی تھی۔ اس قلعہ کی بنیاد ایک بلند پہاڑی پر تھی ' اس کی چاروں طرف خندق ' قلعے میں چاروں طرف برج، فصیل' مینارے اور دروازے دیے گئے تھے۔ پہاڑ پر ہونے کی وجہ سے اس کی شکل بے ہنگم مستطیل ہے، جس کا ہر سرا قریب ڈھائی سو گز طویل ہے۔

اس قلعہ کے اندر تعمیر کی گئی مساجد اور محلوں کے بارے میں ابن بطوطہ نے عجیب و غریب احوال تحریر کیے ہیں۔ اس محل میں ایک بڑا محل تھا جسے سونے کی اینٹوں سے تعمیر کیا تھا جس کی دمک سورج کی روشنی میں آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ تغلق آباد قلعے کی شکستہ فصیل کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اور پل کے بھی کچھ آثار ہیں جو قلعے سے غیاث الدین تغلق کے مقبرے کو ملاتا ہے۔

دولت آباد

یہ شہر دہلی سلطنت کے تغلق دور میں آباد کیا گیا ایک اہم شہر ہے جو دکن کے علاقے دیوگیر کی قدیم شہر کی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا۔ محمد بن تغلق دور میں دہلی کی پوری آبادی کو یہاں منتقل کر کے اس شہر کو دار الحکومت بنانے کی کوشش کی گئی۔ جس کی وجہ سے جنوبی ہند میں مسلم تہذیب اور زبان کے اثرات پہنچے۔

دولت آباد کا قلعہ محمد تغلق کا سب سے اہم تعمیراتی کارنامہ ہے۔ اس میں جنگی فن تعمیر کا بہترین استعمال کیا گیا ہے' اور اس میں محمد تغلق کی اختراعیت اور بلند خیالی کی جھلک نظر آتی ہے۔ قلعہ کو ایک ایسی پہاڑی پر بنایا گیا جہاں تک پہنچنے کا راستہ بہت پیچ و خم کے ساتھ لے جایا گیا ہے۔ تاکہ ایک چھوٹی فوج بھی دیر تک دشمن کا مقابلہ کر سکے اور ہر طرف سے دشمن پر حملہ کرنا ممکن ہو۔ قلعے کی برجوں میں روزنوں کی تعداد زیادہ رکھی گئی۔

اس قلعے کے دو حصے بنائے گئے، اوپر کی منزل فوجیوں کے لیے تھی' اور اسے نیچے کی منزل سے علاحدہ کر دیا گیا تھا' اور اوپر کی منزل کا راستہ نیچے کی منزل سے الگ کر کے زمین دوز اس طرح اوپر لے جایا گیا تھا کہ اگر دشمن نیچے کی منزل پر قبضہ بھی کر لے تو اوپر کی فوج کو مقابلہ میں دشواری نہ ہو۔ پھر زمین دوز راستوں کے بالائی حصہ پر ایک آہنی انگیٹھی رکھی گئی تھی' جس میں حملہ کے وقت آگ جلا دی جاتی تو اس کے دھویں اور شعلوں سے حملہ آور اس راستے سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

صبح الاعشیٰ کے مصنف کے مطابق ' سلطان نے اس شہر کی جو تقسیم کی تھی، اس کے رو سے ہر گروہ کے لیے الگ محلے تھے اور ہر محلے میں مسجد، بازار، حمام، پن چکی، آتش خانے اور ہر قسم کے دستکار موجود تھے تاکہ ایک محلے کا آدمی خرید و فروخت اور لین دین میں دوسرے محلے کا محتاج نہ ہو اور ہر محلے کی حیثیت ایک مستقل شہر کی سی ہو'۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی اس شہر کا تذکرہ اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'دولت آباد بہت بڑا شہر ہے، جو عظمت اور وسعت میں دلی کا مقابلہ کرتا ہے اس کے تین حصے ہیں، ایک حصے میں بادشاہ اور اس کا لشکر رہتا ہے اور اسی کو دولت آباد کہتے ہیں۔ دوسرے حصے کا نام کنکہ ہے تیسرے حصے کو جو قلعہ ہے اسے دیو گڑھ کہتے ہیں اور بادشاہ کا استاد خاں اعظم قطلو خاں اسی شہر میں رہتا ہے'۔

فیروز آباد

فیروز شاہ کے دور میں یہ شہر قنوج کے پاس آباد کیا گیا یہ شہر آج بھی اپنی دست کاری کے لیے معروف ہے۔ فیروز شاہ نے جب یہ شہر آباد کیا تو اس کثرت سے باغات لگوائے جس میں ہر قسم کے پھول اور پھل ہوتے تھے۔ ان باغات سے جو محصول آتا تھا اس کی تعداد ایک لاکھ تنکہ تھی۔ فیروز شاہ نے اس کے علاوہ بھی کئی شہر آباد کیے جیسے شہر حصر فیروزہ، شہر فتح آباد وغیرہ لیکن ان تمام شہروں میں فیروز آباد سب سے بڑا اور مشہور شہر ہے۔ اس شہر میں فیروز آباد کا قلعہ بھی تھا جو فیروز شاہ کوٹلہ کے نام سے معروف ہے۔ قلعے میں آٹھ مساجد تھیں اور اس شہر کی جامع مسجد اتنی وسیع تھی کہ اس میں اس وقت تقریباً دس ہزار آدمی نماز ادا کر سکتے تھے۔ قلعے کی فصیل میں چار دروازے تھے۔ مینارہ زریں کے نام سے اس کوٹلہ میں اشوک کی لاٹ نصب کی گئی تھی جو ایک تاریخی یادگار ہے۔

جونپور کا شہر

اس شہر کو فیروز شاہ تغلق نے 752ھ میں اپنے چچازاد بھائی سلطان فخر الدین جونہ کے نام پر گومتی ندی کے کنارے آباد کیا تھا۔ اس شہر کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ اس میں فیروز شاہ نے ایک محل تعمیر کروایا بعد میں اس کے نائب ابراہیم نے اس میں مسجد اور قلعہ تعمیر کروایا۔ اس قلعہ کا ایک دروازہ آج بھی باقی ہے دہلی سلطنت کے زوال کے بعد سلاطین شرقیہ کا بھی پایہ تخت رہا اور علم وفضل کا مرکز بن گیا۔ اس شہر کو تاریخ میں شیراز ہند کے نام سے شہرت ملی۔

پٹیالہ کا شہر

بہلول لودھی کے حکم سے اس کے صوبہ دار تاتار خاں نے پٹیالہ شہر کی 887ھ میں پنجاب کے قریب ایک ویران مقام پر بنیاد ڈالی۔ اس علاقے کی زمین نہایت زرخیز تھی اس لیے زرعی پیداوار میں کافی ترقی ہوئی اور اس شہر کو پرگنہ کی حیثیت دے دی گئی۔ بعد میں مغل بادشاہوں کے دور میں بھی اس کو کافی ترقی دی گئی۔ اس شہر کے اطراف میں بہت سے اولیاء اللہ کے مزارات ہیں اور اسی علاقے سے بارہ کوس کے فاصلے پر گرونانک کا مکان اور سمادھی بھی واقع ہے۔

آگرہ کا شہر

سکندر لودھی نے اس شہر کی بنیاد ڈالی۔ اس زمانے میں آگرہ کا نام سکندر آباد تھا۔ شہر آباد ہو جانے کے بعد سکندر لودھی نے دہلی کی بجائے آگرہ کو دار الحکومت بنا دیا لیکن پھر بعد میں دہلی منتقل ہو گئے۔ اس شہر کو آگے چل کر عالمی شہرت نصیب ہوئی۔

11.3.2 عبادت گاہیں۔ مساجد

فن تعمیر کے خصوصی اسلامی عناصر میں مینار، معلق، چھوٹی اور سہارا دینے والی محرابیں، شہد کے چھتوں جیسی جالیاں اور نصف گنبد والے دروازے بھی شامل ہیں۔ آرائشی مضوعات عربی حروف کے نقوش، اقلیدی اشکال اور روایتی گلکاریوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کے اندر قرآن حکیم کی خوبصورت انداز میں لکھی ہوئی یا کھدائی کی ہوئی قرآنی آیات بھی ہوا کرتی تھیں۔

قطب الدین ایبک کی بنائی ہوئی جامع مسجد جسے بعد میں قوۃ الاسلام مسجد کہا جانے لگا دہلی کی پہلی مسجد ہے، مملوک سلاطین کے بعد یکے بعد دیگرے خلجی، تغلق، لودھی سلاطین کا دور آیا ان سلاطین نے، ان کے امیروں نے، صوفیائے کرام کے مریدوں نے دہلی اور اس کے قرب وجوار میں سینکڑوں چھوٹی اور بڑی مساجد تعمیر کروائیں، صرف فیروز تغلق کے وزیر خان جہاں مقبول جونا شاہ تلنگانی کے نام سے جانے جاتے ہیں، نے ہی چار عظیم الشان مساجد تعمیر کروائیں، بیگم پور، کھڑکی، کلاں مسجد اور بستی نظام الدین کی جامی مسجد اس کے علاوہ اس نے کوٹلہ فیروز شاہ، کالو سرائے میں مساجد کی تعمیر کی۔

ان مساجد کے علاوہ دہلی سلاطین کے دور میں درگاہ نظام الدین اولیاء سے متصل خضر خان کی مسجد، سیری کے پاس محمدی مسجد، لاڈو سرائے کے پاس مڑھی مسجد، حوض خاص مارکیٹ کے پاس نیلی مسجد، تغلق آباد کی مسجد، لودھی گارڈن کی مسجد، وزیر آباد کی مسجد، شیخ فضل اللہ کی مسجد اور متعدد دیگر مساجد، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہوگی، تعمیر کی گئیں۔

ہم یہاں مختصراً دہلی سلطنت کے دور میں تعمیر کی گئی سب سے اہم مسجد کے بارے میں مزید پڑھیں گے۔

مسجد قوت الاسلام (قطب مینار)

قطب الدین ایبک اور مسجد قوۃ الاسلام کا سنگ بنیاد اسی سال رکھا گیا جس سال دہلی فتح ہوا تھا۔ قطب الدین ایبک نے جب دہلی سلطنت کی بنیاد رکھی اور شمالی ہندوستان کے علاقوں کو فتح کیا تو اس کے سامنے ہندوستانی عوام کی شاندار تعمیرات موجود تھیں۔ یہاں کی عوام کے ذہنوں میں اپنی سلطنت کی عظمت کا نقش قائم کرنے کے لیے یہ مناسب تھا کہ بلند و بالا اور پر شکوہ عمارتوں کی تعمیر کی جائے۔

سلطان قطب الدین ایبک نے اس کے لیے مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد رکھی اور اس کے اذان خانہ کے طور پر عظیم الشان قسم کا مینارہ بنوایا۔ یہ مینارہ جو اب قطب مینار کہلاتا ہے۔ دراصل مسجد کا اذان خانہ تھا' مسجد بڑی وسیع و عظیم بنانے کا منصوبہ تھا اور مینار کی تعمیر میں اس نے اپنے اسلامی ذوق اور عظمت و شکوہ کے اظہار کو سمویا تھا۔ اس مینارہ کی تعمیر میں زیادہ تر ہیں کے کاریگر جیسے مستری اور سنگ تراش استعمال کیے گئے۔ مسلم فن تعمیر میں مینار پہلے سے ایک ضروری حصہ تھے لیکن یہ مینار اپنے آپ میں کچھ انفرادیت رکھتا تھا' اس کی اونچائی 71.4 میٹر رکھی گئی۔ قطب مینار بلند تخیل کے ساتھ بہت عمدہ طریقہ پر بنایا گیا تھا۔ اس کے چھجے (بالکونی) اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں جو ابھرے اور باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔ قطب مینار کی پہلی منزل پر قرآن کی آیت لا اکراہ فی الدین (دین میں کوئی زبردستی / جبر نہیں ہے) نقش ہے۔ اس پورے مینار کو بہترین نقاشی، خطاطی اور گل کاری کے نمونوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔

قطب الدین نے اس کے قریب ایک مقصورہ بھی تعمیر کروایا جس کے درمیان میں ایک 45 فٹ اونچی محراب ہے اور اس کے بازوؤں پر دو اور محرابیں ہیں جو آج بھی باقی ہیں مقصورہ کی آرائش پھول کی پتیوں بیلوں اور آیات قرآنی سے کی گئی ہے۔

شمس الدین التمش نے ایبک کے کاموں کو آگے بڑھایا۔ اس نے مسجد قوۃ الاسلام کی توسیع کرائی اور شمال' جنوب اور مشرق کی سمتوں میں مسجد کے اندر اضافہ کر دیا جس سے یہ مسجد تین گنی ہو گئی۔ اس نے قطب مینار کی منزلوں میں بھی اضافہ کرایا۔

خلجی دور میں علاء الدین خلجی نے قطب مینار سے دوگنا اونچا ایک اور مینار تعمیر کرانا چاہا لیکن اس کا یہ منصوبہ پورا نہیں ہو سکا' البتہ اس نے قوۃ الاسلام میں داخلہ کا ایک دروازہ بنوایا جو علائی دروازہ کہلاتا ہے۔ اسے نئے اصول پر بنایا گیا تھا جو ہندوستان میں اپنے طرز کی پہلی عمارت تھی۔ اس کی صنعت اور آرائش ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ قوت الاسلام کی چہار دیواری کی جنوبی سمت میں ہے۔ اس تعمیر سے مسجد کا صحن بہت وسیع ہو گیا۔ علائی دروازے کی عمارت ساٹھ فٹ چوڑی اور گنبد دار ہے، جس کی تینوں سمتوں میں محرابی دروازے ہیں۔ چوتھا دروازہ مسجد میں داخلہ کے لیے ہے اس کی طرز تعمیر دیگر دروازوں سے مختلف ہے۔ ان دروازوں محرابوں اور حاشیوں پر کتبوں سے آرائش کی گئی ہے اور ان میں دلکش اور خوش نما توازن ہے اس سے نظر کو سکون محسوس ہوتا ہے۔ فن تعمیر کے ماہرین کے مطابق یہ دروازہ مسلمانوں کی ابتدائی تعمیرات کا بہت ہی منفرد، دلکش اور مکمل نمونہ ہے۔ اس دروازہ میں ایک مربع شکل کی عمارت کو ایک ہشت پہل میں تبدیلی کرتے ہوئے ابھارا گیا ہے جس پر گنبد تعمیر ہے۔ دروازہ کی اندرونی دیواریں مرصع نقش و نگار سے مزین ہیں جو نہایت عمدہ ہیں۔ علاء الدین آخری سلطان ہے جس نے غلام عہد کے سلاطین کے فن تعمیرات کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد تغلق خاندان میں نئی طرز تعمیر کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تغلق دور میں قطب مینار اوپر کی ایک منزل گر گئی تھی تو اس عمارت کی مرمت سلطان فیروز تغلق نے کروائی جبکہ آسمانی بجلی سے اس مینار کو نقصان پہنچا تھا۔ اس کے بعد سکندر لودھی نے بھی اس عمارت کی مرمت و تزئین کروائی تھی۔ قطب مینار کی مختلف منزلوں میں مختلف کتبے نصب ہیں جو بعد میں باشاہوں نے مرمت اور اضافوں کے بطور یادگار نصب کروائے ہیں۔ ایک کتبہ میں درج ہے کہ اس کی بلندی 80 گز ہے اور مینار کی پہلے سات منازل تھیں جو اب صرف پانچ رہ گئی ہیں جڑ کی موٹائی پچاس گز ہے اور اوپری حصہ کی ضخامت دس گز ہے۔

ڈھائی دن کا جھونپڑا

قطب الدین ایبک نے اجمیر میں ایک مسجد بنوائی جسے ڈھائی دن کا جھونپڑا کہا جاتا ہے۔ روایتوں کے مطابق یہ مسجد صرف ڈھائی دن میں بن گئی تھی۔ تاہم اس کی آرائش و تزئین کا کام التتمش کے عہد میں مکمل ہوا۔ اس مسجد میں فن سنگ تراشی کے بجائے گچ کاری کی تعمیر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں قطب الدین کے جانشین التتمش نے اجمیر کی اس مسجد میں مقصورہ بنوایا جو مرصع نقش و نگار اور گچ کاری کے ابتدائی نمونہ کی نشانی ہے۔

التتمش نے بدایوں میں مسجد اور عیدگاہ بنوائی۔ امیر خسرو کے مطابق علائی دروازہ کی تعمیر کے بعد علاؤالدین نے مسجد کی توسیع کرائی، نو دروازے رکھے، دارالحکومت کے باہر متھرا کے مقام پر مسجد اور شیخ فرید کے لے ایک خانقاہ کی تعمیر بھی کروائی۔

تغلق دور کے فن تعمیر میں ہر عمارت میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور نئے طریقوں کو آزمانے کا سلسلہ چل پڑا۔ اس کی مثال ہمیں اس عہد کی مساجد میں بھی نظر آتی ہیں۔ فیروز کے وزیر خان جہاں تلنگانی نے مسجدوں کی تعمیر میں جدت کی، شہر جہاں پناہ کی کھڑکی مسجد اور نظام الدین کی کالی مسجد میں مسقف چبوترہ بنوا کر اس کے کھلے ہوئے حصوں کو چار صحنوں میں تقسیم کر دیا تاکہ اندر جانے والے لوگ دھوپ اور تپش اور بارش سے بچ سکیں۔ اسی طرز کی سات مساجد بنانے کا ذکر ملتا ہے جو مختلف شہروں اور قصبوں میں بنوائی گئیں۔

11.3.3 مقبرے

دہلی سلاطین نے دیگر اسلامی حکومتوں کی طرح مقبرے بکثرت بنوائے۔ دارالسلطنت اور ان شہروں میں جہاں امراء وسلاطین کے ساتھ ساتھ مشائخ فقراء وصوفیاء کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی اور اسی اعتبار سے ان کے لیے مقبرے بھی تعمیر کیے جاتے تھے۔ ان میں بعض مقبرے فن تعمیر کے اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

التتمش نے اپنی زندگی میں ہی مقبرہ بنوایا جو مربع شکل کی عمارت تھا اور چاروں کونوں پر ہشت پہل کی شکل دے کر گنبد تعمیر کیا گیا تھا، اندرونی دیواروں پر متاثر کن نقاشی کی گئی تھی جس میں خطاطی کے اندر ہندوستان کی گل کاری کی آمیزش کی گئی تھی۔ یہ گویا ہندو مسلم روایات کے آپسی امتزاج کا نشان تھا۔ التتمش نے اپنے لڑکے ناصر الدین کے لیے بھی مقبرہ تعمیر کروایا تھا جو باہر سے قلعے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ سفید پتھروں سے بنی ہوئی یہ قبر آج بھی آرٹ و آرکیٹکچر کی سمجھ رکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے کیونکہ یہاں قرآنی آیات کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ پتھروں پر تراشا گیا ہے۔۔ اندرونی طور پر اس میں نہایت متانت اور سکون برستا تھا قبر کے اوپر برج تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک مسجد بھی تھی جس کا مختصر حصہ آج بھی باقی ہے۔ اس عمارت میں ایک غم کی فضا محسوس ہوتی ہے۔

بلبن کے دور میں وسط ایشیا سے آئے ہوئے مسلم ماہرین فن، ریاضی داں اور ماہرین تعمیرات سے بھی استفادہ کیا گیا چنانچہ بلبن کے مقبرہ میں محراب میں فنی اعتبار سے زیادہ پختگی نظر آتی ہے، اس میں محراب کو دونوں طرف ابھرے چھجے یا منڈیر جیسے پتھروں پر براہ راست ابھارا گیا ہے اور ہندوستان میں پہلے سے رائج طریقہ ترک کیا گیا ہے جس میں پتھر پر پتھر رکھ کر فاصلے کم کرتے جاتے تھے اور پھر اوپر ایک پتھر کی سل رکھ کر اسے ڈھک دیتے تھے۔

ملتان میں غیاث الدین تغلق کا مقبرہ چوکور ہے جس پر ہشت پہل گنبد ہے سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی عمارت ہے۔ اس مقبرے میں مختلف زاویوں میں برج بنے ہیں۔ اس کے داخلے کو ایسی اوٹ دی گئی ہے کہ اندر جانے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ اس کا احاطہ قلعہ کی دیوار کی طرح ہے اس عمارت کی سب سے اہم بات اس کی سادگی ہے۔ غیاث الدین تغلق کا یہ مقبرہ مشہور بزرگ شیخ رکن الدین ملتانی کو دے دیا گیا تھا، کیونکہ سلطان کی وفات اچانک دہلی میں ہو گئی تھی۔

غیاث الدین تغلق کے دور میں طرز تعمیر کے اندر نقاشی اور نقش نگاری کو چھوڑ کر سادہ انداز اختیار کر لیا گیا، انتہا درجہ کی سادہ تعمیرات کا نیا اسٹائیل اس نے پیدا کیا اس کا مقبرہ اسی نئے طرز کی عمدہ مثال ہے۔ اس کے علاوہ اسی طرز پر اس نے تغلق آباد کا قلعہ بھی بنوایا۔

دہلی میں غیاث الدین تغلق کا اصل مقبرہ، تغلق آباد کے قلعے کے باہر تعمیر کیا گیا۔ اس کے اطراف میں جھیل واقع تھی قلعے کے

ساتھ مقبرے کا راستہ ڈھائی سو گز طویل پل کے ذریعہ قائم کیا گیا تھا اس پل میں 27 محرابی دروازے تھے قلعے تغلق آباد سے الگ تھلگ ہونے کی بنا پر یہ مقبرہ ایک چھوٹا قلعہ نما کی طرح نظر آتا ہے۔ اس مقبرے کا دیو ہیکل دروازہ سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے مقبرے کے اطراف ایک کنگورہ دار سنگ خارہ کی فصیل ہے اور پوری فصیل میں غلام گردشیں بنی ہوئی ہیں اور ان میں 46 حجرے ہیں۔ مقبرے کی عمارت میں خالص سنگ سرخ اور سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا ہے۔ محرابوں میں سنگ مرمر کی جالیوں کا استعمال اسی عمارت سے شروع ہوا۔ یہ مقبرہ مجموعی اعتبار سے فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ مانا جاتا ہے۔ اس مقبرے میں تین قبریں ہیں جو بادشاہ ملکہ اور جانشین محمد تغلق کی بتائی جاتی ہیں۔

مقبرے کی شکل نیم مخمسی ہے۔ اس عمارت پر تعمیر کیا گیا گنبد ہند اسلامی فن تعمیر کے پہلے مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس عمارت کے ساتھ خیر کے لیے دار الامان کی عمارت بھی بنائی گئی تھی جو عمارت میں خطاطی اور دیگر خصوصیات کی بنا پر اہمیت کی حامل ہے۔

محمد تغلق نے طرز تعمیر اور اس کے تصور میں کچھ تبدیلی کی ٗاس نے مقبرہ کے سوگوارانہ ماحول کو ختم کیا۔ مقبرہ کو جھیل کے درمیان بنایا اور گنبد اور دیواروں کے نقش و نگار کے ذریعہ دیکھنے والوں کے لیے ایک اچھا منظر فراہم کیا۔ غیاث الدین کا مقبرہ اس طرز تعمیر کا نہایت دلکش نمونہ ہے۔

محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق نے بھی اپنے لیے مقبرہ تعمیر کروایا جس میں اس نے غیاث الدین تغلق کے آسان اور دلکش طرز تعمیر کو اختیار کیا۔ فیروز شاہ کے وزیر خان جہاں تلنگانی کا مقبرہ چھوٹا اور ہشت پہل ہے۔ مقبرہ کی یہی شکل بعد میں مدتوں تک اپنائی جاتی رہی ہے۔

سادات سلاطین کے زمانہ میں بڑے پیمانے پر مقبرے تعمیر ہوئے ٗان میں سائز کا اضافہ ہوا ٗرنگ و زینت میں اضافہ کیا گیا ٗاور فرش و دیواروں کو مزین کرنے کا رواج ہوا۔ ان عمارتوں میں بہترین قسم کے میناروں ٗچھتریوں اور بڑے گنبدوں کے اضافہ کیے گئے۔ اور شاہی خاندان اور حرم کے مختلف افراد جیسے باندی، دادی، پوتی وغیرہ کے لیے بھی اہتمام سے مقبرے بنائے جانے لگے جن کا طرز تعمیر ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتا تھا۔

لودھیوں کے زمانے میں زینت و آرائش میں اور اضافہ ہوا ٗرنگین ٹائل کا استعمال کیا گیا ٗانہیں اونچے چبوتروں پر اٹھایا گیا۔ جس سے وہ عالیشان نظر آنے لگے۔ کچھ مقبروں کو باغات میں تعمیر کیا گیا۔ لودھی گارڈن اسی کی مثال ہے۔ اس دور میں ایک نیا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ گنبد دوہرے بنائے گئے ٗسکندر لودھی کے مقبرے میں یہ فن پوری طرح اختیار کیا گیا ہے ٗاس میں اوپر اور نیچے گنبد ہوتے ٗاوپر کے گنبد کی اونچائی زیادہ ہوتی اور نیچے کا گنبد اتھلا بنایا جاتا ٗاس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اوپر کا گنبد زیادہ اونچا رکھنا آسان ہو جاتا تھا۔ گنبد کی تعمیر کا یہ طریقہ عام عمارتوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔

11.3.4 قلعے اور محل

قلعہ معلیٰ قطب الدین ایبک نے دہلی کے قریب تعمیر کروایا۔ یہ قلعہ آج بھی شکستہ عالم میں موجود ہے۔ اس کی تعمیر ثانی مغل

بادشاہ ہمایوں نے کروائی تھی۔ قصر سفید سلطان التتمش نے بنوایا تھا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے التتمش کے محل کے بارے میں لکھا ہے کہ سلطان نے اپنے محل کے سامنے سنگ کی شیروں کی دو مورتیاں بنوا رکھی تھیں، جن کے گلے میں گھنٹیاں لگی تھیں، اور کوئی بھی شخص ان گھنٹیوں کو بجا کر سلطان سے سیدھے طور پر فریاد کر سکتا تھا۔ یہ محل اب معدوم ہو چکا ہے۔ کوشک لعل محل سلطان غیاث الدین بلبن نے بنوایا تھا۔ اس میں مزید اضافے اور از سر نو تعمیر علاء الدین خلجی نے کروائی تھی۔

علاء الدین خلجی نے اپنے دور میں ہزار ستون کا ایک محل بنوایا تھا۔ اسی طرز کا ایک ہزار ستون محل محمد شاہ تغلق نے بھی بنوایا تھا جو تغلق آباد میں واقع تھا۔ جس کے کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔

فیروز شاہ دہلی کے حکمرانوں میں سب سے بڑا معمار بادشاہ تھا۔ اس کے بے شمار تعمیراتی کاموں میں محلات، مساجد، مقبرے، قلعے اور شہر شامل ہیں۔ اس نے دہلی کے بعد ایک نیا شہر فیروز آباد تعمیر کیا۔ اس میں محلاتی قلعہ جس کا نام کوٹلہ فیروز شاہ تھا، تعمیر کیا گیا تھا۔ کوٹلہ کے اندر دو تعمیرات خصوصی تذکرے کی مستحق ہیں ایک جامع مسجد اور دوسری ایک مخروطی ساخت کی تعمیر جس کے اوپر شوق مینار ہے۔ ملتان اور اُچ اور بعض دوسرے مقامات پر تغلق دور کی یادگار عمارتیں اب بھی قائم ہیں۔

11.3.5 تعمیرات رفاہ عام

تمدن کے ضروری اجزاء میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ ایسی خدمات شامل ہو جن سے تمام رعایا فائدہ اٹھائے اور اس میں کسی مذہب و ملت کی تفریق نہ ہو۔ دہلی سلاطین کے عہد میں رعایا کے آرام و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نہایت وسیع پیمانے پر تعمیرات کی گئیں ان کا ذکر تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ ہم مختصراً یہاں ان کے بارے میں جانیں گے۔

حوض شمسی اپنے فن تعمیر کے اعتبار سے تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوض کو سلطان التتمش کے عہد میں صوفی قطب الدین بختیار کاکی کی ایما پر بنوایا گیا تھا۔

اس کے بارے میں "آثار الصنادید" میں ہے: "قطب صاحب کے نواح میں سلطان شمس الدین التمش نے قریب 627 ہجری مطابق 1229ء کے یہ حوض بنایا تھا۔ جو بہت عمیق تھا اور چاروں طرف سے پختہ تھا۔ بعد کے دور میں یہ حوض مٹی سے اٹ گیا تھا۔ سلطان علاء الدین نے اپنے دور میں اس کو صاف کرایا اور اس کے بیچوں بیچ میں ایک چبوترہ بنوا کر اس پر خوبصورت برج بنوایا اور لداؤ گنبد تعمیر کروایا جو اب تک موجود ہے۔ فیروز شاہ نے بھی اپنے زمانۂ بادشاہت میں اس حوض کی مرمت کی اور پانی آنے کے راستے صاف کروائے اس حوض کے آگے فیروز شاہ نے اپنے دور میں ایک بند بنایا تھا کہ پانی وہاں رک کر قلعہ تغلق آباد کی خندق میں جاتا تھا۔ اس حوض پر بعد میں غازی خان نے راستہ بنا کر نہریں اور دیگر حوض بنا دیں۔ مگر اب یہ تالاب بہت اٹ گیا ہے اور تین چار مہینے کے سوا اس میں پانی نہیں ٹھرتا۔ حوض شمسی کسی زمانے میں بہت بڑا تھا اور ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ گرمی میں جب پانی خشک ہو جاتا تو اس کے اندر کسان سبزیاں اور ککڑیاں بویا کرتے تھے۔

سلطان علاء الدین خلجی کے بارے میں تاریخ فرشتہ میں ہے کہ اس نے قلعہ شہر اور مساجد کے علاوہ کثرت سے حوض اور سرائے

بنوائیں۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے رفاہ عام کی عمارتیں بنوانے میں ناموری حاصل کی اور سرئے اور کنویں اور حوض تعمیر کروائے۔ اس کے بعد محمد تغلق نے بھی عمارتیں بنوانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کی تعمیرات میں دولت آباد کا قلعہ' شہر جہاں پناہ' دہلی کا لال گنبد شامل ہیں۔

محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق بادشاہ ہوا تو غیاث الدین تغلق کے آسان اسٹائل کی طرف متوجہ ہوا' اس کی عمارتوں میں بڑی سادگی اور نشیب آگیا۔ فن تعمیر میں کسی جدت کے بجائے اس کی توجہ رفاہ عام' زراعت کی ترقی اور لوگوں کی فلاح و بہبود پر رہی۔ فیروز شاہ کی عمارتوں میں پتھروں پر گچ یا چونے کے مسالے کی ایک بڑی سی تہہ چڑھائی جاتی تھی' جس پر سفید پتائی کی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بعد میں بھی رائج رہا۔ فیروز شاہ کی عمارتوں کی سجاوٹ میں کنول نظر آتا ہے۔

رفاہ عام کی تعمیرات میں سب سے زریں دور فیروز شاہ کا ہے جس نے نہ صرف نئ عمارتیں تعمیر کروائیں بلکہ گذشتہ سلاطین کی عمارتوں کی مرمت بھی کروائی۔ فیروز شاہ کے دور میں جو مختلف عمارتیں تعمیر کی گئیں ان میں زیادہ تر عوام کی فلاح و بہبود کے لیے تھیں۔ اس نے کثرت سے نہریں جاری کیں' کنویں کھدوائے' مسجدیں اور خانقاہیں بنوائیں' نئے شہر بسائے' حمام تیار کرائے' شفاخانے بنوائے' ہزاروں باغ لگوائے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ فیروز شاہ نے صرف دہلی کے اطراف میں پھلوں کے بارہ سو باغات لگوائے جہاں انگور اور دیگر پھلوں کی پیداوار ہوتی تھی۔ کل مملکت میں لگائے گئے باغات سے فیروز شاہ تغلق کو ایک لاکھ اسی ہزار تنکہ کی آمدنی ہوتی تھی۔

اس ضمن مین خود تاریخ فیروز شاہی میں درج ہے کہ مسجد خانقاہ کی تعمیر کے علاوہ ماضی میں تعمیر کی گئ عمارتوں کی تجدید کاری بھی شیر وز شاہ نے کی ہے اور اس کے علاوہ حمام، حوض، کنویں تعمیر کر کے ان کے مصارف کے انتظام کیے ہیں، جن سے اچھی آمدنی بھی ہونے لگی۔ ان تمام عمارتوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لیکن تاریخ فرشتہ میں حسب ذیل عمارتوں کا ذکر ملتا ہے کہ فیروز شاہ نے 40 مساجد، 50 شفاخانے 30 مقبرے، 100 خانقاہ، 20، حمام 10 محل بنوائے۔ اس نسبت سے فیروز شاہ کو معمار بادشاہ بھی کہا جاتا ہے۔

دہلی سلطنت کے عہد حکومت میں باقاعدہ شفاخانہ سب سے پہلے فیروز شاہ تغلق نے قائم کیا اس دور میں اس کو صحت خانہ کہا جاتا تھا۔ اس میں طبیب اور کحال مقرر کیے۔ مریضوں کی دوا اور غذا کا انتظام کیا اور اس کے مصارف کے لیے بہت سے دیہات وقف کیے۔

فیروز شاہ تغلق کے دَور میں پنجاب میں زراعت کی ترقی کے لیے بڑی توجہ دی گئی۔ اس نے بنجر علاقوں بالخصوص پنجاب کو سیر اب کرنے کے لیے کئی نہریں کھدوائیں۔ ایک نہر جس کی لمبائی اڑتالیس کوس تھی، دیپالپور کو سیر اب کرنے کے لیے دریائے ستلج سے جھجر تک کھدوائی گئی۔ فیروز شاہ تغلق کو پنجاب میں نہری نظام کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ ہشت بند فیروز شاہ کے عہد میں بنایا گیا تھا جس میں پانی کی نکاسی کے لیے سات لکڑی کے دروازے تھے۔ اسی طرح ایک اور بند، بند فیروز شاہی کا ذکر ملتا ہے جس کے ذریعہ پانی کی نکاسی اور اس کے اطراف باغات کی آبپاشی اور پینے کے پانی کے لیے نہروں کا انتظام تھا۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ نے کئی پل بھی تعمیر کروائے۔

11.3.6 صوبائی یا علاقائی تعمیرات

دہلی سلطنت کے دور زوال میں مختلف علاقوں میں ذیلی اور صوبائی حکومتیں قائم ہو گئیں تھیں۔ ان حکومتوں نے بھی فن تعمیر کی سرپرستی کی اور شاہکار عمارتیں تعمیر کیں۔

صوبائی (یا علاقائی) طرز تعمیرات میں جونپور، مالوہ، بنگال، گجرات اور دکن کے آثار قدیمہ برصغیر میں مسلم فن تعمیر کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ صوبائی حکمراں خانوادوں کی تعمیرات مسلمانوں کے تعمیراتی کمالات کی عظمت کے منہ بولتے شواہد ہیں۔ فن تعمیر کی ترقی کے اعتبار سے جونپور کے مشرقی حکمرانوں کی بنوائی ہوئی مساجد بڑی مستحکم اور پر شکوہ ہیں۔ مالوہ میں واقع شہر مانڈو اپنے محلات اور عظیم مسجد کی بناء پر ارد گرد ایک رومانی فضا لیے ہوئے ہے۔

جون پور کے شارقی حکمراں علم اور فن تعمیر کے لئے جانے جاتے تھے۔ جون پور اس عرصے میں ہندوستان کے شیراز کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جون پور میں شارقی طرز کے فن تعمیر کی ایک قابل ذکر مثال اٹالہ مسجد، لال دروازہ مسجد اور جامع مسجد ہیں۔ اگرچہ، اٹالہ مسجد کی بنیاد فیروز شاہ تغلق نے 1376ء میں رکھی تھی لیکن اس کی تعمیر 1408ء میں ابراہیم شاہ کے دور میں مکمل ہوئی۔ ایک اور مسجد، جھانجری مسجد کو بھی ابراہیم شاہ نے 1430ء میں تعمیر کی تھی۔ لال دروجامع مسجد (1450ء) اگلے حکمراں محمود شاہ تغلق کی حکمرانی کے دوران تعمیر کی گئی تھی۔

سلطنت گجرات نے نہایت عمدہ عمارات بنوائیں جن کی خوبصورت آرائش اور پتھر کی تراشی جالیاں قابل دید ہیں۔ ملتان میں اولیاء کرام کے پانچ مقبرے تعمیری نمونوں میں ایک نیا آہنگ مہیا کرتے ہیں۔ باگرہٹ کے مقام پر خان جہاں کی ست گنبد مسجد ایک مشہور تاریخی عمارت ہے جس پر فی الواقعہ تہتر گنبد بنائے گئے تھے۔

11.3.7 ہند اسلامی فن تعمیر

دہلی سلاطین اپنے ساتھ وسطی ایشیا سے فنون لطیفہ اور تعمیرات کی انتہائی ترقی یافتہ روایات لے کر آئے تھے۔ مسلمانوں کا فن تعمیرات بہت اعلیٰ اور معیاری تھا جو حقیقی محرابوں، قبہ دار چھتوں اور گنبدوں پر مشتمل تھا۔ محراب ایک تعمیراتی اسلوب ہے جس کی طاقت کا دارومدار پتھروں کی ایسی تراش میں ہے جس سے وہ اوپر کی طرف تو چوڑے ہوتے ہیں اور نچلی طرف تنگ۔ انہیں اس انداز سے نصب کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اوپر لگے ہوئے ایک کلیدی پتھر کے توسط سے ملتے جاتے ہیں۔ ایک قبہ دار چھت محراب کی توسیعی کئی صورتوں میں ہوتی ہیں جو اسی اصول پر بنائی جاتی ہے جبکہ گنبد قبہ دار چھت کی گولائی کو کہا جاتا ہے۔ اس طرزِ تعمیر کے فوائد یہ ہیں کہ بڑے بڑے فاصلوں کو رکاوٹ کے بغیر مسقّف کیا جاسکتا ہے اور عمارتیں زیادہ مضبوط اور زیادہ پر شکوہ ہوتی ہیں۔

اسلامی فن تعمیر کے طرز میں ہندوستانی طرز کی آمیزش کرتے ہوئے اسلامی ذوق ورجحان کو برتا گیا' ہند اسلامی فن تعمیر کہلایا۔ مسلم سلاطین نے اپنی عمارتوں میں ہندوستان کے کئی اسٹائل اور بالخصوص نقاشی میں گل و بوٹے وغیرہ استعمال کیے۔ پھر ہندو مندروں میں

مسلم طرز تعمیر سے متاثر ہو کر وسیع گنبد اور درباروں میں زیبائش و آرائش کے ملتے جلتے انداز اختیار کئے گئے۔ علاقائی حکومتوں کی تعمیرات میں اسی طرز کے اندر علاقائی اثرات بھی شامل ہوتے گئے' اور نئے نئے انداز کی عمارتیں بنیں اور رفتہ رفتہ ہند اسلامی فن تعمیر کی اپنی ایک منفرد شناخت وجود میں آگئی۔

11.3.8 فنون لطیفہ

اسلامی فن تعمیر کی ترقی نے کتبہ نویسی کا ایک مستقل فن ایجاد کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسلامی فن تعمیر کی خصوصیات عمارتوں میں گچ سے پھول پتیوں کی آرائش اور قرآنی آیات کی سجاوٹ نے گچ کاری اور پچی کاری کو ہندوستان میں ایک مستقل شکل دی۔ فنون لطیفہ کے ضمن میں مختلف طرز کی تصویر سازی اور مصوری کی ابتدائی شکلیں دہلی سلطنت میں ملتی ہیں جن کو کاغذ اور کپڑوں پر بنوایا جاتا تھا۔ ان میں اکثر ایران کی مصوری سے ماخوذ تھیں جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس دور میں ایران پر منگول حملوں کی بنا پر ایران کے شہزادے اور فنکار ہندوستان میں پناہ گزیں تھے۔

موسیقی کا رواج بھی درباری سطح پر پایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ صوفیاء کرام کے درباروں اور خانقاہوں میں سماع کے رواج نے بھی صوفیانا موسیقی اور شاعری کو ہندوستان میں کافی فروغ دیا۔

دہلی سلاطین کے عہد میں کاغذ سازی کے کارخانے بھی بکثرت قائم ہوئے جس سے علمی سرگرمیوں کو کافی فروغ ملا۔

فن خطاطی جو کہ ایک خاص اسلامی فن ہے اس نے ہندوستان میں دہلی سلاطین کے دور میں نمایاں طور پر ترقی کی۔ جس وقت یہ سلاطین وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئے اس وقت تک اسلامی ممالک میں فن خطاطی کاغذوں سے آگے بڑھ کر عمارتوں کی دیواروں پر مزین ہو چکا تھا اور فن تعمیر کا حصہ بن چکا تھا۔ چنانچہ دہلی سلاطین کے دور میں بھی فن تعمیر میں اس فن کا بخوبی استعمال ہوا اور انتہائی نزاکت اور حسن کے ساتھ آیات قرآنی اور دیگر عربی عبارتیں عمارتوں میں کندہ کی جانے لگیں جو ابتدائی دور کی ہونے کے باوجود اپنی پختگی کی بنا پر قابل رشک ہیں۔

جس طرح یہ سلاطین اور شہزادے فاتح اور کشور کشا نیز علم دوست اور ادب نواز تھے، اُسی طرح شاہی محلوں سے تعلق رکھنے والی خواتین بھی فنِ حرب وضرب میں ماہر اور علم وادب کی دلدادہ تھیں۔ ہندوستان کے شاہی محلات ہر دور میں فکر و فن اور علم وادب کے مراکز رہے ہیں۔ یہاں اہلِ علم کی قدر دانی ہوتی رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اپنے دور کے نام ور دانش ور اور حکماء و علماء شہزادوں اور شہزادیوں کی تربیت کے لیے رکھے جاتے تھے۔

فنِ حرب اور شہسواری نہ صرف شہزادوں کو سکھائے جاتے تھے بلکہ شہزادیوں کو بھی ان فنون میں یکتائے روزگار بنایا جاتا تھا۔ حالاں کہ خواتین کو جنگوں میں حصہ لینے کے مواقع کم ہی ملتے تھے، مگر علمی محفلوں میں ان کی شرکت خوب ہوا کرتی تھی۔ ایسے ماحول میں تربیت پانے والی خواتین یکتائے روزگار ہوا کرتی تھیں اور پسِ پردہ رہ کر بھی اپنے دور کی سیاست پر اثرانداز ہوا کرتی تھیں۔

ہندوستان کی شاہی بیگمات چوں کہ پردے میں رہتی تھیں اور انہیں میدان جنگ میں لڑنے کے مواقع کم ہی ملتے تھے، لہٰذا ان کی بیشتر توجہ علم وادب کی طرف تھی۔ ان بیگمات میں کئی اچھی ادیبہ، اور صاحب دیوان شاعرہ تھیں تو کئی مؤرخ اور عالمہ تھیں۔ شاہی خواتین کو علم و ادب کے ساتھ ساتھ فنِ مصوّری، خطاطی اور عمارت سازی کا بھی شوق تھا اور انہوں نے اس میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔

رضیہ سلطانہ ہندوستانی تاریخ کی تنہا خاتون حکمراں تھی، اس نے اپنے باپ التمش کے مقبرے کی تعمیر وتزئین میں حصہ لیا۔ آج اس مقبرے کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے مگر جو کچھ باقی ہے وہ رضیہ سلطانہ کے ذوق اور فن سے دلچسپی اور مہارت کی مثال ہے۔

11.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علمی کاموں کے ساتھ سلاطین دہلی نے تعمیرات میں بھی دلچسپی لی اور عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قطب الدین ایبک نے مسجد قوۃ الاسلام بنوائی اور عظیم الشان قطب مینار تعمیر کرایا جو سلطنت دہلی کی تعمیری عظمت کا نشان ہے۔ التمش نے مسجد اور مینار میں اضافہ کے ساتھ اجمیر وغیرہ میں مسجدیں بنوائیں۔
- علاء الدین خلجی کے زمانہ سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے' اس نے خوبصورت علائی دروازہ بنوایا۔ سیری میں پایۂ تخت تعمیر کرایا۔
- تغلق کے دور میں تعمیر کا ایک نیا اسٹائل اختیار کیا گیا۔ غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد کا قلعہ بنوایا جو سادگی کا نمونہ ہے۔ محمد بن تغلق نے لال گنبد' غیاث الدین کا مقبرہ اور جہاں پناہ بنوایا' اس کا بڑا کارنامہ دولت آباد کا قلعہ ہے' جو دو منزلہ اور حربی فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ فیروز تغلق نے مدرسہ فیروز شاہی' قلعہ فیروز شاہ کوٹلہ اور کثرت سے مدرسے' مسجدیں' سرائے' محل' شفاخانے وغیرہ بنوائے۔
- سید سلاطین کے عہد میں مقبرے کثرت سے تعمیر کیے گئے اور لودھی عہد میں مقبروں کی عمارتوں میں نقش ونگار پر زیادہ توجہ دی گئی اور کئی ڈیزائن اختیار کیے گئے جو آئندہ بھی جاری رہے۔ جیسے دوہرے گنبد کا رواج شروع ہوا جس کی مثال سکندر لودھی کا مقبرہ ہے۔ دہلی سلطنت کی ان تعمیرات سے ہندوستان کے قدیم اسٹائل کے اندر عربی ذوق اور اسلامی تصورات کی آمیزش کر کے اسے عہد بہ عہد ترقی دی گئی اور ان نئے نئے تجربات کی وجہ سے ایک نیا فن وجود میں آیا جو ہند اسلامی فن تعمیر بنا۔
- عہد سلاطین میں یوں تو شجر کاری اور باغات لگوانے کا رواج تھا لیکن فیروز شاہ کا دور باغبانی اور باغات کی کثرت کے اعتبار سے بہت مشہور ہوا اسی طرح فیروز شاہ کے بارے میں آتا ہے کہ اسے نادر اور نایاب جانور جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا اس لیے اس نے دنیا بھر سے مختلف جانور جمع کیے اور عجائب گھر بنوائے۔

- دہلی سلاطین کے عہد میں کاغذ سازی کے کارخانے بھی بکثرت قائم ہوئے جس سے علمی سرگرمیوں کو کافی فروغ ملا۔

11.5 نمونہ امتحانی سوالات

11.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مسجد قوت الاسلام کی تعمیر سلطان نے کی تھی؟

(a). قطب الدین ایبک (b). التتمش (c). علاءالدین (d). فیروز شاہ

2. ڈھائی دن کا جھونپڑے کا مقصورہ کس نے بنوایا تھا؟

(a). قطب الدین ایبک (b). التتمش (c). علاءالدین (d). فیروز شاہ

3. صحت خانہ کی باقاعدہ تعمیر کس عہد میں ہوئی؟

(a). غلام خاندان (b). خلجی (c). تغلق (d). سب صحیح

4. کس بادشاہ نے باغات لگوانے اور عجائب گھر بنوانے کا رواج ڈالا؟

(a). علاءالدین خلجی (b). غیاث الدین تغلق (c). فیروز شاہ تغلق (d). سکندر لودھی

5. تغلق آباد کا قلعہ کس نے بنوایا؟

(a). غیاث الدین تغلق (b). فیروز تغلق (c). محمد تغلق (d). سب غلط

6. آگرہ کا شہر کس بادشاہ نے بنوایا؟

(a). قطب الدین ایبک (b). محمد تغلق (c). سکندر لودھی (d). شاہ جہاں

7. سلطان کا مقبرہ صوفی نصیر الدین کو دے دیا گیا تھا۔

(a). غیاث الدین تغلق (b). فیروز تغلق (c). سکندر لودھی (d). سب غلط

8. علائی دروازہ کہاں بنایا گیا؟

(a). دہلی (b). دولت آباد (c). ملتان (d). لاہور

9. کاغذ بنانے کا کارخانہ دہلی سلاطین کے دور میں قائم ہو گیا تھا۔

(a) صحیح (b)غلط

10. علاءالدین کے دور سے دہلی سلاطین کے فن تعمیر کا کونسا دور شروع ہوتا ہے؟

(a). آخری (b). تیسرا (c). دوسرا (d). پہلا

11.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. قطب مینار کی تعمیری خصوصیات پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. علاء الدین خلجی سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ تبصرہ کیجیے۔
3. محمد بن تغلق کی تعمیراتی خدمات پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. دہلی سلطنت میں مقبروں کی تعمیر کا مختصر اتعارف کرائیے۔
5. لودھی دور میں فن تعمیر کی صورت حال قلم بند کیجیے۔

11.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. دہلی سلطنت میں فن تعمیر کی خصوصیات پر ایک تحقیقی مضمون قلم بند کیجیے۔
2. دہلی سلطنت کے معمار بادشاہ کی خدمات پر تبصراتی مضمون قلم بند کیجیے۔
3. دہلی سلطنت میں تعمیر کی گئی مساجد کا تعارف پیش کیجیے۔

11.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں : جیمس فرگسن، ترجمہ: مولوی سید ہاشمی
2. ہند اسلامی فن تعمیر : صہبا وحید
3. آثار الصنادید : سر سید احمد خاں
4. ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک : سید صباح الدین عبد الرحمن' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ
5. بزم مملوکیہ : سید صباح الدین عبد الرحمن' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 1999ء
6. خلجی خاندان : کے ایس لال' اردو ترجمہ' یسین مظہر صدیقی
7. مختصر تاریخ ہند : سید ابو ظفر ندوی' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2006
8. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui,Pearson:2011

اکائی 12: مغل حکومت: قیام و استحکام

اکائی کے اجزا:

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 مغلیہ حکومت کا قیام

12.2.1 مغل حکومت کے قیام کے اسباب

12.2.2 سلطان ظہیر الدین محمد بابر

12.2.3 پانی پت کی پہلی جنگ

12.2.4 راجا حسن خاں میواتی

12.2.5 دیگر فتوحات

12.2.6 بابر کی شخصیت

12.3 سلطان نصیر الدین ہمایوں (1530-1556)

12.3.1 ہمایوں کی شخصیت

12.4 جلال الدین اکبر

12.4.1 پانی پت کی دوسری جنگ

12.4.2 فتوحات

12.4.3 اکبر کی شخصیت

12.5 نور الدین محمد جہانگیر (1605-1627)

12.5.1 شخصیت

12.6 شاہجہاں (1627-1658)

12.6.1 قندھار

12.6.2 شاہجہاں کی شخصیت
12.7 محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (1707-1658)
12.7.1 شخصیت
12.8 اکتسابی نتائج
12.9 نمونہ امتحانی سوالات
12.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

ہندستان کی تاریخ میں مغل عہد کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔اس عہد میں ہندستان کی وسیع حکومت قائم ہوئی اور تاریخ میں پہلی بار تقریباً پورا ہندستان ایک ملک بنا اور متحدہ ہندستان وجود میں آیا ساتھ ہی اس دور میں ملک کے اندر رواداری پر مبنی بہترین معاشرہ وجود میں آیا، انھوں نے عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے اہم کام کیے اور ملک کو ترقی کے بام عروج تک پہنچایا۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ مغلیہ سلطنت کیسے قائم ہوئی اور اس میں بتدریج کیسے استحکام آیا۔وہ حکومت کتنی وسیع تھی اور ان کے عہد میں کون کون اہم حکمراں ہوئے اور انہوں نے ملک کی تعمیر و ترقی میں کیا کردار ادا کیا۔ تاہم زیادہ توجہ اسی بات پر رہے گی کہ مغلیہ حکومت کے قیام اور استحکام کے پہلوں کو نمایاں کیا جائے۔

12.2 مغلیہ حکومت کا قیام

12.2.1 مغل حکومت کے قیام کے اسباب

مغل حکومت دراصل ترک حکومت ہے، وہ دراصل برلاس قبیلے کے ترک تھے، ان کے جد اعلیٰ امیر تیمور تھے، جو اپنے وقت کے ایک عظیم فاتح اور تیموری سلطنت کے بانی تھے۔ امیر تیمور کے بعد وسط ایشیا میں کم و بیش سو سال ان کے اسلاف نے حکومت کی۔ اس کے بعد

وہ وسط ایشیا کے اندر سیاسی طور پر وہ لوگ بے اثر ہو گئے۔ امیر تیمور کی پانچویں پشت میں بابر کی ولادت ہوئی۔ بابر کے پاس ایک تجربہ کار فوج اور ایک شاندار تاریخی روایت تھی، لیکن وسط ایشیا میں حالات ان کے لیے ساز گار نہیں تھے۔ اس لیے بابر کو کسی نئی پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں جنگی ٹیکنالوجی میں سب سے زیادہ اہمیت توپ خانے کو حاصل تھی۔ بابر نے اپنی فوج کو توپ خانہ سے مسلح کیا اور اس نے ہندستان کو فتح کرنے کا خواب دیکھا۔ حالات اس کے مواقف رہے اور اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور ہندوستان کے اندر ایک عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی جس کا شمار دنیا کی عظیم حکومتوں میں ہوتا ہے۔ اس عظیم سلطنت کے قیام اور استحکام کو دیکھا جائے تو اس کے من جملہ اسباب کے حسب ذیل اسباب بہت اہم ہیں:

1. بابر کی فوج جدید ترین آلات سے مسلح تھی، ان میں توپ خانہ اس کی خصوصیت تھی، توپ خانہ کی مدد سے بابر کو اپنے مقابل خاص طور پر دہلی کے حکمراں سلطان ابرہیم لودھی کے مقابلے میں برتری حاصل تھی اور میدان جنگ میں اس کو بڑی کامیابی ملی۔
2. بابر خود بہت طالع آزما اور حوصلہ مند شخصیت کے مالک تھے انہوں نے ہر جگہ بڑی بہادری اور حوصلے سے مقابلہ کیا۔
3. بابر کی فوج زیادہ منظم اور تجربہ کار تھی۔ بابر کی فوج میں صف بندی اور مقابلہ آرائی تک ہر جگہ بڑی نظم اور ترتیب تھی۔
4. بابر کو کئی سال کی طویل جنگ آزمائی کے نتیجے میں جنگی تجربات بہت تھے اور اس کو معلوم تھا کہ فوج کو کس طرح لڑایا جائے۔
5. بابر کے مقابلے میں سلطان ابرہیم لودھی کی فوج غیر منظم تھی اس کا ذکر خود بابر نے بھی کیا ہے، اس لیے وہ میدن جنگ میں جم کر نہیں لڑ سکے اور جب توپوں سے مقابلہ ہوا تو فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور سلطان ابرہیم میدان جنگ میں شہید ہو گئے۔
6. شیر شاہ سوری نے اچھا مقابلہ کیا اور ایک طرح سے مغل سلطنت کا خاتمہ کر دیا، لیکن اس کے جانشین زیادہ اہل ثابت نہیں ہوئے اس لیے مغلوں کو دوبارہ ہندستان فتح کرنے کا موقع مل گیا۔
7. بیرم خاں کی جنگی قابلیت اور حوصلہ مندی بھی مغل حکومت کے قیام میں ایک اہم سبب رہی۔ پانی پت کی دوسری جنگ اسی کی حکمت عملی سے فتح ہوئی۔

12.2.2 سلطان ظہیر الدین محمد بابر

مغلیہ سلطنت کے بانی سلطان ظہیر الدین محمد بابر (1483-1530) ہیں۔ بابر سے پہلے ہندوستان پر لودھی پٹھانوں کی حکومت تھی۔ لودھی حکمراں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر بابر نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس طرح ہندوستان کے اندر عہد سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ایک نئی حکومت قائم ہوئی جو اگلی تین صدیوں سے زیادہ تک قائم رہی۔

بابر کی ولادت فرغانہ میں ہوئی۔ وہ امیر تیمور کی پانچویں پشت میں تھے۔ ان کے والد عمر شیخ مرزا بن ابو سعید مرزا بن مرزا سلطان بن میران شاہ بن امیر تیمور تھے۔ بابر اپنے والد کی وفات کے بعد 11 سال کی عمر میں فرغانہ کا حاکم بنا۔ بابر کو شروع سے ہی مشکلات کا سامنا تھا۔ اس کی حوصلہ مندی اس کو کچھ بڑا کرنے کی ترغیب دیتی لیکن اس کے حالات اور اس کے چچا الغ بیگ مرزا کی مخالفت اس کی راہ کی رکاوٹ بنتی۔ 1503 میں اس نے سمرقند پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ 1504 میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ 1511 میں شاہ اسماعیل صفوی کی

مدد سے سمرقند، بخارا اور خراسان پر فتح حاصل کی، لیکن وہ دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ ایک سال بعد ہی اس کو کابل واپس جانا پڑا۔

ہندوستان کی مہم

بابر نے اپنے موروثی علاقوں کی غیر مستقل سیاسی صورت حال میں اپنے لیے ہندوستان آنے کا راستہ اختیار کیا اور کئی سال تیاری کر کے فوج مرتب کی۔ استاد علی رومی اور مصطفیٰ رومی کی مدد سے توپخانہ تیار کیا اور 1519 سے اس نے ہندوستان پر حملے شروع کیے۔ 1524 میں اس نے لاہور اور دیپال پور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے دہلی کا رخ کیا۔

12.2.3 پانی پت کی پہلی جنگ

بابر نے 1526 میں دہلی پر حملے کی تیاری کی اور پانی پت کے میدان میں اپنی فوجوں کے ساتھ پڑاؤ ڈالا۔ دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی نے بھی فوج تیار کی اور پانی پت کا رخ کیا۔ 21 اپریل 1526 کو دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ بابر نے ایک کتاب 'تزک بابری' لکھی ہے۔ اس کتاب میں اس نے جنگ کا حال خود لکھا ہے۔ بابر کے پاس تھوڑی فوج تھی تقریباً 12 ہزار، جبکہ ابراہیم لودھی کی فوج ایک لاکھ تھی۔ بابر نے بڑی حکمت اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بابر کے توپخانہ سے بھی اس کی مدد ہوئی اور ایک ہی دن کی جنگ میں لودھی افواج ہار گئی۔ خود سلطان ابراہیم میدان جنگ میں فوت ہو گیا۔ اس طرح دہلی اور آگرہ پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

بابر نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے نام کا خطبہ شروع کیا۔ آگرہ پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو بھیجا۔ آس پاس کے پٹھان حکمرانوں نے بابر کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح باضابطہ مغل سلطنت کی بنیاد قائم ہوئی۔ بابر سے قبل پایہ تخت دہلی تھا۔ بابر نے حفاظتی انتظامات کے لحاظ سے آگرہ کو اپنا دارالحکومت کی حیثیت سے منتخب کیا لیکن ابھی بابر کا ایک بڑا امتحان باقی تھا۔

12.2.4 راجا حسن خاں میواتی

میوات کا حکمران راجا حسن خاں تھا۔ اس نے ابراہیم لودھی کا ساتھ دیا۔ چونکہ میوات کا علاقہ دہلی اور آگرہ کے درمیان ہے اس لیے میوات کو قابو کرنا ضروری تھا۔ تزک بابری سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابر نے راجا حسن خاں کو اپنے ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی تھی، راجا حسن خاں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے ان کے بیٹے طاہر خاں کو بھی رہا کر دیا جو اس سے قبل پانی پت کی جنگ میں قید ہو گیا تھا، ان سب باتوں کا ذکر خود بابر نے اپنی تزک میں کئی مرتبہ کیا ہے۔ لیکن بابر کی ہر کوشش کے باوجود راجا حسن خاں بابر کے خلاف ہی رہا اور رانا سانگا کے ساتھ مل کر اس نے بابر کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا بیڑا اٹھایا اور خانوا کے میدان میں جمع ہوئے۔ راجپوتوں اور میواتیوں کی فوج کم و بیش دو لاکھ تھی، لیکن اس جنگ میں بھی بابر کو فتح حاصل ہوئی۔ راجا حسن خاں میواتی میدان جنگ میں شہید ہو گئے اور رانا سانگا بھی زخموں سے چور ہو گئے تھے۔ بعد میں ان کی بھی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد بابر کے سامنے کوئی طاقت باقی نہیں رہی اور وہ شمالی ہند کے ایک بڑے رقبے کا مالک بن گیا۔

12.2.5 دیگر فتوحات

بابر اور اس کی فوج نے قنوج، دھول پور، کالپی اور سنبھل کے علاقوں پر بھی معمولی جدوجہد کے بعد قبضہ کر لیا۔ اس طرح کابل سے قنوج تک مغل حکومت قائم ہو گئی اور مقامی سطح پر کوئی طاقت ایسی نہیں رہی جو بابر کا مقابلہ کر سکے۔ پٹھان زیادہ تر اس علاقے سے نکل کر مشرقی طرف بہار میں جمع ہو گئے۔ وہاں بنگال کے حکمراں نصرت شاہ کی مدد سے بابر پر حملہ کیا، لیکن اس مرتبہ بھی بابر نے 6 مئی 1529 کو گھاگھرہ ندی کے کنارے پٹھانوں کو شکست دی اور آگے بڑھ کر بہار پر بھی قبضہ کر لیا۔

بابر کی ساری عمر معرکہ آرائی اور جنگ و جدال میں بسر ہوئی۔ صحت اس کی پہلے سے ہی خراب تھی۔ لیکن 1528 سے اور زیادہ گر گئی۔ آخر کار ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھنے کے بعد 26 دسمبر 1530 کو آگرہ میں ان کی وفات ہو گئی۔ وفات کے وقت بابر کی عمر 47 سال تھی۔

12.2.6 بابر کی شخصیت

سلطان ظہیر الدین بابر ایک حوصلہ مند، طالع آزما، مدبر، دور اندیش، مخیر ہونے کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق کے بڑے شوقین تھے۔ وہ ترکی زبان کے شاعر بھی تھے۔ ان کو حکومت کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس لیے بابر کی انتظامی قابلیتوں کا اندازہ پورے طور پر مشکل ہے۔ بابر نے اپنے چار سالہ دور میں قلعے تعمیر نہیں کرائے۔ البتہ ان کے ذوق تعمیر کا مظاہرہ ان کے بنائے ہوئے باغات، حوض وغیرہ سے ہوتا ہے۔ علمی طور پر بابر کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی ڈائری ہے جو 'تزک بابری' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ نظم و نثر میں بابر کی کئی کتابیں ہیں۔ بابر نے نصابی کتاب بھی لکھی اور ایک رسم الخط بھی ایجاد کیا تھا جو اس کے نام پر 'خط بابری' کے نام سے موسوم ہوا۔

12.3 سلطان نصیر الدین ہمایوں (1530-1556)

بابر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا نصیر الدین ہمایوں تخت نشیں ہوا۔ ہمایوں 17 مارچ 1508 کو کابل میں پیدا ہوا۔ بابر کی نگرانی میں اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کو مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل تھی۔ 20 سال کی عمر میں وہ بدخشاں کا امیر مقرر ہوا اور اپنے والد کے آخری دنوں میں سنبھل کا امیر مقرر رہا۔ مرزا ہمایوں نے بادشاہ بننے کے بعد سب سے پہلے اپنے بھائیوں کے درمیان پوری حکومت کو تقسیم کر دیا۔ مرزا کامران کو کابل و قندھار کا علاقہ دیا، مرزا عسکری کو سنبھل اور مرزا ہندال کو میوات اور الور و تجارہ کا امیر بنایا اور اپنے ایک چچیرے بھائی سلیمان مرزا کو بدخشاں کا علاقہ دیا۔ ہمایوں نے ملک کی تقسیم اپنے باپ کی خواہش کے مطابق کی تھی۔ اس کو امید رہی ہوگی کہ بھائی آپس میں مل کر بہتر انتظام چلائیں گے لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ بھائیوں نے خاص طور پر مرزا کامران اور مرزا عسکری نے ہی مخالفت شروع کر دی، ملک کی یہ تقسیم ہمایوں کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔

بغاوتیں

حکومت سنبھالنے کے بعد ہمایوں کو ایک مسئلہ تو بھائیوں کی مخالفت کا تھا، اس کے ساتھ ہی ملک میں بغاوتیں پھیل گئیں۔ اس لیے

ہمایوں کو سب سے پہلے ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اگرچہ ہمایوں کے پاس مضبوط فوج اور وفادار سپاہی تھے لیکن اس کے سامنے اندرونی سازشیں اور بیرونی بغاوتیں دو محاذ بن گئے۔ ہمایوں نے دونوں محاذ پر حکمت و تدبر سے مقابلہ شروع کیا اور اس نے بڑی حد تک ان پر قابو بھی پالیا تھا۔ لیکن شیر خاں سوری کے مقابلے میں کئی محاذ پر شاندار کامیابی کے باوجود آخر میں اس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

شیر شاہ سوری

ہمایوں کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں ان میں شیر شاہ سوری کی بغاوت سب سے زیادہ دیرپا اور انجام کے اعتبار سے کامیاب رہی۔ دراصل پٹھانوں نے اور خاص طور پر محمود لودھی نے ابراہیم لودھی کی موت کا بدلہ لینے کے نام پر بغاوت کی اور شیر شاہ نے اس کی قیادت کی۔ شروع میں جون پور اور چنار گڑھ ان کے مرکز تھے، لیکن ہمایوں نے ان کا محاصرہ کرکے شیر شاہ کو ہرادیا۔ شیر شاہ نے وفاداری کا وعدہ کرکے جان بچائی، بعد میں ہمایوں گجرات کی مہم اور پھر بنگال کی مہم میں مصروف ہوگیا تو اس موقع کا فائدہ اٹھا کر شیر شاہ نے جون پور، قنوج وغیرہ پر قبضہ کرلیا۔ ہمایوں نے 1538 میں بنگال کو بھی فتح کرلیا لیکن شمالی ہند کے نامساعد حالات کی بنا پر وہ واپس لوٹا۔ ہمایوں کی فوج نے بکسر کے قریب چوسا میں قیام کیا تھا۔ وہاں شیر شاہ نے شب خوں مار کر ہمایوں کو ہرادیا۔ شکست کھا کر ہمایوں قنوج گیا۔ شیر شاہ نے تعاقب کیا اور قنوج میں بھی ہمایوں کو شکست ہوگئی۔ اس کے بعد ہمایوں کے پاس شمالی ہند کو چھوڑ کر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس لیے راجپوتانہ کے راستے وہ سندھ چلا گیا۔

ایران میں پناہ

سندھ میں ہمایوں نے حمیدہ بانو سے شادی کی جن کے بطن سے اکبر پیدا ہوا۔ سندھ میں مرزا کامران اور عسکری نے ہمایوں کے قتل کی سازش رچی، لیکن ہمایوں کو بروقت اطلاع ہوگئی اس لیے وہ ان کے جال سے نکل گیا اور بلوچستان ہوتے ہوئے ایران چلا گیا۔ ایران کے صفوی حکمرانوں سے اس کے خاندانی تعلقات تھے۔ ایران کے بادشاہ طہماسپ نے ہمایوں کی آؤ بھگت اور استقبال کیا۔ ایران میں ہمایوں کا قیام کئی سال رہا۔ اس دوران اس نے اپنی فوج کو دوبارہ منظم کیا اور شاہ طہماسپ سے بھی فوجی مدد حاصل کی اور ایک بڑی فوج تیار کرکے پہلے اس نے مرزا کامران اور مرزا عسکری کو شکست دے کر ان علاقوں پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد دہلی کی طرف رخ کیا۔

دہلی پر قبضہ اور وفات

دہلی میں اس زمانے میں سوری پٹھانوں کی حکومت تھی، لیکن شیر شاہ سوری کے بعد وہ کمزور ہوچکے تھے اس لیے ہمایوں کو آسانی سے دہلی میں داخلہ مل گیا۔ دہلی میں ہمایوں نے اس قلعے میں قیام کیا جس کو وہ ایران کی طرف جانے سے قبل تعمیر کروا رہے تھے یہ قلعہ اب پرانا قلعہ کہلاتا ہے۔ اس قلعہ میں شیر منڈل نام کی عمارت ہے۔ ہمایوں اس عمارت کے اوپر مغرب کی اذان کی آواز سن کر اترنے لگے۔ اسی میں اس کا پیر پھسلا اور گر کر ان کی موت ہوگئی۔ ان کی تاریخ وفات 27 جنوری 1556 ہے۔

12.3.1 ہمایوں کی شخصیت

ہمایوں ایک علم دوست اور رحمدل بادشاہ تھے۔ معاف کرنا، خاص طور پر دشمنوں کو معاف کرنا ان کا امتیازی وصف تھا۔ اس نے متعدد مرتبہ اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ اس رحم دلی کے ساتھ نظام حکومت چلانا آسان نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ہمایوں ایک کامیاب بادشاہ ثابت ہوئے۔ اس نے ایک بڑے خطے پر حکومت کی، پھر اس کو کھو دیا اور آخر میں اس کو پھر حاصل کر لیا، یہ ہمایوں کا امتیاز تھا۔ ہمایوں کے اندر تعمیر کا ذوق بہت تھا۔ مشکل حالات کی وجہ سے ہمایوں کو زیادہ موقع نہیں ملا، تاہم پھر بھی عہد ہمایونی کی کئی اہم عمارتیں موجود ہیں۔ ان میں سب سے مشہور دہلی کا پرانا قلعہ ہے جو اگرچہ آج بھی ادھورا ہے تاہم اس کی شان و شوکت اور اس کا طرز تعمیر بے مثال ہے۔

12.4 جلال الدین اکبر

ہمایوں کی وفات کے بعد ان کا بڑا بیٹا جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بنا۔ اکبر کی پیدائش سندھ میں ہوئی تھی۔ جب ہمایوں ایران گئے تو اکبر مرزا کامران کے پاس تھا اس لیے اکبر کی پرورش مرزا کامران کے یہاں ہوئی۔ جب ہمایوں واپس آئے تو انہوں نے اکبر کو اپنے پاس بلوایا۔

ہمایوں نے بیرم خاں کو اکبر کا اتالیق یعنی مربی اور سرپرست مقرر کیا۔ ایک بڑی فوج اس کی کمان میں دے کر اس کو فوجی مہمات پر متعین کیا۔ جس وقت دہلی میں ہمایوں کی وفات ہوئی اس وقت اکبر پنجاب کے اندر جنگ میں مصروف تھا۔ بیرم خاں نے اس خبر کے سنتے ہی نہایت سادگی کے ساتھ اکبر کی تاجپوشی کرا دی۔ سوری سلطنت کے وزیر ہیموں بقال اس وقت سب سے بڑی طاقت تھے۔ انہوں نے مغلوں کو دہلی سے نکالنے کی ایک اور کوشش کی۔

12.4.1 پانی پت کی دوسری جنگ

پانی پت کی دوسری جنگ نو عمر سلطان اکبر اور ہیموں کے درمیان لڑی گئی۔ اس جنگ میں ہیموں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن فتح اکبر کو حاصل ہوئی۔ اس طرح مغل فوج دوبارہ ہندوستان کے اندر اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئی۔

اکبر کے سامنے اس وقت کئی بڑے مسائل تھے۔ ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ اکبر پوری طرح خود مختار نہیں تھے بلکہ بیرم کی سرپرستی میں تھے۔ دوسرا مسئلہ پوری مغل حکومت کے لیے تھا، وہ یہ کہ مغلوں کی فوجی قوت اگرچہ مضبوط تھی تاہم ہندوستان کے اندر اس وقت کم از کم تین بڑی طاقتیں تھیں۔ ایک طاقت راجپوتوں کی تھی، دوسری میواتیوں کی اور تیسری پٹھانوں کی۔ اکبر کو ان مشکل حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے طاقت سے زیادہ تدبر کی ضرورت تھی۔ اکبر نے اس کا مظاہرہ کیا اور رفتہ رفتہ سارے مسائل کو حل کر کے عظیم الشان اور پائیدار مغل حکومت کی بنیاد رکھی جو دنیا کی بڑی حکومتوں میں شمار ہوتی ہے۔

بیرم خاں کی برطرفی

بیرم خاں ایک بہادر ترک سردار تھا۔ ہمایوں کا بھروسہ مند تھا۔ اس نے اکبر کی ابتدائی زندگی میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید مغل حکومت بر قرار نہ رہ پاتی۔ جب اکبر کی عمر اٹھارہ سال کی ہو گئی تو اکبر نے بیرم کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا اور ان کو حج پر جانے کی درخواست کی۔ بیرم خاں کو یہ بات پسند نہ تھی اس لیے درمیان میں کچھ ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے۔ تاہم بیرم خاں کو حج کے لیے جانا پڑا۔ بیرم خاں سفر حج میں گجرات میں تھے کہ 1561ء کے شروع میں ایک پٹھان نے ان کا قتل کر دیا۔

راجپوت پالیسی

اکبر کی سب سے کامیاب پالیسی راجپوت پالیسی رہی۔ اس نے راجپوتوں کے ساتھ رشتہ داری کے تعلقات استوار کیے۔ پہلے اس نے رشتہ داری کے ذریعے میواتیوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ راجا حسن خاں کے بھائی جمال خاں کی ایک بیٹی سے خود شادی کی اور دوسری سے بیرم خاں کی شادی کی۔ ہندی کے مشہور شاعر عبدالرحیم خانخاناں جو 'رحیم' کے نام سے مشہور ہیں، وہ بیرم خاں کی اس میواتی بیوی کے بطن سے تھے۔ اکبر نے جے پور کے راج گھرانے میں بھی شادی کی، پھر یہ روایت بن گئی کہ مغل گھرانے کے لوگ راجپوتوں سے رشتہ داریاں کرنے لگے اور اس طرح مغلوں کو راجپوتوں کی مضبوط حمایت مل گئی۔ راجپوت راجاؤں سے دوستی استوار کرنے کے بعد اکبر نے ملک گیر فتوحات کا آغاز کیا اور عظیم مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔

12.4.2 فتوحات

اکبر کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی کامیابی تو پانی پت کی دوسری جنگ میں حاصل ہوئی۔ تاہم اس جنگ میں نام ہی اکبر کا تھا، جنگ در حقیقت بیرم خان نے لڑی تھی۔ لیکن بیرم خان کے بعد اکبر نے بھی اپنی جنگی قابلیت کا بھرپور ثبوت دیا۔ اس نے 1561 میں مالوہ اور گونڈوانہ فتح کیا۔ 1569 میں رنتھم بھور فتح کیا۔ اسی سال کالنجر فتح کیا۔ 1572 اور 1573 میں گجرات فتح کیا۔ اس طرح 1575 میں اکبر نے بنگال فتح کر کے اپنی حدود مملکت تقریباً اتنی ہی کر لی جتنی ان کے والد ہمایوں کے زمانے میں تھی۔

اکبر نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ اپنی حدود حکومت میں مسلسل اضافہ کرتے رہے۔ 1586 میں اکبر نے کشمیر فتح کیا۔ کشمیر کو اس سے قبل کسی مسلمان بادشاہ نے فتح نہیں کیا تھا۔ اکبر پہلا بادشاہ ہے جس نے کشمیر کو فتح کر کے مغل حکومت میں شامل کیا۔ اکبر سے پہلے کشمیر ایک آزاد ریاست تھی اور اس وقت بھی وہاں کی اکثریت مسلمان تھی۔

چوں کہ اکبر کا زیادہ زور شمالی ہندوستان پر رہا اس لیے بعض علاقے جو پہلے مغل سلطنت کے ماتحت تھے لیکن اب وہ آزاد یا نیم خود مختار ہو گئے تھے۔ خاص طور پر سندھ، بلوچستان اور کابل و قندھار براہ راست مغل حکومت کے ماتحت نہیں رہے تھے۔ اس لیے اکبر نے ان علاقوں کو بھی اپنے ماتحت کرنے کے لیے فوجی مہم کا آغاز کیا اور 1595 میں قندھار فتح کر کے اپنی حکومت کی سابقہ حدود بھی پھر استوار کر دیں، اس سے قبل 1592 میں سندھ کو فتح کیا اور پھر 1596 میں بلوچستان کو فتح کیا تھا۔

شمالی ہند میں فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد اکبر نے پورے ملک میں بہترین نظام نافذ کیا اور جنوبی ہند کی ریاستوں کو بھی اپنے ملک میں شامل کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اکبری عہد کے نظام حکومت کی تفصیلات اکبر نامہ اور آئین اکبری میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کے اندر چار ریاستیں تھیں احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ اور خاندیش۔ اکبر نے ان ریاستوں کو پیغام دیا کہ وہ مغلوں کی ماتحت اور باجگذار بن کر رہیں۔ تین ریاستوں نے اپنی آزادی کو باقی رکھا اور خاندیش کے فاروقی حکمرانوں نے اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد اکبر کی فوجیں احمد نگر کی طرف بڑھیں۔ سات سال کے مسلسل محاصرے اور جنگ آزمائی کے باوجود احمد نگر پر مغلوں کا قبضہ نہیں ہو سکا اور اس درمیان میں خاندیش کے حکمراں راجا علی خاں فاروقی کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد وہاں کا حکمراں بہادر شاہ بنا۔ اس نے مغلوں کی اطاعت ختم کردی۔ اس لیے مغل فوج نے خاندیش پر چڑھائی کردی۔ تقریباً دو سال کی جدوجہد کے بعد 1601 میں خاندیش پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔

اکبر نے کم وبیش 50 سال حکومت کی۔ اس نے طویل فوجی مہموں کے ذریعے موجودہ افغانستان سے لے کر بنگال تک ایک وسیع و عریض سلطنت قائم کی۔ ایک طاقتور فوج بنائی اور ملک میں بہتر انتظام نافذ کیا۔ جنوبی ہند کی مسلم ریاستیں اگرچہ اکبر کے مقابلے میں کمزور تھی اور اکبر کا ارادہ بھی تھا کہ ان ریاستوں کو بھی اپنی حکومت کا حصہ بنالے۔ احمد نگر کی طویل مہم اس کی مثال ہے اور خاندیش کی ریاست تو ختم ہو گئی تھی لیکن باقی ریاستیں ابھی اس کے اقتدار میں نہیں آئیں تھیں کہ اکبر کے گھر میں ایسے مسائل پیدا ہوگئے کہ دکن کی مہم ترک کرنا پڑی۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ سلیم نے الہ آباد میں بغاوت کردی۔ اس نے اکبر کے ایک اہم ساتھی ابوالفضل کا قتل بھی کر دیا۔ اگرچہ بغاوت فرو ہوگئی لیکن یہ اکبر کے لیے بڑا صدمہ ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ دیگر حادثات نے اکبر کو بہت کمزور کر دیا۔ جیسے 1599 میں شہزادہ مراد کی وفات ہوگئی۔ اسی طرح 1604 میں شہزادہ دانیال کی موت ہوگئی۔ اسی سال اکبر کی والدہ حمیدہ بانو کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان مسلسل حادثات نے اکبر کو کافی کمزور کر دیا۔

لگاتار تقریباً 50 سال فوجی مہمات اور انتظامی کاموں میں مشغول رہ کر 63 سال کی عمر میں 26 اکتوبر 1605 میں اکبر کا انتقال ہوگیا۔

12.4.3 اکبر کی شخصیت

اگر کہا جائے کہ مغل سلطنت کا اصل بانی اکبر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ مغل حکومت کو دوبارہ قائم کرنے، اس کو مستحکم بنانے اور وسعت دینے میں سب سے زیادہ خدمات اکبر کی ہیں۔ تاہم چوں کہ اکبر کو یہ حکومت وراثت میں ملی تھی اس لیے بانی تو نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس حکومت کو استحکام اکبر کے ذریعہ ہی ملا۔ سلطان جلال الدین محمد اکبر کی شخصیت بے مثال تھی۔ وہ فطرتاً نرم دل اور علم وعلماء کے بڑے قدر دان تھے۔ ان کے دربار میں امامت کے فرائض انجام دینے والے ملا عبدالقادر بدایونی نے، جو اگرچہ اکبر کے خلاف بھی تھے، ان کے جو واقعات لکھے ہیں وہ اکبر کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت معاون ہیں۔

اکبر شروع میں ذاتی طور پر بڑے متبع شریعت اور دیندار تھے۔ تاہم مذہبی رواداری کی روایت بھی ان کے اندر اعلیٰ درجے کی تھی۔ اکبر نے مذہبی معاملات میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بڑی سہولتیں فراہم کیں، ہندو زائرین سے ٹیکس معاف کر دیا، بڑی تعداد میں ہندو صاحبان کو فوج اور دیگر سرکاری محکموں میں ملازمتیں دیں، اس کے علاوہ اکبر نے ہندو مذہب کے وسیع مطالعے کی بنیاد رکھی، ہندو مذہب کی

کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کروایا تاکہ مسلمان بھی براہ راست ہندو مذہب کو سمجھ سکیں اور ملک کے اندر بھائی چارہ اور یک جہتی قائم ہو۔

اکبر کے دربار میں بڑی تعداد علماء کی تھی، لیکن ان کی ایک تعداد ایسی تھی جس کا مقصد محض دولت دنیا حاصل کرنا تھا۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے پر الزام لگاتے اور معمولی باتوں کو بڑھا کر پیش کرتے، مذہبی اختلافات کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ اکبر نے اس زمانے میں شیخ سلیم چشتی سے متاثر ہو کر فتح پور سیکری میں اپنا دارالحکومت تعمیر کروایا تھا۔ وہاں انہوں نے عبادت خانہ کے نام سے ایک عمارت بھی بنوائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مذہبی اختلافات کے درمیان بحث ومباحثہ اور استدلال کے ذریعے حقیقت کو جانا جائے۔ اکبر کا مقصد اگرچہ اچھا تھا لیکن اس بحث و مباحثہ کا نتیجہ غلط نکلا۔ علماء کی بحثوں سے تنگ آکر اکبر نے اس محفل کو دوسرے مذاہب کے لیے بھی کھول دیا اور اس میں پھر بین المذہبی مباحثے ہونے لگے۔

مذہبی مباحثے عبادت خانے میں ہوتے تھے۔ خود اکبر اس میں حاضر رہتے۔ اس دوران ملا مبارک ناگوری اور ان کے دونوں بیٹے فیضی اور ابوالفضل بھی اکبر کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ اکبر جو مذہبی مناظروں سے پہلے پریشان ہو چکا تھا، ملا مبارک نے اس کو ایک نئی راہ سجھائی۔ وہ راہ یہ تھی کہ اکبر کو مجتہد بین المذاہب کا مقام حاصل رہے اور مذاہب کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ اکبر کی بصیرت سے دور کیے جاسکتے ہیں۔ اس کام کے لیے باضابطہ محضر نامہ تیار کرایا۔ اس پر علماء سے دستخط لیے۔ اس طرح اکبر کی مذہبی پالیسی دینداری سے بدل کر آزاد روی کی ہو گئی۔ اس کے بعد نئے فرامین جاری ہوئے اور گویا ایک نیا مذہب وجود میں آگیا۔ مورخین نے اس کو 'دین الٰہی' کا نام دیا ہے۔

مذہبی معاملات اکبر کے جیسے بھی ہوں لیکن اکبر کی علم دوستی اور علماء نوازی کی روایت بے مثال تھی۔ اکبر نے بہت سے علماء، فضلاء، ماہرین اور اصحاب فن اپنے دربار میں جمع کیے۔ ان کو اکبر کے 9 رتن کہا جاتا ہے۔ اکبر کے دربار میں ابوالفضل، فیضی، عبدالرحیم خانخاناں، میر فتح اللہ شیرازی، ملا عبدالقادر بدایونی، راجا ٹوڈرمل، بخشی نظام الدین، تان سین، خواجہ عبدالصمد وغیرہ اپنے وقت کے مشہور اور نامور علماء و فضلاء تھے۔ اکبر نے جن کتابوں کی سنسکرت سے فارسی ترجمے کروائے ان میں رامائن، مہابھارت، گیتا، لیلاوتی راکھ، سنگھاسن بتیسی اور پنچ تنتر شامل ہیں۔

اکبر کے دور میں نظام حکومت بھی بہت مضبوط تھا۔ عدالت آزادانہ کام کرتی تھی، مذہبی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ بازار میں قیمتوں اور اوزان وغیرہ کی بھی نگرانی ہوتی تھی۔ اکبر کے دور میں تعمیر کا کام بھی بہت ہوا۔ اکبر کے دور کی یادگار عمارتوں میں فتح پور سیکری کی عمارتیں، ہمایوں کا مقبرہ اور بعض شہروں کی مساجد ومقابر شامل ہیں۔

اکبر کی وفات کے وقت مغل حکومت نہایت مستحکم بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی۔ انہی بنیادوں پر بعد کے حکمرانوں نے حکومت کو مزید وسعت دی۔

12.5 نورالدین محمد جہانگیر (1605-1627)

مغلیہ سلطنت کا چوتھا حکمران سلطان جہانگیر ہوا۔ مغل حکومت کو اصل استحکام اکبر بادشاہ کے ذریعے ملا اور جہانگیر نے نہ صرف

اپنی خاندانی وراثت کی حفاظت کی بلکہ اس کو مزید ترقیاں عطا کیں۔

جہانگیر کا اصل نام سلیم تھا جو شیخ سلیم چشتی کے ساتھ اکبر کی عقیدت کی نشانی ہے۔ اکبر خود ان کو شیخو بابا کہتے تھے۔ جہانگیر کی پرورش اور تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ تاہم شہزادگی جہانگیر کو زیادہ راس نہ آئی۔ بری صحبت نے بعض غلط عادتیں ڈال دیں اور غلط مشیروں نے ان کو اپنے باپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ اس کے باوجود اکبر کے پاس جہانگیر کو اپنا جانشین بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے اکبر کی وفات کے بعد وہی بادشاہ بنے۔ جہانگیر کو سب سے پہلا معرکہ خود اپنے بیٹے خسرو کے ساتھ کرنا پڑا۔ خسرو نے جہانگیر کی تخت نشینی کے صرف چھ ماہ بعد بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز کوکہ نے اس کا ساتھ دیا۔ تاہم یہ بغاوت فرو ہو گئی اور کچھ دن کے بعد خسرو کی بھی وفات ہو گئی۔

میواڑ کی فتح

جہانگیر سے قبل اکبر نے بھی میواڑ کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکامی ہوئی۔ جہانگیر نے بھی اس مہم کو اولیت دی اور 1605 میں شہزادہ پرویز کی سرکردگی میں ایک فوج میواڑ روانہ کی، لیکن اس کو کامیابی نہیں ملی۔ اس کے بعد 1608 میں مہابت خاں، 1609 میں عبداللہ خاں کے ذریعہ اس کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس کے بعد شہزادہ خرم، جو بعد میں شاہجہاں کے نام سے مشہور ہوئے، ان کو 1614 میں بھیجا۔ انہوں نے ایک سال کی جنگ کے بعد میواڑ کو فتح کر لیا اور وہاں کے راجا کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔

احمد نگر

1610 میں جہانگیر نے ایک فوج احمد نگر روانہ کی لیکن اس کو وہاں کامیابی نہیں ملی۔ اس لیے 1617 میں شہزادہ خرم کو وہاں بھیجا گیا۔ انہوں نے احمد نگر کو فتح کر لیا اور ملک عنبر کے ساتھ صلح کر لی۔ جہانگیر نے اس فتح کی خوشی میں شہزادہ خرم کا بڑا استقبال کیا اور اس کو شاہجہاں کا خطاب دیا۔ بادشاہ بننے کے بعد انہوں نے اسی خطاب کو شاہی لقب کے طور پر اختیار کیا۔

ملک عنبر نے 1620 میں معاہدہ توڑ دیا اور احمد نگر پر قبضہ کر لیا۔ شہزادہ خرم دوبارہ فوج لے کر گئے اور دوبارہ فتح حاصل کی۔ اس کے بعد بڑی سخت شرائط پر صلح ہوئی اور احمد نگر ریاست کا ایک بڑا حصہ مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

بغاوت

شہزادہ خرم کو لگاتار فتوحات کی وجہ سے پورے ملک پر ایک طرح کا اقتدار حاصل تھا۔ لوگ یہی امید کر رہے تھے کہ جہانگیر کے بعد خرم ہی بادشاہ ہوں گے۔ لیکن یہ بات جہانگیر کی ایک بیوی نور جہاں، جن سے جہانگیر نے 1611 میں شادی کی تھی، ان کو پسند نہیں تھی۔ وہ شہریار کو حکمراں بنانا چاہتی تھی۔ اس وجہ سے خرم نے بغاوت کی۔ یہ بغاوت 1622 میں شروع ہوئی اور اگرچہ درمیان میں شہزادہ خرم نے باپ سے معافی مانگ لی تھی، لیکن 1627 میں جہانگیر کی وفات تک دو محاذ بنے رہے۔ جہانگیر کو آخر عمر میں بہت سے امراض نے گھیر لیا تھا اور سیاہ و سفید کی مالک نور جہاں بن گئی تھیں۔ اس لیے جہانگیر کی زندگی میں ملک کے حالات معمول پر نہیں آسکے۔

آخری عمر میں جہانگیر امراض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے پر فضا مقام کی تلاش میں کشمیر گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے واپسی میں 28 اکتوبر 1627 کو ان کی وفات ہو گئی۔ میت کو لاہور لا کر دفن کیا گیا۔ وہاں مقبرہ جہانگیر اب بھی موجود ہے۔

12.5.1 شخصیت

جہانگیر کی شخصیت بڑی متضاد کیفیات کی حامل تھی۔ وہ بڑے علم دوست اور علماء نواز تھے۔ لیکن ابو الفضل جیسے فاضل کا قتل، قاضی نوراللہ سوشتری کا قتل اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی اسیری کا واقعہ بھی انہی کے دور میں پیش آیا۔ پھر بھی مجموعی طور پر جہانگیر کو بعض صوفیہ سے بڑی عقیدت تھی اور بعض علماء کا بڑا اکرام کرتے تھے۔ خود بھی عالم وفاضل تھے۔ انہوں نے اپنی ڈائری لکھی تھی جو تزک جہانگیری کے نام سے موسوم ہے اور اہم تاریخی معلومات سے پُر ہے۔ عدل انصاف عہد جہانگیری کا خصوصی امتیاز ہے، بلکہ 'عدل جہانگیری' کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے، انہوں نے قلعہ کے باہر ایک زنجیر لٹکا دی تھی۔ کوئی بھی فریادی اس کو کھینچ کر بادشاہ سے براہ راست انصاف حاصل کر سکتا تھا۔ عدل وانصاف کے علاوہ فنون لطیفہ اور مصوری میں بھی اس دور میں بڑی ترقی ہوئی۔

12.6 شاہجہاں(1658-1627)

شہزادہ خرم کو سلطان جہانگیر نے شاہجہاں کا خطاب دیا تھا۔ وہ اسی نام سے اپنے باپ کی وفات کے بعد 7621 میں بادشاہ بنے۔ شاہجہاں نے ایک وسیع وعریض ملک اور ایک طاقتور فوج وراثت میں پائی۔ شاہجہاں کے مخالف بھی زیادہ نہیں تھے۔ سب سے بڑی مخالف نور جہاں تھیں لیکن نور جہاں کے بھائی اور شاہجہاں کے سسر آصف خاں دل وجان سے ساتھ تھے اور انہوں نے اپنی بہن نور جہاں کو جیل میں بھی ڈال دیا تھا۔ اس لیے شاہجہاں بآسانی تخت نشین ہو گئے۔

شاہجہاں کے بارے میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے اندر فوجی قابلیت بہت تھی۔ انہوں نے ایام شہزادگی میں کئی اہم معرکے سر کیے تھے۔ بادشاہ بننے کے بعد جو مشکلات آئیں ان کو بھی حسن تدبیر سے ختم کر دیا۔ شہزادہ شہریار کے ساتھ اقتدار کی جنگ جیتنے کے بعد ان کو مختلف بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے گوالیار کے راجا جھنجھار سنگھ کی بغاوت کا استیصال کیا، پھر 1629 میں خان جہاں لودھی بھاگ کر دکن چلے گئے، ان کو سزا دینے کے لیے شاہجہاں رنتھمبور ہوتے ہوئے دکن کی طرف چلے۔ برہان پور کے قیام کے دوران شاہجہاں کی چہیتی بیوی ممتاز محل کا انتقال ہو گیا۔ ان کی یاد میں شاہجہاں نے 'تاج محل' جیسی بے مثال عمارت تعمیر کی۔

احمد نگر کی تسخیر

خان جہاں لودھی کی وجہ سے شاہجہاں کی دکن مہم کا آغاز ہوا۔ 1632 میں انہوں نے دولت آباد کو فتح کر لیا تھا۔ 1636 میں احمد نگر کی ریاست ختم کر دی گئی اور یہ ریاست مغل سلطنت کا حصہ بن گئی۔ اس کے بعد دکن کی دیگر دو ریاستوں بیجاپور اور گولکنڈہ نے اطاعت قبول کر لی۔

پرتگالیوں کا استیصال

ہندوستان کے مختلف حکمرانوں اور مغلوں نے بھی مغربی اقوام کو بڑی مراعات دیں تھیں۔ وہ یہاں تجارت کرتے تھے لیکن ان کی نگاہیں تجارت کے پردے میں سیاست اور لوٹ مار پر بھی تھی۔ پرتگالی بھی یہی کرتے تھے۔ سمندر میں تو بلا روک ٹوک لوٹ پاٹ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ہندوستانی حاجیوں کو بھی لوٹ لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے شاہی قافلے کو بھی لوٹ لیا تھا۔ پرتگالیوں کی ان حرکات سے ناراض ہو کر شاہجہاں نے ان کے خلاف فوجی مہم بھیجی۔ تقریباً دو سال کی جنگ کے بعد پرتگالیوں کو دیس سے نکال دیا گیا اور ہبلی کی بندرگاہ پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

12.6.1 قندھار

قندھار شروع سے ہی مغل حکومت کے ماتحت تھا۔ لیکن کچھ تو مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے اور کچھ علاقے کی وجہ سے نیم مختار اور بعد میں صفوی حکمرانوں کی مدد سے ایران کا حصہ بن گیا۔ ایران کی طرف سے مردان علی خاں قندھار کے حاکم تھے۔ انہوں نے قندھار شاہجہاں کے سپرد کر دیا اور خود آگرہ آگئے۔ صفوی بادشاہ نے قندھار کو واپس لینے کی کوشش شروع کر دی۔ اس لیے شاہجہاں نے خود کابل کا سفر کیا اور تقریباً چار ماہ وہاں رہ کر ایران کے حملوں کی روک تھام کی۔ قندھار عارضی طور پر مغلوں کو مل گیا تھا لیکن شاہ عباس دوم نے تقریباً 15 سال بعد دوبارہ قندھار پر قبضہ کر لیا۔ شاہجہاں نے اس کو واپس لینے کی بہت کوشش کی۔ خود بھی کابل کا سفر کیا، شہزادہ مراد بخش، دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی قیادت میں قندھار پر حملے کیے گئے، لیکن نتیجہ یہی نکلا کہ ہر جنگ نے مغلوں کی فوج اور اثاثوں کے نقصان میں اضافہ ہی کیا اور مغلوں کو ہمیشہ کے لیے قندھار سے دستبردار ہونا پڑا۔

اولاد کے درمیان جنگ

1658 میں شاہجہاں بیمار ہو گئے اور اس بیماری کی شہرت اتنی زیادہ ہوئی کہ اس کو لوگوں نے مرض الوفات مان لیا۔ اس وہم میں مغل شہزادوں کے درمیان تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ دارا شکوہ، مراد بخش، اورنگ زیب اور شاہ شجاع نے اپنی اپنی بساط جمائی۔ کئی جنگیں ہوئیں۔ دارا شکوہ کی طرف سے مرزا سلیمان شکوہ نے بھی جنگیں کیں، لیکن فیصلہ کن جنگ دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان ہوئی۔ اس میں دارا شکوہ کو شکست ہوئی۔ اورنگ زیب نے اپنے والد کو معزول کر کے تخت حکومت پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں دارا شکوہ بھی مارا گیا۔

شاہجہاں کے آخری اوقات لال قلعہ (آگرہ) کے اندر بسر ہوئے۔ اگرچہ ان کے سابقہ معمولات زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، تاہم حکومت سے بالکل کنارہ کش ہو گئے۔ عہد شاہجہانی کے ایک بڑے مورخ محمد صالح کمبوہ نے ایک اہم کتاب 'عمل صالح' لکھی ہے۔ اس میں شاہجہانی عہد کے چشم دید واقعات ہیں۔ انہوں نے معزولی سے وفات تک کے احوال بھی لکھے ہیں۔ اس معزولی کے دوران 27 جنوری 1660 کو ان کی وفات ہو گئی۔

12.6.2 شاہجہاں کی شخصیت

شاہجہاں مغل عہد کے ممتاز ترین حکمرانوں میں سے ہیں۔ انہوں نے مغل عہد کو تعمیر و ترقی، خوشحالی اور فراوانی کی انتہاؤں تک پہنچایا۔ شاہجہاں کے دور کو اس لیے مغل عہد کا سنہرا دور کہا جاتا ہے کہ اس دور میں مختلف میدانوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ خاص طور پر فن تعمیر کے بے مثال نمونے اس عہد میں تعمیر ہوئے۔ تاج محل جو دنیا کی انتہائی خوبصورت عمارت مانی جاتی ہے، اس کو شاہجہاں نے تعمیر کیا۔ اس کے علاوہ جامع مسجد دہلی، لال قلعہ دہلی، پورا شاہجہان آباد اور ملک کے مختلف علاقوں میں بنی ہوئی متعدد عمارات ان کے عہد کی یادگار ہیں۔ تعمیرات کے علاوہ فنون لطیفہ، خطاطی، مصوری اور موسیقی جیسے فنون میں بھی بہت ترقی ہوئی۔

12.7 محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (1707-1658)

اورنگ زیب ان کا اصلی نام تھا۔ ممتاز محل اور شاہجہاں کے بیٹے تھے۔ بچپن سے ہی بہت بہادر، دیندار، علم دوست اور سادگی پسند تھے۔ شاہجہاں کے دور میں انہوں نے متعدد اہم معرکے سر کیے، جن کی وجہ سے ان کی شہرت ہوگئی اور اس کی فوجی قابلیت کو لوگ تسلیم کرنے لگے۔ 1658 میں جب دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان ساموگڑھ میں جنگ ہوئی تو اس جنگ میں اورنگ زیب کی مہارت کام آئی اور دارا شکوہ کو شکست ہوگئی۔ اس جنگ سے یہ بھی طے ہوگیا کہ اب اورنگ زیب ہی مغل سلطنت کے بادشاہ ہوں گے۔

دارا شکوہ نے بعد میں کافی کوشش کی کہ وہ کہیں جم کر اورنگ زیب کے خلاف تیاری کر سکے، لیکن آخر کار وہ قید ہوگئے اور دہلی میں ان کو قتل کر دیا گیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اورنگ زیب نے توسیع سلطنت پر توجہ دی۔ اس کے ساتھ سلطنت کے استحکام، مالیات کے نظام، قانون اور انتظامیہ کو بہتر کرنے کی کوشش کی۔

توسیع

اورنگ زیب کی توسیع پسند پالیسی عمر بھر جاری رہی۔ 1663 میں انہوں نے لداخ کو اپنی حکومت کا حصہ بنایا۔ 1664 میں بنگال کی حکومت شائستہ خاں کو بخشی۔ اس نے پرتگالی قزاقوں کا استیصال کیا اور چٹاگانگ کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ 1685 میں بیجاپور کی تسخیر کے لیے اپنے بیٹے اعظم شاہ کو بھیجا۔ ایک سال جنگ چلی لیکن فیصلہ نہ ہوا تو خود بھی بیٹے کی امداد کو پہنچ گئے اور آٹھ دن کی جنگ کے بعد بیجاپور پر قبضہ کر لیا۔ اگلے سال گولکنڈہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح جنوب کی دونوں ریاستیں مغل سلطنت کا حصہ بن گئیں اور تبت سے لے کر کنیا کماری کی سرحدوں تک پورا ملک ایک ہی بادشاہ کے تحت آگیا۔

انگریز پالیسی

اورنگ زیب کے زمانے میں برطانیہ، فرانس، پرتگال اور روس سے بہت سے تجارتی وفود ہندوستان آئے۔ ان میں سے کچھ کے عزائم سیاسی بھی تھے اور انگریز و پرتگالی توباضابطہ قزاقی بھی کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے بہتوں کو تجارتی مراعات دیں اور بعض قوموں کے معاملات میں سختی بھی برتی۔ 1686 سے 1690 کے درمیان انگریز کمپنی جو قزاقی کرتی تھی اس کو سزا دینے کے لیے جنگ کی۔ آخر کار کمپنی

کو معافی مانگنی پڑی۔ 1695 میں ایک برطانوی قزاق نے سورت کے قریب مغلوں کے ایک حاجیوں کے کارواں کو لوٹ لیا۔ اس کی پاداش میں انگریزوں کو بھاری معاوضہ دینا پڑا۔ 1667 میں فرانس کی حکومت کی درخواست پر سورت میں ایک کمپنی کھولنے کی اجازت دی۔ 1696 میں روس کا سفیر آیا، اورنگ زیب نے اس کا استقبال اور اس کو تجارتی مراعات عطا کیں۔

عالمی تعلقات

اورنگ زیب نے اس وقت دنیا کے بہت سے ملکوں سے تعلقات قائم کیے۔ ترکی میں خلیفہ کے ساتھ ان کا رابطہ تھا لیکن وہ ایک حد تک سرد مہری کا رویہ تھا۔ شریف مکہ سے بھی اورنگ زیب کے تعلقات تھے۔ حبشہ سے بھی انہوں نے دوستانہ روابط رکھے۔ مالدیپ کے بادشاہ نے اورنگ زیب سے مدد کی درخواست کی تھی لیکن شاید وہ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغلوں کے پاس بحری فوج کی کمی تھی۔

بغاوتیں

اورنگ زیب نے تقریباً 50 سال حکومت کی۔ ان کے زمانے میں کئی بغاوتیں ہوئیں۔ جیسے بھرت پور کے جاٹوں کی بغاوت، مراٹھوں اور شیواجی کے ساتھ جنگ، سکھوں کے ساتھ مقابلہ، ستنامی بغاوت، پختونوں کی بغاوت وغیرہ۔ اورنگ زیب اگرچہ ان تمام جنگوں میں کامیاب رہے، تاہم ان کے ذریعے مغل سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں اور اس کے بعد مغل سلطنت بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی۔

اورنگ زیب نے تقریباً 90 سال عمر پائی۔ آخر عمر میں وہ کمزور ہو گئے تھے۔ 3 مارچ 1707 کو احمد نگر میں ان کی وفات ہو گئی۔

12.7.1 شخصیت

اورنگ زیب عالمگیر دنیا کے بڑے بادشاہوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک وسیع و عریض ملک پر کم و بیش پچاس سال حکومت کی۔ ان کے زمانے میں ہندوستان کے اندر بڑی ترقی بھی ہوئی۔ دنیا کے بہت سے ملکوں سے تعلقات استوار ہوئے۔ ان کے زمانے میں ہندوستان دنیا کا سب سے امیر ملک بن گیا۔ ان کے زمانے میں علم و ادب میں بھی بہت ترقی ہوئی۔ اسلامی قانون کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری ان کے زمانے میں لکھی گئی۔ اورنگ زیب نے مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں خاص طور پر ہندو مذہب کے مٹھوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ مجموعی طور پر اورنگ زیب کا دور پرامن رہا اور اس میں ملک نے بہت ترقی کی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان کی سرحدیں سب سے وسیع تھیں۔ لیکن اس کے بعد بتدریج مغل بادشاہوں کے اختیارات محدود ہونے لگے۔ 1764 میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کا اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ بہت سی دیسی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اس دور زوال میں تقریباً 12 مغل بادشاہ ہوئے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

محمد اعظم شاہ : 1707

بہادر شاہ اول	:	1712–1707
جہاں دار شاہ	:	1713–1712
فرخ سیر	:	1719–1713
رفیع الدرجات	:	1719
شاہجہان ثانی	:	1719
محمد شاہ	:	1748–1719
احمد شاہ بہادر	:	1754–1748
عالمگیر ثانی	:	1759–1754
شاہ عالم ثانی	:	1806–1760
اکبر شاہ ثانی	:	1837–1806
بہادر شاہ ظفر	:	1857–1837

12.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مغل سلطنت ہندوستان کی، بلکہ دنیا کی ایک عظیم سلطنت ہے۔ یہ سلطنت 300 سال سے زیادہ قائم رہی۔ سلطان ظہیر الدین محمد بابر نے اس کو قائم کیا اور اس کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہوئے۔ اس سلطنت میں مجموعی طور پر 18 بادشاہوں نے حکومت کی، جن میں سے چھ بڑے بادشاہ ہیں اور باقی نسبتاً کمزور مانے جاتے ہیں۔ بابر نے کابل سے قنوج تک ایک حکومت قائم کی اس کے بعد اس کے بیٹے ہمایوں نے اس کو مزید وسعت دی لیکن شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد اس کو ایران جانا پڑا۔
- 15 سال کے بعد ہمایوں واپس آیا اور اس نے دہلی فتح کی اس کے بعد اکبر بادشاہ بنا۔ اکبر کے دور میں اس حکومت کو مزید استحکام ملا۔ اس حکومت کی سرحدوں میں مزید وسعت ہوئی اور یہ شمالی ہند کی سب سے بڑی حکومت بن گئی۔ بابر کے بعد جہانگیر نے اس کو مزید وسعت دی اور استحکام بخشا۔ جہانگیر کے بعد شاہجہاں بادشاہ بنا اس کے دور میں مغلیہ سلطنت کی بنیادیں مزید مضبوط ہوئیں اور نظام حکومت کو بھی استحکام ملا اور نظام عدل بہتر ہوا۔ اس دور میں تعمیرات کے اندر بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔
- شاہجہاں کے بعد حکومت اورنگ زیب کو ملی اس نے مغلیہ سلطنت کی سرحدوں کو مزید وسعت بخشی اور متحدہ ہندستان وجود میں آیا۔ اورنگ زیب نے کم و بیش پچاس سال حکومت کی لیکن ان کی وفات کے بعد حکومت کو بتدریج زوال آگیا اور رفتہ رفتہ تقریبا

150 سال کے طویل دورانیے میں یہ حکومت ختم ہو گئی۔

- مغل سلطنت کے ہندوستان کی تاریخ، ثقافت، علم و ادب، فنون، تعمیرات، مصوری، خطاطی اور نظم مملکت پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مغلوں نے مذہبی رواداری کا بھی مناسب ماحول پیدا کیا۔ اکبر، شاہجہاں اور داراشکوہ نے ہندو مذہب کے وسیع مطالعے کی بنیاد رکھی۔ اورنگ زیب نے مندروں اور مٹھوں کو بڑے پیمانے پر جاگیریں دیں۔

12.9 نمونہ امتحانی سوالات

12.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مغلیہ سلطنت کے بانی تھے؟

(a). بابر (b). ہمایوں (c). اکبر (d). شیر شاہ

2. پانی پت کی پہلی جنگ کب ہوئی تھی؟

(a). 1520ء (b). 1526ء (c). 1530ء (d). 1528ء

3. راجا خان میواتی کہاں شہید ہوئے؟

(a). چوسا کی جنگ میں (b). پانی پت میں (c). دہلی میں (d). خانوا کی جنگ میں

4. دہلی کی جامع مسجد کس بادشاہ نے بنوائی؟

(a). شاہجہاں (b). جہانگیر (c). اورنگ زیب (d). بابر

5. دہلی کی جامع مسجد کس بادشاہ نے بنوائی؟

(A). شاہجہاں (b). جہانگیر (c). اورنگ زیب (d). بابر

6. فتحپور سیکری کس بادشاہ نے تعمیر کروائی تھی؟

(a). جہانگیر (b). شاہجہاں (c). اکبر (d). ہمایوں

7. اکبر باشاہ کی والدہ کا نام کیا تھا؟

(a). حمیدہ بانو (b). گلبدن بانو (c). نور جہاں (d). جہاں آرا

8. دہلی کی حکومت حاصل کرنے میں کس غیر ملکی بادشاہ نے اس کی فوجی مدد کی تھی؟

(a). یمن (b). ایران (c). ترکی (d). احمد نگر

9. نور جہاں کون تھیں؟

(a). اکبر کی بیوی (b). اورنگ زیب کی والدہ (c). جہانگیر کی بیوی (d). بابر کی بیٹی

10. داراشکوہ اور اورنگ زیب کی فیصلہ کن جنگ کس میدان میں ہوئی؟

(a). ساموگڑھ (b). چوسا (c). قندھار (d). گول کنڈہ

12.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے قیام کے اسباب بیان کیجیے۔
2. ہمایوں نے ہندستان کی حکومت دوبارہ کیسے حاصل کی۔ بیان کیجیے۔
3. عہد اکبری کی خدمات بیان کیجیے۔
4. بابر کی شخصیت کا تعارف کرائیے۔
5. شاہجہاں کے عہد میں ہوئے تعمیری کاموں کا تعارف کیجیے۔

12.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ہندستان میں مغل حکومت کے قیام اور استحکام پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
2. اورنگ زیب کی خدمات اور پالیسیوں کا تعارف کیجیے۔
3. مغلوں نے ہندستان کو کیا دیا؟ تفصیل سے بتائیے۔

12.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: (حصہ دوم) : ثروت صولت مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی
2. رود کوثر : شیخ اکرام
3. بزم تیموریہ : صباح الدین عبد الرحمن
4. تزک بابری : سلطان ظہیر الدین محمد بابر
5. مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال : آر۔ پی۔ ترپاٹھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
6. منتخب التواریخ : عبد القادر بدیوانی
7. آئین اکبری : ابو الفضل

اکائی 13:   مغل حکومت (اہم حکمراں-1)

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید

13.1 مقصد

13.2 مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر (1430-1530ء)

13.2.1 ظہیر الدین محمد بابر کے شخصی اوصاف

13.2.2 ظہیر الدین محمد بابر کی آمد کے وقت ہندوستان کے سیاسی حالات

13.2.3 ظہیر الدین محمد بابر کی جنگی مہمات اور فتوحات

13.2.4 ظہیر الدین محمد بابر اور علم وادب نوازی کا شوق

13.3 نصیر الدین محمد ہمایوں (1508۔1556ء)

13.3.1 نصیر الدین محمد ہمایوں کی جنگی مہمات اور فتوحات

13.3.2 ہمایوں کا مقبرہ

13.3.3 ہمایوں نامہ

13.4 جلال الدین محمد اکبر (1542ء۔1605ء)

13.4.1 جلال الدین محمد اکبر کی جنگی مہمات اور فتوحات

13.4.2 جلال الدین محمد اکبر کا نظم ونسق

13.4.3 جلال الدین محمد اکبر اور سماجی اصلاحات

13.4.4 جلال الدین محمد اکبر کا دین الٰہی

13.5 اکتسابی نتائج

13.6 نمونہ امتحانی سوالات

13.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

ہندوستانی تاریخ کے شاندار باب کا آغاز بابر کی آمد سے شروع ہوتا ہے جس نے ابراہیم لودھی (1480-1526ء) کے چچا عالم خان لودھی (جو علاء الدین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) اور پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی کی درخواست پر ہندوستان پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ سولہویں صدی کے نصف آخر سے مغلوں نے آگرہ اور دہلی میں اپنی سلطنت کو وسعت دینا شروع کیا اور سترہویں صدی تک مغلوں نے تقریباً تمام برصغیر پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ ازبکستان کے تیموری خاندان کے سردار ظہیر الدین محمد بابر نے پانی پت کی پہلی جنگ میں دہلی سلطنت کے آخری حکمراں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دی اور 1526ء میں پورے برصغیر یعنی ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور بنگلہ دیش پر حکومت کرنے والی مسلم سلطنت یعنی سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ڈالی اور بابر نے چار سال یعنی 1530ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد ڈالنے سے پہلے بابر نے 1505ء اور 1519ء میں بھی ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کی غرض حملہ آور ہوتا تھا لیکن ناکام رہا۔ مغلوں نے ہندوستان پر 1526ء سے لیکر 1707ء تک حکومت کی۔ ایک سو اکیاسی (181) سالوں میں مغلوں نے ہندوستانی تہذیب پر اپنے انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں اور ہندوستانی ثقافت کی تشکیل نو میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مغل حکمرانوں نے اپنے لیے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اگرچہ مغل حکمراں اکبر نے دین الٰہی کو رائج کرنے کی کوشش کی لیکن عموماً مغل سلطنت کا سرکاری مذہب اسلام رہا۔ ابتدائی دور میں فارسی مغل سلطنت کی دفتری زبان رہی لیکن اُردو زبان معرض وجود میں آنے کے بعد یہی سرکاری زبان قرار پائی۔ مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کے مختلف خیالات و نظریات اور پالیسی واہداف نے ہندوستانی تاریخ پر دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں۔

13.1 مقصد

- اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ ظہیر الدین محمد بابر کے شخصی اوصاف سے واقف ہوں گے۔
- اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کو ظہیر الدین محمد بابر کی جنگی مہمات و فتوحات کا علم ہوگا۔
- اس اکائی کو پڑھنے سے آپ کو سوریوں کے ہاتھوں نصیر الدین محمد ہمایوں کی شکست کے اسباب و علل پر بحث کریں گے۔
- اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ کو جلال الدین محمد اکبر کے نظم و نسق کا جائزہ لیں گے۔
- اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ قیام دین الٰہی کے پس منظر پر گفتگو کر سکیں گے۔

13.2 مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر (1430-1530ء)

بابر کی پیدائش 1483ء میں اندجان، فرغانہ (ازبکستان) میں ہوئی۔ بابر کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی طرف سے چنگیز خان سے ملتا ہے۔ ہفت پہلو و متوازن شخصیت کا حامل ظہیر الدین محمد بابر انسانی نفسیات کو پرکھنے اور امور حرب میں بہت زیادہ مہارت رکھنے کے باوصف ایشیاء کا سب سے مقبول و معروف شہزادہ تھا۔ ماں اسے پیار سے بابر (شیر) کہتی تھی۔ بابر کی ابتدائی زندگی انتہائی مشکلات میں گزری ہے۔ 1494ء میں جب بابر والد عمر شیخ مرزا کے انتقال کے بعد تخت پر بیٹھا تو اس وقت اس کی عمر محض 12 سال تھی۔ تخت پر بیٹھا ہی تھا کہ ماموں نے شورش پیدا کر دی اور چچا نے چڑھائی کر دی۔ شدید خانہ جنگی کے حالات میں نوعمر بابر کے لیے فرغانہ کی چھوٹی ریاست کی حفاظت کرنا ناممکن تھا۔ منگول گروپ ازبکوں کے حملے کے باعث آبائی تخت چھوڑنے پر بابر مجبور ہوا۔ نتیجتاً بابر کے ہاتھ سے فرغانہ سمیت دوسرے علاقے چھن گئے مگر ترکستان کے بعض خانہ بدوش سردار اور ان کی رعایا بابر کو بدستور اپنا بادشاہ تسلیم کرتے رہے۔ بابر اپنی زندگی کے مشکل ترین دنوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ہی مرتبہ "تزک بابری" میں لکھتا ہے "اس وقت دل بہت پریشان ہوا، سوچا کہ یہ کیا زندگی ہے۔ پہاڑوں سے سر پھوڑنے سے آخر کیا حاصل نہ گھر ہی پاس ہے نہ کوئی قلمرو پاس رکھتا ہوں اور نہ کوئی سکھ چین ہی نصیب ہے"۔

13.2.1 ظہیر الدین محمد بابر کے شخصی اوصاف

بابر ایک پرکشش انسان، اعلیٰ درجہ کا دانشمند تھا لیکن اسے نہ انتظامی امور میں کوئی مہارت حاصل تھی اور نہ انتظامیہ میں اصلاحات لانے کی کوئی فکر۔ وہ اکثر ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کو اپنے رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کر کے ان صوبوں کے انتظامی امور بھی ان کے سپرد کر دیا کرتا تھا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق "سخاوت اور مروت بابر کی سرشت میں داخل تھی، اس کے نوکروں نے بار بار اس کے ساتھ بے وفائیاں کیں، بلکہ بعض مرتبہ اس کی جان کے درپے بھی ہوئے لیکن اس صاحب مروت تاج دار نے ان پر قابو پا کر بھی ان سے بدلہ نہ لیا بلکہ ان کو انعام و احسان سے مالامال فرمایا"۔ معاشی انتظامیہ کے معاملات میں اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ خالی خزانے بابر کے بیٹے ہمایوں کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ بابر کو عوام کی فلاح و بہبود کے امور سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ہندوستان کو ضرور فتح کر لیا تھا لیکن ہندوستانی عوام کے دلوں میں اپنا مقام بنانے میں ناکام رہا یہی وجہ ہے کہ جس سلطنت کی اس نے بنا رکھی تھی وہ ناپائیدار تھی۔ اگر بابر مضبوط و مستحکم بنیاد پر مغل سلطنت کی بنیاد رکھتا تو اس کے بیٹے ہمایوں کو ہندوستان سے راہ فرار اختیار نہ کرنی پڑتی۔

بابر عظیم فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا فنکار اور عظیم ادیب و شاعر بھی تھا۔ چغتائی ترکی زبان میں بابر شعر و شاعری کیا کرتا تھا۔ تاریخ فرشتہ میں ہے "بابر علم موسیقی، شاعری، املا اور انشاء میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، بابر نے اپنے عہد حکومت کے واقعات ایسی شستہ اور فصیح ترکی زبان میں لکھے ہیں کہ اس زبان کے بڑے بڑے ماہرین نے اس کی انشاء پردازی کا لوہا مانا ہے"۔ علاوہ ازیں بابر ہند کی سیاسی و تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ نباتات، حیوانات اور ہندوستان کی مختلف اشیاء سے متعلق تفصیلات حاصل کرنے میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ ظہیر الدین محمد بابر کا انتقال 26 دسمبر 1530ء کو بعمر 47 سال 10 ماہ ہوا۔ وفات سے قبل بابر نے شہزادہ نصیر الدین محمد ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر

کیا۔ بابر کی وصیت کے مطابق اس کے جسد خاکی کو کابل میں پیوند خاک کر دیا گیا۔ بابر کا مقبرہ افغانستان کے دار الحکومت کابل شہر کے مضافات میں واقع ''باغِ بابر'' میں واقع ہے۔

13.2.2 ظہیر الدین محمد بابر کی آمد کے وقت ہندوستان کے سیاسی حالات

جس وقت بابر ہندوستان پر فتح حاصل کی اس وقت ہندوستان بے شمار چھوٹی اور آزاد ریاستوں میں منقسم تھا۔ جن میں مسلمانوں کی پانچ اور ہندوؤں کی دو اہم ریاستیں بھی شامل تھیں۔ ان ریاستوں کے علاوہ دیگر ریاستیں بھی ہندوستانی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود کوئی ایسی مرکزی طاقت نہیں تھی جو ان ریاستوں کو بیرونی حملہ سے محفوظ رکھ سکے۔ متحارب طاقتوں کے درمیان سیاسی بالادستی کے لیے جدوجہد جاری تھی جس کے باعث ہر طرف افراتفری، تناؤ کا ماحول تھا اور سماجی و سیاسی حالات انتہائی غیر مستحکم تھے۔ 1526ء میں محمد بن تغلق کی موت کے ساتھ دہلی سلطنت کا زوال شروع ہوا جس کے باعث شمالی ہندوستان میں بے اطمینانی اور اضطرابی کیفیات پائی جاتی تھیں۔ جنوبی ہند کے سیاسی حالات بھی ابتری کا شکار تھے۔ بہمنی سلطنت پانچ چھوٹی سلطنتوں (احمد نگر کی نظام شاہی، برار کی عماد شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی، بیدر کی برید شاہی، اور گولکنڈہ کی قطب شاہی) میں بٹ چکی تھی۔ وجے نگر کی ہندو سلطنت کرشنا دیورائے کے ماتحت تھی جسے صرف دکن کی سیاست میں دلچسپی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ ملک سیاسی طور پر زوال کا شکار ہو چکا ہے۔ بابر کے لیے یہ غیر مستحکم سیاسی حالات ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے انتہائی سازگار ثابت ہوئے۔ بابر نے اس زریں موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور ہندوستان پر حملہ کر کے مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت ہندوستان میں کوئی ایسا طاقتور حکمران نہیں تھا جو بابر کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔

13.2.3 ظہیر الدین محمد بابر کی جنگی مہمات اور فتوحات

وسط ایشیاء میں اپنے آبائی علاقوں کو کھونے، پے در پے ناکامیوں اور دگرگوں حالات سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر اس نے جنوب کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا اور طویل جدوجہد کے بعد اپنے مخالفین اور دشمنوں کو شکست دیتے ہوئے ظہیر الدین محمد بابر نے پہلے افغانستان کا رخ کیا اور 1504ء میں بلخ، کابل اور 1511ء میں قندھار کا علاقہ فتح کیا۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان جیسے وسیع ملک کا رخ کیا۔ 1524ء میں لاہور اور پھر 1525ء میں پنجاب کو دوبارہ حاصل کیا۔ 1517ء میں سکندر لودھی کی وفات کے بعد اس کا نالائق بیٹا ابراہیم لودھی دہلی سلطنت کا وارث بنا۔ اس کی غلط حکمرانی اور متکبرانہ رویے کے باعث اس کے رشتہ داروں اس سے دور ہو گیے تھے اور اس کی حکومت دہلی، آگرہ، دوآب، جونپور، بہار، بیانہ اور چندھیری کے کچھ حصوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ 1526ء میں پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ میں بابر نے ہندوستان میں پہلی دفعہ توپ سے بارود نکالنے والی ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے ابراہیم لودھی اور اس کے افغان حامیوں کو شکست دی اور فاتح کی حیثیت سے آگرہ پھر گوالیار میں داخل ہوا۔ اس طرح ذہین و فطین بابر نے انتہائی نازک ترین حالات میں مٹھی بھر سپاہیوں کے ذریعہ ہندوستان میں سب سے بڑی، بے نظیر اور سب سے زیادہ لمبے عرصے تک حکومت کرنے والی سلطنت 'مغلیہ سلطنت' کی 1526ء میں بنیاد ڈالی اس وقت بابر کی عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ بابر 1519ء تا سن 1525ء میں ہندوستان کو فتح کرنے کو شش کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ مغل سلطنت کے پاس زمانہ عروج میں دنیا کی ایک چوتھائی سے زیادہ دولت تھی۔ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے

بعد بابر تیسرا ایسا حملہ آور تھا جس نے ہندوستان پر حکومت قائم کی۔ بابر ان تین حملہ آوروں میں اس حوالے سے ممتاز ہے کہ بابر نے بارہ ہزار نفوس پر مشتمل فوج کے ساتھ ابراہیم لودھی کو شکست دی جس کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ دہلی میں مغلیہ سلطنت قائم کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اندرونی مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دی اور محلاتی سازشوں اور بغاوتوں کو کچلنے میں کامیابی حاصل کی۔ 1527ء میں رانا سانگا راجپوت حکمرانوں اور ان کے اتحادیوں کو شکست دی۔ 1528ء میں بابر نے راجپوتوں کو چندھیری میں شکست دی۔

شمال مغربی ہندوستان کی فتح اور پانی پت میں سخت گیر پٹھان بادشاہ ابراہم لودھی کی بابر کے ہاتھوں شکست نے نہ صرف بابر کو شمالی ہندوستان کا بادشاہ بنادیا تھا بلکہ ان فتوحات سے اس کے لیے ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کے امکانات کافی روشن ہو چکے تھے لیکن اس کے بھائیوں کی دشمنی، اور اس کے دو حریف یعنی افغان اور راجپوت بابر کے لیے ہندوستان میں مزید پیش رفت کرنے اور قدم جمانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ بابر کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان دو مضبوط طاقتوں میں پہلے کس سے نمٹا جائے؟ اس مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لیے بابر نے آگرہ میں جنگی کونسل کی میٹنگ منعقد کی۔ کونسل نے اسے مشورہ دیا کہ وہ پہلے افغانی خطرے سے نمٹے چونکہ یہ اس وقت راجپوتوں کی جارحیت سے زیادہ خطرناک تھا۔ لیکن چتوڑ (اودے پور) کے مشہور راجپوت رانا سانگا (جس کا اصلی نام رانا سنگرام سنگھ تھا) کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مد نظر رکھتے ہوئے بابر نے کونسل کی رائے کے خلاف سانگا کے خلاف مہم کا آغاز کیا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے بھی بابر کو ہندوستان پر حملہ کے لیے مدعو کیا تھا۔ رانا سانگا کو یہ گمان تھا کہ بابر اپنے جد امجد امیر تیمور کی طرح دہلی فتح کرکے واپس چلا جائے گا اور ہندوستان میں راجپوتوں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ لیکن جب پانی پت کی جنگ کے بعد بابر واپس نہیں گیا تو رانا سانگا نے ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کو ہندوستان کا حاکم بنادیا۔ بابر کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ بغیر کسی وجہ کے جنگ کو بھڑکانا سیاسی اصولوں کے مغائر ہے اسی لیے بابر نے سانگا پر معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کا الزام لگایا کہ اس نے پانی پت میں ابراہیم لودھی کے خلاف جنگ میں بابر کا ساتھ نہیں دیا جو سراسر دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ رانا سانگا کی فوج کی عددی برتری کے باوجود عظیم جرنیل بابر نے بہترین حکمت عملی سے رانا سانگھا کو کنواہیہ کے مقام پر مارچ 1527ء میں لڑی گئی جنگ میں شکست فاش دی اور رانا سانگا کو اس جنگ میں میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور چند روز کے بعد رانا سانگا کا انتقال ہو گیا۔ اس فتح کی خوشی میں اس میدان کا نام فتح پور سیکری رکھا گیا۔

13.2.4 ظہیر الدین محمد بابر اور علم و ادب نوازی کا شوق

ظہیر الدین محمد بابر علم و ادب سے بے انتہاء شغف باوصف بلند پایہ اہل قلم میں شمار ہوتا تھا جسے عربی، فارسی، ترکی، ہندی، زبانوں پر کامل دسترس حاصل تھی اور وہ شاعر شیریں کلام تھا۔ خمسہٴ نظامی، خمسہٴ خسروی، مثنوی جلال الدین رومی ہمیشہ اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ بابر کو موسیقی، مصوری، باغبانی اور تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ بابر نامہ یا تزک بابری یا وقائع بابری ظہیر الدین محمد بابر کی خود نوشت سوانح عمری اور شاہکار تصنیف ہے جو ہمیشہ ادبی حلقوں میں ممتاز شناخت کی حامل رہی ہے۔ اس تصنیف نے بابر کو بے نظیر مصنفوں کے صفوں میں شامل کر دیا۔ معتبر و مستند کتاب تزک بابری میں بابر نے اپنی کمزوریوں، غلطیوں، اور شکستوں کو بچپن سے لیکر زندگی کے آخری سالوں

تک اپنی آپ بیتی بیان کی ہے۔ واضح باد کہ وقائع بابری ظہیر الدین بابر کی مکمل زندگی کو محیط نہیں بلکہ اس میں صرف اس کے اٹھارہ (18) سالوں کی جہد وجہد کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں 1503ء تا1504ء، 1508ء تا1519ء اور 1520 تا1525ء تک کے واقعات درج نہیں ہے۔ اس خلا کو مسز بیوریج نے اپنے انگریزی ترجمہ میں معاصر تاریخی کتب کی مدد سے پر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ موصوفہ نے اپنے انگریزی ترجمہ میں قیمتی حواشی درج کیے ہیں جس سے قارئین کو واقعات اور اس کے پس منظر کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ تزک بابری کے بہت سارے اوراق حوادثات زمانہ کے نذر ہوگئے۔ اس شاہکار تصنیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر عظیم جنگجو ہونے کے علاوہ بہترین شاعر، ماہر عروض اور جغرافیہ داں تھا۔ بابر نامہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ بابر نے کسی مذہبی ڈھانچے یا عبادت گاہ کو منہدم نہیں کیا۔ ظہیر الدین محمد بابر نے اس آپ بیتی کو اپنی مادری زبان چغتائی ترکی میں مرتب کیا ہے۔ اس روزنامچہ کو بہت شہرت ملی۔ یہ ڈائری سادہ، سلیس، عام فہم اسلوب اور ادبی چاشنی سے مملو ہونے کے باعث دنیا کے بہترین علمی و تاریخی سرمایوں میں شمار ہوتی ہے۔ شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر 1589ء میں عبدالرحیم خان خاناں نے اس کو سب سے پہلے فارسی زبان میں ترجمہ کیا جو اُس وقت مغل دربار کی سرکاری زبان تھی۔ 19 ویں صدی کے بعد اس کتاب کے تراجم دنیا کی مختلف اور بڑی زبانوں بشمول عربی، اُردو، انگریزی، فرنچ، اسپینش، آذربائیجانی میں ہوئے ہیں جن کی تعداد تیس (30) سے متجاوز ہے۔

بابر نامہ ظہیر الدین محمد بابر کے مشاہدات، تبصرے، اور اس کی فطرت، معاشرت، سیاست، اور معاشیات میں اس کی دلچسپی کی عکاس ہے۔ بابر جن علاقوں میں قیام پذیر رہا ان کی تاریخ اور جغرافیہ کو بابر نامہ میں قلم بند کیا ہے۔ علاوہ ازیں تصنع و مبالغہ سے پاک اور حقیقت نگاری پر مبنی یہ کتاب فلکیات، دستکاری، اقوام، فوجی معاملات، مصائب و مشکلات، جنگی مہمات، فتوحات، جمادات، نباتات، حیوانات، اوقات، تعمیرات، باغات، سوانح حیات، اوزان، اعداد، خاندانی تاریخ، درباریوں، فنکاروں، موسم و ایام، ریاضی، موسیقی، شاعری، انسانی فطرت کا مطالعہ وغیرہ جیسے متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے جنھیں ظہیر الدین محمد بابر نے انتہائی دلچسپ اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ بابر نے بابر نامہ میں تصاویر کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن 1589ء میں اس کے پوترے اکبر نے فارسی ترجمہ کے اختتام کے بعد بابر نامہ کے چار نسخہ جات مع تصاویر کے تیار کروائے۔ تزک بابری کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد اور دوسرا لندن برٹش میوزیم میں محفوظ وموجود ہے۔

بابر نامہ، دیوانِ بابر اور بدایونی کی منتخب التواریخ کے حوالوں سے یہ بات طویل عرصے تک مشہور تھی کہ ہندوستان فتح کرنے سے قبل بابر نے علم عروض پر فارسی زبان میں ایک رسالہ بعنوان عروض رسالہ سی تحریر کیا تھا جس کی تکمیل کے لیے اسے 2 تا3 سال لگے تھے۔ یہ رسالہ 1923ء میں اس وقت منظر عام پر آیا جب محمد فواد کوپریلی نے پیرس سے اس کے قلمی نسخہ کو دریافت کیا تھا۔ اس رسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصرعوں میں ترکی شاعروں کے استعمال کردہ فن عروض پر تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہے جو امیر علی شیر وانی کی میزان الاوزان میں بھی نہیں ملتیں۔ بابر کو فقہ حنفی سے بھی خاص دلچسپی تھی اور اس نے فقہ حنفی پر ایک رسالہ مرتب کیا۔ عروض رسالہ سی کے ایک حوالے کے مطابق بابر نے 1521ء میں چھوٹی بحر (فاعلتن مفاعلن فاعلن) پر مثنوی کی شکل میں ایک رسالہ بعنوان مبین لکھا۔

اس رسالہ میں حنفی فقہ کے کچھ مسائل سے بحث کی گئی ہے۔وسط ایشیا کے عظیم صوفی خواجہ عبید اللہ احرار نے صوفیا کے اخلاق پر ایک منظوم رسالہ بعنوان والدیہ مثنوی کی شکل میں تحریر کیا تھا جو بیان کے اعتبار سے انتہائی سادہ اور دلکش ہے۔ عنوان سے ظاہر ہے کہ آپ نے یہ رسالہ والدین کے اصرار پر لکھا تھا۔ اس رسالہ میں کل 243 اشعار بحر رمل (یعنی فعلاتن فعلاتن فعلن) میں ہے۔ بابر نے 1529ء میں اس رسالہ کا چغتائی ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف کی طرف بھی بابر کا میلان تھا۔ علاوہ ازیں بابر نے ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جس کا اکثر حصہ ترکی زبان میں جبکہ چند نظمیں فارسی زبان میں ہیں۔ یہ دیوان غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، تیوغ، معمااور مفرد پر مشتمل ہے۔اس دیوان کی بیشتر نظمیں سادہ اور فطری ہیں۔

13.3 نصیر الدین محمد ہمایوں(1508۔1556ء)

ہمایوں کی ولادت ماہم بیگم کے بطن سے 1508ء میں کابل میں ہوئی۔ نجی زندگی میں ہمایوں وفادار دوست، فرمانبردار بیٹا اور پیار کرنے والا بھائی تھا۔ ہمایوں سنی العقیدہ مسلمان تھا اور ہمیشہ سچے مسلمان کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہمایوں کو اہل بیت اطہار سے بے انتہاء عقیدت تھی جس کے باعث اس کا میلان شیعہ مسلک کی طرف ہو گیا تھا۔ اس حقیقت کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے دور حکومت میں اہم ذمہ داریاں شیعہ حضرات کے سپرد تھیں۔ ہمایوں میدان جنگ میں اپنے فوجیوں اور افسروں کا بھرپور ساتھ دینے والا تھا۔ اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے سے زیادہ مہم جو کی حیثیت سے مشہور تھا اسی لیے وہ اپنی حکومت کو مستحکم کرنے میں ناکام رہا۔ ہمایوں کو ترک، فارسی اور عربی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ اسے حساب، فلسفہ، علم نجوم اور علم فلکیات سے خاصا لگاؤ تھا۔ ہمایوں اکثر اپنے فاضل اوقات سماجی تانے بانے کو مضبوط کرنے اور ادبی بحث ومباحثہ میں گزارنا پسند کرتا تھا۔

بابر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا مرزا نصیر الدین محمد المعروف ہمایوں 1530ء کے اختتام سے محض دو دن قبل بابر کی وصیت کے مطابق دہلی کے مسند پر تخت نشین ہوا جو بابر کی موت سے صرف چار دن پہلے آگرہ پہنچا تھا۔ کابل اور مغل سلطنت کے دوسرے حکمراں ہمایوں کا دور اقتدار 1530 سے لیکر 1540ء تک پھر 1555ء سے لیکر 1556ء تک رہا۔ جب ہمایوں 22 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اس وقت وہ ہندوستان سے بڑی حد تک ناواقف تھا چونکہ اس نے اپنی زندگی کا اسی (80) فیصد حصہ بیرون ہندوستان گزارا تھا۔ گرچہ ہمایوں 1562ء میں ہندوستان فتح کرنے کی مہم میں بابر کے ساتھ شامل تھا لیکن ایک سال بعد وہ وسط ایشیا واپس چلا گیا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی سلطنت کے انتظام وانصرام کے لیے جو موثر پالیسیاں درکار تھیں ہمایوں ان سے بالکل ناواقف تھا۔۔ شہنشاہ کے طور پر ہمایوں نے کچھ فتوحات حاصل کیں لیکن وہ اپنے والد کے طاقتور وسط ایشیائی کمانڈروں اور سوتیلے بھائیوں کی مستقل حمایت وتائید حاصل نہ کر سکا۔ ہمایوں نے وراثت کو اپنے والد کی وصیت کے مطابق تقسیم کرتے ہوئے اپنے سوتیلے بھائیوں یعنی کامران مرزا کو پنجاب، قندھار اور کابل، ہندال کو میوات اور عسکری کو سنبھل کا صوبہ بطور جاگیر دیا۔ ہمایوں کے اس فیاضانہ سلوک کے باوجود اس کے سوتیلے بھائی ہمیشہ اس کے خلاف سازشیں رچنے میں مصروف رہے۔ کامران مرزا نے پنجاب پر قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے مغل سلطنت فوجی اور معاشی طور پر کمزور ہو گئی۔

13.3.1 نصیر الدین محمد ہمایوں کی جنگی مہمات اور فتوحات

ہمایوں اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث 1520ء تا1525ء اور 1527ء تا 1529ء بدخشاں کا گورنر رہا۔ سن 1527ء میں ہمایوں بدخشاں روانہ ہوا جہاں اس نے سمرقند کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ازبکوں کے خلاف فیصلہ کن مہم چلائی۔ 1529ء میں امن معاہدہ ہونے کے بعد ہمایوں ہندوستان واپس آ گیا۔ 1529ء میں اسے سنبھل کی جاگیر کے انتظامی امور تفویض کیے گئے۔ بابر کی وفات کے بعد مغل سلطنت میں چاروں طرف بغاوتیں پھیل گئیں۔ ہمایوں جس وقت تخت نشین ہوا اس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات انتہائی خراب تھے۔ شیر خان افغان مشرقی علاقوں بنگال اور بہار میں اور بہادر شاہ مغربی علاقہ گجرات میں مغل سلطنت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس کے باوجود ہمایوں نے 1531ء میں کالنجر کے راجہ کو زیر کیا اور بایزید اور ببن کے زیر قیادت بہار سے پیش قدمی کرنے والے افغانوں کے خلاف جنگی مہم چلائی اور دموہ میں انہیں شکست دی۔ 1532ء میں ہمایوں نے شیر خان کا چنار میں محاصرہ کرنے کے بعد آگرہ لوٹ آیا۔ 1533ء میں ہمایوں نے دہلی میں دین پناہ شہر کی بنیاد ڈالی جس کی قلعہ بندی 1534ء میں مکمل ہوئی۔ 1535ء میں ہمایوں گجرات کے سلطان بہادر شاہ کے شمال کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لیے آگرہ سے روانہ ہوا اور اس کا مقابلہ کیا اور مندسور میں بہادر شاہ کا محاصرہ کر لیا۔ دو ماہ بعد بہادر شاہ نے اپنی فوج کو چھوڑ کر منڈو سے راہ فرار اختیار کی۔ 1536ء میں ہمایوں نے محمود آباد میں گجراتیوں کو شکست دی جو عماد الملک کے زیر قیادت تھے۔ اس کے بعد ہمایوں مالوا کے لیے روانہ ہوا۔ 1537ء میں ہمایوں مشرقی ہندوستان میں شیر خان سوری کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے روانہ ہوا اور چند مہینے کے محاصرہ کے بعد چنار کا قلعہ فتح کر لیا۔

وراثت میں ملی غیر مستحکم سلطنت، ہمایوں کی اپنی متعدد فاش غلطیوں، افغانوں کی مخالفت، اور ہمایوں کے بھائیوں بالخصوص مرزا کامران کی غداری نے ہمایوں کو مشکلات سے دوچار کر دیا۔ اس طرح ہمایوں افغانوں کے مقابل بہت کمزور ہو گیا اور اسے سلطنت سے ہاتھ بھی دھونا پڑا۔ انتظامی اور فوجی مہارتوں میں ید طولی رکھنے والے شیر خان سوری نے 1539ء میں چوسا اور 1540ء میں قنوج میں ہمایوں کو شکست دی اور مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کیا۔ ہمایوں کو ہندوستان سے بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہمایوں پہلے لاہور، ملتان اور سندھ میں پناہ لینی چاہی لیکن افغان اس کا مسلسل تعاقب کر رہے تھے جس کی وجہ سے ہمایوں کو بالآخر ایران میں پندرہ سال (15) سال تک پناہ لینی پڑی۔ ہمایوں نے جب سندھ میں پناہ لی اس وقت ہمایوں کا بیٹا اکبر 1542ء میں پیدا ہوا۔ ایران میں ہمایوں کو صفوی حکومت کے حکمراں شاہ طہماسپ کی حمایت حاصل ہوئی جس نے اسے بھرپور مدد فراہم کرنے کا بھروسہ دلایا۔ 1550ء میں ہمایوں نے اپنے بے وفا بھائی کامران سے دوبارہ کابل حاصل کر لیا۔ شیر شاہ کی اولاد کے درمیان جاری خانہ جنگیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمایوں نے 1555ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اور اسی سال پنجاب کے باغی افغان گورنر سکندر شاہ سوری کو سرہند میں شکست دینے کے بعد دہلی اور آگرہ دوبارہ حاصل کرتے ہوئے دوبارہ مغلیہ سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ہمایوں جب ایران سے فاتح بن کر ہندوستان واپس آیا تو اس کے ساتھ ایران شرفا بھی اس کے ہمراہ ہندوستان آئے جس کے باعث ایرانی زبان و ادب، فنون اور فن تعمیر کو ہندوستان میں خوب فروغ حاصل ہوا۔

13.3.2 ہمایوں کا مقبرہ

ہمایوں کا مقبرہ 1560ء میں ہمایوں کے بیٹے عظیم شہنشاہ اکبر کی سرپرستی میں تعمیر کیا گیا جو ثقافتی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ہمایوں کا مقبرہ برصغیر ہند و پاک میں عظیم الشان اور خاندانی مقبروں میں بھی پہلا بڑا مقبرہ ہے۔ مغلیہ سلطنت دوبارہ قائم کرنے کے بعد ہمایوں زیادہ دن تک زندہ نہ سکا اور 1556ء میں اذان کی آواز سن کر اپنے کتب خانہ (لائبریری) کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا کہ اس کا پاؤں لباس میں پھنس گیا اور وہ نیچے گر کر شدید زخمی ہو گیا۔ تین دن بعد وہ فوت ہو گیا۔ اس کی میت کو پہلے پرانا قلعہ میں سپرد لحد کیا گیا تھا لیکن ہیمو کے دہلی پر حملہ آور ہونے اور پرانا قلعہ پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے ہمایوں کی میت کو پنجاب منتقل کیا گیا جہاں اکبر کی تاجپوشی ہوئی۔ نوجوان مغل بادشاہ اکبر پانی پت کی دوسری جنگ میں ہیمو کو شکست دینے کے بعد ہمایوں کی میت کو دہلی میں ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا جو مغل فن تعمیر کا پہلا شاہکار اور سب سے بڑا باغیچہ ہے۔ مغلیہ دور کی بڑی تعمیراتی اختراعات اور دیگر ہندوستانی یادگاریں اسی مقبرہ کو نظیر بنا کر بنائی گئیں۔ اسی (80) سال بعد تاج محل بھی اسی فن تعمیر سے متاثر ہو کر تعمیر کیا گیا۔ یونیسکو نے سن 1993ء میں اس مقبرہ کو عالمی ثقافتی ورثے کا درجہ دیا۔

13.3.3 ہمایوں نامہ

شہنشاہ اکبر نے اپنی پھوپی گلبدن بیگم سے اپنے والد ہمایوں کی سوانح حیات لکھنے کی درخواست کی۔ ہمایوں کی والدہ ماہم بیگم نے گلبدن بیگم کو منہ بولی بیٹی بنالیا تھا اس لیے گلبدن بیگم ہمایوں سے سگی بہن کی طرح پیار و محبت کرتی تھی۔ بھتیجے کی خواہش پر ظہیر الدین محمد بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ تصنیف کی جس کے آغاز میں بابر کا تذکرہ کیا اس کے بعد اس نے مغلیہ خاندان کے واقعات اور خاص طور پر عہد ہمایوں کے تمدنی، معاشرتی، سیاسی و سماجی حالات کو انتہائی سادہ اور دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب عہد ہمایوں سے متعلق معلومات پر اہم و مستند اور قیمتی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ برطانوی خاتون اے۔ ایس بیورج نے 1902ء میں ہمایوں نامہ کو ایڈٹ کیا اور دیباچہ میں گلبدن بیگم کی سوانح عمری درج کی اور ان خواتین کے حالات بھی قلم بند کیے جن کے نام ہمایوں نامہ میں مذکور ہیں۔ اس کتاب کی انشاء پردازی کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ فارسی زبان میں سادہ اور واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزک جہانگیری اور واقعات عالمگیری ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ اُن سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف الفاظ، روزمرہ کی عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی، دل کو بے اختیار کر دیتی ہے، اس کی قابل قدر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس عہد کے تمدن، شائستگی، معاشرت اور خانگی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ ہمایوں نامہ کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خاندان کی سرکردہ خواتین نے سیاسی معاملات اور ازدواجی تعلقات بنانے، بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کو ذمہ داریوں کا احساس دلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے پسندیدہ مرد و زن رشتہ داروں کے عزائم کی بھی بھرپور حمایت کی۔ بعض اوقات وہ اپنے قریبی مرد رشتہ داروں کی طرف سے ان کی ترقی یا معافی کے لیے سرپرست سے سفارش بھی کیا کرتی تھیں۔

13.4 جلال الدین محمد اکبر (1542ء-1605ء)

اکبر کے دادا (بابر)، والد (ہمایوں) اور ان کے سر کردہ حامی زیادہ تر بیرون ہند رہتے تھے اور ان کا زیادہ تر رجحان ومیلان وسط ایشیا کی طرف ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اکبر کی ولادت 1542ء میں سندھ (مغربی ہندوستان) کے مقام امر کوٹ میں ہوئی تھی اور اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان ہی میں گزارا تھا۔ ہمایوں کا لڑکا جلال الدین اکبر جو مغلیہ تاریخ میں اکبر اعظم کے نام سے مشہور ہے اپنے والد کی وفات کے بعد 1556ء میں تخت نشین ہوا اور 1605ء تک مغل سلطنت کا حکمراں رہا۔ وہ ایک سیکولر حکمراں تھا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس کے نورتنوں میں مغلیہ سلطنت کا سپہ سالار مان سنگھ، راجہ ٹوڈر مل، بیربل اور سنگیت سمراٹ تانسین جیسے ہندو بھی شامل تھے۔ اکبر نے بنارس، پریاگ اور دیگر مذہبی مقامات کی زیارت کے لیے جانے والے زائرین کا زیارت ٹیکس معاف کر دیا۔ 1564ء میں اکبر نے ہندوؤں پر لگنے والے جزیہ ٹیکس کو برخواست کر دیا۔ اکبر کے زمانے میں ہندوؤں کے مذہبی کتب کا دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ فیضی نے اسی دور میں گیتا اور مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی عہد اکبری میں حاجی ابراہیم سرہندی نے اتھروید، ملا شیری نے ہری ونشا، ملا عبدالقادر بدایونی نے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کیا۔

ہمایوں کی وفات کے بعد مغل سلطنت کے انتظامی امور اکبر کے سرپرست بیرم خان کے سپرد ہوئے اور اکبر نے اپنے نصف صدی پر محیط دور حکومت کا آغاز کیا۔ حقیقتاً مغل سلطنت کا قیام اسی دور میں عمل میں آیا۔ 1556ء میں شہنشاہ ہمایوں کی غیر متوقع موت کے بعد اکبر کی جانشینی یقینی نہیں تھی۔ کیونکہ سر کردہ کمانڈروں کو اُس وقت تباہ کن انتشار پھیل جانے اور نوزائیدہ سلطنت کے خاتمے کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا چونکہ ہمایوں کے نصف سے زیادہ اعلی افسران اور اہلکاروں کا تعلق وسط ایشیا سے تھا، جبکہ ایک تہائی کا تعلق ایران سے اور بہت چند ایسے تھے جن کا تعلق ہندوستانی مسلمان یا راجپوت سے تھا۔ کچھ وسط ایشیائی اور ایرانی ہمایوں سے ذاتی عناد کی وجہ سے ہندوستان ہجرت کر گئے تھے اور اب وہ وطن واپس ہونا چاہ رہے تھے۔ اسی لیے ہمایوں کے باقی حریف درباریوں نے اس کی موت کو دو ہفتوں تک چھپا کر جانشینی کے بحران کو موخر کرنے کی کوشش کی۔ بعض کمانڈروں نے ہمایوں کی موت کو اپنے لیے بہترین موقع سمجھا اور تیموری روایت کے مطابق علاقوں کو اپنے بیٹوں، قریبی مردرشتہ داروں یا خود میں تقسیم کر لینے چاہا۔ لیکن ہمایوں کا سب سے زیادہ طاقتور ساتھی بیرم خان خوش قسمتی سے پنجاب ہی میں تھا جو ہمایوں کے بڑے بیٹے اور ہمایوں کی جانشین ہونے کا سب سے اہم دعویدار 12 سالہ اکبر کا ذاتی سرپرست بھی تھا۔ ہمایوں نے اکبر کو بچپن ہی سے حکمرانی کے لیے تیار کیا تھا اور اسے کابل اور غزنی کا گورنر بھی مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ہمایوں کے جان لیوا زخم کی خفیہ اطلاع ملتے ہی بیرم خان نے اکبر کو فوری طور پر عارضی تخت پر بٹھایا پھر اسے آگرہ کے دربار میں لے گیا اور اکبر کی تخت نشینی کا باضابطہ اعلان کیا۔ اکبر کی نوعمری کے دوران بیرم خان نے بحیثیت وکیل السلطنت مغل سلطنت کے انتظامی امور کو انتہائی وفاداری کے ساتھ چلایا اور اکبر کی تخت نشینی کے بعد چار سال تک مغل سلطنت کی توسیع میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر ہمیشہ بیرم خان کو رضاعی والد کا درجہ دیا کرتا تھا اور احترام سے بیرم کو خان بابا کہہ کر خطاب کرتا تھا۔

اکبر اپنی نوجوانی کے ایام ہی سے بڑا دلیر اور نڈر تھا وہ وقتاً فوقتاً جنگی مہمات میں حصہ لیا کرتا تھا۔ 1562ء میں آگرہ سے سو کیلو میٹر

فاصلہ پر اکبر شکار میں مصروف تھا ایک برہمن آیا اور شکایت کی کہ مقامی غنڈے اس پر ظلم کرتے ہیں اور اس کے لڑکے کو قتل کر کے ان غنڈوں نے اس کی جائیداد بھی لوٹ لی ہے۔ اکبر خود بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھی اور چند محافظوں کے ساتھ ہزاروں ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا۔ سات تیر اکبر کی ڈھال پر لگے جن میں سے پانچ ڈھال کے آرپار ہو گئے جبکہ دو ڈھال پر آکر رک گئے۔ آخر کار اکبر کا ہاتھی دیوار توڑ کر اندر داخل ہو گیا اور بڑی تعداد میں غنڈوں کو مار ڈالا۔ اکبر جنگ اور سیاست میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا بار ہا منواتا رہا ہے۔

13.4.1 جلال الدین محمد اکبر کی جنگی مہمات اور فتوحات

اکبر نے پانچ دہائیوں پر مشتمل اپنے دور سلطنت میں ہندوستان میں مغل سلطنت کی مضبوط و مستحکم بنیاد رکھی۔ اکبر کے دور حکومت میں مغلوں نے لاہور، پنجاب کے شہر ملتان، اجمیر اور گوالیار کے قلعوں اور مالوا کو فتح کیا۔ اکبر اور اس کے قریبی مشیروں نے ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کلیدی پالیسیاں بنائیں۔ اکبر اور اس کے وزرا نے مرکزی مالیاتی اور انتظامی نظام متعارف کر کے سلطنت کی تشکیل نو کی۔ اکبر نے انتظامیہ اور عدلیہ میں بڑے پیمانے پر تقررات کر کے توسیع دی۔ اکبر کی زندگی کا بیشتر حصہ میدان جنگ میں گزرا اور اپنی موت سے عین قبل تک وہ براہ راست فوجی مہمات کی قیادت کرتا رہا۔ شہنشاہ اکبر اور اس کے قریبی مشیر علاقائی فتوحات کے ذریعہ مغل سلطنت کو وسعت دینے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ اکبر کے دور حکمرانی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 1556 تا 1570ء اکبر نے اس دور میں سلطنت سور کے حکمرانوں، افغانوں، مالوا اور گونڈوانا کی پڑوسی سلطنتوں، سوتیلے بھائی مرزا حکیم اور ازبکوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے جنگی مہم چلائی۔ سلطنت کے خلاف سب سے طویل عرصے تک لڑنے والے سرکردہ راجپوت قبیلوں میں میواڑ کا سیسودیا تھا۔ اکبر نے 1568ء میں ان سے چتوڑ کا مضبوط قلعہ حاصل کر لیا۔ اسی طرح اکبر نے اسی سال رنتھمبور پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ دوسرا دور 1570 تا 1585ء اس دور میں اکبر نے گجرات اور مشرق میں بہار، بنگال اور اڑیسہ میں فوجی مہم چلائی۔ 1572ء میں احمد آباد کو فتح کیا اس کے بعد اکبر نے دنیا کا سب سے اونچا دروازہ یعنی بلند دروازہ فتح پور سیکری میں تعمیر کیا۔ 1575ء میں اکبر نے بنگال فتح کیا اور 1576ء میں اکبر نے ہلدی گھاٹی کی جنگ میں میواڑ کے راجہ مہارانا پرتاپ سنگھ کو شکست سے دوچار کیا۔ 1581ء سے 1593ء تک اکبر نے کابل، کشمیر، لداخ اور سندھ کے علاقوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔ تیسرا دور 1585ء تا 1605ء اس دور میں اکبر نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی غرض سے شمال مغرب میں فوجی مہمات آغاز کیا۔ اکبر 1585ء تا 1598ء ازبیکوں اور افغانوں کی قوت کو کم کرنے میں مصروف رہا۔ 1586ء کشمیر کو فتح کیا گیا۔ 1589ء میں اکبر نے کشمیر کا دورہ کیا اور کشمیر کے انتظامی امور کو قابل، تجربہ کار اور ماہر منتظمین کے سپرد کیا۔ 1595ء میں اکبر نے قندھار کو مغل سلطنت میں ضم کر لیا۔ اسی سال بلوچستان بھی مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ دکن میں فوجی مہمات شروع ہوئیں برار، خاندیش اور احمد نگر کے کچھ حصوں کا مغل سلطنت میں انضمام کر لیا۔ اس طرح اکبر نے ہندوستان (جو مختلف سلطنتوں میں منقسم تھا) کو متحد کرنے میں کامیاب ہوا۔ اپنے دور حکمرانی کے آخری سالوں میں اکبر مستقبل کے شہنشاہ جہانگیر کی بغاوت سے کافی پریشان ہو گیا تھا۔

13.4.2 جلال الدین محمد اکبر کا نظم و نسق

مغل سلطنت کی توسیع اور پھیلاؤ کے بعد شہنشاہ اکبر نے بڑی ہی فہم و فراست اور سیاسی سوجھ بوجھ سے مغل سلطنت کو بہتر انداز

سے سنبھالا۔ اکبر نے کبھی کسی ایک اہلکار کو سب سے طاقتور بننے کا موقع نہیں دیا بلکہ اس نے بیرم کے اختیارات کو بڑی احتیاط کے ساتھ وزراء کے درمیان تقسیم کیا اور انہیں اپنی راست نگرانی میں رکھتا تھا۔ اکبر نے حکومت کو فوجی لحاظ سے مستحکم کرنے اور سلطنت کے نظم و نسق کو کارکرد، بہتر اور موثر بنانے کے لیے 1575ء میں نادر و مخصوص نظام یعنی منصب داری نظام کو متعارف کروایا اور باقاعدہ بنایا جو بانی سلطنت بابر کے وجہ داری نظام سے کئی نہایت اہم پہلوؤں سے مختلف تھا۔ یہ منصب داری کا نظام شفافیت اور افسر شاہی پر مبنی تھا۔ اس نئے نظام کے تحت اکبر نے ترک باشندوں کے علاوہ ایرانی، افغانی، ہندوستانی مسلمانوں، راجپوتوں، مراٹھاؤں الغرض تمام ذاتوں کے لوگوں کو ان کی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق نمائندگی دی اور ان کی بحیثیت منصب دار تقرری عمل میں لائی۔ فارسی لفظ منصب دار سے مراد وہ شخص کے پاس کوئی منصب یا رتبہ ہو۔ جیسے صدی اور ہزارہ نامی فوجی یعنی وہ کمانڈر جس کے تحت بالترتیب سو اور ایک ہزار سپاہی ہوں۔ اس نظام کا استعمال عہدہ، تنخواہ، اور ذمہ داری کا تعین کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ عہد اکبری میں سب سے چھوٹا منصب 10 کا اور سب سے بڑا منصب پانچ ہزار کا تھا۔ ہر منصب دار براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا۔ اکبر نے مغلیہ سلطنت کے ارد گرد کی چھوٹی، آزاد اور خود مختار ریاستوں کو فتح کر لیا جس کے بعد مغل سلطنت معاشی و مالی طور پر مستحکم ہوگئی اسی باعث وسط ایشیا اور ایران سے دستکاری، مصوری، موسیقی، ادب و شاعری، تاریخ اور امور انتظامی میں مہارت و تجربہ رکھنے والے ہندوستان کا رخ کرنے لگے۔ اس طرح مغل سلطنت میں علم و ادب، فنون و تعمیری کاموں کو بھرپور فروغ ملا۔ سلطنت کے انتظامی امور کو مزید بہتر و کارکرد بنانے کے لیے اکبر نے 1580ء میں صوبائی نظام قائم کیا۔

13.4.3 جلال الدین محمد اکبر اور سماجی اصلاحات

جلال الدین محمد اکبر کو اپنی ہندو رعایا کی فلاح و بہبود سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے ان برائیوں کا خاتمہ کرنے کی بھرپور کوشش کی جو ہندو سماج کو شہد کے چھتے میں ڈال رکھا تھا۔ رواداری اور مفاہمت کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے باوجود اکبر نے ہندو سماج میں پائی جانے والی خرابیوں کو دور کرنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اس نے کم سنی کی شادیوں کو ممنوع قرار دیا، ستی کی روایت کی حوصلہ شکنی کی اور بیواؤں کی شادی کو بڑھاوا دیا۔ علاوہ ازیں اس نے ذات پات کی پابندیوں کے خلاف عملی طور پر جدوجہد کی اور پیار و محبت کی بنیاد پر انسانی اقدار کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اکبر وہ پہلا مسلم حکمراں ہے جس نے تعلیم کو ہر شہری کا بنیادی حق قرار دیا۔ عہد اکبری میں سلطنت کے تعاون سے مختلف نوعیت کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے جہاں عہدے، نسل یا مذہب کی پابندی کے بغیر ہندو اور مسلمان یکساں طور پر عصری علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اکبر نے تعلیم کو مستحکم بنیادوں پر منظم کرنے کی غرض سے تعلیمی نصاب کی از سر نو ترتیب کی ذمہ داری اس وقت کے مشہور و معروف فلسفی و منطقی عالم میر فتح اللہ شیرازی کے سپرد کی۔ انہوں نے اخلاقیات، ریاضیات، زراعت، فلکیات، منطق، حکومتی امور، سنسکرت، گرامر، فلسفہ اور طب کو نصاب میں شامل کیا۔ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے بے شمار دانشوروں اور مذہبی پیشواؤں نے سائنس، فطرت، تاریخ، ادب، طب وغیرہ سے متعلق تحقیقات کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ اسی لیے شہنشاہ اکبر کو برصغیر میں تعلیمی اصلاحات کا علمبردار مانا جاتا ہے۔ اکبر کے دور حکومت میں متعارف ہونے والی دور اندیش تنظیمی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی اصلاحات کے باعث عہد اکبری کو ہندوستانی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

13.4.4 جلال الدین محمد اکبر کا دین الٰہی

صلح کل کے اصول پر گامزن جلال الدین محمد اکبر نے اسلام، ہندومت، جین مت، سکھ مت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور زرتشت مذاہب کی خوبیوں کو جمع کر کے ایک نئے مذہب کا تصور پیش کیا تھا جسے دین الٰہی کہتے ہیں۔ اس مذہب کو علمائے سو اور صوفیائے خام کی بھرپور تائید حاصل تھی جنھوں نے اکبر کو قبلہ مرادات اور کعبہ حاجات جیسے القابات دیئے۔ خام خیالی اور غلط اندیشی کے حامل ان حضرات نے ایک طرف اکبر کی اس پہل کو مستحسن اقدام قرار دیا تو دوسری جانب حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کو فرقہ پرورانہ جدوجہد سے تعبیر کیا۔ ایسے ہی خوش فہم دانشوروں نے دین الٰہی کو ہندوستان میں متحدہ قومیت کے جذبہ کو فروغ دینے والا قرار دیا تھا۔ اسی سے حوصلہ پاکر اکبر نے اپنے نام کا خطبہ جاری کیا۔ دین الٰہی میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ شخص اخلاص چارگانہ، ترک مال، ترک جان، ترک ناموس، ترک دین پر قائم رہنے کا اقرار نامہ لکھ کر دے۔ اس مذہب کی کوئی مقدس کتاب تھی اور نہ ہی مذہبی رہنماء۔ اس مذہب میں روح کو زیادہ ترجیح دی گئی تھی اور جانور کو غذا کے طور پر استعمال کرنا اور شاہی شکار کرنا ممنوع تھا۔ رواداری، صلح کل، دنیاوی خواہشات سے اجتناب، فکرِ عقبی، نرم گوئی، خوش گفتاری، اخوت، بھائی چارہ، خالق اور مخلوق کی محبت میں وقف ہو جانا دین الٰہی کے بنیادی اصولوں میں شامل تھے۔ اس مذہب کا بنیادی مقصد مذہبی اختلافات کو فراموش کر کے تمام مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا تھا تا کہ ملک میں بھائی چارگی کی فضا قائم رہے۔ اس مذہب کے فروغ کی غرض سے 1575ء میں اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک عظیم عبادت خانہ تعمیر کروایا جہاں تمام مذاہب کے لوگ آکر عبادت کیا کرتے اور مذہبی فلسفہ پر بحث مباحثہ ہوتا تھا۔ دین الٰہی کے پیروکار کو چیلہ کہا جاتا تھا اور ان کی تعداد 19 تھی جو بعد میں رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوئے ختم ہوگئی۔ دین الٰہی کے ان محدود پیروکاروں میں سے بعض وہ بھی تھے جو محض تمغہ کی حد تک محدود تھے جبکہ بعض محض بادشاہ کے خوشامدے مسخرے تھے۔ دین الٰہی کے اہم ستون مانی جانے والی شخصیات یعنی شیخ مبارک، فیضی اور ابوالفضل کی موت کے بعد یہ دین از خود ختم ہوگیا۔

13.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- بابر کی پیدائش 1483ء میں اندجان، فرغانہ (ازبکستان) میں ہوئی۔ بابر کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی طرف سے چنگیز خان سے ملتا ہے۔
- منگول گروپ ازبکوں کے حملے کے باعث آبائی تخت چھوڑنے پر بابر مجبور ہوا۔ نتیجتاً بابر کے ہاتھ سے فرغانہ سمیت دوسرے علاقے چھن گئے۔
- بابر ایک پرکشش انسان، اعلی درجہ کا دانشمند تھا لیکن اسے نہ انتظامی امور میں کوئی مہارت حاصل تھی اور نہ انتظامیہ میں اصلاحات لانے کی کوئی فکر۔ جس وقت بابر ہندوستان پر فتح حاصل کی اس وقت ہندوستان بے شمار چھوٹی اور آزاد ریاستوں میں منقسم تھا۔ جن

میں مسلمانوں کی پانچ اور ہندوؤں کی دو اہم ریاستیں بھی شامل تھیں۔

- بابر عظیم فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا فنکار اور عظیم ادیب و شاعر بھی تھا۔ چغتائی ترکی زبان میں بابر شعر و شاعری کیا کرتا تھا۔ اسے عربی، فارسی، ترکی، ہندی، زبانوں پر کامل دسترس حاصل تھی۔
- ہمایوں کی ولادت ماہم بیگم کے بطن سے 1508ء میں کابل میں ہوئی۔ نجی زندگی میں ہمایوں وفادار دوست، فرمانبردار بیٹا اور پیار کرنے والا بھائی تھا۔ وہ سنی العقیدہ مسلمان تھا اور ہمیشہ سچے مسلمان کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔
- جب ہمایوں 22 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اس وقت وہ ہندوستان سے بڑی حد تک ناواقف تھا چونکہ اس نے اپنی زندگی کا اسی (80) فیصد حصہ بیرون ہندوستان گزارا تھا۔
- وراثت میں ملی غیر مستحکم سلطنت، ہمایوں کی اپنی متعدد فاش غلطیوں، افغانوں کی مخالفت، اور ہمایوں کے بھائیوں بالخصوص مرزا کامران کی غداری نے ہمایوں کو مشکلات سے دوچار کر دیا۔ اس طرح ہمایوں افغانوں کے مقابل بہت کمزور ہو گیا اور اسے سلطنت سے ہاتھ بھی دھونا پڑا۔
- ہمایوں نے ایران میں پندرہ سال (15) سال تک پناہ لینی پڑی۔ ایران میں ہمایوں کو صفوی حکومت کے حکمراں شاہ طہماسپ کی حمایت حاصل ہوئی جس نے اسے بھرپور مدد فراہم کرنے کا بھروسہ دلایا۔
- ہمایوں نے 1555ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اور اسی سال پنجاب کے باغی افغان گورنر سکندر شاہ سوری کو سرہند میں شکست دینے کے بعد دہلی اور آگرہ دوبارہ حاصل کرتے ہوئے دوبارہ مغلیہ سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔
- ہمایوں کے بیٹے عظیم شہنشاہ اکبر کی سرپرستی میں ہمایوں کا مقبرہ 1560ء میں تعمیر ہوا جو ثقافتی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ہمایوں کا مقبرہ برصغیر ہندوپاک میں عظیم الشان اور خاندانی مقبروں میں پہلا بڑا مقبرہ ہے۔
- شہنشاہ اکبر نے اپنی پھوپی گلبدن بیگم سے اپنے والد ہمایوں کی سوانح حیات لکھنے کی درخواست کی۔ گلبدن بیگم نے اپنی اس تصنیف کے آغاز میں بابر کا تذکرہ کیا اس کے بعد اس نے مغلیہ خاندان کے واقعات اور خاص طور پر عہد ہمایوں کے تمدنی، معاشرتی، سیاسی و سماجی حالات کو انتہائی سادہ اور دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے۔
- اکبر کی ولادت 1542ء میں سندھ (مغربی ہندوستان) کے مقام امر کوٹ میں ہوئی تھی جو بابر کی وفات کے بعد 1556ء میں تخت نشین ہوا اور 1065ء تک مغل سلطنت کا حکمراں رہا۔
- اکبر نے پانچ دہائیوں پر مشتمل اپنے دور سلطنت میں ہندوستان میں مغل سلطنت کی مضبوط و مستحکم بنیاد رکھی۔ اکبر کے دور حکومت میں مغلوں نے لاہور، پنجاب کے شہر ملتان، اجمیر اور گوالیار کے قلعوں اور مالوا کو فتح کیا۔
- جلال الدین محمد اکبر کو اپنی ہندو رعایا کی فلاح و بہبود سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے ان برائیوں کا خاتمہ کرنے کی بھرپور کوشش کی جو ہندو سماج کو شہد کے چھتے میں ڈال رکھا تھا۔

13.6 نمونہ امتحانی سوالات

13.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. بابر کے والد عمر شیخ مرزا کا انتقال کس سن میں ہوا؟

(a).1556 (b).1608 (c).1494 (d).1530

2. ظہیر الدین بابر نے پانی پت کی جنگ میں کس کو شکست دی؟

(a). ابراہیم لودھی (b). سکندر لودھی (c). راناسانگا (d). دولت خان

3. تزک بابری کس کی تصنیف ہے؟

(a). گلبدن (b). فیضی (c). بدایونی (d). بابر

4. ظہیر الدین محمد بابر کہاں مدفون ہے؟

(a). دہلی (b). کابل (c). لاہور (d). آگرہ

5. نصیر الدین محمد ہمایوں کس سن میں تخت نشین ہوا؟

(a).1508 (b).1526 (c).1530 (d).1542

6. نصیر الدین محمد ہمایوں کی زندگی کا بیشتر حصہ کہاں گزرا؟

(a). مالوا (b). دہلی (c). بیانہ (d). بیرون ہند

7. نصیر الدین محمد ہمایوں نے سن 1536ء میں ہمایوں نے محمود آباد میں کن کو شکست دی؟

(a). افغانیوں (b). گجراتیوں (c). منگولوں (d). راجپوتوں

8. عہد اکبری میں رامائن اور مہابھارت کا ترجمہ کس نے کیا؟

(a). بدایونی (b). ابوالفضل (c). فیضی (d). شیخ مبارک

9. سن 1572ء میں احمد آباد فتح کرنے کے بعد اکبر نے کونسی یادگار عمارت تعمیر کی؟

(a). بلند دروازہ (b). جامع مسجد (c). آگرہ کا قلعہ (d). دیوانِ خاص

10. تعلیمی اصلاحات کا علمبر دار کس مغل حکمراں کو کہا جاتا ہے؟

(a). اورنگ زیب (b). جہانگیر (c). شاہ جہاں (d). اکبر

13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ظہیر الدین محمد بابر کے تیمور اور چنگیز خان سے تعلق پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
2. ظہیر الدین محمد بابر کی سوانح عمری مختصراً بیان کیجیے۔
3. نصیر الدین محمد ہمایوں کی شکست کے وجوہات کا سر سری جائزہ پیش کریں۔
4. نصیر الدین محمد ہمایوں نے کس طرح اپنی سلطنت دوبارہ حاصل کی؟ اس کا مختصر خاکہ بیان کیجیے۔
5. جلال الدین اکبر نے کس دین کو قائم کیا تھا اور اس کے بنیادی اصول پر مختصر نوٹ لکھیے۔

13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ظہیر الدین بابر کو کس نے دعوت دی اور کیوں؟ اس کا تاریخی پس منظر لکھیے۔
2. ظہیر الدین محمد بابر کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی وجوہات کا تجزیاتی جائزہ لیجیے۔
3. نصیر الدین محمد ہمایوں کی جنگی مہمات وفتوحات پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

13.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	ظہیر الدین محمد بابر مسلمان وہندو مورخین کی نظر میں	:	سید صباح الدین عبد الرحمن
2.	تاریخ فرشتہ	:	محمد قاسم فرشتہ
3.	ہندوستان پر مغلیہ حکومت	:	مفتی شوکت علی فہمی
4.	مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال	:	آر۔پی۔ترپاٹھی
5.	بابر نامہ	:	محمد ظہیر الدین بابر اُردو ترجمہ از محمد قاسم صدیقی
6.	تزک بابری	:	محمد ظہیر الدین بابر اُردو ترجمہ از مرزا نصیر الدین حیدر
7.	دین الٰہی آغاز سے انجام تک	:	شاہد مختار
8.	دین الٰہی اور اس کا پس منظر	:	محمد اسلم

اکائی 14: مغل حکومت (اہم حکمراں-2)

اکائی کے اجزا:

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 شہنشاہ نورالدین جہانگیر

14.2.1 شہنشاہ کے ابتدائی حالات

14.2.2 مظلوموں کے لیے زنجیر عدل

14.2.3 جہانگیر کے بارہ احکامات

14.2.4 جہانگیر کا نور جہاں سے نکاح

14.2.5 ہندوستان میں طاعون کی بیماری

14.2.6 ہیروں کی کان پر قبضہ

14.2.7 جہانگیر کا کردار

14.3 محی الدین محمد اورنگ زیب

14.3.1 اورنگ زیب اور داراشکوہ میں دشمنی

14.3.2 اورنگ زیب کی شخصیت اور کارنامے

14.3.3 اورنگ زیب کی تاج پوشی

14.3.4 موسیقی کی ممانعت

14.3.5 ہندوؤں پر دوبارہ جزیہ کا ٹیکس

14.3.6 اورنگ زیب کے ابتدائی دور حکومت کی فتوحات

14.3.7 اورنگ زیب کا دور حکومت اور اس کا نظام

14.3.8 وصیت نامہ

14.3.9 اورنگ زیب کی موت
14.4 اکتسابی نتائج
14.5 نمونہ امتحانی سوالات
14.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
14.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا بانی اول شہنشاہ ظہیر الدین بابر تھا۔ جس نے نازک ترین حالات میں مبتلا ہونے کے باوجود مٹھی بھر سپاہیوں کے ذریعہ اس برصغیر میں ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس کے فرمانروا صدیوں تک اس ملک پر شان اور دبدبے کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔ ظہیر الدین بابر اپنے دور کا نہایت ہی حوصلہ مند بادشاہ ہوا ہے۔ جو بار بار گرا اور گر کر سنبھلا۔ جس نے سخت ترین مصیبت ومشقت جھیلنے کے باوجود اس کے پایہ استقلال میں ذرہ برابر تزلزل نہیں آیا۔ اس کی حوصلہ مندی اور ہوش مندی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ فرغانہ کی چھوٹی سی ریاست کے ایک معمولی سے رئیس سے ترقی کرتے کرتے ایک بہت بڑی مملکت کا شہنشاہ بن گیا۔

بابر کی خوش نصیبی تھی کہ اسے زیادہ مدت تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیوں کہ ہندوستان میں لودھی حکومت کے خلاف اچانک ہندوستانی امرا اور عمال میں سخت ناگواری پیدا ہوئی جس کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر بابر نے لودھی حکومت کے خلاف 1526ء میں ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ جو کہ پانی پت کے تاریخی میدان میں اس نے ابراہیم لودھی کو شکست دے دی۔ چنانچہ لودھی کی اس شکست کے بعد ہندوستان سے لودھی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد بابر نے اور پھر اس کے بیٹے ہمایوں نے کئی ریاستوں کو فتح کر کے ہندوستان میں اپنی حکومت کو مستحکم کر دیا۔ اسی طرح بعد کے حکمرانوں نے بھی کئی جنگیں لڑی اور فتوحات حاصل کر کے اپنے دائرے کو وسیع کیا۔ انہی حکمرانوں میں ایک حکمراں اکبر کا بیٹا سلیم بھی گزرا ہے جس کو دنیا شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے نام سے یاد کرتی اور جانتی ہے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ مغل حکمراں جہانگیر اور اورنگ زیب کے عہد میں کیا کارنامے انجام دیے اسی طرح اس عہد کی خصوصیات سے آگاہی حاصل ہو گی۔ اس عہد میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں مثلاً انتظام وانصرام، قیام امن، اصلاح کی جدوجہد اور

بغاوت ان سب کے بارے میں جانیں گے۔

14.2 شہنشاہ نورالدین جہانگیر

اکبر نے اپنی وفات سے تھوڑی دیر قبل یوں تو اپنے سامنے ہی شہزادہ سلیم کو بادشاہ بنا دیا تھا۔ لیکن اس کی باقاعدہ تخت نشینی کی رسم 1605ء کو ہوئی۔ 38 سال کی عمر میں دارالسلطنت آگرہ میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ انجام دی گئی۔ تخت نشین کے وقت شہزادہ سلیم اپنے لیے شہنشاہ نورالدین جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔

14.2.1 شہنشاہ کے ابتدائی حالات

شہنشاہ کے کارناموں کو بیان کرنے سے قبل اس کے ابتدائی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اکبر کے یہاں 38 سال تک کی عمر میں کوئی اولاد نہ تھی۔ جو بچہ پیدا ہوتا مر جاتا تھا۔ اکبر کو لوگوں نے بتایا کہ اگر ہندوستان کے روحانی شہنشاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار مبارک پر تشریف لے جاکر اولاد کے لیے تمنا کرے تو اس کی دعا قبول ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اکبر اجمیر شریف گیا اور اس نے یہ منت مانی کہ اگر مجھے اللہ نے جیتے جاگتے اولاد سے نوازا تو میں آگرہ سے اجمیر تک پیدل حاضری دوں گا۔ چنانچہ اس نے جہانگیر کی پیدائش کے بعد اس منت کو پورا کیا۔

آگرہ کے قریب قصبہ سیکری میں ایک مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی رہتے تھے اکبر نے ان سے بھی بیٹے کے لیے دعا کروائی اور یہ عہد کیا کہ جو بھی پہلا بیٹا ہوگا اسے آپ کے قدموں میں ڈال دے گا۔ چنانچہ جب ولادت کا وقت قریب ہوا تو اکبر نے رانی جودھابائی کو حضرت شیخ کے گھر قصبہ سیکری میں بھیج دیا۔ جہانگیر کی پیدائش شیخ کے گھر قصبہ سیکری میں 17 / ربیع الاول 977ھ بمطابق 1549ء میں پیدا ہوا۔ اس لیے اس کا نام شیخ سلیم کے نام پر "سلیم" رکھا گیا۔ مگر اکبر ہمیشہ شیخ کی وجہ سے ان کے احترام کے پیش نظر کبھی بیٹے کو سلیم کہہ کر نہیں پکارتا بلکہ ہمیشہ شیخ جی یا شیخو بابا کہا کرتا تھا۔ جہانگیر کے پیدائش کے بعد اکبر کو شیخ سلیم الدین سے کافی عقیدت ہوگئی تھی اس لیے اس نے شیخ کے مسکن قصبہ سیکری کو ایک خوبصورت شہر بنا دیا۔

چار سال کی عمر میں جہانگیر کو پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا۔ اور اس کی تعلیم کا اکبر نے بہتر انتظام کیا۔ اتالیقی کی ذمہ داری بیرم خان کے فرزند عبدالرحیم خانخاناں کے سپرد کی گئی اور 8 برس کی عمر جہانگیر کو منصب دہ ہزاری عطا ہوا۔

پندرہ برس کی عمر میں جہانگیر کی پہلی شادی 1585ء میں راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے ہوئی۔ دوسری شادی 1586ء میں راجہ اودے سنگھ کی بیٹی سے ہوئی۔ جہانگیر کا سب سے بڑا لڑکا خسرو بھگوان داس کی لڑکی سے پیدا ہوا۔ دوسرا لڑکا پرویز اس کی تیسری بیوی سے ہوا جو زین خان کوکا کی بیٹی تھی۔ جہانگیر کا تیسرا بیٹا خرم جسے دنیا شاہجہاں کے نام سے جانتی ہے راجہ اودے سنگھ کی لڑکی سے پیدا ہوا۔ اکبر نے خرم کو بیٹا بنا لیا تھا۔ جہانگیر کے دو بیٹے خواصوں سے بھی پیدا ہوئے تھے۔ جن کا نام جہاندار اور شہریار تھا۔

1596ء میں اکبر نے راجہ اودے پور کی سرکوبی کے لیے ایک مہم بنائی اور اس کا سپہ سالار جہانگیر کو مقرر کیا۔ لیکن راستہ میں ہی

راجہ مان سنگھ اور دوسرے امرائے سلطنت نے مشورہ دیا کہ اس مہم کو سر کرنے کے بجائے آگرہ میں جو تخت خالی پڑا ہے اس کی طرف رخ کرے اور اس کے بعد وہاں سے الہ آباد اور بنگال کی جانب متوجہ ہو۔ جہاں بغاوتیں برپا ہیں۔ چنانچہ اکبر کو جہانگیر کے اس مہم چھوڑنے کا رنج ہوا۔ چنانچہ جہانگیر نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دی کیوں کہ وہ آگرہ کا قلعہ فتح کرنا چاہتا تھا۔ مگر قلیج خان کے مشوروں سے وہ اودھ اور بہار کی جانب چلا گیا اور وہاں جا کر باغیانہ سرگرمیاں شروع کر دیں اور اسی اثنا میں ابوالفضل کا قتل بھی کروا دیا۔ ابوالفضل سے جہانگیر کی دشمنی کے دو سبب تھے۔ پہلا تو یہ کہ جہانگیر کو یہ یقین تھا کہ ابوالفضل اکبر کو اس کے خلاف بھڑکاتا تھا اور دوسرے یہ کہ جہانگیر کو اس کے ملحدانہ عقائد سے سخت نفرت تھی جس نے اس کے باپ کو قطعی بے دین اور ملحد بنا دیا تھا۔ مزید ایام گزرنے کے بعد جب اکبر نے جہانگیر کو طلب کیا تو وہ بہت گھبرایا لیکن حکم کی تعمیل ضروری تھی اس لیے اپنی حفاظت کے لیے ایک بڑا لشکر ساتھ لے کر دارالسلطنت کی جانب روانہ ہوا۔ اکبر کو جب اس کی اطلاع ملی تو باپ بیٹے کے درمیان مزید بدمزگی پیدا نہ ہو جائے اکبر نے بیٹے کو خط لکھا کہ "اگر تجھے آنا ہے تو تن تنہا آ۔ اور اگر کوئی تجھ کو وہم ہے تو الہ آباد واپس چلا جا۔ جب تیرے دل سے وہم دور ہو جائے تو اس وقت حاضر ہو جانا" اس کے بعد جہانگیر نے دارالسلطنت جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس واقعہ کے چند ایام گزرنے کے بعد اکبر نے سلطان بیگم کو جہانگیر کو لانے کے لیے الہ آباد بھیجا۔ سلطان نے جہانگیر کے دل سے تمام وسوسے اور اندیشے دور کر دیے جو باپ کی طرف جہانگیر کے دل میں پیدا ہو گیے تھے۔ اور جہانگیر سلطان بیگم کے ساتھ آگرہ آیا۔ اور اپنی دادی مریم مکانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی جگہ پر باپ اور بیٹے دونوں سے ملاقات ہوئی۔ باپ نے بیٹے کو گلے سے لگایا اور کہا کہ شراب نے تیری حالت بہت خراب کر دی ہے۔ کیوں کہ جہانگیر شراب بہت پیتا تھا۔ اکبر نے اس کو اپنے پاس ہی علاج کرانے کا حکم دیا اور تقریباً دس دن کے بعد جب اکبر اس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا تو اس نے جہانگیر کو آزادی دیدی کہ وہ جہاں چاہے رہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کا بھی حکم دیا کہ جو اس نے رانا کے خلاف اس مہم کو ادھورا چھوڑا تھا اس کو پایہ تکمیل تک پہونچائے۔ جہانگیر اس مہم کو سر کرنے کے لیے فوراً روانہ ہوا لیکن راجہ مان سنگھ اور خان اعظم جو جہانگیر کو بجائے خسرو کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے انہوں نے اس مہم کے لیے ضروری سامان فراہم نہ کیا جس کی وجہ سے جہانگیر کو اس مہم کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ غرض اسی طرح گاہے بگاہے جہانگیر کے حریف اکبر کو اس کے متعلق بھڑکاتے رہے تا کہ جہانگیر کو تخت شاہی پر نہ بٹھایا جائے۔ اس کے بدلے خسرو کو بادشاہ بنایا جائے۔

چند ایام گزرنے کے بعد الہ آباد میں جہانگیر کو یہ اطلاع ہوئی کہ اس کے والد اکبر بذریعہ کشتی اس کو لینے کے لیے آگرہ سے الہ آباد آرہے تھے کہ راستے میں خبر ملی کہ اکبر کی ماں مریم مکانی سخت بیمار ہو گئی ہے اس لیے اکبر واپس چلا گیا۔ اس کے آگرہ پہنچتے ہی اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی اس زحمت فرمائی اور دادی کی موت کی خبر سننے کے بعد جہانگیر بے چین ہو کر فوراً آگرہ روانہ ہوا اور باپ سے ملاقات کی ۔باپ بڑی شفقت سے پیش آیا جس سے مخالفوں کو بڑا صدمہ پہونچا۔

جہانگیر کے آگرہ پہونچنے کے بعد جہانگیر کے مخالفوں نے اکبر کو جہانگیر سے بدظن کرنے کے لیے کئی ایک تدبیریں کیں۔ ہاتھیوں کی لڑائیاں کروائیں جس سے جہانگیر کے ہاتھی کو خسرو کے ہاتھی سے شکست دلوا کر جہانگیر کو اکبر کے خلاف اس کے اقبال کو بلند ہونے سے

روک سکیں گے اور پھر اکبر اس سے بد ظن ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا جہانگیر کا ہاتھی فتح یاب ہوا اور خسرو کے ہاتھی کو شکست ہوئی۔ اس سے بھی مخالفوں کو سکون نہ ملا تو انہوں نے بادشاہ کے خاصہ ہاتھیوں میں سے ایک بڑا ہاتھی منگایا، لیکن جہانگیر کے طرف دار اس کو روکنے کی کوشش کرنے لگے جس سے اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا جس سے اکبر کبیدہ خاطر ہو کر محل کے اندر چلا گیا۔ اور اسے بخار ہو گیا یہاں تک کہ اس کے بخار نے شدت اختیار کر لی۔ جہانگیر کو جب باپ کی علالت کی اطلاع ملی تو وہ مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا اور عیادت کر کے واپس چلا گیا۔ دوسرے دن عیادت کی کوشش کی تو مان سنگھ اور اعظم خان نے اس کو ملنے نہ دیا اور بلا عیادت کے واپس آ گیا۔ اسی طرح روز بروز اس کے مخالف اپنی تدبیریں کرتے رہیں۔ لیکن اکبر ان تدابیر کو سمجھ گیا۔ فوراً جہانگیر کی طلبی کا حکم دیا۔ جہانگیر دوڑتا ہوا باپ کی خدمت میں پہونچا اور قدموں میں سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ اکبر نے لیٹے لیٹے کو گلے سے لگایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے بیٹے کو شاہی تلوار اور دستار عطا کر کے حکم دیا کہ دستار پہنو، تلوار لگاؤ۔ میں نے تم کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا۔ جہانگیر حکم کی تعمیل کرتا جاتا اور روتا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ اکبر نے اس آخری ایام میں اس خطرناک ہنگامہ کو فرو کر دیا جو راجہ مان سنگھ اور خان اعظم خسرو کے نام پر کھڑا کرنا چاہتے تھے۔

14.2.2 مظلوموں کے لیے زنجیر عدل

اکبر کے زمانے سے ہی جہانگیر نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ مظلوم عوام اپنی فریاد کو لے کر بادشاہ تک نہیں پہونچ پاتے۔ کیوں کہ درباری امرا ان کو بادشاہ کے دربار تک جانے نہیں دیتے۔ اس لیے مظلوموں کی فریاد بادشاہ تک نہیں پہونچ پاتی۔ مظلوموں کی فریاد کو بذات خود سننے کے لیے اس نے ایک زنجیر لگوائی جس کا نام زنجیر عدل رکھا۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ مظلوم اور فریادی اس زنجیر کو کھینچنے کے بعد بادشاہ سے براہ راست مخاطب ہو سکتا تھا۔ اور بادشاہ خود اس کی فریاد سماعت کر سکتا تھا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ زنجیر سونے کی تھی اور اس کا طول تیس گز تھا اور وزن میں چار من تھی۔ اس زنجیر میں ساٹھ گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں جب کوئی مظلوم یا فریادی اس گھنٹی کو کھینچتا تو یہ گھنٹے بجنے لگتے تھے۔ اور جہانگیر خود مظلوموں کو بلا کر ان کی فریاد سنتا۔

جہانگیر کے زنجیر عدل کے علاوہ اس نے خفیہ پولیس کا بھی بہترین انتظام کر رکھا تھا یہ خفیہ نویس صرف دربار ہی تک محدود نہیں تھے بلکہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے جہانگیر کو ہر بری اور اچھی خبر موصول ہوتی رہتی تھی۔ اس خفیہ نویسوں کی سرگرمیوں سے ملک کی نظم و نسق پر بہت اثر پڑا۔ ملک میں ظلم و ستم جو غریبوں پر ہوتے رہے وہ کافی حد تک ختم ہو چکے تھے۔

14.2.3 جہانگیر کے بارہ احکامات

زنجیر عدل کے علاوہ جہانگیر نے نہایت مفید بارہ احکامات جاری کیے اور حکم دیا کہ ساری سلطنت میں ان بارہ احکامات پر سختی سے عمل کیا جائے۔

1. زکوٰۃ، تمغہ اور تیر بحری کے نام سے جو محصول شاہی سرکار لیتی تھی اس کو بند کر دیا جائے وصول نہ کیا جائے راستوں کا محصول، دریاؤں گھاٹوں کا محصول، شہر اور قصبوں کی رعایا سے چنگی اور بندرگاہوں سے جو مال ہندوستان میں آئے اس پر کوئی محصول نہ لیا جائے۔ ان تمام محصولات کو بند کر دیا جائے۔

2. جن راستوں پر ڈاکہ زنی اور چوری ہوتی ہو ان راستوں پر سرائے خانے یا مسجد بنوائی جائیں اور ان علاقوں کو آباد کرنے کا اور کنویں کھدوانے کا انتظام کیا جائے تاکہ مسافروں کو بھی آرام ملے۔ اور چور ڈاکوؤں کا بھی انسداد ہو جائے۔

3. تمام ممالک محروسہ میں اگر کسی کا بھی انتقال ہو جائے وہ کسی بھی عقیدہ کا ہو اس کا مال واسباب ان کے ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے اور اس کے لیے ایک تحویلدار مقرر کر دیا جائے اور اگر مرنے والا لاوارث ہو تو اس کے مال کو سرکاری کاموں کے بجائے رفاہی کاموں میں استعمال کیا جائے۔ اگر کوئی مسلم ہو تو اس کے مال سے مسجد یا سرائے وغیرہ بنوائی جائیں اور اگر کسی غیر عقیدہ کا ہو تو اس سے تالاب کھدوائیں جائیں اور سرائے خانے وغیرہ بنوائیں جائیں۔

4. گرچہ یہ بات تاریخ میں بیان ہے کہ جہانگیر خود شراب نوشی کرتا تھا لیکن اس نے شراب اور اس جیسی نشہ آور چیزوں پر پابندی لگا دی تھی تاکہ اس کی رعایا نشہ بازی سے دور رہے اور ممالک محروسہ میں امن وامان قائم رہے۔ اس نے یہ احکام صادر کیے کہ ممالک محروسہ میں نہ کوئی شخص شراب، بھنگ اور نہ اس جیسی کوئی چیزیں بنائے اور نہ ہی اس کی تجارت کرے اور نہ ہی اس کو استعمال میں لائے۔ اس نے اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ گرچہ میں اٹھارہ برس کی عمر سے اب تک شراب پیتا ہوں لیکن میں اپنی رعایا کو اس سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔

5. رعایا کسی قوم یا کسی بھی مذہب کی ہو اس کے ذاتی مکان کو سرکاری آدمی نزولی نہ بنائے۔ اگر سرکاری کام کے لیے کسی کی جگہ یا زمین یا مکان کی ضرورت ہو تو اس کے مالک کو منھ مانگی رقم دے کر خرید لیا جائے۔ کوئی سرکاری ملازم کسی کے ساتھ جبر نہ کرے۔

6. کسی مجرم کو ناک، کان کاٹنے کی سزا نہ دی جائے۔ خود میں نے بھی بارگاہ الٰہی میں عہد کیا ہے کہ کسی شخص کو اس قسم کی سزا نہیں دوں گا۔

7. کوئی جاگیر دار شاہی عامل یا اس کے ملازم رعیت کی کسی زمین کو چھین کر خود اس میں کاشت نہ کرے۔

8. شاہی عامل اور جاگیر دار جس پرگنہ کے حاکم ہوں حکم شاہی کے بغیر وہاں کے لوگوں کے ساتھ رشتہ نہ کریں۔

9. بڑے بڑے شہروں میں شفاء خانے بنائے جائیں اور اس میں علاج کے لیے طبیب مقرر کیے جائیں اور مریضوں کو دوا اور غذا مفت ملا کرے یہ سارا خرچہ شاہی خزانے سے ادا کیا جائے۔

10. میرے والد کے طریقہ کے موافق ہر سال 18 / ربیع الاول سے جو ان کی پیدائش کی تاریخ ہے عمر کے ہر سال کے لیے ایک روز شمار کر کے یعنی مسلسل 63 / دن ممالک محروسہ میں کوئی بھی جانور ذبح نہ ہو نیز اتوار کے روز بھی کوئی جانور ذبح نہ کیا جائے۔ کیوں کہ یہ میرے والد کے ولادت کا دن ہے۔

11. میران صدر جہاں میرے والد کے زمانے میں عرصہ دراز تک ان علماء اور اماموں کی تنخواہ کا منتظم رہا ہے۔ اس کو اسی عہدہ پر برقرار رکھا جائے۔ یہ ہندوستان کا صحیح النسب سید ہے۔ اس کو حکم دے دیا گیا کہ وہ مستحقوں کو خود سامنے بلا کر دیا کرے۔

12. جیل خانوں اور قلعوں میں جتنے آدمی قید ہیں وہ سب رہا کر دیے جائیں۔

ان بارہ احکامات کے علاوہ جہانگیر نے ان تمام محصولوں اور قوانین کو منسوخ کر دیا جن سے رعایا کو تکلیف ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ جہانگیر نے یہ بھی پابندی لگادی کہ جس علاقے یا گاؤں میں چوری یاڈاکوؤں کا حملہ ہو اس علاقے کے باشندے کے اوپر لازم ہے کہ وہ چور یاڈاکوؤں کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے مجبور کیا جائے۔

تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے امرائے سلطنت کو خطابات، عہدے اور انعامات عطا کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ چنانچہ اس نے اپنے بڑے بیٹے خسرو کو ایک لاکھ روپیہ عطا کیا۔ سعید خان کو پنجاب کی حکومت سونپی۔ فوج کے افسر اعلیٰ کو شیخ فرید بخشی کو سابقہ عہدہ جلیل پر برقرار رکھا۔ اور اس طرح سے بہت سارے لوگوں کو انعامات و کرامات سے نوازا۔ یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کو بھی بہت سارے منصب عطا کیے۔ راجہ مان سنگھ اس کا سب سے بڑا مخالف تھا اس کو اس نے صوبہ بنگال کا گورنر مقرر کیا۔ بیر داس کو میر آتش کا عہدہ دیا۔

14.2.4 جہانگیر کا نور جہاں سے نکاح

جہانگیر جس کے دل میں مہر النساء کی محبت نے گھر کر لیا تھا۔ اس نے شیر افگن کے قتل کے بعد مہر النساء کو نکاح کا پیغام بھیجا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ دراں حالانکہ مہر النساء کے دل میں بھی جہانگیر کی محبت تھی۔ لیکن شیر افگن کے واقعہ نے وقتی طور پر اس کی محبت کو نفرت میں بدل دیا تھا۔ مہر النساء کے انکار کے بعد جہانگیر نے اس غم کو بھلانے کے لیے راجامان سنگھ کے بیٹے جگت سنگھ کی بیٹی سے نکاح کر لیا۔ تین چار سال بعد جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے مختلف ذرائع سے مہر النساء کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ مہر النساء اس کے عمدہ رویے کی وجہ سے اس سے نکاح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئیں اور 1611 میں ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد جہانگیر نے پہلے تو مہر النساء کو نور محل کا خطاب دیا۔ اس کے بعد نور جہاں کا خطاب عطا ہوا۔ جہانگیر کے حرم گرچہ نہایت خوبصورت حسین و جمیل بیٹیاں تھیں لیکن نور جہاں کے مقابلے میں سب ہیچ تھیں۔

14.2.5 ہندوستان میں طاعون کی بیماری

جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان میں طاعون کی وبا پھیلی اور 1616ء میں پہلی مرتبہ پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں پھیلی اور وہاں سے لاہور پہنچی۔ اس وبا کے بارے میں جہانگیر اپنی تزک جہانگیری میں رقم طراز ہے کہ: ”اس سال ہندوستان کے بعض مقامات پر ایک وبائے عظیم پھیلی ہے۔ پنجاب سے اس کا ظہور ہوا اور رفتہ رفتہ شہر لاہور میں آئی۔ اس وبا سے بہت سے ہندوستانیوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ پھر یہ وبا رفتہ رفتہ دہلی کے اطراف تک آپہنچی۔ بہت سے قصبوں اور شہروں کو اس نے ویران کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی میت کو ہاتھ لگاتا یا اس کے کپڑوں کو چھوتا تو وہ بھی زندہ نہ بچ پاتا۔ غرض یہ کہ اس کا ہلکا اثر بھی کسی پر ہوتا تو وہ زندہ نہ بچتا تھا۔ ہندوستان کا کوئی بھی صوبہ اس وبا سے خالی نہیں تھا۔

جہانگیر کو سیاحت کا بہت شوق تھا جب وہ دکن اور اودے سے پوری طرح مطمئن ہو گیا اس نے سیاحت شروع کر دی اور ملک کے مختلف گوشوں میں سیاحت کرتا رہا۔ اجمیر گیا اس کے بعد گجرات کا رخ کیا وہاں کے قیام کے بعد کشمیر کا رخ کیا پھر وہاں سے دلی آیا اور چند دن قیام کرنے کے بعد پھر دوبارہ کشمیر کا ارادہ کیا اور وہاں جا کر کئی ساری عمارتیں تعمیر کروائیں۔ غرض یہ کہ بادشاہ کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں

وقف ہونے لگا۔

14.2.6 ہیروں کی کان پر قبضہ

صوبہ بہار پٹنہ میں ایک مقام کھوکھر تھا جہاں بہترین قسم کے ہیرے نکلتے تھے۔ اس علاقے پر "درجن سول" نامی شخص نے قبضہ کرر کھا تھا۔ جس نے مغل افسروں کو ناجائز رشوت دے کر قبضہ جما لیا تھا۔ درجن سول کی حیثیت کسی راجہ سے کم نہیں تھی اس نے باقاعدہ فوج چھوڑ رکھی تھی۔ جب جہانگیر کو اس بارے میں پتہ چلا تو اس نے ابراہیم خان کو اس پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ چنانچہ 1615ء میں اس نے حملہ کر کے فوراً قبضہ جما لیا۔ اس کان سے بڑے بڑے قیمتی ہیرے نکلتے تھے۔

اسی طرح جہانگیر نے بہت ساری جنگیں کیں اور فتوحات بھی اس کے حصے میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر جب مہابت خان کی قید میں تھا اس وقت شہزادہ پرویز کی موت کی خبر اس کے سامنے آئی جس سے جہانگیر کو کافی رنج و صدمہ پہونچا۔ اس صدمے کی وجہ سے جہانگیر کی صحت خراب ہوتی چلی جارہی تھی۔ چنانچہ مہابت خان کی گرفت سے وہ نکل کر آیا تو اس وقت اس کی صحت کافی گرچکی تھی۔ صحت کی درستی کے لیے وہ کشمیر چلا گیا لیکن وہاں کے موسم اور آب وہوا اس کو راس نہیں آئی۔ دمہ کے پرانے عارضہ نے خطرناک صورت اختیار کرلی غرض یہ کہ جہانگیر اس قدر کمزور پڑ گیا کہ گھوڑے ہاتھی پر تو درکنار پالکی میں بھی بیٹھنا مشکل ہوتا تھا۔ افیون اس نے قطعی چھوڑ رکھی تھی اور شراب بھی تقریباً موقوف کرر کھا بس کبھی جی چاہا تو ہلکی سی ایک دو جام لے لیا کرتا۔

جب بادشاہ کس قدر کمزور ہو گیا تو اس نے سوچا کہ کشمیر کی سردی کی وجہ سے اس کے مرض میں اضافہ نہ ہو جائے تو اس کے لیے اس نے میدانی علاقے میں جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ کشمیر سے لاہور کی جانب روانہ ہو گیا۔ لیکن راستہ میں ہی اس کی حالت بگڑ گئی اور 28 اکتوبر 1627 کو منزل جنکر تہی میں اس کا ساٹھ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس نے 22 برس حکومت کی۔ انتقال کے بعد جہانگیر کی نعش کو لاہور لایا گیا اور وہ نور جہاں کے باغ میں دفن کیا گیا۔

14.2.7 جہانگیر کا کردار

جہانگیر کے ذاتی کیرکٹر کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے بذات خود تزک جہانگیری میں اپنی اچھی اور بری ساری صحبت کا تذکرہ کیا۔ وہ کوئی بہادر اور جانباز سپاہی تو نہ تھا لیکن ایک نہایت ہی منصف مزاج حکمراں ضرور تھا۔ انصاف کے معاملے میں وہ کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ نور جہاں بھی جو اس کے دل ودماغ پر چھائی ہوئی تھی اسے بھی جھڑک دیتا تھا۔ مذہبی معاملہ میں وہ ایک وسیع النظر سنی عقیدہ کا مسلمان تھا۔ اس نے اپنے باپ کی طرح کبھی بے دینی اور الحاد کو پسند نہیں کیا۔ مرتے دم تک شراب پیتا رہا لیکن شراب نوشی کو عیب سمجھتا رہا۔ وہ علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ شعر وشاعری سے بھی اسے کافی لگاؤ تھا اور مصوری سے بھی اسے فطری لگاؤ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بڑھیا جو بے حد غریب تھی، کئی وقت کی بھوکی تھی۔ نور جہاں سے امداد طلب کرنے گئی لیکن نور جہاں اس وقت کافی غصہ میں تھی اس لیے اس کی طرف توجہ نہیں دے رہی تھی۔ اسی اثنا میں بڑھیا نے یہ کہہ دیا کہ جو غریبوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔ اتنا سننے پر ملکہ اور برہم ہو گئی اور بڑھیا کو مارنے کا حکم دے دیا جب یہ خبر جہانگیر کو پتہ چلی تو اس نے یہ کہا کہ گرچہ کہ تم

مجھکو بہت عزیز ہو لیکن تم کو رعایا پر ظلم کرنے کی وجہ سے عام مجرموں کی کی طرح سزا دی جائے گی۔ لہٰذا اسے چھ مہینے قید کا حکم سنا دیا۔ لیکن چھ گھنٹے کے بعد اراکین سلطنت کے کہنے سے رہا کر دی گئی بعد میں ملکہ نے بڑھیا سے معافی مانگی اور دو سو روپے بطور امداد عطا کیے۔

جہانگیر کی یہ بھی خاصیت تھی کہ وہ بھیس بدل کر رعایا کی اندرونی حالت کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ ایسے بہت سے واقعات تزک جہانگیری میں رقم طراز ہیں جس سے جہانگیر کے اخلاقی اقدار اور انصاف پسند ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

14.3 محی الدین محمد اورنگ زیب

شاہ جہاں اور ممتاز محل کی ساتویں اولاد حاکم کی شکل میں دس سال تک اور حکمراں کے طور پر پچاس سال تک حکومت کرنے والا ابو المظفر محمد محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی پیدائش گجرات کے شہر دبد میں بعض تاریخ کے مطابق اجین کے نزدیک دبد میں 24 اکتوبر 1618ء میں ہوئی تھی۔

تعلیم و تربیت

اورنگ زیب کی تعلیم لائق اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی جن استادوں نے اسے علم کے زیور سے آراستہ کیا ان میں مولانا عبد اللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، علامہ سعد اللہ، ملا موہن بہاری، مولانا سید محمد قنوجی وغیرہ جیسے لوگ شامل تھے۔ ملا موہن کا اصلی نام محی الدین تھا صوبہ بہار کے شہر بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ شاہ جہاں کے دربار سے منسلک ہوئے تو اورنگ زیب کی تعلیم کی خدمت ان کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اورنگ زیب حافظ قرآن بھی تھا۔ تیموری بادشاہوں میں یہ سعادت صرف انہی کو حاصل ہے۔ اورنگ زیب نے چالیس سال کی عمر میں حفظ کیا اور اورنگ زیب کو فن خطاطی کا بھی شوق تھا اور اس میں ان کو حد درجہ مہارت بھی حاصل تھی۔ یہ فن انہوں نے سید علی خاں الحسینی اور عبد الباقی سے سیکھا تھا۔ اورنگ زیب نے یہ فن صرف اپنی ذاتی دلچسپی کے لیے نہیں سیکھا تھا بلکہ اس سے دین کی سعادت حاصل کرنے کے لیے سیکھا تھا۔ اوقات فرصہ میں صبح 5 بجے سے 7 بجے تک اور دوپہر ڈھائی بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک قرآن کریم کے نسخے لکھتے تھے۔ یہ سلسلہ شہزادگی کے دور سے اپنے آخری عمر تک رہا۔ اورنگ زیب فارسی، عربی، ترکی اور ہندوستانی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔

چودہ برس کی عمر میں اس نے ہاتھی کی لڑائی کے سلسلے میں اس وقت حملہ کر دیا جب سارے شہزادے خوفزدہ ہو کر بھاگ گیے تھے۔ ہاتھی پر قابو پانے کے بعد جب وہ شاہجہاں کے پاس آیا تو پیار سے ڈانٹتے ہوئے والد نے اسے تنبیہ کی۔ اورنگ زیب نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ جنگ میں فوت ہو جانا ڈر کے بھاگ جانے سے تو بہتر تھا۔

14.3.1 اورنگ زیب اور داراشکوہ میں دشمنی

اورنگ زیب عمر میں داراشکوہ سے چار سال اور شاہ شجاع سے دو سال چھوٹا تھا۔ دونوں بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہونے کے باوجود اس قدر ذہین تھا کہ دونوں بھائی اس کو اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ داراشکوہ نے اسے دارالسلطنت سے دور رکھنے کے لیے اپنی

چالبازی سے اسے دکن بھجوادیا تھا۔ جس سے اورنگ زیب کو سخت ناگواری پیدا ہوئی۔ داراشکوہ کو اس سے بھی تسلی نہیں ہوئی تو اس نے اپنے باپ شاہ جہاں کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ شاہ جہاں کو اتنا متنفر کر دیا کہ شاہ جہاں نے اورنگ زیب کے وکیل عیسیٰ کو جو دربار میں رہتا تھا اس کو قید کرادیا تھا۔ داراشکوہ کی مخالفت کی وجہ سے اورنگ زیب کو دکن کی گورنری سے معزول کر دیا گیا تھا۔ اس کی ساری جاگیر ضبط کر لی گئی۔ ان ذاتی وجوہ کے علاوہ داراشکوہ اور اورنگ زیب میں عقائد بھی زبردست اختلاف تھا۔ داراشکوہ جس کو تصوف سمجھتا تھا اورنگ زیب اس کو کھلا ہوا الحاد سمجھتا تھا۔ اورنگ زیب کے نزدیک داراشکوہ اسلام سے منحرف ہو کر بے دین ہو چکا تھا۔ اس کے برخلاف اورنگ زیب کٹر مسلمان تھا۔

14.3.2 اورنگ زیب کی شخصیت اور کارنامے

13 دسمبر 1634ء کو دس ہزار گھوڑوں کا شاہی منصب دار بنایا گیا۔ گجرات کی صوبہ داری دو سال کرنے کے بعد اورنگ زیب 21 جنوری 1647ء کو بلخ اور بدخشاں کا صوبہ دار اور سپہ سالار مقرر ہوا۔ اورنگ زیب اپنے طاقتور دشمن کا مقابلہ بھی صبر تحمل، مضبوطی اور پورے نظم کے ساتھ کرتا تھا۔ بدخشاں کا صوبہ دار مقرر ہونے کے بعد اس صوبے کے سلطان کو شاہ جہاں کی ماتحتی قبول کرنے کے لیے اس نے چڑھائی کر دی جب نماز کا وقت آیا تو اپنے گھوڑے سے اتر کر ہی میدان جنگ میں چادر بچھادی اور نماز ادا کرنے لگا۔ اس منظر کو دیکھ کر بخارا کی فوج دنگ رہ گئی۔ وہاں کا بادشاہ فوراً چیخنے لگا فوراً جنگ بند کر دو ایسے انسان سے لڑنا اپنی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ بلخ کی اس جنگ کے بعد اورنگ زیب ملتان اور سندھ کا صوبہ دار رہا۔

14.3.3 اورنگ زیب کی تاج پوشی

اورنگ زیب نے یہ طے کیا تھا کہ وہ اس وقت تک اپنی تاجپوشی کا جشن منعقد نہیں کرے گا جب تک اسے اپنے دشمنوں پر کامل فتح حاصل نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ اورنگ زیب جب شاہ شجاع کو شکست دے چکا۔ راجپوت جسونت سنگھ کو مطیع کر لیا اور داراشکوہ کو شکست دینے کے بعد وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا تو اس نے اپنی تاج پوشی کا ارادہ بنایا۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کی رسم نہ تو کسی قلعہ میں انجام دی گئی نہ ہی شاہی محل میں بلکہ وہ نہایت ہی سادہ طریقے سے دہلی کے قریب "باغ المزا" یعنی میدان جنگ سے واپسی میں تخت نشین ہوا جب کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لیے ترتیب دے رہا تھا۔ جانشینی کے موقع پر وہ دکن کا صوبہ دار تھا۔ اپنے تین بھائیوں داراشکوہ، شجاع اور مراد کو شکست دی اور اپنے والد کو محل ہی میں نظر بند کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ 15 جون 1659ء کو اورنگ زیب کی تاج پوشی ہوئی اور "ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالم گیر غازی" کا لقب اختیار کیا، نیا سکہ جاری کیا اور امرائے سلطنت کو خلعتوں اور منصوبوں سے نوازا گیا۔ جشن کے چند روز بعد ہی اورنگ زیب کو جب یہ اطلاع ملی کہ داراشکوہ گرفتار کر لیا گیا ہے تو اس نے اپنے جشن کی توسیع کر دی اور چار مہینے تک تقریباً اس کا جشن مناتا رہا۔ تاج پوشی کے اس طویل جشن ہی میں داراشکوہ کو قید کر کے لایا گیا اور اس کو سزائے موت دی گئی۔

تاج پوشی کے بعد اورنگ زیب کی اصلاحات

تاج پوشی کی رسم ادائیگی کے بعد اورنگ زیب ملک کی اصلاحات کی جانب متوجہ ہوا۔ اس مقصد کے لیے چند نئے قوانین اور ضابطے مقرر کیے گیے۔ 1661ء میں اس نے محکمہ دینیات کھولنے کا حکم دیا۔ جس کا کام عوام کو دینی باتوں سے باخبر کرنا اور غیر اسلامی رسوم سے باز رکھنا۔ اکبر کے زمانے سے سال وماہ کا حساب شمسی تھا۔ اس نے اس کو قمری ماہ سال میں تبدیل کیا۔ فواحشات اور منشیات کی روک تھام کے لیے قوانین اخذ کیے۔ منشیات کے استعمال اور تجارت پر روک لگادی۔

14.3.4 موسیقی کی ممانعت

1668ء میں اورنگ زیب نے نئے احکامات جاری کیے اور گانے بجانے پر مملکت میں مکمل طور پر پابندی عائد کردی گئی۔ شاہی لوگوں کو انعام وکرام دے کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا گیا۔ اسی طرح ایام محرم میں تابوت نکالنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ چوں کہ برہان پور میں ایام محرم میں تابوت نکالنے پر مسلمانوں میں خانہ جنگی ہو جایا کرتی تھی۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ آئندہ سے تابوت یا اس قسم کی کوئی بھی چیز ایام محرم میں نکالی جائے۔ اسی طرح اس نے یہ حکم بھی نافذ کر دیا کہ عام شہری کو بھی یہ حق ہے کہ وہ بادشاہ پر فوجداری یا دیوانی مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ اگر بادشاہ پر رعایا کا کوئی مطالبہ ہو یا بادشاہ پر کوئی الزام ہو تو بذریعہ عدالت اس کا فیصلہ ہو سکے۔

14.3.5 ہندوؤں پر دوبارہ جزیہ کا ٹیکس

اورنگ زیب کے دور میں جب ست نامیوں کا فرقہ وارانہ رنگ میں اٹھایا گیا اور اس کے اٹھانے والے سب کے سب ہندو فقیر تھے۔ اس لیے اس کا اورنگ زیب کے دل ودماغ پر بے حد اثر پڑا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اس فتنہ کو روکنے کے لیے 1672ء میں ہندوؤں پر جزیہ کا محصول عائد کر دیا جس کو اکبر نے ختم کر دیا تھا۔ جزیہ غیر مسلموں پر ایک شرعی ٹیکس تھا جو غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا۔ اس ٹیکس کے ادا کرنے والے غیر مسلم جنگی خدمت سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ شریعت اسلامیہ کے مطابق اس قسم کا ٹیکس مسلمانوں سے بھی لیا جاتا تھا جس کو زکوۃ کہتے ہیں لیکن اس ٹیکس کی ادائیگی کے باوجود مسلمان جنگی خدمت سے بری نہیں تھے ان کے لیے جنگی خدمات لازمی تھی۔

مغلوں سے قبل جزیہ کی رقم دس روپیہ سے لے کر چالیس روپیہ تک تھی لیکن اورنگ زیب کے عہد میں ساڑے تیرہ روپیے سالانہ مقرر کر دیا گیا۔ اس سے زیادہ جزیہ کسی غیر مسلم نے نہیں لیا جاتا تھا۔ جزیہ صرف خاندان کے سرپرست سے لیا جاتا تھا۔ نہ کی خاندان کے تمام افراد سے بلکہ باقی لوگ اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ غیر مسلم چوں کہ زمانہ دراز سے اس جزیہ سے مستثنیٰ تھے اس لیے جزیہ عائد کرنے کے حکم ان کو بہت ناگوار گذرا اور اس کو ان لوگوں نے محسوس کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مختلف ذرائع سے اس ٹیکس کو رفع کرنے کے لیے اورنگ زیب تک بات پہنچائی گئی لیکن اس نے ان کی نفی کر دی اور اس ٹیکس کے منسوخ کیے جانے کے لیے کسی طرح بھی راضی نہیں ہوا۔ غیر مسلموں کو یہ ٹیکس مجبوراً ادا کرنا پڑا۔ اس ٹیکس کی بنا پر ہندوؤں میں اورنگ زیب کی حکومت کے خلاف منافرت پیدا ہو گئی۔

14.3.6 اورنگ زیب کے ابتدائی دور حکومت کی فتوحات

1660ء میں اورنگ زیب کو قلعہ پرینہ بغیر خونریزی کے مل گیا۔ امیر الامراء شائستہ خان کے مطالبہ پر یہ قلعہ عادل شاہ کے حاکم غالب نے مغلوں کے حوالے کر دیا۔ قلعہ پرینہ زمانہ قدیم سے نظام الملک کے تصرف میں تھا۔ جب نظام الملک کی حکومت ختم ہو گئی تو والی بے جاپور نے اس پر قبضہ جمالیا تھا۔ اسی سال جب مغلیہ فوج داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شاہ کے تعاقب میں سری نگر پہونچی اور سری نگر کے تمام علاقوں کو پامال کر کے سلیمان شکوہ کو گرفتار کیا گیا تو سری نگر کے راجہ پرتھی سنگھ نے بھی اطاعت قبول کرلی۔ پرتھی سنگھ وہی راجہ ہے جس نے شاہ جہاں کے انتہائی کوشش کے باوجود بھی اطاعت قبول نہیں کیا تھا۔ 1661ء میں مغل فوجوں نے حملہ کر کے کھاتا کھیری کے قلع کو فتح کیا اور چکر سین جو باغی ہو گیا تھا قتل کیا گیا۔ اسی طرح آسام اور بہار کو بھی فتح کیا گیا۔

14.3.7 اورنگ زیب کا دور حکومت اور اس کا نظام

اورنگ زیب کا دور حکومت تقریباً پچاس سال رہا1658ء تا1707ء اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی نقطہ نظر سے وہ ایک سچا اور پکا مسلمان تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ ایک حکمراں بھی تھا۔ اورنگ زیب ایک دوراندیش بادشاہ تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ملک کا اکثریتی طبقہ اپنے مذہب کا سختی سے عامل ہے تلوار کے زور پر ان کو اسلام کا پیروکار نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر وہ اکثریتی طبقہ کو نقصان پہنچاتا تو ملک کے اور اتنے بڑے وسیع سلطنت کا مالک نہ بنتا۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ دہلی سلطنت سے لے کر مغل حکمرانوں میں اورنگ زیب وہ واحد بادشاہ تھا جس کی سرحد برما سے لے کر بدخشاں تک اور دکن سے لے کر کشمیر کی آخری سرحد تک قائم تھی۔ اگر وہ سخت گیر بادشاہ ہوتا تو اتنی بڑی وسیع سلطنت کا مالک نہیں بن پاتا۔

1659ء میں اس نے سکے پر کلمہ کندہ کروانا بند کروادیا۔ اس خیال سے کہ یہ سکے دونوں فریقوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اورنگ زیب نے رواداری کا بھی خیال رکھا۔ ہندوستانی زبان سیکھنے اور سکھانے کے لیے ایک ڈکشنری تیار کروائی جس کے ذریعہ فارسی جاننے والے آسانی سے ہندی زبان سیکھ سکیں۔ ہندی نظموں اور غزلوں کے متعلق قواعد واصولوں کو جاننے کے لیے ورائج کرنے کے لیے اس نے ایک خاص کتاب ترتیب دی۔

شہنشاہ اکبر نے اپنے زمانے میں یوم پیدائش منانے کا رواج عام کیا اورنگ زیب نے اس رواج کو ختم کیا۔ اسی طرح اس نے بڑے پیمانے پر مسجدیں تعمیر نہیں کروائی بلکہ قدیم مساجد کو رنگ وروغن کروایا۔ ملازم، امام، موذن وخطیب کو سرکاری خزانے سے اس نے تنخواہ جاری کروائی۔ اورنگ زیب نے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا کہ غیر مسلم اور مسلم کو ہمیشہ یکساں سزادی جائے۔ اورنگ زیب ہمیشہ انصاف کے ساتھ کام کیا۔ جیسا کہ تاریخ میں موجود ہے کہ مراٹھوں پر فتح پانے کے بعد ایک سردار محرم خان نے غیر مسلموں کو دشمن بناتے ہوئے کہا کہ ان کو اعلیٰ عہدوں سے معزول کر دیا جائے، اورنگ زیب کو لکھ کر بھیجا۔ اس بات پر اورنگ زیب نے کہا کہ ”دنیاوی معاملے کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں اگر تمہاری بات پر عمل کروں تو تمام غیر مسلم راجاؤں اور ان کے ہم نواؤں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا۔“

راجپوتوں سے تعلقات

اپنے اسلاف کی طرح اورنگ زیب نے بھی راجپوتوں سے بہتر تعلقات بنائے رکھے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش میں رہا۔ میواڑ کے رانا کا منصب 5000 سے بڑھا کر 6000 کر دیا۔ راجہ یشونت سنگھ جس نے اورنگ زیب کے خلاف جنگ میں شہزادہ شجاع اور داراشکوہ کا ساتھ دیا تھا۔ اسے اورنگ زیب نے اس کا منصب لوٹا دیا اور گجرات کا حاکم مقرر کیا۔

14.3.8 وصیت نامہ

- میرے ذریعہ سلی ہوئی ٹوپی کی قیمت میں سے چار روپیہ دو آنے محلدار آیا بیگا کے پاس ہے۔ اسے لے لو اور اس سے میرا کفن تیار کرنا۔ میرے ذاتی خرچ کی تھیلی میں قرآن نقل کرنے کے ہدیے تین سو پچاس روپئے ہیں۔ میری وفات کے بعد اس کو محتاجوں میں بانٹ دینا۔
- مجھ گنہگار شخص کو ننگے سر قبر میں دفن کرنا کیوں کہ اللہ رب العزت کے سامنے کھلے سر جانے والے پر اللہ کرم فرمائے گا۔
- میرے جانشین کے لیے زیادہ بہتر ہو گا کہ وہ میرے ہمدردوں اور خدمت گاروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں۔
- محاسب کے عہدوں پر کام کرنے والوں میں فارس والوں سے بہتر کوئی نہیں۔ شہنشاہ ہمایوں کے وقت سے اب تک کوئی بھی ان کی برادری کا میدان جنگ سے فرار نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ کبھی دغابازی نہیں کرتے لیکن ان کو سنبھالنا بہت مشکل ہے کیوں کہ ان کو اپنی عزت بہت پیاری ہوتی ہے۔ اگر ان کو عزت دی جائے تو وہ کبھی دغا نہیں کرتے۔
- تورانی لوگ ہمیشہ جری سپاہی رہے ہیں۔ وہ حملہ، شب خون مارنے اور گرفتار کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ جب انہیں لڑائیوں کے درمیان پیچھے ہٹنے کا حکم دیا جاتا ہے وہ شک، ناامیدی اور بے عزتی کا احساس نہیں کرتے۔ ہندوستانی تو گردن کٹانا پسند کریں گے لیکن لڑائی میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ تمہیں اس قوم پر ہمیشہ مہربان رہنا ہو گا کیوں کہ کئی موقعوں پر دوسری برادری ضروری اقدام کرنے میں ناکام رہتی ہے تو ہندوستان کی برادری (راجپوت) اسے کر گذرتی ہے۔
- جہاں تک ممکن ہو بادشاہ کو چاہیے کہ وہ اپنی سلطنت کا دورہ برابر کرتا رہے۔ تاکہ حکومت کے حالات اور رعایا کی حالت کا صحیح پتہ چلے۔
- اپنے بیٹوں پر کبھی یقین نہ کرنا اور نہ ہی نزدیکی بنانا۔ اگر شہنشاہ نے دارشکوہ کے ساتھ اتنی نزدیکی نہ رکھی ہوتی تو ان کا معاملہ اتنا خراب نہ ہوتا۔ اس قول کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ "بادشاہ کا وعدہ مطلب کے لحاظ سے صفر ہوتا ہے۔"
- حکومت کی خبروں سے باخبر رہنا کیوں کہ حکومت کی یہ اہم بنیاد ہے۔ ایک لمحہ کی بے پروائی کے سبب ہی شیواجی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیے اور مجھے زندگی بھر مراٹھوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

اپنے فرزند شہزادہ معظم بہادر شاہ کو قید سے چھوڑتے وقت اورنگ زیب نے یہ مشورہ دیا "ہر ایک شہنشاہ کو نرمی و سختی کے درمیان

رہنا چاہیے۔ اگر دونوں میں سے کوئی بھی عادت اگر بڑھ جائے تو وہ اقتدار کے زوال کا باعث ہوتا ہے۔ نرمی کا مزاج اپنانے پر بے خوفی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں اور اگر سخت مزاج ہو جائے تو لوگ ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔ شہنشاہ اور پانی دونوں کے لیے ایک جگہ پر رکے رہنا مناسب نہیں پانی سڑ جاتا ہے اور بادشاہ کی حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ ملک کا دورہ کرتے رہنے سے ہی بادشاہ کی عزت ہے، عیش وآرام بادشاہ کو غیر یقینی ناکارہ بنا دیتی ہے۔ مجبوری اور مصلحت کے تحت میں نے تمہیں چند برسوں کے لیے قید میں رکھا تھا تاکہ تمہارے کردار میں بلندی آجائے اور تم مستقبل میں ایک اچھے بادشاہ بن سکو۔ اپنی زندگی میں ہی میں نے تمہیں جنت نشان ہندوستان کی صوبہ داری دی ہے"۔

14.3.9 اورنگ زیب کی موت

اس کی موت ایک ایسے وقت میں ہوئی جب سیاسی طور پر شمالی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سرکشی بڑھ رہی تھی۔ دکن کے علاقے میں مراٹھے، گجرات، مالوہ اور خاندیش جیسے دور دراز کے مغل صوبوں اور بادشاہ کی چھاؤنی پر حملہ کر رہے تھے۔ حکومت کا انتظام کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ اپنے والد کی سلطنت تقسیم کرنے کی خواہش کو جانتے ہوئے بھی شہزادہ معظم، شہزادہ اعظم اور شہزادہ کام بخش تخت کے لیے جنگ کو تیار تھے۔ دوسری طرف اہل خانہ میں ہونے والی پے درپے اموات نے بھی اسے پریشان کر دیا تھا۔ 1702ء میں اس کی لڑکی زیب النساء کی موت ہو گئی۔ 1704ء میں اس کے لڑکے اکبر 1705 میں اس کی بہو اور 1706 میں اس کی واحد بہن گوہر آرا کی موت ہو گئی۔ بہت سارے اعزا و اقربا کی اموات سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر 91 سال ہو چکی تھی اور دکن کے 26 سال کے معرکوں نے اس کی صحت کو بالکل برباد کر دیا تھا۔ 1707ء میں ایسا بیمار ہوا کہ اس کی زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ بخار کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی گھنٹوں تک بے ہوش پڑا رہتا تھا۔ اسی بیماری میں اس نے قاضی القضاۃ کو چار ہزار روپیے غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے دیے۔

ہر انسان کے اندر ایک ضمیر ہوتا ہے جو اسے ہر وقت اس کے اچھے اور برے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اورنگ زیب کے اپنے عہد میں جو کچھ بھی فیصلے کیے اس اسے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے اس نے اپنے ضمیر کی آواز پر ایک وصیت بھی تحریر کر دی تھی۔ دنیا نے اورنگ زیب کو صرف ایک بادشاہ کی شکل میں دیکھا۔ لیکن خاندان کا مالک سب سے بڑا نوکر ہوتا ہے۔ اس کہاوت کو سچ ثابت کرنے والا تنہا اورنگ زیب ہی تھے۔ دنیا نے یہ مانا کہ وہ تمام دولت کا مالک ہے۔ اس نے اپنے ذاتی خرچ چلانے کے لیے تاعمر اپنے ہاتھوں سے ٹوپیاں سینے کے علاوہ قرآن کے اوراق کی نقل لکھتا رہا۔ لوگوں نے اسے ہندو مخالف کہا لیکن وہ اپنی تمام رعایا کے لیے ایک نظر رکھتا تھا۔ تین مسلم طاقتیں (افغان، بیجاپور، گولکنڈہ) اور تین ہندو طاقتیں (مراٹھا، سکھ اور راجپوت) کی تلوار ہمیشہ اس کے سر پر لٹکتی رہی۔ 1707ء کو بروز جمعہ صبح کی نماز کے بعد اورنگ زیب کا 91 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد کے قریب سپرد خاک کیا گیا۔ اورنگ زیب نے 50 سال 3 ماہ حکومت کی۔

14.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جہانگیر نے اپنے عہد میں زنجیر عدل کے علاوہ خفیہ پولیس کا بھی بہترین انتظام کر رکھا تھا یہ خفیہ نویس صرف دربار ہی تک محدود نہیں تھے بلکہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے جہانگیر کو ہر بری اور اچھی خبر موصول ہوتی رہتی تھی۔ اس خفیہ نویسوں کی سرگرمیوں سے ملک کی نظم ونسق پر بہت اثر پڑا۔ ملک میں ظلم وستم جو غریبوں پر ہوتے رہے وہ کافی حد تک ختم ہو چکے تھے۔
- جہانگیر کے ذاتی کیرکٹر کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے بذات خود تزک جہانگیری میں اپنی اچھی اور بری ساری صحبت کا تذکرہ کیا۔ وہ کوئی بہادر اور جانباز سپاہی تو نہ تھا لیکن ایک نہایت ہی منصف مزاج حکمراں ضرور تھا۔ انصاف کے معاملے میں وہ کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ نور جہاں بھی جو اس کے دل ودماغ پر چھائی ہوئی تھی اسے بھی جھڑک دیتا تھا۔
- اورنگ زیب نے 1659ء میں سکے پر کلمہ کندہ کروانا بند کروادیا۔ اس خیال سے کہ یہ سکے دونوں فریقوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اورنگ زیب نے رواداری کا بھی خیال رکھا۔ ہندوستانی زبان سیکھنے اور سکھانے کے لیے ایک ڈکشنری تیار کروائی جس کے ذریعہ فارسی جاننے والے آسانی سے ہندی زبان سیکھ سکیں۔
- تاج پوشی کی رسم ادائیگی کے بعد اورنگ زیب ملک کی اصلاحات کی جانب متوجہ ہوا۔ اس مقصد کے لیے چند نئے قوانین اور ضابطے مقرر کیے گیے۔ 1661ء میں اس نے محکمہ دینیات کھولنے کا حکم دیا۔ جس کا کام عوام کو دینی باتوں سے باخبر کرنا اور غیر اسلامی رسوم سے باز رکھنا۔ اکبر کے زمانے سے سال وماہ کا حساب شمسی تھا۔ اس نے اس کو قمری ماہ سال میں تبدیل کیا۔

14.5 نمونہ امتحانی سوالات

14.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جہانگیر کی اتالیقی کس کے ذمہ تھی؟

(a). عبدالرحیم خانخاناں (b). سلیم چشتی (c). عبدالباقی (d). ابولفضل

2. جہانگیر کی تخت نشینی کی رسم کب ہوئی؟

(a). 1605ء (b). 1707ء (c). 1632ء (d). 1505ء

3. تزک جہانگیری کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a). اورنگ زیب (b). جہانگیر (c). اکبر (d). ہمایوں

4. جہانگیر کی تخت نشینی کی رسم کب ہوئی؟

(a). 1605ء (b). 1705ء (c). 1526ء (d). 1707ء

5. مغل بادشاہوں میں حافظ قرآن کون تھا؟

(a). جہانگیر (b). اورنگ زیب (c). ہمایوں (d). سب غلط

6. فن خطاطی اورنگ زیب نے کس سے سیکھی؟

(a). عبدالباقی (b). بیرم خان (c). ابوالفضل (d). سب صحیح

7. محکمہ دینیات کس نے کھولا تھا؟

(a). اورنگ زیب (b). اکبر (c). ہمایوں (d). بابر

8. موسیقی کی ممانعت کس بادشاہ نے کی؟

(a). اورنگ زیب (b). اکبر (c). ہمایوں (d). شاہ جہاں

9. دوبارہ جزیہ کس مغل بادشاہ نے شروع کیا؟

(a). اکبر (b). جہانگیر (c). اورنگ زیب (d). تمام غلط

10. 1658ء تا 1707ء کس کا عہد ہے؟

(a). اکبر (b). بابر (c). ہمایوں (d). اورنگ زیب

14.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں طاعون کی بیماری کس کے عہد میں ہوئی؟ نوٹ لکھیے۔
2. اورنگ زیب اور داراشکوہ کی عداوت کے بارے میں لکھیے۔
3. اورنگ زیب کا دور حکومت اور اس کے نظام پر روشنی ڈالیے۔
4. اورنگ زیب کی وصیت کا جائزہ لیجیے۔
5. جہانگیر کے کردار پر بحث کیجیے۔

14.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. جہانگیر کی ابتدائی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

2. اورنگ زیب کی شخصیت اور کارناموں پر مضمون لکھیے۔

3. جہانگیر کے بارہ احکامات اور مظلوموں کے لیے اقدامات کا ذکر کیجیے۔

14.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ہندوستان پر مغلیہ حکومت	:	مفتی شوکت علی فہمی
2. محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک	:	محمد سعید الحق
3. اورنگ زیب عالم گیر	:	پرویز اشرفی
4. مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال	:	آر پی۔ ترپاٹھی

اکائی 15: مغلیہ حکومت (دور زوال)

اکائی کے اجزا:

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 تعارف و پس منظر

15.3 مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب

15.3.1 اورنگ زیب کے جانشینوں کی نااہلی اور کمزوری

15.3.2 جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی

15.3.3 اکبر کا غلط مسلک

15.3.4 غدار امراء کی سرکشی اور گروہ بندی

15.3.5 کمزور فوج اور جدید اسلحوں کی عدم فراہمی

15.3.6 مراٹھوں اور سکھوں کی سیاسی بیداری

15.3.7 نادر شاہ اور ابدالی کے حملے

15.3.8 مغلوں کی بحری قوت سے بے پرواہی

15.3.9 اقتصادی بدحالی اور مغل خزانے کا دیوالیہ پن

15.4 کلیدی الفاظ

15.5 اکتسابی نتائج

15.6 نمونہ امتحانی سوالات

15.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

گذشتہ اکائیوں میں آپ ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام وپس منظر، عروج واستحکام اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ مطالعے کے بعد آپ کے علم میں کافی اضافہ ہو چکا ہو گا کہ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب وتمدن میں مغلوں کا عمل و دخل غیر معمولی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ سابقہ حکومتوں سے زیادہ رہا ہے تو مبالغہ نہیں ہو گا، لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک ایسی سلطنت جس نے اپنے عروج واستحکام کے زمانے میں ترقی کے اعلیٰ منازل طے کئے وہ 1707ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد زوال کا شکار ہو گئی۔ اس کے وارث شہزادوں کی نااہلیت رنگ لائی اور انہیں ڈوبنے سے کوئی نہیں بچاسکا۔ تقریباً150 برس کے بعد 1857ء میں اس سلسلے کا آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو محض ڈیڑھ سو سپاہیوں پر مشتمل ٹکڑی نے گرفتار کیا اور اس طرح پوری سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ ہندوستان کی ایک عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال اور خاتمے سے نہ صرف واقف ہو سکیں بلکہ اس کا بخوبی علم حاصل کر سکیں کہ وہ کون سے اسباب وعوامل تھے جن کی وجہ سے ایک ایسی حکومت جس نے ہندوستان پر تقریباً تین صدیوں تک شان سے حکومت کی، جو مضبوطی اور پائیداری میں اپنی مثال آپ تھی، کیوں کر اس کو زوال وپستی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس اکائی کا مقصد آپ کو عہد زوال کے حکمرانوں سے متعارف کرانا بھی ہے، تاکہ آپ عہد زوال کے حکمرانوں، ان کی کارگزاریوں اور پالیسیوں سے بخوبی واقف ہو سکیں۔ اس اکائی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ عہد وسطیٰ ہندوستان کی دوسری سلطنتوں اور حکومتوں میں موازنہ وتفریق کر سکیں۔

15.2 تعارف وپس منظر

ملک میں مغلیہ سلطنت کے زوال کی داستان، مفاد پرست جماعت وگروہ کا اقتدار حاصل کرنے کی باہمی رشہ کشی کا عبرت انگریز واقعہ ہے۔ جب یورپ کی استعماری طاقتیں سرزمین ہندوستان کو اپنا نشانہ بنا رہی تھیں اس وقت ہندوستان کے سیاسی افق پر مفاد پرست جماعتیں ہر طرف لوٹ کھسوٹ کر رہی تھیں اور یہی تفرقہ پھیلانے والی طاقتیں اپنا ننگا ناچ شروع کر چکی تھیں۔ جس کے نتیجے میں دہلی کا فوجی نظام اور اس کی مالی وسیاسی قوت منتشر ہو گئی اور بیرونی حکمرانوں کو کھلا میدان مل گیا۔ علامہ اقبال کا قول " قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی" کے مطابق ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی موت واقع ہو گئی۔ یہ اٹھارویں صدی کا عبرت ناک واقعہ ہے جس کے حقیقی اسباب جاننے کے لئے بلا تعصب مذہب وملت کا قومی نقطہ سے تاریخ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اٹھارویں صدی کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس دور کے تین واضح وجوہات نظر آتی ہیں۔

1. مغلیہ سلطنت کا زوال

2. حکمراں طبقے کا منفی کردار

3. بیرونی طاقت کی ریشہ دوانیاں

ان تینوں عوامل کی وجہ سے جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کی صورت میں نظر آیا، اسے سیاسی غلامی کا نام اس لئے دیا جاسکتا ہے کیونکہ نااہل حکمراں طبقے کی وجہ سے 'سونے کی چڑیا' غلامی کی زنجیر میں جکڑ دی گئی۔

یوں تو مغلوں نے ہندوستان میں تقریباً 315 سال حکومت کی۔ سب سے پہلے 166 سال تک بابر کی تخت نشینی (1526) سے لے کر اورنگ زیب کی وفات تک مغل سلطنت کے عروج کا زمانہ مانا جاتا ہے اس دوران نہایت عظیم صلاحیتوں کے چھ بادشاہ مغلیہ سلطنت کو نصیب ہوئے۔

ظہیر الدین بابر	(1526 تا 1530ء)
ہمایوں	(1530 تا 1539_1556ء)
اکبر	(1556 تا 1605ء)
جہانگیر	(1605 تا 1627ء)
شاہ جہاں	(1627 تا 1657ء)
اورنگ زیب عالمگیر	(1657 تا 1707ء)

1707ء سے 1857ء یعنی 150 سال کا دور، مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور رہا۔ اس دوران تقریبا تیرہ بادشاہ گذرے جو اپنی نااہلی اور آپسی خانہ جنگی کی وجہ سے یا تو برائے نام بادشاہ رہے یا وظیفہ خوار کی حیثیت سے رہے۔ ان میں سے اکثر یا تو قتل کر دیئے گئے یا زبردستی تخت سے اتار دیئے گئے۔ ان بادشاہوں کا مختصر مگر جامع تعارف آئندہ سطروں میں پیش کیا جارہا ہے۔

1. بہادر شاہ

محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول (1707-1712ء) مغلیہ سلطنت کا ساتواں شہنشاہ تھا۔ مرنے سے قبل اورنگ زیب عالمگیر نے ایک وصیت کے مطابق اپنی سلطنت کو تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا تا کہ کسی طرح کی کوئی نااتفاقی یا خون خرابہ نہ ہونے پائے۔ مگر عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ جاجو کی لڑائی میں 'اعظم' اور 'کام بخش' مارے گئے۔ شہزادہ معظم بہادر شاہ ظفر (اول) کے لقب سے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔

بہادر شاہ ظفر نے تخت نشین ہوتے ہی جزیہ معاف کر دیا۔ اودے پور اور جودھ پور کے راجاؤں کی خود مختاری تسلیم کر کے راجپوتوں کے ساتھ صلح کر لی۔ ساہو جی کو رہا کر دیا گیا تا کہ وہ دکن جا کر مغلوں کے نائب کی حیثیت سے مہاراشٹر اور دیگر مراٹھ علاقوں پر حکومت

کرے۔ پنجاب میں سکھوں نے بندہ بیراگی کے ماتحت شورش برپا کی۔ مگر لاہور کے مغل حاکم عبدالصمد خان نے بندہ بیراگی کو ایک ہزار ہمراہیوں سمیت فرخ سیر کے زمانے میں 1715ء میں گرفتار کرلیا اور لوٹ مار کے الزام میں اسے قتل کر دیا۔ پانچ سال حکومت کرنے کے بعد بہادر شاہ نے 69 سال کی عمر میں وفات پائی اور دہلی میں مشہور چشتی صوفی بزرگ بختیار کاکی کے مزار کے احاطے میں مدفون ہوئے۔

2. جہاندار شاہ

معزالدین جہاندار شاہ (1712-1713ء) مغلیہ سلطنت کا آٹھواں مغل شہنشاہ تھا۔ بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جہاندار شاہ امیر ذوالفقار کی مدد سے اپنے بھائیوں کو شکست دے کر دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے خاندانی آدمیوں کے بجائے بازاری لوگوں کو اعلیٰ عہدے دینے شروع کئے اور انہیں اپنا مشیر خاص بنایا۔ سلطنت کے کاموں سے بے پرواہ ہو کر یہ بادشاہ عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ یہ ایک کمزور اور نااہل حکمران تھا اس کا شمار مغل حکمرانوں میں ایک کٹھ پتلی بادشاہ کے طور پر ہوتا ہے۔ تقریباً ایک سال بعد بہادر شاہ کے دوسرے بیٹے عظیم الشان کے فرزند فرخ سیر نے سید عبداللہ خان اور سید حسین علی خان (سید برادران) کی مدد سے جہاندار شاہ کو کھجوہ کی لڑائی میں شکست دی۔ اور خود دہلی کے تخت پر جا بیٹھا۔

3. فرخ سیر

شہزادہ معین الدین محمد فرخ سیر (1713-1719ء) تخت نشین ہوتے ہی سید عبداللہ کو اپنا وزیر اعظم اور سید حسین علی خان کو امیر الامراء بنایا۔ یہ دو سید بھائی بادشاہ گر کہلائے جانے لگے۔ ان کا قد سلطنت میں بہت بڑھ گیا۔ دونوں بھائی قابل اور منتظم تھے۔ مگر ان کے اقتدار سے دوسرے امراء تنگ آ گئے اور فرخ سیر بھی چھ سال تک تابعداری کرنے کے بعد سید برادران کے پنجے سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگا اس پر سید برادران نے فرخ سیر کو قتل کر دیا۔ اور اس کے بعد انہوں نے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو یکے بعد دیگرے بادشاہ بنایا مگر یہ دونوں بادشاہ چند ماہ حکومت کرنے کے بعد تپ دق کے عارضہ سے فوت ہو گئے۔

4. محمد شاہ

محمد شاہ روشن اختر بہادر (1719-1748ء) مغلیہ سلطنت کا چودھواں بادشاہ تھا۔ سیدوں نے رفیع الدولہ کی وفات کے بعد روشن اختر کو جو بہادر شاہ اول کا پوتا تھا، محمد شاہ کا خطاب دے کر دہلی کا بادشاہ بنایا۔ اس نے سب سے پہلے سید برادران کو ختم کرایا اور درباری سازشوں کا قلع قمع کیا۔ یہ بھی ایک کمزور اور نااہل بادشاہ ثابت ہوا کیونکہ آرام طلبی، عیش پرستی و نشاط انگیزی اس کے یہاں بڑے پیمانے پر تھی۔ انتظامی صلاحیت، نظم و نسق اور دوراندیشی سے کوسوں دور تھا اس لئے تاریخ میں اسے بجا طور پر محمد شاہ رنگیلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمد شاہ کا 29 سالہ طویل دور مغلیہ سلطنت کو دوبارہ مستحکم کرنے کا آخری موقع تھا، مگر بدقسمتی سے بادشاہ عیش پرستی اور بے فکری کے عالم میں مبتلا رہا۔ اس نے حکومتی و انتظامی امور میں کوئی دلچسپی نہ لی اور نہ ہی کبھی لائق و فائق وزراء کا تعین کیا۔ محمد شاہ کی اس کمزور حکمرانی اور امراء و روسا کی آپسی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند مضبوط امیروں و صوبے داروں نے اپنی خود مختار اور آزاد ریاستوں کی بنیاد ڈال دی۔ حیدرآباد دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے ایک خود مختار ریاست قائم کی۔ جس کو دیکھتے ہوئے بنگال میں علی وردی خان

اور سعادت علی خان اودھ میں خود مختار ریاست قائم کی۔ مراٹھوں کے پیشوا باجی راو نے دکن کے اکثر حصوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ ان علاقائی ریاستوں کے ابھرنے کی وجہ سے مرکزی سلطنت دھیرے دھیرے دہلی و آگرہ کے صوبوں تک محدود ہو کر رہ گئی اور سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔

داخلی خلفشار، خود مختار ریاستوں کا وجود اور کمزور فوج اور ناکام انتظامیہ نے بیرونی حملہ آوروں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ مغلیہ سلطنت کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نادر شاہ نے 1739ء میں ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ کرنال کے میدان میں مغل فوجوں کو شکست دینے کے بعد وہ دہلی میں داخل ہوا۔ جہاں اس نے دو ماہ تک لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد وہ تخت طاؤس، کوہ نور اور بے شمار ہیرے جواہرات لے کر ایران واپس چلا گیا۔ ایران جانے سے قبل محمد شاہ کو دوبارہ تخت نشین کر گیا لیکن سلطنت دہلی کی رونق اجڑ چکی تھی۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد مغل سلطنت کا رعب و دبدبہ عوام و خواص کے دلوں سے نکل گیا۔ ملک کے ہر خطے میں بغاوتیں سر ابھارنے لگیں مختلف ریاستیں وجود میں آ گئیں جس سے سلطنت بڑی تیزی سے زوال کی طرف گامزن ہو گئی۔

5. احمد شاہ

ابو ناصر محمد احمد شاہ بہادر (1748-1754ء) مغل شہنشاہ محمد شاہ کا بیٹا تھا۔ احمد شاہ کے عہد حکومت میں احمد شاہ ابدالی نے 1751 میں ہندوستان پر دوبارہ حملہ کر کے پنجاب کو افغانستان کی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس دور میں غازی الدین نامی ایک وزیر کا اثر و رسوخ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے 1754 میں احمد شاہ کو دہلی کے تخت سے اتار کر قید کر دیا اور اندھا بنا دیا۔ اس کے بعد عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھا دیا۔

6. عالمگیر ثانی

عزیز الدین عالمگیر ثانی (1754-1759ء) عالمگیر ثانی ملک کا برائے نام فرماں روا تھا۔ دراصل سیاہ و سفید کا مالک اس کا وزیر غازی الدین تھا۔ اس وزیر نے افغانوں سے پنجاب واپس لے لیا۔ 1755ء میں احمد شاہ ابدالی نے پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ غازی الدین نے مراٹھوں کو امداد کے لئے بلایا۔ اس پر احمد شاہ ابدالی نے آگے بڑھ کر دہلی کو تباہ و برباد کر دیا اور 1759ء میں غازی الدین نے بادشاہ عالمگیر کو قتل کروا دیا۔

7. شاہ جہاں سوم

محی الملک الملت شاہ جہاں سوم (1759-1760ء) تقریباً ایک سال کے لئے مغل حکمران رہا۔ یہ بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کا سب سے بڑا بیٹا محی السنت مرزا کا بیٹا تھا۔ یہ برائے نام بادشاہ تھا اس کے پاس اختیارات نہیں تھے اصل اختیارات وزیر اعظم عماد الملک اور مراٹھوں کے پاس تھی۔ تاہم بعد میں اسے معزول کر دیا گیا اس کا دور حکومت 10 ماہ پر مشتمل تھا۔

8. شاہ عالم ثانی

محمد علی گوہر شاہ عالم ثانی (1760-1806ء) مغلیہ سلطنت کا سولہواں بادشاہ تھا۔ شاہ عالم مغلیہ سلطنت کا آخری با اثر مغل شہنشاہ تھا جس کی دور حکومت میں مغلیہ سلطنت میں خود مختار ریاستوں کا قیام عمل میں آیا اور مغل سلطنت کا حدود سمٹ کر دہلی تک محدود ہو گیا۔

شاہ عالم کے آخری دور میں یہ مقولہ مشہور ہو چکا تھا کہ حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم (پالم دہلی کا ایک قریبی علاقہ)۔

بادشاہ نے اپنے دورِ حکومت میں انگریزوں کو بکسر کی لڑائی کے بعد بہار، بنگال اور اڑیسہ کے علاقوں کی دیوانی عطا کی۔ اس کے عہد میں روہیلوں نے زور پکڑا، اور ان کے سردار غلام قادر روہیلہ نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں۔ مراٹھوں نے بادشاہ کو اس ظالم روہیلہ کی قید سے نجات دلائی اور بوڑھے بادشاہ کو دوبارہ دہلی کے تخت پر بٹھایا۔ نیز اس ظالم روہیلہ سردار کا سر کاٹ کر بادشاہ کے قدموں میں ڈال دیا۔ مراٹھوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے مسلم دانشوروں اور امیروں کو تشویش لاحق ہوئی، خاص طور پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ اور چند دوسرے امیروں نے مراٹھوں کا زور توڑنے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ ابدالی اس دعوت پر ایک بار پھر ہندوستان آیا اور پانی پت کے میدان میں 1761ء کو ابدالی اور مراٹھوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں مراٹھوں کو شکست ہوئی اور ان کے کئی بڑے بڑے سپہ سالار مارے گئے۔ پانی پت کی اس لڑائی میں فتح حاصل کرنے کے باوجود احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم نہیں کی بلکہ شاہ عالم کو مسندِ تخت پر بحال رکھا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں گرچہ مراٹھوں کو شکست فاش ہوئی تھی لیکن چند سالوں میں مراٹھوں نے پھر اپنے آپ کو منظم کیا اور شمال کی جانب سے دہلی کی طرف بڑھنا شروع کیا اور 1772ء میں پھر دہلی پر قابض ہو گئے۔ شاہ عالم جو اب تک انگریزوں کی سرپرستی میں تھا اس نے خود کو مراٹھوں کے حوالے کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد مراٹھے بھی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد برصغیر میں ایسی کوئی طاقت نہ بچی جو باہری حملے کا مقابلہ کر سکے انگریز مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ یہاں تک کہ 1803ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور مغل بادشاہ شاہ عالم برائے نام ملک کا فرماں روا رہا۔

9. اکبر شاہ ثانی

ابو ناصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی (1806–1837ء) مغلیہ سلطنت کا اٹھارہواں بادشاہ تھا۔ بادشاہ شاہ عالم ثانی کے بعد اس کا بیٹا اکبر ثانی مسند دہلی پر تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے باپ کی طرح بے اختیار اور برائے نام حاکم تھا جبکہ اصل اختیارات انگریزوں کے پاس تھے۔ یہ بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار رہا اور اس کی حکومت لال قلعہ دہلی کی حدود سے باہر نہ تھی۔ بادشاہ کو شعر و شاعری، شطرنج اور موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ 1835ء میں بادشاہ نے اپنے سفیر کو برطانیہ اس غرض سے بھیجا کہ وہ بادشاہ کے وظیفے میں اضافہ کی درخواست رکھے، مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا اور اسی دوران بادشاہ کی وفات ہو گئی۔

10. بہادر شاہ ظفر ثانی

سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ ثانی (1837–1857ء) اکبر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا، خاندان مغلیہ کا آخری بادشاہ اور اردو ادب کا ایک بہترین و مقبول شاعر تھا۔ 1857ء تک برائے نام حکمراں رہا۔ غدر کے دوران باغیوں نے اسے برصغیر کا خود مختار بادشاہ بنا دیا۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد اسے رنگون بھیج دیا جہاں اس کا 1862ء میں انتقال ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کی وفات پر خاندان مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

15.3 مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب

یہ نہ صرف ایک تاریخی حقیقت ہے بلکہ قانون الٰہی کا نظام بھی ہے کہ ہر عروج کا ایک زوال ہوتا ہے اور اس بات کا اطلاق انسان کی انفرادی زندگی سے لے کر سماج و قوم کی اجتماعی زندگی کی ہر سطح پر ہوتا ہے۔ اگر دنیا کی مختلف اقوام کی تاریخ کا سرسری طور پر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی جس اقوام نے بھی تاریخ کے کسی دور میں ترقی و عروج کے منازل طے کئے، نظام قانون الٰہی کے مطابق عروج اور ترقی کی ایک خاص منزل پر پہونچنے کے بعد ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے جس کے سبب ایک حکمراں طبقے کو دوسرے حکمرانوں کے لئے مسند اقتدار کو خالی کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستان کی عظیم مغلیہ سلطنت کو بھی اسی لازوال قانون الٰہی کے مطابق ایک دن دوسروں کے لئے جگہ خالی کرنی ہی تھی۔ مغلیہ سلطنت جس نے اپنے قیام کے بعد بڑا عروج و استحکام حاصل کیا اور اپنے دور میں تہذیب و ثقافت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ آخر کار انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اس کا بھی زوال ہوا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں مغلیہ سلطنت کا جو انتشار و زوال کا سلسلہ شروع ہوا، اس کو اورنگ زیب عالمگیر کی قد آور شخصیت اور عظیم مدبرانہ صلاحیتوں نے پچاس سال تک روکے رکھا اور اس کی رفتار کافی سست کر دی، اگر اورنگ زیب جیسا ستارہ ہندوستان کے افق پر طلوع نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ مغلیہ سلطنت کا زوال بہت پہلے ہو چکا ہوتا لیکن اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں میں کوئی ایسا مرد آہن اور مرد مجاہد نہ تھا جو اس زوال و انحطاط کے سلسلہ کو روک دیتا یا کم از کم اس کی رفتار سست کر دیتا۔ اس کے جانشین سیاسی بونے تھے اور محض طریق انتخاب اور سیاسی نظام کے سبب بر سر اقتدار آ گئے تھے اور اسی کے ساتھ انہوں نے اس جڑ کو ہی کاٹ ڈالا اور اس بنیاد کو اکھاڑ پھینکا جس سے مغلیہ سلطنت وابستہ اور قائم تھی یعنی وہ آپسی خلفشار اور گروہوں میں بٹ گئے۔ اس نتیجہ میں زوال کی رفتار پہاڑی آبشار کے پانی کی طرح اتنی تیز ہو گئی کہ اب اسے قعر فنا میں گرنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی تھی۔

مورخین اور تاریخی تجزیہ نگاروں نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر مغلیہ سلطنت کے زوال کے بہت سے اسباب اپنی تحریروں میں بیان کئے ہیں۔ ان اسباب میں سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور انتظامی تقریباً سبھی طرح کے اسباب و عوامل کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ تاریخی کتابوں میں جو ہندوستانی تاریخ کے عہد وسطیٰ سے متعلق ہیں، ان میں حکمرانوں کی بے اعتدالیوں اور ان کی ان پالیسیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کی وجہ سے مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ ذیل میں مورخین اور تجزیہ نگاروں کے ذریعہ پیش کردہ ان اسباب و عوامل کا ایک خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

15.3.1 اورنگ زیب کے جانشینوں کی نااہلی اور کمزوری

سلطنت مغلیہ دیگر ایشیائی سلطنتوں کی طرح ایک شخصی سلطنت تھی جو انتہائی مرکزیت پر مبنی تھی۔ ایسی طرز حکومت کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار بادشاہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی انتظامی قابلیت، تدبر اور زور فہمی سے سلطنت کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح اس کی نالائقی سلطنت کے انتظام میں خرابی پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے سلطنت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس بات کی واضح اور بین مثالیں پورے

مغلیہ تاریخ میں پڑھی اور دیکھی جاسکتی ہے۔ پہلے چھ بادشاہ کی انتظامی قابلیت نے سلطنت کی شان و شوکت کو بڑھایا۔ عالمگیر کے جانشین ناکارہ، نااہل اور نالائق تھے۔ امور سلطنت کو سمجھنا یا سنبھالنا ان کے بس کا نہ تھا۔ ملک کے حالات بد سے بد تر ہوتے چلے گئے۔ ایسی صورت میں سلطنت مغلیہ کی تباہی یقینی تھی۔

15.3.2 جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی

مغلوں کے یہاں جانشینی کا کوئی ٹھوس اور واضح قانون موجود نہ تھا جس کی بنا پر تقریباً سبھی حکمرانوں کی وفات کے وقت وراثت کے لئے اس کے بھائیوں اور بیٹوں میں جنگ چھڑ جاتی تھی کیونکہ سبھی شہزادے اپنے آپ کو جانشینی کا اصلی حقدار سمجھتے تھے۔ جس کی وجہ سے لڑائیاں ہوتی تھیں اور اس کا آخری فیصلہ تلوار کے ذریعہ ہوتا تھا۔ جانشینی کا کوئی ٹھوس اور واضح قانون نہ ہونے کی وجہ سے درباری امراء اور وزراء اس کا غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے مختلف قسم کی سازشیں کرتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر شاہ جہاں کے آخری دور میں کس طرح مغل دربار آپس میں منقسم تھا، اورنگ زیب کو حکمراں بننے کے لئے اپنے بھائیوں سے جنگ اور باپ کو قید کرنا پڑا۔ 1707ء میں اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی کیسے اس کے بیٹوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ 1712ء میں بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد جانشینی کے لئے ہونے والی جنگ میں ذوالفقار خان نے باشاہ گر کا کردار ادا کیا۔ اسی طرح سے 1713ء سے 1720ء تک سید برادران بادشاہ گر کا کردار نبھاتے رہے۔ اس دور میں انہوں نے چار حکمرانوں کو تخت شاہی پر بٹھایا اور پھر معزول کیا۔ مغل دربار کے منظرنامے سے سید برادران کے غائب ہونے کے بعد غازی الدین اور آصف جاہ نظام الملک بادشاہ گر کا کام کرتے رہے۔ اس لئے بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی نے مغلیہ سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

15.3.3 اکبر کا غلط مسلک

سلطنت کے استحکام کا دارومدار عوام کی وفاداری اور حب الوطنی کے جذبہ پر تھا وہ سلطنت کی بقاء کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہتے، جب تک یہ احساس ان کے اندر رہا کہ یہ سلطنت ان کی اپنی ہے۔ مگر اکبر نے جب غیر اسلامی روش اختیار کرکے غیر مسلموں کو انتظام سلطنت میں حصہ دار بنانا شروع کیا اور انہیں عہدے دے کر اسلامی سلطنت کو ہندوستانی بادشاہت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگا تو مسلمانوں نے ایسی سلطنت کے امور میں لاتعلقی کا اظہار کرنا شروع کیا۔ دوسری طرف غیر مسلموں کو مغلیہ سلطنت سے کوئی دلی ربط یا علاقہ نہ تھا۔ اس طرح اکبر غیر مسلموں کی مخلصانہ وفاداری حاصل نہ کرسکا۔ ان حالات میں مغلیہ سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔ اکبر کی غلط پالیسی کے تحت مذہب بادشاہ کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔ چنانچہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی تحقیر ہونے لگی اس سے مسلمان اور بھی دل برداشتہ ہوگئے اور وہ سلطنت کی سالمیت کے متعلق غیر جانبدار ہوگئے اس طرح انتظام سلطنت سے عوام کی بے تعلقی، مذہبی جوش کا فقدان اور جنگی اسپرٹ کی کمزوری کے باعث مغلیہ سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔

15.3.4 غدار امراء کی سرکشی اور گروہ بندی

بہادر شاہ اول کے بعد مغل بادشاہ کسی نہ کسی امیر کے وسیلے سے تخت پر بیٹھے جو بادشاہ کی نسبت زیادہ اختیارات رکھتے تھے۔ اس

امر کی دیکھا دیکھی سلطنت کے دیگر صوبیداروں میں خود مختاری کی ہوس پیدا ہو گئی، چنانچہ محمد شاہ رنگیلے کے وقت میں نظام الملک آصف جاہ نے حیدرآباد میں، علی وردی خان نے بنگال میں، سعادت علی خان نے اودھ میں اور مراٹھوں نے دکن کے باقی علاقوں میں خود مختار سلطنتیں قائم کرلیں۔ نیز سید برادران کی لگاتار سازشوں کے باعث سلطنت میں گروہ بندیاں شروع ہو گئیں۔ ہر گروہ کی یہ کوشش ہوتی تھی بادشاہ وقت کو کٹھ پتلی کے طور پر استعمال کرکے اپنی حیثیت کو مستحکم کرے۔ اس پر اکتفانہ کرتے ہوئے سید برادران نے مراٹھ سواروں کو بھرتی کرنا شروع کیا۔ مراٹھا فوج کو اپنی امداد کے لئے دہلی میں بلایا اور دکن کے انتظامی معاملات میں انہیں مساویانہ حقوق دیا۔ اس طرح مراٹھوں کو اپنی سیاسی اہمیت کا احساس ہوا جس کی بناپر وہ شمالی ہند میں مسلمانوں کے اقتدار کو خاک میں ملانے کے منصوبے سوچنے لگے۔ دوسری طرف شاہی دربار امراء اور وزراء کی سازشوں کا اکھاڑہ بن گیا یہ گروہ بندیاں کرنے والے سیاسی بصیرت سے عاری تھے وہ اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتے تھے کہ ان کی گروہ بندی سے مرکزی سلطنت کے اقتدار کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ ایرانی اور تورانی امراء کی باہمی کشمکش سے سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔ ان کے باہمی اختلافات سے مرکزی حکومت کو سخت نقصان پہنچا خصوصاً جب یہ غدار امراء انتہائی خطرے کے وقت بھی اشتراکِ عمل کے وصف سے محروم رہے۔

15.3.5 کمزور فوج اور جدید اسلحوں کی عدم فراہمی

مغل فوج ہندوستان میں آنے کے وقت جفاکشی، بہادری اور جوانمردی کے پتلے تھے مگر ہندوستان کی گرم آب وہوا نے ان کے نہ صرف فوجی جوہر کو تباہ وبرباد کردیا بلکہ ان کے اخلاق بھی بگاڑ دئے۔ امراء اور سپاہی عیش پسند ہو گئے کہاں وہ وقت تھا جب بابر کی فوج کئی دن فاقہ کش رہتی تھی اور اف تک نہ کرتی تھی اور اورنگ زیب کے مغل سپاہی پالکیوں میں بیٹھ کر لڑائی کے لئے جاتے تھے۔ مراٹھوں کے ہلکے پھلکے سواروں کا مقابلہ کرنا بھی ان عیش پسند سپاہیوں کے بس کا نہ تھا۔

جغرافیائی ماحول اورآب وہوا کی تاثیر کے علاوہ فوج کی قابلیت بڑی حد تک اس کی ہیئت ترکیبی اور سپاہیوں کے انفرادی کردار پر موقوف ہوتی ہے۔ جب تک مغل فوج میں مسلمانوں کی اکثریت رہی اور ان کی فوجی حرکات پاکیزہ مقاصد کے حصول پر مبنی ہونے کے علاوہ مادر وطن کے جذبہ خدمت گزاری سے معمور رہیں، تب تک یہی فوج قیام امن، سلطنت کی دفاع اور توسیع کے لئے ایک بے مثال کردار نبھاتی رہی۔ مگر اکبر نے فوج کی تربیت میں نمایاں تبدیلی کی۔ اس نے راجپوتوں اور دیگر غیر مسلموں کو سالاری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنا شروع کیا۔ مسلمان سالار قابلیت کی بناء پر مقرر کئے جاتے تھے۔ اوران میں ازبک سردار، افغان، ایران کے شیعہ بھی ہوتے تھے۔ اس طرح مغل مختلف طبقوں پر مشتمل ہونے کے باعث ایک ناکارہ اور بے ڈول سی مشین بن گئی تھی۔ ان طبقوں کے سپاہیوں کے جنگ کے طریقے مختلف تھے نیز راجپوت سپاہی کبھی اپنے ہم قوم ہندوں کے خلاف اور ایرانی شیعہ سپاہی گولکنڈہ اور بیجاپور کی فوجوں کے خلاف کبھی گرم جوشی سے نہ لڑے۔ ان حالات میں مغل افسر لڑنے کے بجائے اپنے حریف افسروں کو رشوت دے کر اپنا مقصد پورا کرلیتے تھے کچھ مدت کے بعد خود مغل افسروں نے رشوت لینی شروع کردی۔ عالمگیر جیسا بیدار مغز اور مخلص انسان تو ایسی فوج کی قیادت کرکے کامیاب لڑائیاں لڑسکتا تھا لیکن اس سے کمتر درجے کے جنرل ایسے افسروں سے کوئی کام نہیں لے سکتے تھے۔ بلآخر مغل فوج کا اخلاقی

انحطاط مغلیہ سلطنت کی بربادی کا باعث ہوا۔

مغلوں کا طریقہ جنگ ،جدید اسلحوں کے تقاضوں اور طریقوں سے ہم آہنگ نہ تھا بلکہ قدیم ہو چکا تھا۔ مغل فوج توپ خانوں اور گھڑ سوار تیر اندازوں پر زیادہ منحصر تھی جب کہ عملاً توپ خانے کی مار زیادہ دور تک نہ تھی اور اسے حرکت دینے میں بھی زیادہ طاقت اور وقت صرف ہوتا تھا۔ اس کے برعکس دشمنوں کی فوج کم بوجھل اور سریع الحرکت ہوتی تھی وہ بجلی کی تیز رفتار سے حملہ آور ہوتی، مغل فوج جب تک سمجھ پاتی وہ اپنا کام تمام کر کے نکل جاتی۔ بارتھولڈ کا یہ خیال درست ہے کہ ”ہندوستان میں مغلوں کا عروج بارود کے استعمال کا نتیجہ تھا تو بجا طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آتشیں ہتھیاروں یعنی توپ اور بندوق کے استعمال کا بڑھنا اور گھڑ سواروں کی جنگی صلاحیت کم ہونے کے نتیجے میں مغل فوجوں کا دبدبہ کم ہو گیا تھا“۔

15.3.6 مراٹھوں اور سکھوں کی سیاسی بیداری

مسلمانوں کے سیاسی انتشار اور باہمی رسہ کشی نے مراٹھوں کو دکن میں اور سکھوں کو پنجاب میں جرأت دلائی کہ وہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر کے اپنی آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ شیواجی اور رام داس نے گئور کھشا کی تحریک کا آغاز کیا۔ اپنے پیروؤں کو چھاپہ مار جنگ کرنے کی تربیت دی۔ دکن کی شیعہ ریاستیں بیجاپور اور گولکنڈہ کی مغل فوجوں کے خلاف مراٹھوں کی امداد کرتی رہتی تھیں۔ ادھر پنجاب میں مسلمان گورنروں کی سختیوں کے باعث سکھوں نے فوجی طرز پر اپنے آپ کو منتظم کرنا شروع کر دیا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ آگرہ اور دہلی میں جاٹوں نے اُدھم مچا دیا۔ سکندرہ میں اکبر بادشاہ کی قبر کھود کر اس کی ہڈیاں جلا دیں۔ عالمگیر کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سیاسی انتشار سے مراٹھوں اور سکھوں کی قومی تحریکوں کو تقویت پہنچی۔ رفتہ رفتہ مراٹھوں نے دکن میں اور پنجاب میں سکھوں نے آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ اگرچہ پانی پت کی تیسری لڑائی نے مراٹھوں کے سیاسی منصوبوں پر کاری ضرب لگائی۔ تاہم مغلوں کی مرکزی طاقت کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا اور ان کی ساخت بگڑتی گئی جس سے قطعی بربادی کے امکانات پیدا ہو گئے۔

15.3.7 نادر شاہ اور ابدالی کے حملے

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے سلطنت مغلیہ کے وقار پر کاری ضرب لگائی اور اس کے زوال کی رفتار تیز کر دی۔ ان حملوں کے باعث سلطنت مغلیہ مغربی صوبے خصوصاً سندھ، کابل اور مغربی پنجاب کٹ کر سلطنت افغانستان کا حصہ بن گئے اس سے مراٹھوں کے حوصلے بڑھ گئے انہوں نے مغلوں کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر متواتر کامیابیاں حاصل کرنا شروع کر دیں۔ ان باتوں سے انہیں یقین ہو گیا کہ وہ مغلیہ سلطنت کو برباد کر کے برصغیر کے مالک بن جائیں گے۔

15.3.8 مغلوں کی بحری قوت سے بے پرواہی

مغلوں نے بحری طاقت سے بے پرواہی برتی۔ اکبر کے زمانے میں پرتگیزی بحری قزاقوں نے اسلامی تجارت کو نقصان پہنچایا۔ مغل بادشاہوں نے ان باتوں کے باوجود اپنی بحری قوت بڑھانے کی اہمیت کی طرف توجہ نہ دی۔ آخر فرنگی بحری قزاقوں کے حوصلے اتنے بڑھے کہ

وہ شاہ جہاں کے زمانے میں مسلمان بچوں اور عورتوں کو اغوا کر کے انہیں غلام بنالیتے یا بیچ ڈالتے تھے۔ اس کے علاوہ حاجیوں کے جہازوں کو بھی کبھی کبھی لوٹ لیتے تھے۔ شاہ جہاں اور عالمگیر نے بنگال میں ان کے مرکز تباہ کئے لیکن ان کی بحری قوت کے کچلنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ فرانسیسوں اور انگریزوں نے سارے بحر ہند کو اپنے سامراجی عزائم کو پورا کرنے کے لئے اکھاڑہ بنالیا۔ چونکہ مغلیہ سلطنت کے ساحلی علاقوں کی حفاظت کے لئے مغلوں کی کوئی بحری طاقت موجود نہ تھی اس لئے برصغیر کا انگریزوں کے استعمار و سیاسی اقتدار کے پنجے میں پھنس جانا ایک یقینی امر تھا۔ اس طرح یہ نیا انگریزی خطرہ بالآخر مغلیہ سلطنت کی بربادی کا باعث بن گیا۔

15.3.9 اقتصادی بدحالی اور مغل خزانے کا دیوالیہ پن

سلطنت مغلیہ کے دور میں گرچہ ہندوستان کی پہنچان ایک عظیم صنعتی اور تجارتی ترقی کے طور پر ہوتی تھی لیکن اس کے باجود زرعی زمین ہی حکومت کی آمدنی کا خاص ذریعہ تھی۔ عام طور پر مغلیہ سلطنت میں زرعی زمین دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک حصہ برائے راست شاہی ملکیت میں جاتا تھا جس کو خالصہ کہا جاتا تھا۔ خالصہ زمین کی مالگزاری حکومت کا محکمہ مال وصول کرتا تھا جو شاہی خزانے میں داخل کیا جاتا تھا۔ دوسرا حصہ جاگیر کا تھا جس کی مالگزاری جاگیردار وصول کرتے تھے جس سے منصب داروں، امراء اور فوجی سربراہوں کی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اکبر اور شاہ جہاں کے دور حکومت میں خالصہ اور جاگیرداری کی نظام میں ہی بدحالی کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ اورنگ زیب نے حکومتی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے خالصہ زمین کے رقبے میں تھوڑا اضافہ کیا اور مال گزاری کی شرح بھی بڑھائی جس کی وجہ سے کاشت کاروں پر بوجھ بڑھ گیا۔ مالگزاری ادا کرنے کے بعد کاشت کار کے پاس اتنا کچھ بچ پاتا کہ وہ سال بھر تک اپنی ذاتی اور خاندان کی ضروریات کو پورا کر سکے، جبکہ کھیتی باڑی کو ترقی دینے یا وسیع کرنے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں بچتا تھا۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں صنعت اور تجارت میں خاطر خواہ ترقی ہوئی لیکن زراعت بدستور جامد اور قدیم طریقے پر چلتی رہی زرعی ترقی کے رک جانے سے شرح پیداوار گھٹ گئی۔ اس کے دو واضح اسباب تھے۔ ایک تو آبادی بڑھ جانے سے زرعی زمین خاندانوں میں تقسیم در تقسیم ہو کر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔ زمین کی کمی پوری کرنے کے لئے کاشتکاروں نے کم زرخیز اور بنجر زمین کو کھیتی میں شامل کر لیا۔ زرخیز اور بنجر زمین کے ملاپ سے پیداوار کی شرح میں اضافہ تو نہیں ہوا لیکن کاشتکار کے زرعی اخراجات بڑھ گئے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ کاشتکار زرخیز زمینوں پر صدیوں تک معقول کھاد دئے بغیر فصلیں اگاتے رہے۔ لہٰذا زرخیز زمینوں کی قوت نمو بتدریج کم ہوتی گئی۔ زرعی پسماندگی نے حکومت کے مالیہ کو بری طرح متاثر کیا۔

شاہ جہاں کی تعمیراتی دلچسپی نے بھی مغلیہ سلطنت کے خزانے پر برا اثر ڈالا، ساتھ ہی دکن میں اورنگ زیب کی جنگوں کی وجہ سے خزانے پر مزید بوجھ پڑا اور حالات یہاں تک پہنچے کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغل خزانہ تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ ولیم نورس کے قول کے مطابق "اورنگ زیب کی حکومت کے آخری سالوں میں سرکاری خزانہ خالی ہو چکا تھا، لڑائیاں مسلسل جاری تھیں، فوج غیر منظم ہو چکی تھی اور حکام ناخوش و غیر بھروسے مند ہو چکے تھے"۔ اس کے علاوہ سرکاری خزانہ خالی ہونے اور مغلیہ سلطنت میں کمی واقع ہونے کی ایک دوسری وجہ علاقائی ریاستوں کا قیام بھی شمار کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے حکومتی آمدنی میں بڑے پیمانے پر کمی واقع ہوئی اور اخراجات میں

مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ مستقل جنگوں نے ملکی معیشت پر بھی برے اثرات ڈالے، زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت سبھی میں کمی واقع ہوتی گئی۔ نتیجتاً ایک وقت ایسا آیا کہ پوری ملکی معیشت کا ڈھانچہ کمزور ہو گیا، جو سلطنت مغلیہ کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔

15.4 کلیدی الفاظ

استعماریت	:	زبردستی کسی ملک کو اپنے ساتھ ملا لینا یا دوسری مکمل آبادیوں پر قابض ہونا
ریشہ دوانی	:	شرارت، فساد، سازش، جوڑ توڑ
کٹھ پتلی	:	بے اختیار شخص، بے بس
قلع قمع	:	توڑ پھوڑ، مسمار
چپقلش	:	جھگڑا، دنگا، فساد
خود مختار	:	آزاد، با اختیار
بادشاہ گر	:	وہ جو اپنی مرضی اور طاقت سے جسے چاہے بادشاہ بنا دے
قلمرو	:	سلطنت، حکومت، ریاست
عہد وسطیٰ	:	وہ زمانہ جو تقریباً 1000ء سے لے کر 1453ء تک شامل ہے
حب الوطنی	:	وطن کی محبت
قزاق	:	ڈاکو، لٹیرا

15.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مغلوں نے ہندوستان میں تقریباً 315 سال حکومت کی۔
- پہلے 166 سال بابر کی تخت نشینی (1526ء) سے لے کر اورنگ زیب کی وفات تک مغل سلطنت کے عروج کا زمانہ مانا جاتا ہے۔
- عروج کے دوران چھ نہایت عظیم صلاحیتوں کے حکمراں مغلیہ سلطنت کو نصیب ہوئے۔
- 1707ء سے 1857ء یعنی 150 سال کا دور مغلیہ سلطنت کا زوال کا دور رہا۔

- دورزوال میں تقریباً تیرہ بادشاہ گزرے جو اپنی نااہلی اورآپسی خانہ جنگی کی وجہ سے یاتوبرائے نام بادشاہ رہے یاوظیفہ خوار کی حیثیت سے رہے۔ ان میں سے اکثریاتوقتل کردیئے گئے یا زبردستی کرسی سے اتاردیئے گئے۔ مغلیہ سلطنت کا آخری فرماں روا سراج الدین بہادر شاہ ظفر تھا جسے انگریز افواج کی محض ڈیڑھ سو سپاہیوں پر مشتمل ٹکڑی نے ہمایوں کی مقبرہ سے گرفتار کیا۔
- اورنگ زیب کا انتقال ہندوستانی تاریخ کا عہد جدید کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔
- 1803ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کیا۔
- تاریخی تجزیہ نگاروں نے مغلیہ سلطنت کے زوال میں بہت سے اسباب وعوامل کا تذکرہ کیا ہے جن میں مغل حکمرانوں کے یہاں جانشنی کے قانون کی عدم موجودگی، اورنگ زیب کے نااہل اور کمزور جانشین، اکبر کا غلط مذہبی پالیسی، غدارامراء کی سرکشی اور گروہ بندی، کمزوراور عیش پسند سپاہی، اندرونی بغاوتیں، بیرونی حملے، خود مختار ریاستوں کا ظہوراور معاشی بدحالی کافی اہم ہیں۔
- برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع نے تابوت میں آخری کیل کا کام کیا، جس کے بعد مغلیہ سلطنت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

15.6 نمونہ امتحانی سوالات

15.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مغلیہ سلطنت کی بنیاد کب پڑی؟

(a). 1526ء　(b). 1530ء　(c). 1553ء　(d). 1520ء

2. مغلیہ سلطنت کی بنیاد کس نے ڈالی؟

(a). ہمایوں　(b). بابر　(c). اکبر　(d). بہادر شاہ ظفر

3. وہ کونسا مغل بادشاہ تھا جسے رنگیلا کا لقب دیا گیا؟

(a). فرخ سیر　(b). جہاندار شاہ　(c). محمد شاہ　(d). بہادر شاہ

4. ”قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی“ یہ کس کا قول ہے؟

(a). مرزا غالب　(b). حالی　(c). ابوالکلام آزاد　(d). علامہ اقبال

5. ان میں سے کس مغل بادشاہ کو سید برادران نے تخت شاہی پر بٹھایا؟

(a). جہاندار شاہ　(b). فرخ سیر　(c). بہادر شاہ اول　(d). اورنگ زیب

6. اٹھارویں صدی میں مشہور کوہ نور ہیرا کون لے کر گیا؟

(a). نادر شاہ　(b). احمد شاہ ابدالی　(c). احمد ثانی　(d). بہادر شاہ ظفر ثانی

7. احمد شاہ ابدالی نے کس مغل بادشاہ کے وقت میں ہندوستان پر حملہ کیا؟

(a). محمد شاہ (b). شاہ عالم ثانی (c). عالمگیر ثانی (d). فرخ سیر

8. احمد شاہ ابدالی نے کس مسلم دانشور کے بلاوے پر ہندوستان پر حملہ کیا؟

(a). شاہ اسماعیل شہید (b). شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (c). شاہ عبد العزیز (d). شاہ رفیع الدین دہلوی

9. مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کس سنہ میں ہوا؟

(a).1857 (b).1762 (c).1850 (d).1845

10. مغلیہ سلطنت کا آخری باشاہ کون تھا؟

(a). عالم ثانی (b). فرخ سیر (c). احمد ثانی (d). بہادر شاہ ظفر ثانی

15.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. محمد شاہ رنگیلا پر ایک جامع نوٹ لکھیں۔
2. مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب میں سے تین اسباب پر روشنی ڈالیں۔
3. مغل حکومت کے زوال میں اکبر کی پالیسیاں کس حد تک ذمہ دار ہیں؟ وضاحت کریں۔
4. مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کیسے ہوا؟
5. مغل سیاست میں سید برادران کا کیا کردار رہا؟ مثالوں سے واضح کریں۔

15.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مغلیہ سلطنت کے عہد زوال کے حکمرانوں کا ایک خاکہ پیش کریں۔
2. مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب کی نشاندہی کیجیے۔
3. مغلیہ سلطنت کے زوال میں ہندوستانی معیشت اور بیرونی حملے کہاں تک ذمہ دار ہیں؟ وضاحت کریں۔

15.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم) : ثروت صولت
2. رود کوثر : شیخ محمد اکرام
3. ہندوستان میں مسلم دور حکومت کا خاتمہ : ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی
4. ہندوستان پر مغلیہ حکومت : مفتی شوکت علی فہمی
5. مغلوں کے زوال سے قیام پاکستان تک : سید ہاشمی فرید آبادی

اکائی 16: مغل حکومت (نظم ونسق)

اکائی کے اجزا:

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 شہری نظم ونسق اور اس کا ارتقا

16.2.1 مرکزی نظم ونسق

16.2.2 صوبائی نظم ونسق

16.2.3 علاقائی نظم ونسق

16.2.4 قصبہ، قلعہ اور بندر گاہ کا نظم ونسق

16.3 عدالتی نظم ونسق

16.3.1 عدلیہ اور اس کی تنظیم

16.3.2 عدلیہ کی قسمیں

16.4 نظام محصول ومال گزاری

16.4.1 نظام محصول ومال گزاری کی بنیادیں اور پالیسیاں

16.4.2 مغل نظام محصول کے اہم افسران

16.5 فوجی نظم ونسق

16.5.1 شاہی افواج

16.5.2 منصب دار افواج

16.5.3 مغل فوجی دستے

16.6 اکتسابی نتائج

16.7 کلیدی الفاظ

16.8 نمونہ امتحانی سوالات
16.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

مغل عہد ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم اور شان دار باب شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت و عظمت کا انحصار صرف سلطنت کی وسعت، طول زمانی اور علمی و فنی ترقیات پر ہی نہیں، بلکہ بڑی حد تک نظم مملکت سے متعلق ان اصولوں اور اداروں پر بھی ہے، جو حکومتی استحکام کے ساتھ ساتھ بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و ملت رعایا کی ہمہ جہت ترقی اور قیام امن و انصاف کے ضامن تھے۔ مغل انتظامی ڈھانچے کا مقصد نہ صرف سلطنت کے مختلف حصوں پر سیاسی بالا دستی اور مکمل اختیار حاصل کرنا بلکہ عوام کے لیے ایک پر امن اور جرائم سے پاک ماحول فراہم کرنا تھا۔ مذہبی، نسلی، لسانی و ثقافتی تنوع اور اختلاف کے باوجود یہ حکومت ایک لمبے عرصے تک قائم رہی، اس کا سہرا ان کی انتظامی پالیسیوں کو جاتا ہے۔ اس عہد کی انتظامی پالیسیوں اور سیاسی اداروں نے حکومت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مغل ہندوستان میں علاقائی سرداروں کا اپنی رعایا اور علاقے پر گہرا اثر تھا۔ مغل سیاست کی انفرادیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ مغلوں نے مختلف النوع طبقے کے سرداروں کو اپنے انتظامی ڈھانچے میں شامل کیا، انہیں مختلف قسم کے عہدے دیے۔ ساتھ ہی مملکت کے انتظام و انصرام کو درست طریقہ سے چلانے کے لیے مرکزی سطح سے لے کر علاقائی سطح تک مختلف شعبوں پر مشتمل ایک وسیع اور منظم انتظامی ڈھانچہ ترتیب دیا۔ مغل نظم ونسق کے ابتدائی خاکے سلطنت اور سوری عہد میں ترتیب دیے جاچکے تھے۔ مغلوں نے اسی خاکے میں مزید رنگ بھرنے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش کی۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو مغل حکومت کے نظم ونسق سے روشناس کرانا ہے، تاکہ آپ کو اس بات کی آگہی ہوسکے کہ وہ کون سے بنیادی اصول اور اجزا تھے، جن پر مغل عہد کا نظم ونسق منحصر تھا۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ جانیں گے کہ مغل عہد کے نظم ونسق اور اس کے انتظامی ڈھانچے کا ارتقا کس طرح ہوا؟ مرکزی، صوبائی اور علاقائی سطحوں پر کس قسم کے شعبے اور عہدے دار موجود تھے؟ ان شعبوں اور عہدوں پر افراد کی تقرری اور ان کی معزولی کا کیا نظم وضبط تھا؟ ان کی ذمہ داریاں کیا تھیں اور انہوں نے مغل حکومت کی ترقی و

توسیع اور استحکام کے لیے کس قسم کی خدمات انجام دیں؟

16.2 شہری نظم ونسق اور اس کا ارتقا

مغل حکومت کی سیاسی عمل آوری میں برصغیر ہند کے ساتھ اطراف کے دوسرے علاقے بھی شامل تھے۔ ابتدائی مغل حکمراں بابر اور ہمایوں اپنے مختصر دور حکومت اور عسکری مصروفیت کی وجہ سے نظم ونسق پر کامل توجہ نہیں دے سکے۔ نظم مملکت کے تعلق سے اکبر کا عہد کافی اہم رہا ہے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ مغل انتظام مملکت کا بنیادی اور تفصیلی ڈھانچہ اسی عہد میں تیار ہوا۔ آئین اکبری سے مرکزی، صوبائی اور علاقائی سطح پر حکومت کے مختلف شعبوں کے سربراہوں کو تفویض کردہ کاموں کی تفصیلات اور دفاتر و محکموں کے قیام کا پتہ چلتا ہے۔ اسی عہد میں حکومتی افسران و کارکنان کے سرکاری اور ذاتی طرز عمل کی رہنمائی کرنے والے ضوابط وضع کیے گئے۔ مغل عہد کے شہری نظم ونسق کو چار سطحوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے: (1) مرکزی نظم ونسق، (2) صوبائی نظم ونسق، (3) علاقائی نظم ونسق اور (4) قصبہ، شہر و بندرگاہ کا نظم ونسق۔

16.2.1 مرکزی نظم ونسق

مغل عہد میں سلطنت کو فعال بنانے، استحکام بخشنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے ہر سطح پر مختلف قسم کے انتظامی اقدامات کیے گئے تھے۔ مغل سیاست اور نظم ونسق میں مرکزی حکومت کے سیاسی اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے متعدد قسم کے ادارے قائم تھے۔ ان سیاسی و انتظامی اداروں کو فعال اور متحرک رکھنے کے لیے ان میں بڑے پیمانے پر عہدے داروں اور کارکنان کی تعیناتی کے ساتھ ساتھ ان کے فرائض اور ذمے داریاں طے کی گئیں تھیں۔ مرکزی سطح پر قائم اداروں اور عہدے داروں کی تفصیل درج ذیل ہے:

1. بادشاہ / حکمراں

ہندوستانی روایتیں ہمیشہ سے ایک مضبوط حکمراں کی حامی رہی ہیں، عہد وسطی میں مسلم علما اور دانش وروں کا بھی یہی موقف رہا۔ اس فکر کے نتیجہ میں حکمراں سے متعلق الوہی تصور 'السلطان ظل اللہ' یعنی سلطان اللہ کا سایہ اور اس کا نائب ہے، کو بآسانی ہندوستانی عوام میں اعتبار حاصل ہوا۔ اس تصور کو عملی طور پر اکبر نے جھروکہ درشن کے ذریعہ پیش کیا، جس میں بادشاہ ایک مقررہ وقت پر رعایا کے سامنے نمودار ہوتا۔ بادشاہ کے اس یک نظری دیدار سے متعلق عوام کا یہ تصور کہ اس کے ذریعہ ان کی پریشانیوں کا ازالہ ہو گا، ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ مغل انتظامیہ کے تمام امرا، افسران اور کارندے اپنے عہدے اور طاقت کے حصول کے لیے بادشاہ کے مرہون منت ہوتے۔ ان کی تقرری، ترقی، تنزلی اور برطرفی حکمراں کی ذاتی ترجیحات اور خواہشات کے تابع تھی۔ مغل سیاست اور نظم مملکت میں حکومت کا سب سے بڑا عہدے دار بادشاہ تھا۔ وہ اپنے فیصلوں میں مطلق العنان ہوتا اور اسے غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ مملکت کا سربراہ اعلیٰ، حکومتی افواج کا سب سے بڑا سپہ سالار، سب سے بڑا قانون ساز، عدل وانصاف کا سرچشمہ اور تمام طرح کے حکومتی معاملات میں قطعی اختیارات کا مالک تھا۔

2. وکیل / وزیر سلطنت

سلاطین دہلی کے تحت وزیر سلطنت کو شہری اور فوجی دونوں اختیارات حاصل تھے۔ بلبن کے عہد میں، فوجی اختیارات 'دیوان عرض' کو منتقل کر دیا گیا۔ مغل افسر شاہی انتظامیہ میں وکیل یا وزیر سلطنت بادشاہ کے بعد اعلیٰ ترین عہدہ تھا۔ بابر کے وزیر سلطنت نظام الدین محمد خلیفہ کو شہری اور فوجی دونوں اختیارات حاصل تھے۔ عہد اکبری کی ابتدا میں بیرم خان نے لا محدود اختیارات کے ساتھ وزارت / وکالت کے عہدہ کو عروج بخشا۔ 1564 میں اکبر نے وکیل سے مالی اختیارات واپس لے کر 'دیوان کل' (وزیر خزانہ) کے سپرد کر دیا۔ مالیات کی علاحدگی سے وکیل کے اختیارات میں کمی واقع ہوئی، اس کے باوجود بھی مغل افسر شاہی انتظامیہ میں وکیل کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل رہا۔

3. دیوان کل / مرکزی وزیر مالیات

مغل عہد میں 'دیوان کل' مرکزی شعبہ مالیات کا سربراہ ہوتا۔ دیوان کل کے بنیادی فریضے میں شاہی خزانے کی نگرانی، محصولات کی وصولی اور تمام مالیاتی کھاتوں کی دیکھ ریکھ شامل تھا۔ وہ تمام محکموں کے مالی لین دین اور ادائیگیوں کا معائنہ کرتا۔ صوبائی دیوان اور عمال کے کاموں کی نگرانی کرتا۔ مرکزی نظام مال گزاری اور اخراجات کی پوری مشینری اس کے زیر انتظام ہوتی۔ مالیات سے متعلق کاغذات کی تصدیق اور نئی تقرری یا ترقی کے حکم نامہ پر عمل درآمد کے لیے اس کے مہر کی ضرورت ہوتی۔ وہ روزانہ ریاستی مالیات کی رپورٹ شاہی دربار میں پیش کرتا۔ حکومتی ضروریات کے پیش نظر مرکزی وزارت مالیات مختلف شعبوں میں منقسم تھی۔ جیسے: دیوان خالصہ، دیوان تان، دیوان جاگیر اور دیوان بیوتات وغیرہ۔ تمام شعبوں میں کاموں کی انجام دہی کے لیے افسران اور کارکنان پر مشتمل ایک بڑا عملہ موجود تھا۔ ہر شعبہ مختلف ذیلی خانوں میں منقسم تھا، جس کا انتظام ایک نگراں، معاون اور منشی کے ذریعہ چلایا جاتا۔ ان کے علاوہ بھی مغل وزارت مالیات کے چند اہم عہدہ دار شمار کیے جاتے ہیں، جن میں مستوفی (آڈیٹر جنرل)، مشرف (چیف اکاؤنٹنٹ) اور خزان دار (شاہی خزانے کا نگراں) شامل ہیں۔

4. میر بخشی / وزیر فوج

'میر بخشی' محکمہ فوج کا سربراہ ہوتا۔ اس کی ذمہ داری سلطنت کے لیے ایک پیشہ ور، لائق فوج کی تیاری اور اس کی بہتر تنظیم تھی۔ وہ حکومت اور منصب داروں کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتا۔ منصب داروں کی تقرری کے احکامات کا نفاذ کرتا اور تنخواہوں کی ادائیگی کے حکم نامہ کی منظوری دیتا۔ وہ 'داغ وچہرہ' یعنی گھوڑوں کو نشان زد کرنے اور فوجیوں کے ظاہری حلیہ سے متعلق شناختی نظام کی نگرانی کرتا۔ فوجی محکمہ سے متعلق تمام قسم کے معاملات بادشاہ کے سامنے پیش کرتا۔ ملازمت اور منصب و جاگیر کے طلب گار نئے افراد، صوبوں سے آنے والے عہدہ دار، امرا و رؤسا، دوسری سلطنتوں کے سفرا اور معزز مہمان اسی کے ذریعہ شاہی دربار میں رسائی پاتے۔ سپاہیانہ، فوجی پیشہ افراد اور محکمہ فوج کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے وہ تمام منصب داروں کا نمائندہ بھی تھا اور انعام واکرام کے لیے فوجیوں کے نام بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا۔ شاہی دوروں، تفریحی اسفار، شکار کی مہموں اور جنگوں میں وہ بادشاہ کے ساتھ ہوتا۔ اختیارات اور مرتبے کے اعتبار سے

میر بخشی کی حیثیت بہت ہی اہم اور دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ مرکزی سطح پر اس کی مدد کے لیے دوسرے بخشی اور کارکنان کا ایک بڑا عملہ موجود ہوتا۔

5. میر سامان / خان سامان

'میر سامان' یا 'خان سامان' شاہی کارخانوں کا افسر اور منتظم تھا، جو مملکت کے لیے اشیا کی خریداری، ذخیرہ اندوزی اور حفاظت کا ذمہ دار ہوتا۔ اس کے فرائض میں کارخانوں کے اندر تیار ہونے والی اشیا کی نگرانی شامل تھی، خواہ اسلحے ہوں یا ضروریات زندگی سے متعلق اشیاء۔ میر سامان بادشاہ کے ماتحت ہوتا، مگر اسے رقم کی منظوری و فراہمی اور کھاتوں کی جانچ پڑتال کے لیے دیوان کل سے رابطہ رکھنا ہوتا تھا۔ مملکت کے صنعتی امور اور ذخائر اشیا کے منتظم کی حیثیت سے وہ محکمے کے انتظامی امور کو انجام دیتا اور ذیلی شعبوں کی نگرانی کرتا۔ وہ صوبوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا اور متعلقہ امور و تجارتی معاملات کی طرف بادشاہ کی توجہ مبذول کراتا۔ اس کے ماتحت عہدے داروں اور کارکنان کا ایک بڑا عملہ تھا۔ ان میں 'دیوان بیوتات'، 'مشرف کل و جز'، 'داروغہ'، 'تحویل دار'، 'مستوفی'، 'داروغہ کچہری' اور 'ناظر' شامل تھے۔

6. صدرالصدور

صدرالصدور مذہبی امور اور محکمہ وظائف و عطیات کا سربراہ تھا۔ شرعی قوانین کا تحفظ اور نفاذ اس کی ذمہ داری تھی۔ رفاہ عامہ سے متعلق خیراتی ادارے اسی کے ماتحت ہوتے۔ ان کے ذریعہ وہ معذوروں اور ضرورت مندوں میں نقد وظائف تقسیم کرتا، معاشی اعتبار سے غریب و مجبور اور حاجت مند افراد کو سیورغال، انعام و مدد معاش کی شکل میں زمینی عطیات فراہم کرتا۔ مغل عہد کی ابتدا میں عدلیہ کے سربراہ کی حیثیت سے صدرالصدور عدالتی قاضیوں اور مفتیوں کی تقرری کی نگرانی کرتا۔ عہد شاہ جہانی تک قاضی القضاۃ اور صدرالصدور کے عہدے پر ایک ہی فرد کا تقرر ہوتا۔ تاہم، اورنگ زیب کے عہد میں دونوں کو علاحدہ کر دیا گیا، اس طرح صدرالصدور کے اختیارات میں کمی واقع ہوئی۔ صدرالصدور کا کام اس بات کو بھی یقینی بنانا تھا کہ عطیات حق دار کو دی جائیں۔ وہ وظائف اور عطیات سے متعلق نئی اور تجدید کے لیے موصول ہونے والی درخواستوں کی چھان بین کرتا اور منظوری کے لیے بادشاہ کے سامنے پیش کرتا۔ زکوٰۃ بھی اسی کے ذریعہ تقسیم ہوتی۔ مرکزی نظم و نسق کے دوسرے محکموں کی طرح صدرالصدور کے پاس بھی عہدے داروں اور کارکنان کا ایک بڑا عملہ ہوتا۔

16.2.2 صوبائی نظم و نسق

اکبر نے اپنے عہد میں سلطنت کو متعدد صوبوں میں تقسیم کر کے صوبائی نظم و نسق کا ایک موثر اور مستحکم نظام متعارف کرایا۔ 1580 میں مملکت کو 12 صوبوں میں منقسم کیا گیا۔ 1605 میں تین صوبوں کا اضافہ ہوا، اس طرح یہ تعداد 15 ہو گئی۔ شاہ جہاں کے عہد میں صوبوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور صوبے 19 ہو گئے۔ اورنگ زیب کے عہد کے اواخر میں مملکت کے صوبوں کی تعداد 21 تھی۔ ہر صوبہ متعدد سرکاروں (ضلعوں) میں منقسم تھا، ان سرکاروں کو پرگنوں و محال میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر پرگنہ میں متعدد گاؤں شامل تھے۔

1. صوبائی گورنر

صوبے کا گورنر، جو عہد وسطیٰ میں عام طور پر صوبے دار یا والی کے نام سے جانا جاتا، براہ راست بادشاہ کے ذریعے منتخب ہوتا۔ عام

طور پر ایک صوبے دار کی مدت کار تقریباً تین سال ہوتی۔ مغل نظم ونسق میں اپنے اختیارات کے اعتبار سے وہ صوبے کا سربراہ اور ہر قسم کے سیاسی و انتظامی امور کا ذمہ دار ہوتا۔ صوبے دار کے فرائض میں سب سے اہم کام رعایا اور فوج کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا تھا۔ صوبے میں امن و امان کا قیام اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ اپنے صوبے میں زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کی حوصلہ افزائی کرتا۔ ان سے فلاحی اور رفاہ عامہ کے کاموں کی توقع کی جاتی۔ ساتھ ہی ان کا ایک اہم کام مملکت کی آمدنی میں اضافے کے لیے اقدامات کرنا تھا۔

2. صوبائی دیوان

صوبائی دیوان کا تقرر بادشاہ کرتا۔ وہ اپنے اختیارات کے اعتبار سے مرکز کو جواب دہ ایک آزاد افسر تھا۔ صوبائی دیوان، صوبے میں محصول و مال گزاری کا ذمہ دار ہوتا، جو اپنے صوبے میں محصول کی وصولی کی نگرانی کرتا اور صوبائی سطح کی تنخواہوں اور دوسری قسم کے اخراجات کا حساب رکھتا۔ صوبائی دیوان قابل کاشت رقبوں میں اضافے کے لیے اقدامات بھی کرتا۔ متعدد معاملات میں اس کے دفتر سے کاشت کاروں کو پیشگی قرض بھی فراہم کیے جاتے۔ صوبائی دیوان کے ذریعہ ایک روزنامچہ تیار کیا جاتا، جس میں محصول کنندگان اور زمین داروں کے ذریعہ شاہی خزانے میں جمع کی گئی رقوم اور اشیا کی تفصیل ہوتی۔ صوبائی دیوان کے ماتحت افسران اور کارکنان کا ایک بڑا عملہ ہوتا۔

3. صوبائی بخشی

صوبوں میں بخشی کا تقرر میر بخشی کی سفارش پر شاہی دربار کے ذریعہ انجام دیا جاتا۔ وہ صوبے میں منصب داروں کے ذریعہ تقرر کیے گئے سپاہیوں اور خریدے گئے گھوڑوں کا معائنہ کرنے اور ان کی نگرانی کا ذمہ دار تھا۔ وہ منصب داروں اور سپاہیوں دونوں کی تنخواہیں جاری کرنے کی کارروائی کرتا۔ صوبے کے فوت شدہ منصب داروں کی فہرست تیار کرتا، مگر اس تعلق سے اکثر پرگنہ کے وقائع نویس براہ راست صوبائی دیوان کو اطلاع بھیجتے۔ وہ اپنے صوبے میں سرزد ہونے والے واقعات سے مرکزی حکومت کو آگاہ کرتا۔ صوبائی بخشی اپنے کاموں کو سرعت اور بآسانی انجام دینے کے لیے پرگنوں اور اہم دفاتر میں اپنے نمائندوں کا تقرر کرتے۔

4. داروغہ ڈاک اور خفیہ ادارے

مغل عہد میں مواصلات اور معلومات کی فراہمی کا کام ایک علاحدہ محکمہ انجام دیتا تھا۔ دور دراز علاقوں تک سرکاری احکامات پہنچانے کے لیے شاہی ڈاک نظام قائم کیا گیا اور اسی کا استعمال معلومات کے حصول کے لیے بھی کیا جاتا۔ اسی مقصد کے تحت ہر صوبے میں داروغہ ڈاک کا تقرر رہوا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ شاہی دربار تک پیغام رسانی کو ممکن بنائے۔ اس کے لیے سلطنت میں متعدد ڈاک چوکیاں قائم ہوئیں اور خبر رساں تعینات کیے گئے۔ ڈاک کی ترسیل کے لیے گھوڑے اور کشتیوں کا بھی استعمال ہوتا۔ بادشاہ تک براہ راست خبروں کو پہنچانے کے لیے صوبائی سطح پر وقائع نویس اور وقائع نگار مقرر تھے۔ بادشاہ کو خفیہ اطلاعات فراہم کرنے کے لیے سوانح نگار بھی موجود تھے۔ مغل حکمرانوں نے ایک دوسرے سے آزاد دفاتر اور ادارے قائم کرکے صوبائی افسران پر نظر رکھی۔ صوبوں میں بادشاہوں کے متواتر دورے اور اوسطاً تین سال کی مدت میں افسران کے تبادلے کے نظام نے عہدہ داروں کی جانچ پڑتال میں مدد کی۔

16.2.3 علاقائی نظم ونسق

مغل حکمرانوں نے صرف مرکزی اور صوبائی سطح تک ہی سلطنت کو مستحکم نہیں بنایا بلکہ ضلعی و علاقائی سطح، یہاں تک کہ آبادی کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں کو بھی اپنے انتظامی مقاصد کا حصہ بنایا۔ تاکہ فوری طور پر نہ صرف رعایا کے مسائل حل ہو سکیں بلکہ سلطنت کے اندر وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات کی معلومات بھی حکومت کو مل سکے اور حکومتی وسائل کے استعمال کے ذریعہ ان کا مثبت و فوری ازالہ کیا جا سکے۔ اس حصے میں سرکار، پرگنہ اور گاؤں کی سطح پر نظم ونسق سے متعلق مغل دور کے اقدامات کی تفصیل درج ہے۔

1. سرکار / ضلع

علاقائی نظم ونسق میں سرکار سب سے بڑی تقسیم تھی، رقبے کے اعتبار سے اس کا درجہ صوبے کے بعد اور پرگنہ سے اوپر تھا۔ مغل نظم ونسق میں سرکار کی سطح پر بھی کئی انتظامی عہدے دار شمار کیے جاتے ہیں، جن میں فوج دار، عمل گزار اور تھانے دار اہم ہیں۔

فوج دار: سرکار کی سطح پر انتظامی امور کا سربراہ تھا۔ اس کے اختیارات کا دائرہ بڑا ہی پیچیدہ اور متبدل تھا۔ عمومی طور پر ایک فوج دار کا تقرر سرکار کی سطح پر ہوتا، مگر بسا اوقات ایک سرکار کے اندر متعدد فوج دار بھی نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات اس کا دائرہ اختیار دو سرکاروں پر محیط ہوتا۔ فوج دار کی ذمہ داری فرض اپنے دائرہ اختیار میں بغاوتوں کا خاتمہ اور امن وامان کا قیام تھا اور اسی لیے اس کے دائرہ اختیار کا فیصلہ علاقے کی ضرورتوں کے مطابق کیا جاتا۔ اس کی ذمہ داریوں میں اپنے دائرہ اختیار اور علاقے میں رہنے والے افراد کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت بھی تھی۔ وہ اپنے علاقے میں تاجروں کے لیے محفوظ گزر گاہ کو بھی یقینی بناتا۔ اپنے علاقے کے انتظامی امور کا سربراہ ہونے کی وجہ سے وہ باغی اور نافرمان زمین داروں پر نظر رکھتا۔ مخصوص حالات میں وہ محصول کی وصولی میں عمل گزار کی معاونت بھی کرتا تھا۔

عمل گزار / عامل: محصول جمع کرنے والے افسران میں سب سے اہم عہدہ دار عامل تھا، جس کی تعیناتی سرکار کی سطح پر ہوتی۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ ماتحت عہدہ داروں اور اہل کاروں کی مدد سے محصولات کی وصولی کی نگرانی کرے۔ ایک عامل سے یہ امید کی جاتی کہ وہ قابل کاشت اراضی میں اضافہ کرے گا اور کاشت کاروں کو ترغیب دے گا کہ وہ زور زبردستی کے بغیر خود سے بخوشی ورضا محصول جمع کریں۔ وہ روزانہ کی آمدنی واخراجات کی رپورٹیں صوبائی دیوان کو ارسال کرتا اور سرکار کی سطح پر حکومتی آمدنی کے تمام کھاتوں کی دیکھ بھال کرتا۔

تھانے دار: مغل نظم ونسق میں تھانہ وہ مقام تھا، جہاں امن وامان کے قیام کے لیے سپاہی و فوجی قیام کرتے تھے۔ اس کے منتظم کو تھانے دار کہا جاتا۔ اس کا تقرر صوبے دار اور دیوان کی سفارش پر ہوتا۔ وہ عام طور پر علاقے کے فوج دار کے ماتحت ہوتا۔ اس کی ذمہ داری ہوتی کہ سپاہیوں و فوجیوں کے لیے تمام قسم کے بندوبست کرے۔ یہ تھانے خاص طور پر ہنگامہ خیز و غیر مامون علاقوں اور شہروں کے اطراف میں قائم کیے جاتے۔ تھانے دار کی ذمہ داریوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر فوج دار کے معاون افسر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

2. پرگنہ

مغل انتظام مملکت میں پرگنہ سرکار سے نچلی انتظامی اکائیاں تھیں۔ ایک سرکار کے تحت کئی پرگنے ہوتے۔ پرگنہ کی سطح پر بھی متعدد افسران موجود تھے، جن میں شق دار، امین، فوطہ دار اور قانون گو شمار کیے جاتے ہیں۔ شق دار پرگنہ کا انتظامی افسر ہوتا اور محصول جمع کرنے

میں عامل کی مدد کرتا۔ شق دار کی ذمہ داریاں سرکار کی سطح پر عمل گزار کے فرائض کی طرح ہی شمار کی جاتی ہیں۔ امین پرگنہ میں شعبہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا، جس کی مدد کے لیے فوطہ دار یا خزانچی موجود ہوتا۔ قانون گو اپنے علاقے کی زمین سے متعلق تمام قسم کی معلومات اور دستاویزات تیار کرتا۔ وہ پرگنہ میں کاشت کی جانے والی مختلف فصلوں اور ان کی پیداوار کے متعلق معلومات درج کرتا تھا۔

3. گاؤں / موضع

گاؤں مغل انتظام مملکت کی سب سے چھوٹی اکائی تھی۔ ایک پرگنہ کے تحت متعدد گاؤں ہوتے۔ گاؤں کی سطح پر بھی چند عہدے دار ہوتے، جن میں مقدم، پٹواری اور چوکی دار کو شمار کیا جاتا ہے۔ مقدم، گاؤں کے انتظامی امور کا سربراہ تھا، جب کہ پٹواری گاؤں کے محصولات کی نگرانی کرتا اور اس کا ریکارڈ رکھتا۔ چوکی دار کی ذمہ داری گاؤں کی حفاظت اور نگہبانی تھی۔

16.2.4 قصبہ، قلعہ اور بندرگاہ کا نظم ونسق

مغل عہد کے شہری نظم ونسق میں مرکزی، صوبائی اور علاقائی تقسیم کے علاوہ چوتھی تقسیم قصبوں، شہروں اور بندرگاہوں کی تھی۔ مغل حکمرانوں نے ان کے انتظام وانصرام کے لیے علاحدہ افسران متعین کیے تھے۔ ان افسران کی تفصیل اور ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:

1. کوتوال

قصباتی اور شہری مراکز کے انتظام کے لیے شاہی دربار نے کوتوال مقرر کیے تھے، جن کا بنیادی کام شہری باشندوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت تھا۔ اس کے ماتحت شہری حفاظتی امور کا ایک بڑا عملہ کام کرتا۔ کوتوال شہر میں آنے اور جانے والوں کا ریکارڈ رکھتا۔ ہر نووارد کو شہر میں داخل ہونے اور باہر جانے کے لیے کوتوال سے جاری شدہ ایک اجازت نامے کی ضرورت ہوتی۔ کوتوال اپنے علاقے میں غیر قانونی شراب کی تیاری پر بھی لگام لگاتا۔ وہ تاجروں اور دکان داروں کے آلات وزن وپیائش کی بھی دیکھ ریکھ کرتا۔

2. قلعہ دار

مغل عہد میں سلطنت کے مختلف حصوں میں بڑی تعداد میں قلعے تعمیر کیے گئے تھے۔ ہر قلعہ ایک چھوٹے شہر کی مانند ہوتا، جن میں بڑے پیمانے پر فوجی دستے تعینات ہوتے۔ ہر قلعہ ایک فوجی افسر کے ماتحت ہوتا، جسے قلعہ دار کہا جاتا۔ بطور قلعہ دار مقرر کیے گئے افراد کے سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہدے پر عام طور سے اعلیٰ منصب داروں کا تقرر ہوتا تھا۔ وہ قلعہ کے عمومی نظم ونسق اور قلعہ دار کو جاگیر میں تفویض کردہ علاقے کا انچارج ہوتا۔ بعض اوقات قلعہ دار اپنے علاقے میں فوج دار کے فرائض بھی انجام دیتا۔

3. بندرگاہ

مغل عہد میں بندرگاہوں کے نظم ونسق پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس عہد میں یہ بندرگاہ نہ صرف تجارتی سرگرمیوں کے اہم مراکز تھے، بلکہ ان کے ذریعہ اشیا کی آمدورفت اور نقل وحمل تیزی کے ساتھ انجام پاتی تھی۔ مغل عہد میں بندرگاہ کی انتظامیہ مرکزی حکومت کے ماتحت ہوتی۔ بندرگاہوں کے منتظم اعلیٰ کو 'متصدی' کہا جاتا، جس کا تقرر بادشاہ کے ذریعے عمل میں آتا۔ کبھی کبھی متصدی کا

دفتر نیلامی کے ذریعہ سب سے زیادہ قیمت لگانے والے کو دیا جاتا۔ متصدی تجارتی اشیا پر محصول جمع کرتا اور بندر گاہ پر کسٹم ہاؤس (درآمد و برآمد سے متعلق محصول کا دفتر) کو اپنے ماتحت عملے کے ساتھ فعال رکھتا۔ وہ بندر گاہ پر سکہ سازی کے دفتر اور کارخانے کی بھی نگرانی کرتا۔ متصدی کے ماتحت 'شاہ بندر' ایک اہم افسر تھا، جو بنیادی طور پر کسٹم ہاؤس سے منسلک ہوتا اور اس دفتر سے متعلقہ امور کی انجام دہی کرتا۔

16.3 عدالتی نظم ونسق

عدالتی نظام کی تاریخ میں مغل دور کافی نمایاں رہا ہے۔ مغلوں نے عدالتی نظام میں نئی تبدیلیوں کو روشناس کر کے عدالتی نظام پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس عہد کا عدالتی نظم ونسق بہت ہی مستحکم اور فعال شمار کیا جاتا ہے، جس کی سب سے اہم خصوصیت مقدمات و معاملات کا فوری حل تھا۔ مغلوں نے مملکت میں امن وامان کے فروغ کے لیے انصاف کے قیام پر خاص زور دیا، جس کے لیے انہوں نے نچلی یعنی گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک عدالتی نظام کا ایک جال بچھایا تاکہ رعایا کو انصاف کے حصول میں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

16.3.1 عدلیہ اور اس کی تنظیم

مغل عہد میں انصاف کی فراہمی کا بنیادی مصدر اور عدلیہ کا سربراہ اعلیٰ بادشاہ تھا۔ رعایا کو انصاف دلانے کے لیے وہ خود نئے مقدمات اور مختلف عدالتوں سے آئی ہوئی اپیلیں سنتا اور فیصلے سناتا۔ اس کے علاوہ قاضی کی حیثیت سے ایک لائق اور اہل شخص کا تقرر کرتا۔ بادشاہ کو یہ حق تھا کہ وہ ایک شہر میں ایک سے زیادہ قاضیوں کا تقرر کرے لیکن ایسے موقعوں پر ان کے کام اور علاقوں کی توضیح و تشریح ضروری تھی۔ بادشاہ کے فیصلوں کے تجزیے اور بدلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسے کسی بھی طرح کے فرامین جاری کرنے کا مکمل اختیار حاصل تھا۔

مغل عدالتی تنظیم میں انصاف کے بندوبست کا دوسرا مصدر 'قاضی' تھا۔ وہ عدالت میں نئے مقدمے اور ماتحت عدالتی فیصلوں کے خلاف اپیلیں سنتا۔ اس عہد میں قاضی کے اختیارات اور دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ اس عہد میں فوج کے لیے علیحدہ قاضی متعین کیا جاتا، جسے 'قاضی عسکر' کہا جاتا تھا۔ وہ فوج کے ساتھ رہتا اور اس کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا۔ اس عہد کے عدالتی نظام میں مفتی کا عہدہ بھی کافی اہم تھا۔ مذہبی علوم خاص طور پر علم فقہ اور مذہبی قانون میں دست رس رکھنے والے افراد مفتی کہلاتے۔ مغل عدالتوں میں مذہبی مقدمات کو فیصل کرنے کے لیے مفتی شاہی سند کے ساتھ تقرر پاتے، کبھی کبھی پرگنہ کے مفتیوں کو محتسب کے عہدے کا اضافی چارج بھی دیا جاتا۔ وہ ایک شارح قانون کی حیثیت میں عدالتوں سے منسلک ہوتے، انہیں فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا۔ اس عہد کے عدالتی نظام میں ایک عہدہ میر عدل کا تھا، جو عام طور پر نتائج اکٹھا کرنے کا کام انجام دیتا۔ مغل عہد میں ہر قصبہ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں بھی قاضی اور میر عدل کی تعیناتی ہوتی اور یہ دونوں مل کر ایک عدالتی بنچ تشکیل دیتے اور کبھی کبھی یہ دونوں عہدے ایک ہی فرد کے پاس ہوتے۔ شاہ جہاں کے عہد میں قاضی اور میر عدل کے عہدے بالعموم ایک ہی شخص کے پاس ہوتے۔ قاضی کی بہ نسبت میر عدل کے پاس عدالتی اختیارات نہیں تھے۔ حقیقت میں میر عدل عدالت کا سب سے اعلیٰ کلرک تھا۔

مغل عدالتی نظام میں ایک عہدہ محتسب کا تھا۔ یہ عہدہ دارالسلطنت کے ساتھ ساتھ صوبائی اور ذیلی صوبائی مراکز میں بھی تھا۔ مغل عہد میں محتسب کو سزا دینے کا اختیار نہیں تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں اس عہدہ کی اہمیت میں اضافہ ہوا، کیوں کہ اس کی ذمہ داریوں میں ارتداد، مذمت دین، خلاف شرع کام اور شریعت پر عمل نہ کرنے کے معاملات کی نگرانی بھی شامل تھا۔ اس عہد میں محتسب کو شرعی قانون کا مستغیث شمار کیا جا سکتا ہے، جو حکومت کی طرف سے استغاثہ دائر کرتا۔ مغل دور کے عدالتی نظام میں فریقین کی طرف سے عدالت میں مقدمہ پیش کرنے اور مباحثہ کے لیے وکیلوں کی موجودگی بھی ملتی ہے۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں حکومت کی طرف سے وکیل متعین ہوتے تاکہ وہ رعایا کا دفاع کریں اور غریب مدعین کو بلا معاوضہ قانونی مشورے دیں۔ حکومت تمام سرکاروں میں وکیلوں کا تقرر کرتی، جو 'وکیل سرکار' یا 'وکیل شرعی' کے نام سے جانے جاتے۔ ان وکیلوں کو حکومت معاوضے کی شکل میں ایک روپیہ روزانہ کے اعتبار سے ادا کرتی، مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ وکیل اپنے موکلوں سے کتنی فیس لیتے تھے؟ یہ حقیقت ہے کہ وکیل کچھ نہ کچھ فیس ضرور لیتے تھے، جس کی شہادت اورنگ زیب کے اس فرمان سے ملتی ہے، جس میں سرکاری وکیلوں کو حکم دیا گیا تھا کہ مفلسوں اور غریبوں کو بلا معاوضہ مشورے دیا کریں۔

16.3.2 عدلیہ کی قسمیں

مغل عہد میں سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کے مطابق نچلی سطح سے لے کر مرکز تک تمام سطحوں پر عدالتیں قائم تھیں، جن کے ذریعہ رعایا کے لیے انصاف کے حصول کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس دور کے انتظامی ڈھانچے میں گاؤں کو سب سے چھوٹی اکائی کا درجہ حاصل تھا۔ گاؤں کی سطح پر اس کی قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پنچایتی نظام کو جاری رکھا گیا تھا۔ دیہی عوام اپنے معمول تنازعات کو انھی گرام پنچایتوں میں سلجھا لیا کرتے تھے اور انہیں معمولی جھگڑوں اور تنازعات کے لیے عدالتوں کا رخ نہیں کرنا پڑتا تھا۔

1. پرگنہ عدالت

مغل دور میں مملکت کے ہر پرگنہ میں عدالت قائم تھی، جس کا سربراہ قاضی ہوتا۔ اس کی ذمے داری تھی کہ پرگنہ کے اندر انصاف کا بندوبست کرے۔ پرگنہ قاضی کی تقرری شاہی سند کے ذریعہ ہوتی۔ مغل عدالتی تنظیم میں پرگنہ عدالت کو اگرچہ سب سے نچلی عدالت کا مقام حاصل تھا، مگر اس کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ اپنے فیصلوں کا نفاذ کر سکے۔ ان عدالتوں سے قاضی کے علاوہ مفتی، محتسب اور داروغہ عدالت منسلک ہوتے۔ داروغہ عدالت عمومی طور پر ایک چھوٹا منصب دار ہوتا، جس کی تعیناتی احکامات کی تعمیل اور امن کی بحالی کے لیے کی جاتی تھی۔ اس کی ذمے داری ہوتی کہ وہ عدالتی کارروائیوں کے دوران امن و سکون بحال رکھے اور کسی طرح کا تنازع نہ پیدا ہونے دے۔

2. ضلعی یا قاضی سرکار کی عدالت

سرکار کی سطح پر بھی مختلف عدالتیں قائم تھیں۔ دیوانی اور فوج داری عدالتیں قاضی سرکار کے ماتحت تھیں، جہاں دیوانی، فوج داری اور شرعی مقدمے سنے جاتے اور پرگنہ عدالتوں کی اپیلیں بھی درج ہوتیں۔ سرکار کا صدر اعلیٰ، فوج دار بھی عدالتی کارروائی انجام دینے کا

اختیار رکھتا تھا۔ وہ اپنی عدالت میں امن و سلامتی کے مقدمات کی سنوائی کرتا اور فیصلے سناتا۔ سرکار اور مختلف قصبوں میں قانونی خلاف ورزی سے متعلق مقدمے کوتوال کے ذریعے فیصل کیے جاتے۔ سرکار کے عامل کی بھی عدالت تھی، جہاں مال گزاری سے متعلق مقدمات سنے جاتے اور پرگنہ عامل کی عدالتوں کی اپیلیں درج ہوتیں۔ ان عدالتوں میں قاضی کی عدالت سب سے اہم تھی۔ قاضی سرکار اپنے دائرہ کار کی جیلوں کا سرکاری معائنہ کنندہ تھا، اسے جیلوں کے معائنے، قیدیوں کے مقدمے کا جائزہ لینے اور زیر ساعت قیدیوں کو ضمانت پر رہا کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ قاضی کی معاونت اور عدالتی کارروائیوں کی بحسن وخوبی انجام دہی کے لیے اس کی عدالت سے داروغہ عدالت، میر عدل، مفتی، پنڈت، محتسب بلدیہ، وکیل شرعی، پیش کار، کاتب، امین، ناظر، دفتری محلکہ نویس اور اردلی جیسے افسران اور کارکنان وابستہ ہوتے۔

3. صوبائی عدالتیں

مغل عہد میں صوبائی سطح پر تین عدالتوں کا ذکر ملتا ہے۔ (1) ناظم صوبہ کی عدالت (2) قاضی صوبہ کی عدالت (3) دیوان صوبہ کی عدالت۔ صوبہ دار کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے صوبہ میں انصاف کے قیام کا نظم کرے۔ ناظم صوبہ کی عدالت میں نئے مقدمے اور دوسری عدالتوں کی اپیلیں دائر کی جاسکتی تھیں۔ صوبے میں بادشاہ کا نمائندہ ہونے کی بنا پر وہ اپنے صوبے میں موجود تمام عدالتوں کی اپیلیں سنتا، یہاں تک کہ قاضی صوبہ کے عدالت کی اپیل بھی دائر ہوتی۔ نئے مقدمہ میں وہ یک رکنی جج کی حیثیت سے فیصلہ سناتا، اس کے فیصلے کے خلاف مرکزی عدالت میں اپیل کی جاسکتی تھی، جب وہ کسی دوسری عدالت کے فیصلے کی اپیل سنتا تو عدالت دورکنی ہوتی اور اس عدالت کا دوسرا رکن قاضی صوبہ ہوتا۔ یہاں تک کہ زمینی مال گزاری کے مقدمات بھی اس کی عدالت میں دائر ہوسکتے تھے۔

صوبائی سطح پر عدالتی بندوبست کا کام بنیادی طور پر قاضی صوبہ کے ماتحت تھا۔ قاضی صوبہ کا تقرر قاضی القضاۃ یا صدرالصدور کی سفارش پر بادشاہ کرتا۔ قاضی صوبہ کی عدالت میں نئے دیوانی اور فوج داری مقدمے درج ہوتے اور نچلی عدالتوں کے فیصلوں کی اپیلیں بھی سنی جاتیں۔ اس کے عدالتی اختیارات صوبائی گورنر کے برابر تھے اور گورنر کی عدالت میں بھی اس کی ایک مستقل سیٹ ہوتی۔ قاضی صوبہ کی عدالت میں اس کی معاونت کے لیے وہ تمام عدالتی عملہ متعین ہوتا، جس کا تذکرہ قاضی سرکار کے تحت ہوچکا ہے۔

صوبائی سطح پر واقع دیوان صوبہ کی عدالت کا کام صرف مال گزاری سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس عدالت میں عامل کے احکامات اور فیصلوں کے خلاف اپیلیں درج کی جاتی تھیں۔ ان عدالتی فیصلوں کے خلاف اپیل اعلیٰ عدالتوں یعنی ناظم صوبہ کی عدالت اور مرکزی عدالتوں میں داخل کی جاسکتی تھی۔

4. مرکزی عدالتیں

مغل عہد میں رعایا کو انصاف دلانے کے لیے مرکزی سطح پر متعدد عدالتیں قائم تھیں، جہاں پوری مملکت سے درخواستیں آتیں۔ مرکزی سطح پر تین طرح کی عدالتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ (1) شاہی عدالت (2) قاضی القضاۃ کی عدالت (3) مرکزی مال گزاری عدالت۔

مرکز کی شاہی عدالت سلطنت کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ بادشاہ دیوانی اور فوج داری دونوں طرح کے نئے مقدمات سنتا اور دوسرے عدالتی فیصلوں کے خلاف آخری اپیل بھی سنتا۔ بادشاہ جب عدالتی فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سنوائی کرتا تو وہ عدالت میں

موجود ججوں کا صدر ہوتا اور یہ عدالت بادشاہ کے علاوہ قاضی القضاۃ اور اس کی عدالت کے دوسرے قاضیوں پر مشتمل ہوتی۔ جب وہ کسی نئے مقدمے کی سماعت کرتا تو اس کی مدد کے لیے مفتی اور میر عدل موجود ہوتے۔ درخواستیں داروغہ عدالت کے ذریعے پیش کی جاتیں، اگر اسے قانونی طور پر کسی مشورے کی ضرورت ہوتی تو وہ اسے اس مقصد کے لیے موجود ایک بنچ کے سپرد کر دیتا۔ بادشاہ کی عدالت کے ساتھ مفتی، میر عدل، محتسب اور داروغہ عدالت وابستہ ہوتے۔ بادشاہ روزانہ کھلے دربار میں معمولی مقدمات کی سماعت کرتا اور اہم مقدمات کی سماعت اس کی عدالت میں ہفتے میں ایک دن ہوتی۔ اکبر نے اس کے لیے جمعرات، جہاں گیر نے منگل اور شاہ جہاں نے بدھ کا دن متعین کر رکھا تھا۔

مغل عہد میں عدالتی تنظیم کا صدر اعلیٰ قاضی القضاۃ تھا، جو بادشاہ کے ذریعہ منتخب ہوتا۔ عام طور پر اس کا تقرر براہ راست ہوتا، بسا اوقات صوبائی قاضیوں کو بھی اس عہدے پر ترقی دی جاتی۔ قاضی القضاۃ نئے دیوانی اور فوج داری مقدمات کی سماعت کرتا، ساتھ ہی نچلی عدالتوں کی اپیل سنتا اور صوبائی عدالتوں کے کاموں کی نگرانی کرتا۔ بادشاہ کی جانشینی کے وقت قاضی القضاۃ، حلف کا نظم و انصرام کرتا اور جمعہ کا خطبہ بادشاہ کے نام کے ساتھ پڑھنے کا حکم جاری کرتا۔ اس کی عدالت میں معاونت کے لیے ہمیشہ ایک یا دو قاضی بطور نائب متعین ہوتے۔ دارالحکومت میں نماز جمعہ اور عیدین کی امامت کرنا، شاہی گھرانوں اور دوسری اہم تعزیتوں میں شرکت کرنا، شاہی گھرانوں کی نکاح خوانی اور احکام شریعت کی تنفیذ کی نگرانی کرنا بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ رعایا پر نئے محصول کے نفاذ کے وقت قاضی القضاۃ سے ضرور مشورہ لیا جاتا۔ مغل دور میں دارالسلطنت کا علاحدہ قاضی مقرر کیا جاتا، جس کا درجہ قاضی صوبہ کے برابر ہوتا۔ کبھی کبھی عہدہ خالی ہونے کی صورت میں قاضی القضاۃ یا دوسرے قاضیوں کی ذمے داری بھی متعینہ مدت کے لیے اسی قاضی کے ذریعے ادا کی جاتی۔

مرکزی مال گزاری عدالت کا صدر دیوان کل ہوتا۔ وہ حکومتی آمدنی اور تمام طرح کے مالیاتی امور کا نگراں ہوتا۔ مال گزاری سے متعلق نئے معاملات کی سماعت کرتا اور صوبائی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل سنتا۔ ان کے علاوہ حقیقی طور پر اس کے ذریعے سلطنت کی معاشی پالیسیاں طے کی جاتیں۔ مال گزاری عدالتی چارہ جوئی سے متعلق صوبائی سطح سے اپیلیں اس کے پاس بمشکل ہی آتیں۔

16.4 نظام محصول و مال گزاری

مغل سلطنت کے نظام محصول و مال گزاری کا ڈھانچہ اپنی نظریاتی تشکیل کے اعتبار سے سادہ تھا، مگر بدلتی ہوئی ضروریات اور مقامی حالات کی وجہ سے یہ پیچیدہ ہوتا گیا۔ عہد وسطیٰ میں سب سے اہم اور بڑا پیشہ زراعت تھا اور زمینی محصول حکومتی آمدنی کا بنیادی ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ جنگوں سے حاصل ہونے والا مال غنیمت، تجارتی محصول، صنعتی آمدنی، ٹکسال کی آمدنی، لاوارث جائیداد اور تحائف حکومتی آمدنی کے دوسرے اہم ذرائع تھے۔ تاہم، رعایا میں حکومت کی مقبولیت کا انحصار عمومی طور پر حکمرانوں کی زمینی محصول پالیسی پر ہوتا۔

16.4.1 نظام محصول و مال گزاری کی بنیادیں اور پالیسیاں

بابر نے اپنے عہد میں سلطنت کی قابل کاشت زمینوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا: (1) خالصہ: ایسی زمینیں جو براہ راست حکومتی ملکیت تھیں، (2) جاگیر: ایسی زمینیں جو جاگیر داروں میں منقسم تھیں۔ ہمایوں نے سلطنت کی زمینوں کو امرا اور افسران کے درمیان

تقسیم کرنے کا اصول قائم کیا۔ شیر شاہ اور اکبر نے کاشت کاروں کے سلسلے میں غیر متعصبانہ اور فیاضانہ رویہ اختیار کیا۔ شیر شاہ نے زمین اور زمینی محصول نظام میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کیں۔ اکبر نے انہی اصولوں اور بنیادوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنی مال گزاری پالیسیاں تیار کیں۔ اس نے زمینی محصول نظام پر خصوصی توجہ صرف کی۔ اس سلسلے میں تقریباً بیس سالوں تک تجربات کرنے کے بعد کاشت کاروں کے لیے کچھ اصلاحات متعارف ہوئیں۔ اس تعلق سے عہد اکبری کی سب سے اہم اصلاح 'دہ سالہ جدول نرخ نامہ' ہے۔ کاشت کاروں کو حکومت کے اس وعدے سے مزید تقویت ملی کہ اگر آفات ارضی و سماوی کے سبب پیداوار کو نقصان پہنچا تو حکومت اپنے مطالبات کم کردے گی۔ حکومتی آمدنی میں اضافے کے لیے مغل حکمرانوں بالخصوص اکبر نے غیر مزروعہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے کے لیے کاشت کاروں کو مختلف قسم کی رعایتیں دیں۔ عام طور پر مال گزاری کی تحصیل کے تین طریقے رائج تھے، جنہیں 'غلہ بخشی، نسق اور ضبطی' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

16.4.2 مغل نظام محصول کے اہم افسران

زمینی نظام محصول و مال گزاری کے حکومتی دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ مغل عہد میں عام طور پر دو یا تین سال میں جاگیر داروں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اسی طرح زمینی محصول کی وصولی اور اس کے نظم و نسق کے لیے تین قسم کے افسران، اہل کار اور کارکنان کا تذکرہ ملتا ہے: (1) جاگیر داروں کے اہل کار اور کارندے (2) مستقل مقامی افسران و اہل کار، جن میں سے اکثر موروثی ہوتے۔ یہ جاگیر داروں کی متواتر منتقلی سے متاثر نہیں ہوتے تھے اور (3) جاگیر داروں کی مدد اور انہیں قابو میں رکھنے کے لیے شاہی افسران۔ دیہی سطح پر زمینی محصول کی وصولی اور اس کے نظم و نسق کے لیے جو افسران، اہل کار اور کارکنان متعین تھے، وہ درج ذیل ہیں:

کروڑی: عہد اکبری میں یہ دفتر قائم ہوا۔ ابو الفضل نے لکھا ہے کہ وہ محصول کا تخمینہ لگانے اور وصولی دونوں کا ذمہ دار تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں ہر محال میں امین مقرر کر دیے گئے اور انہیں محصول کا تخمینہ لگانے کا کام سونپا گیا۔ اب کروڑی کے پاس صرف محصول کی وصولی کی ذمہ داری باقی رہ گئی۔ کروڑی کا تقرر صوبہ کے دیوان کے ذریعہ عمل میں آتا۔ اس سے کاشت کاروں کے مفادات کا خیال اور ان کے تحفظ کی امید کی جاتی۔ گاؤں کے پٹواریوں کے کاغذات کی مدد سے کروڑیوں اور ان کے کارندوں کی اصل وصولی کے کھاتوں کی پڑتال کی جاتی تھی۔

امین: محصولات اور مال گزاری کا دوسرا اہم اہل کار امین تھا۔ امین کا دفتر شاہ جہاں کے عہد میں قائم ہوا۔ اس کا بنیادی کام محصولات کا تخمینہ لگانا تھا۔ امین بھی صوبائی دیوان کے ذریعہ مقرر کیا جاتا۔ جمع شدہ محصول کی محفوظ ترسیل کے لیے امین بھی کروڑی اور فوج دار کے ساتھ مشترکہ طور پر ذمہ دار ہوتا۔ صوبائی فوج دار، امین اور کروڑی کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتے اور ان کی ترقی کی سفارش بھی کرتے۔

قانون گو: محصول سے متعلق پرگنہ کا مقامی اہل کار ہوتا۔ یہ ایک موروثی عہدہ تھا، مگر کسی بھی نئے شخص کی نامزدگی کے لیے شاہی حکم نامہ کی ضرورت ہوتی۔ قانون گو اگر بدعنوانی کا مرتکب ہوتا یا اپنے فرائض سے غفلت برتتا تو اسے شاہی حکم نامہ کے ذریعہ ہٹایا جا سکتا

تھا۔اس سے یہ توقع کی جاتی کہ محصولات کی وصولی، رقبہ کے اعداد وشمار، مقامی محصول کی شرحوں اور پرگنہ کے طور طریقوں سے متعلق روداد فراہم کرے گا۔عام طور پر یہ تصور کیا جاتا کہ اگر کسی قانون گو سے پچھلے سو سالہ محصول کی روداد پیش کرنے کے لیے کہا جائے تو اسے اس کا اہل ہونا چاہیے۔جاگیر دار کے کارندے عام طور پر علاقوں سے ناواقف ہوتے اور عموماً ان کا انحصار قانون گو کی فراہم کردہ معلومات پر ہوتا۔ قانون گو کو کل محصول کا ایک فیصد بطور معاوضہ دیا جاتا، مگر اکبر کے عہد میں اسے بھی تنخواہ دینے کی ابتدا ہوئی۔

چودھری: قانون گو کی طرح وہ بھی محصول سے متعلق ایک اہل کار تھا۔عام طور پر وہ علاقہ کا سر کردہ زمین دار ہوتا، جو بنیادی طور پر محصول کی وصولی سے تعلق رکھتا اور چھوٹے زمین داروں کا ضمانت دار ہوتا۔چودھری، کاشت کاروں کے درمیان تقوی قرض تقسیم کرتا اور ان کی ادائیگی کا ضامن بھی ہوتا۔چودھری کی ایک اہم ذمہ داری قانون گو کے کاموں میں بدعنوانی کا انسداد بھی تھا۔چودھری کو ملنے والا معاوضہ بہت زیادہ نہیں تھا، مگر اس کے بدلے انہیں بلا محصول انعامی زمینیں عطا کی جاتیں۔

شق دار: شیر شاہ کے عہد میں محصول جمع کرنے اور امن وامان برقرار رکھنے کا ذمہ دار تھا اور اکبر کے عہد میں کروڑی کا ماتحت افسر معلوم ہوتا ہے۔کسی ہنگامی صورت حال میں شق دار رقم کی ادائیگی کے لیے منظوری دے سکتا تھا، جس کی اطلاع شاہی دربار کو دی جاتی۔وہ اپنے دائرہ اختیار میں ہونے والی چوریوں کے لیے بھی جواب دہ ہوتا۔ہر پرگنہ میں مزید دو اہل کار ہوتے، فوطہ دار یا خزان دار اور کارکن یا بتکچی۔

مقدم اور پٹواری: یہ دونوں گاؤں کی سطح کے اہل کار تھے۔مقدم گاؤں کا سربراہ ہوتا،اسے خدمت کے عوض اس محصول میں سے ڈھائی فیصد دیا جاتا، جس کی وصولی اس کے ذریعہ انجام پاتی۔پٹواری گاؤں کی زمینوں، کاشت کاروں کی ملکیت،کاشت کی جانے والی فصلوں کی اقسام اور غیر مزروعہ زمینوں کی روداد تیار کرتا۔اس کی بہی میں گاؤں کے کاشت کاروں کے نام درج ہوتے۔

16.5 فوجی نظم ونسق

مغل فوج اور اس کی تنظیم وہ قوت محرکہ تھی، جس نے برصغیر ہند میں حکومت کے قیام، توسیع اور استحکام کو یقینی بنایا۔بابر کی فوج کا انحصار گھوڑوں پر تھا۔فوجی افسروں کے عہدے اور تنخواہ ان کے پاس موجود گھوڑوں کی تعداد پر منحصر تھی۔ مغل فوج میں گھوڑوں کی تعداد اور ان کے فنی معیار و خصوصیات پر خصوصی توجہ دی جاتی۔ مغل فوج بنیادی طور پر پیدل، گھڑ سوار، توپ خانہ اور بحریہ پر مشتمل تھی، ان کے علاوہ مغل فوجوں میں ہاتھی بھی استعمال ہوتے۔ مغل عہد میں دشمن افواج کو منتشر کرنے اور شکست دینے کے لیے توپ خانے کا استعمال کیا جاتا۔اگرچہ، مغل فوج کی تنظیم کی ابتدا وسط ایشیائی گھڑ سوار افواج میں شمار کی جاتی ہے، مگر اس کا بنیادی و حتمی ڈھانچہ سلطنت کے تیسرے حکمراں اکبر نے ترتیب دیا۔ مغل بادشاہوں نے اپنی سرحدوں کے دفاع، مملکت کے نظم وانصرام اور استحکام کے لیے ایک بڑی مستقل مرکزی فوج تیار کرنے کے بجائے منصب داری نظام پر انحصار کیا۔ تنظیم کے اعتبار سے مغل فوجوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: پہلا زمرہ ان افواج کا تھا، جن کی بھرتی اور تنظیم منصب داروں کے ذریعہ عمل میں آتی، دوسرا زمرہ مغل سلطنت کی مستقل افواج کا تھا، جن کی

تنظیم براہ راست حکمراں کے ذریعہ ہوتی۔ مغلوں نے اپنی فوجی تنظیم عشری نظام پر قائم کی۔ مغل فوجی تنظیم کی ایک خصوصیت یہ بھی شمار کی جاتی ہے کہ دہلی سلطنت کے برعکس پوری فوج براہ راست مغل سلطان کی کمان میں ہوتی تھی۔

16.5.1 شاہی افواج

مغل فوجی نظم و نسق کے اعتبار سے پہلی شاہی فوج 'احدی' کے نام سے جانی جاتی، جو مستقل تنخواہ دار مستعد فوج تھی۔ ان فوجیوں کو براہ راست مغل بادشاہ کے ذریعہ اپنے خونی رشتے داروں اور مخصوص ترک قبائل سے بھرتی کیا جاتا۔ عمومی طور پر ان میں سے کچھ محل میں انتظامی فرائض انجام دیتے۔ دوسری شاہی فوج 'ولاشاہی' یا 'شاہی محافظ دستہ' کو شمار کیا جاتا ہے، جسے مغل افواج میں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور وفادار تصور کیا جاتا تھا۔ یہ بھی براہ راست بادشاہ کے تنخواہ دار گھڑسوار فوجی ہوتے۔ ان میں سے زیادہ تر اپنی نوعمری سے ہی بادشاہ کے ساتھ منسلک ہوتے اور عام طور پر بادشاہ کی خدمت اس وقت سے انجام دے رہے ہوتے، جب اس کی حیثیت صرف ایک شہزادے کی تھی۔ اس طرح ان فوجیوں کی حیثیت بادشاہ کے ذاتی خدمت گاروں اور گھریلو فوجیوں و محافظین کے طور پر ہوتی تھی۔ اسی طرح مغل حکمرانوں کے یہاں ایک پیدل فوجی دستہ اور ایک ذاتی توپ خانہ بھی ہوتا، جن کی بھرتی اور تنخواہ کی ادائیگی براہ راست بادشاہ کے ذریعہ کی جاتی۔

16.5.2 منصب دار افواج

مغل عہد میں قیام امن اور دفاع کے لیے جن فوجی دستوں پر انحصار کیا گیا، ان میں منصب داروں کے ذریعہ فراہم کیے جانے والے فوجی دستے شامل تھے۔ اس عہد میں فوجیوں کی بڑی بھرتی امرا اور مقامی رہنما کرتے، جنھیں منصب دار کہا جاتا۔ منصب داروں کے ذریعہ فوجی نظم و نسق کا یہ منفرد نظام اکبر نے متعارف کرایا۔ منصب دار سے مطلوبہ فوجیوں کی تعداد اس کی تقرری کے فرمان میں درج ہوتا اور اس کا اظہار اس کے منصب سے بھی ہوتا۔ منصب داروں کے فوجی دستوں کو سرکاری تصدیق اور معائنے کے عمل سے گزرنا پڑتا۔ فوجی دستوں کے معائنے کا کام میر بخشی کا محکمہ انجام دیتا۔ منصب دار کے ذریعہ معائنہ کے لیے پیش کردہ تمام گھوڑوں کو ایک خاص مہر کے ذریعہ نشان زد کیا جاتا تاکہ ان میں اور دوسرے منصب داروں کے فوجی دستوں میں فرق کیا جاسکے۔ فوجیوں کی شناخت کے لیے ان کا جسمانی حلیہ بھی درج کیا جاتا۔ مغل عہد میں منصب ذات کے اعتبار سے تنخواہ کا پیمانہ طے کیا گیا تھا لیکن تنخواہوں میں ایک منصب کا دوسرے مناصب سے کوئی ریاضیاتی یا تناسبی تعلق نہیں تھا، یعنی تنخواہ میں تناسب کے اعتبار سے اضافہ یا کمی نہیں ہوتی تھی۔ سوار منصب داروں کی تنخواہ ایک منصب دار کے تمام فوجیوں کو حاصل ہونے والے معاوضے کی مجموعی رقم تھی، جو پوری سلطنت میں یکساں طور پر لاگو ہوتی۔ اکبر کے عہد میں سوار منصب داروں کی تنخواہ کا انحصار مختلف بنیادوں پر تھا، جیسے فی دستہ گھوڑوں کی تعداد اور نسل وغیرہ۔ فی سوار تنخواہ کی ادائیگی 15 سے 25 روپئے کے درمیان ہوتی۔

16.5.3 مغل فوجی دستے

مغل فوج مختلف دستوں میں منقسم تھی، جن میں پیدل، سوار، توپ خانہ اور بحریہ شامل ہیں۔ اسی طرح مغل فوج مختلف النوع نسلی

دستوں پر مشتمل تھی، جن میں ایرانیوں، ترکوں، افغانی پٹھانوں اور راجپوتوں کو شمار کیا جاسکتا ہے۔

پیدل فوج: مغل فوجی تنظیم میں درجہ بندی کے اعتبار سے پیدل فوج کی پوزیشن سب سے نچلی تھی۔ پیدل فوجی دستہ پیادگان یا احشام کے نام سے جانا جاتا۔ پیادگان متعدد گروہوں میں منقسم ہوتے اور مختلف قسم کی فوجی وغیر فوجی خدمات انجام دیتے۔ جیسے بندوقچی، تلوار باز، نیزہ باز، تیر انداز، دربان، خدمت گار یاراہ دکھانے والے، میوراس، پہلوان، پتھر باز، غلام، کہار، بڑھئی، لوہار، سقے وغیرہ۔ ان میں جنہیں تھوڑا اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا، انہیں نیم سوار کہا جاتا۔

گھڑ سوار فوج: مغل فوج کا پہلا گھڑ سوار دستہ 'احدی' تھا، جو بادشاہ کا ذاتی گھڑ سوار دستہ تھا، اس فوجی دستے کی بنیاد اکبر نے رکھی تھی۔ انہیں عمومی اصطلاح میں 'شریف فوجی' کہا جاتا۔ ان کی تنخواہیں عام فوجیوں کے مقابلے زیادہ تھیں، کبھی کبھی ایک احدی کو پانچ سو روپئے تنخواہ ملتی، جب کہ ایک عام فوجی کی تنخواہ بارہ سے پچیس روپئے کے درمیان ہوتی۔ دوسرا دستہ 'داخلی' فوجیوں کا تھا۔ اگرچہ ان فوجیوں کی بھرتی بادشاہ کے ذریعہ ہوتی، مگر ان کی تنظیم منصب داروں کے ذریعہ عمل میں آتی اور یہ انہی کے ملازم ہوتے۔ داخلی فوجی دو قسم کے ہوتے: (1) 'برگیر' جنہیں ہتھیار، سازوسامان اور لباس حکومت کی طرف سے فراہم کیا جاتا اور (2) 'صلہ دار' جو اپنے گھوڑے اور ہتھیار کا انتظام خود کرتے۔ تیسرا دستہ 'کمکی' ہوتا، جس کی بھرتی مخصوص کاموں کے لیے کی جاتی۔ گھڑ سوار دستوں میں سب سے زیادہ تعداد 'تابینان' کی ہوتی، جن کی بھرتی اور تنظیم منصب داروں کے ذریعہ کی جاتی۔ مغل فوجوں میں زیادہ تر عربی، ترکی، تاجک اور ایرانی گھوڑے استعمال ہوتے تھے۔

ہاتھی سوار فوج: ہندوستانی جنگوں کی تاریخ میں ہاتھی بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ جنگوں میں اکثر سپہ سالار اور بادشاہ ان پر سوار ہوتے تاکہ اپنی اور دشمن فوج پر نظر رکھ سکیں۔ مغل فوج میں بوجھ اٹھانے، بھاری توپ خانے کی منتقلی، دریاؤں کو عبور کرنے اور دفاعی اعتبار سے ہاتھی اہم رہے ہیں۔ دفاعی نقطہ نظر سے انہیں ڈھال اور ہتھیاروں سے لیس کیا جاتا۔ ان کی سونڈ پر لوہے کی تختیاں چڑھائی جاتیں اور اکثر ان کی سونڈ سے ایک تلوار اور دو خنجر منسلک کیا جاتا تاکہ وہ دشمن پر حملہ کرسکیں۔ وہ تیر اندازوں، تفنگ بازوں اور چھوٹے توپچیوں (گج نال) کے لیے بھی بہتر ہدف فراہم کرتے۔ اکبر کے اصطبل میں اعلیٰ نسل کے ایک ہزار ہاتھی موجود تھے، جن کی تربیت وغذا کا معقول انتظام تھا۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ مغل سلطنت میں پچاس ہزار ہاتھی موجود تھے، جن میں سے تقریباً پانچ ہزار جنگی تربیت یافتہ تھے۔

توپ خانہ: پانی پت اور خانوہ کی جنگوں میں بابر کے بھاری توپ خانے کا ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمایوں کے پاس 21 توپ اور 700 بندوق تھیں، جب کہ اکبر کے توپوں کی تعداد 150 تھی۔ اکبر نے توپ خانے پر خصوصی توجہ دی اور اس کی سرپرستی میں لوہے اور تانبے کی بھاری توپیں بنائی گئیں۔ اکبر کے عہد میں توپ خانے کی اصلاح کا بھی کام ہوا۔ اس عہد میں ایسی توپیں بنائی گئیں، جنہیں مختلف حصوں میں علاحدہ کرکے منتقل کیا جاسکتا تھا۔ ابوالفضل نے قلعوں کے محاصرے اور بحری کارروائیوں میں توپ خانے کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ بابر کے توپ خانے کی کمان مشہور عثمانی ترک استاد علی قلی اور مصطفی خان کے ہاتھ میں تھی، جب کہ ہمایوں کے توپ خانے کے انچارج رومی خان تھے۔ اکبر نے اپنے توپ خانے کے لیے پرتگالیوں پر اعتماد کیا۔ بھاری اور ہلکی دونوں قسم کی توپیں اور بندوقیں مغل توپ خانے کا

حصہ تھیں۔ مغل عہد میں بھاری توپوں کو بڑے نام اور القاب عطا کیے گئے، جیسے جہاں کشا، کشور کشا اور گرٹھ بھنجن وغیرہ۔

بحری فوج: مغلوں نے بحری بیڑے اور آبی گزر گاہوں کی دیکھ بھال کے لیے میر بحری کی ماتحتی میں ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا۔ یہ محکمہ کشتیاں بنانے، سمندری اور دریائی بندر گاہوں کو منظم کرنے اور پل تعمیر کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اکبر کی دلی خواہش تھی کہ بحر عرب میں پرتگالی بحری ڈاکوؤں کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اس کے لیے اس نے سلطنت عثمانیہ سے تعلقات بھی استوار کیے تھے، مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کے پاس دریائی لڑائیوں کے لیے موثر بیڑے موجود تھے۔ یہ بحری بیڑے خاص طور پر بنگال، بہار اور سندھ میں متعین تھے۔ ان بیڑوں کی افادیت کو بڑھانے کے لیے اکبر نے 105 اور 111 فٹ کی بڑی بڑی کشتیاں بنوائیں، جن میں تقریباً 365 ٹن وزن کا سامان لے جایا جا سکتا تھا۔ اکبر نے لاہور اور الہ آباد میں کشتی سازی کے جو کارخانے قائم کیے تھے، وہ بہت ہی مفید ثابت ہوئے۔

16.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مغل عہد نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ ہندوستانی تاریخ کا ایک بہت ہی اہم اور شان دار ہے۔ اس کی اہمیت و عظمت کا انحصار انتظام مملکت اور نظم و نسق سے متعلق ان اصولوں اور اداروں پر بھی ہے، جو حکومتی استحکام کے ساتھ ساتھ بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و ملت رعایا کی ہمہ جہت ترقی اور قیام امن و انصاف کے ضامن تھے۔
- مغل انتظامی ڈھانچے کا مقصد سلطنت کے تمام حصوں پر سیاسی بالادستی اور عوام کے لیے ایک پر امن و جرائم سے پاک ماحول فراہم کرنا تھا۔ مذہبی، نسلی، لسانی و ثقافتی تنوع اور اختلاف کے باوجود بھی مغل حکومت ایک لمبے عرصے تک قائم رہی، اس کا سہرا ان کی انتظامی پالیسیوں اور نظم و نسق کو جاتا ہے، جنہوں نے سلطنت کو ایک لمبے عرصے تک پائیداری عطا کی اور اسے مضبوط و مستحکم بنایا۔
- مغل نظم و نسق نے سلطنت کے مختلف النوع طبقے کے سرداروں اور حکمرانوں کو اپنے انتظامی ڈھانچے میں شامل کیا، انہیں مختلف قسم کے عہدے دیے۔ ساتھ ہی مملکت کے انتظام و انصرام کو درست طریقہ سے چلانے کے لیے مرکزی سطح سے لے کر علاقائی سطح تک مختلف شعبوں پر مشتمل ایک وسیع اور منظم انتظامی ڈھانچہ ترتیب دیا۔ مغل نظم و نسق کے ابتدائی خاکے سلطنت اور سوری عہد میں ترتیب دیے گئے تھے۔ مغلوں نے اسی خاکے میں مزید رنگ بھرنے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش کی۔

16.7 کلیدی الفاظ

نظم و نسق	:	حکومت چلانے کا قاعدہ و دستور، سرکاری یا دفتری امور کا بندوبست
دیوان کل	:	مرکزی حکومت کا وزیر مالیات

محتسب : حساب لینے والا، وہ حاکم جو خلاف شرع باتوں کی ممانعت کرے

16.8 نمونہ امتحانی سوالات

16.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جھروکہ درشن کی رسم کس بادشاہ کے عہد میں شروع ہوئی؟

(a). ہمایوں (b). اکبر (c). جہاں گیر (d). شاہ جہاں

2. اکبر کے عہد میں ابتدائی طور پر مملکت کو کتنے صوبوں میں تقسیم کیا گیا؟

(a). آٹھ (b). دس (c). بارہ (d). سولہ

3. 'داغ و چہرہ' کا کام کس محکمے کے ذریعہ انجام دیا جاتا تھا؟

(a). میر بخشی (b). دیوان کل (c). صدر الصدور (d). شق دار

4. مرکزی سطح پر مالیات کے شعبے کا ذمہ دار کون تھا؟

(a). دیوان کل (b). میر بخشی (c). صدر الصدور (d). قاضی القضاۃ

5. قاضی القضاۃ کی تعیناتی کہاں ہوتی تھی؟

(a). پرگنہ سطح پر (b). سرکار کی سطح پر (c). صوبائی سطح پر (d). مرکزی سطح پر

6. فوجی قاضی کو کس نام سے جانا جاتا تھا؟

(a). مفتی (b). قاضی القضاۃ (c). قاضی عسکر (d). میر عدل

7. مغل عہد میں بندر گاہوں کا منتظم اعلیٰ کون ہوتا؟

(a). شاہ بندر (b). متصدی (c). فوج دار (d). کوتوال

8. مغل عہد میں مرکزی سطح پر کتنی طرح کی عدالتیں قائم تھیں؟

(a). دو (b). چار (c). پانچ (d). تین

9. شاہی کارخانوں کا سب سے بڑا افسر اعلیٰ کون تھا؟

(a). وکیل سلطنت (b). دیوان کل (c). میر بخشی (d). میر سامان

10. مغل نظام محصول و مال گزاری میں امین کا دفتر کس حکمراں کے عہد میں قائم ہوا؟

(a). شاہ جہاں (b). اکبر (c). جہاں گیر (d). اورنگ زیب

16.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مغل نظم ونسق میں بادشاہ کی حیثیت اور اس کے اختیارات کو بیان کیجیے۔
2. مغل نظم ونسق میں دیوان کل کے اختیارات اور اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کیجیے۔
3. مغل عدالتی نظام میں قاضی القضاہ کی عدالت اور اس کے کاموں کا جائزہ لیجیے۔
4. مغل فوجی نظم ونسق میں گھڑ سوار افواج اور ان کی تنظیم کی وضاحت کیجیے۔
5. مغل نظام محصول کے اہم افسران اور ان کی ذمہ داریوں کو بیان کیجیے۔

16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مرکزی اور صوبائی تنظیم کے حوالے سے مغل عہد کے شہری نظم ونسق کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔
2. "مغل عہد کے فوجی نظم ونسق نے سلطنت کی توسیع اور استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔" وضاحت کریں۔
3. مغل عہد کے عدالتی نظم ونسق اور عدلیہ کی اقسام پر بحث کیجیے۔

16.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ابوالفضل: آئین اکبری، اردو ترجمہ: مولوی محمد فدا علی طالب، دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، 1938
2. ابن حسن: دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی، اردو ترجمہ: عبدالغنی نیازی، مجلس ترقی ادب، لاہور
3. آر پی ترپاٹھی: مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال، اردو ترجمہ: ریاض احمد شروانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2010
4. Ishtiaq Husain Qureshi: The Administration of the Mughal Empire, Low Price Publication, Ashok Vihar Phase IV, Delhi 1973
5. Sir Jadunath Sarkar: Mughal Administration, S C Sarkar & Sons Ltd., College Square, Calcutta, Third Edition, 1935

اکائی 17: مغل حکومت (مذہبی حالات)

اکائی کے اجزا:

17.0 تمہید

17.1 مقاصد

17.2 مغل حکومت کا قیام

17.3 ہندو مذہب

17.4 بھکتی سے متاثر فرقے

17.5 کبیر اور تحریک وحدانیت

17.6 جین مذہب

17.7 سکھ مذہب

17.8 اسلام

17.8.1 اکبر کی مذہب اسلام سے دلچسپی

17.8.2 صوفی تحریک اور اسلامی نظام تعلیم

17.8.3 اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں مذہبی حالات اور تعلیم

17.9 عیسائیت

17.10 کلیدی الفاظ

17.11 اکتسابی نتائج

17.12 نمونہ امتحانی سوالات

17.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

17.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

17.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

17.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

17.0 تمہید

ہندوستان کی سرزمین روزاول سے مختلف مذاہب کا گہوارہ رہی ہے۔ تاریخ میں مغل عہد کو مذہبی رواداری کی ایک بہترین مثال کہا جاتا ہے۔ یہ دور "گنگا جمنی تہذیب" کا عملی نمونہ رہا ہے۔ مغل دور کی سیاسی سرگرمیوں میں مذہب ایک بنیاد کی طرح نظر آتا ہے، خاص کر ہندو مت اور اسلام کے مِلاپ نے یہاں کی مذہبی تعلیمات میں ایک دوسرے پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ چونکہ مغل جس سرزمین سے آئے تھے وہاں اسلام کی عکاسی ضرور تھی مگر وہ پختگی اور خوداعتمادی نہ تھی جو عہد سلطنت کے بادشاہوں میں تھی اور اسی وجہ سے مغل عہد میں کوئی بھی ایسی جنگ نظر نہیں آتی جس میں مذہب کا کوئی دخل ہو اور نہ ہی مذہب تبدیل کرنے کی کوئی روایت نظر آتی ہے، جبکہ عہد سلطنت میں اسلام قبول کرنے کے بہت سے واقعات نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغل عہد میں لوگوں کو مذہبی آزادی زیادہ ملی جس کی وجہ سے مختلف مذاہب نے مختلف تحریکوں کے ذریعہ اپنے مذہب کے اندر مزید استحکام پیدا کیا، مسلمانوں میں مہدوی تحریک اور ہندوؤں میں بھکتی تحریک اور سکھ مت کا عروج نمایاں نظر آتی ہے۔ مغل عہد میں ان کے مذہبی افق پر ہمیں ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، جین مت، اور بدھ مت کے ماننے والے لوگ اپنے عقائد و نظریات کے ساتھ پوری آزادی کی زندگی گذارتے تھے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کے اثرات بھی قبول کرتے تھے اور اسی کی مغلوں کی مثال صلح کل پالیسی ہے۔

17.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ عہد مغلیہ میں مختلف مذاہب کی حالت پر گفتگو کر سکیں۔ اس پورے عہد میں ان مذاہب کے اندر کیا نئے کام ہوئے؟ ان کی ترقی کے لئے کیا کوششیں ہوئیں؟ ان کے اندر اصلاحی تحریکات کون سی اٹھیں اور اس عہد میں ان مذاہب کے اندر اہم اور اچھا کردار کن لوگوں نے نبھایا اس پر تبادلہ خیال کر سکیں۔ اس یونٹ کے اندر، ہندو مذہب اور اس کی تحریکات، اسلام اور تصوف، جین مذہب، بدھ مذہب اور سکھ مذہب کے علاوہ عیسائیت کا پورا تعارف کرایا ہے۔ جس کا آپ تنقیدی جائزہ لے سکیں گے۔ چوں کہ مغلیہ عہد کے اندر یوروپ کے عیسائی بھی یہاں آنے لگے تھے، اس طرح اس یونٹ کے مطالعے سے عہد مغلیہ کے ہندوستان کی مکمل مذہبی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

17.2 مغل حکومت کا قیام

ظہیر الدین محمد بابر نے 21، اپریل 1526ء میں ابراہیم لودی کو پانی پت کے میدان میں تاریخی شکست دی اور ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد رکھی، اور کئی علاقے فتح کر کے مغلیہ حکومت کو وسیع کیا۔ اس کی کوششوں سے مغلیہ حکومت کی حدود سندھ سے بہار تک اور ہمالیہ سے گوالیار اور چندیری تک پھیل گئی۔ بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نصیر الدین محمد ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے دور میں اٹھنے والی بغاوتوں کو ختم کیا لیکن شیر شاہ سوری کی بغاوت فرو نہ کر سکے اور آخر کار چوسا کی جنگ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران چلا گیا۔ پھر شاہ ایران سے مدد حاصل کی اور ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمایوں کے بعد جلال الدین محمد اکبر 13، سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اکبر کا شمار عظیم حکمرانوں میں ہوتا ہے، وہ بہت ہی

ذہین اور سیاست کی نوک پلک سے بخوبی واقف تھا اس نے مغلیہ سلطنت کو مزید مستحکم کیا اس کے علاوہ مذہبی معاملات میں بھی مختلف تدبیریں اپنائیں۔ اکبر ایک علم دوست حکمراں تھا اس نے اپنے دور حکومت میں علوم وفنون کو ترقی دی ساتھ ہی سنسکرت، عربی اور فارسی کی کئی کتابوں کے ترجمے کروائے اور فارسی میں کئی کتابیں تصنیف کروائیں۔ اکبر کے بعد اس کا بیٹا نورالدین جہانگیر بادشاہ بنا اس کے دور حکومت میں بھی کئی بغاوتیں ہوئیں۔ جن کو کامیابی سے فرو کر دیا۔ میواڑ کی تسخیر اس دور کا اہم واقعہ ہے۔ اس کے دور میں سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال اوراستحکام پیدا ہوا۔ اس دور کے عدل وانصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں۔ اس دور میں خصوصاً مصوری کو بہت فروغ ملا۔ جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس دور میں بھی کئی علاقے فتح کیے گئے۔ شاہجہاں کا دور تہذیبی لحاظ سے کافی اہم شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا تیس سالہ دور خوشحالی کا دور تھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بنا۔ اورنگ زیب نے اپنی دور حکومت کے پچیس سال دکن کے حالات درست کرنے میں صرف کیے۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ حکومت زوال پذیر ہوگئی۔ اس کے نااہل جانشینوں نے حکومت کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ بالآخر 1857ء میں مغلیہ حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

عہد مغلیہ میں مذاہب

ہندوستان شروع سے unity in diversity کا قائل رہا ہے۔ یہاں مختلف ذات پات، رنگ ونسل اور زبان کے بولنے والے لوگ آباد رہے ہیں۔ چنانچہ مغلیہ عہد میں یہاں ہندو، مسلم، سکھ، بدھ، جین اور عیسائی مذہب کے ماننے والے لوگ آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے عقائد وعبادات کے مطابق زندگی گزارتے تھے اس دور کو قومی یکجہتی کا ایک عملی نمونہ کہا جاتا ہے۔

17.3 ہندومذہب

اکبر کے زمانے میں اسلام کی کمزوری کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ اس سے قبل دوصدیوں میں دہلی کی حکومت بجائے ترقی کے تنزلی کررہی تھی۔ البتہ سماج میں روحانی اور مذہبی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ روحانی احیا نے بھکتی تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ جس کے بعض رہنما مثلاً گرونانک صلح کل کے حامی تھے۔ (تلسی داس) دوسرے مذاہب سے بے تعلق تھے۔

ہندو مذہب عقائد اور معاملات کا ایسا مجموعہ ہے جس میں متضاد باتوں کے لیے پوری گنجائش ہے، کئی طرح کی فکر رکھنے والے لوگ اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتے ہیں، دوسرے الفاظ میں ہر اس ہندوستانی کو جو مسلمان نہیں تھا، ہندو کہا جاتا تھا۔ ہندوازم کو اُسی معنی میں اعتقادات کا ایک نظام تصور نہیں کیا جاسکتا جس معنی میں ہم ایسا عموماً اسلام یا دوسرے سامی (Semitic) مذاہب کے سلسلہ میں سوچ سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ مختلف ہندو فرقے ایک دوسرے کے ساتھ تفاعل (Interact) کے ذریعہ سامنے آئے تھے اور تفاعل بڑی حد تک بالخصوص علمی زبان یعنی سنسکرت کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکا تھا۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں مختلف ہندو فرقے نہ صرف ایک ہی قسم کی مذہبی اصطلاحات کا استعمال کرتے تھے بلکہ اکثراُن کے دیوتاؤں میں بھی مماثلت تھی۔ دبستان مذاہب" کی تصنیف سے قبل ابوالفضل نے" آئین اکبری (1595) میں ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے بارے میں ایک تفصیلی اور جامع بیان درج

کیا تھا۔

مغل عہد میں لکھی گئی مذہبی تحریروں میں راسخ العقیدہ ہندومذہب کے ان تمام بنیادی عناصر پر زور دیا جاتا رہا جن کا ذکر "آئین اکبری اور دبستان مذاہب میں کیا گیا ہے مثلاً نارائن بھٹ(Narayan Bhatt) کی 1600ء کے آس پاس لکھی گئی کتاب "مان میودیہ (Manameyodaya)" میں میمانسا(Mimansa) کے فلسفہ پر بحث ملتی ہے۔اس فلسفہ کے مطابق تناسخ کا عمل اپنے آپ جاری رہتا ہے۔یہ ایک طرح سے زندگی کا آزاد عمل ہے جس میں ایک جنم کسی ایک وقت میں روح کا مقام پچھلے جنم مقاموں میں اس کے کرموں کا نتیجہ ہوگا۔اس سلسلہ میں "دبستان مذاہب" کے مصنف نے ایک نہایت پر معنی جملہ درج کیا ہے۔ان کے مطابق ہندوؤں میں یہ ایک عام اعتقاد تھا کہ دنیا کو بنانے والا ایک خدائے واحد ہے لیکن مخلوق کی زندگیاں ان کے پچھلے اعمال (Karama) سے متعین ہوتی ہیں۔

گویا اب دھرم "کنجی" کرم(Karama)"یعنی وہ اعمال تھے جو اسمرتیوں(Smritis) کے مختلف مدارس نے تجویز کئے ہیں۔اس میدان کے روایتی نظریوں پر اسمرتیوں کی تازہ ترین تفسیروں میں برابر زور دیا جاتا رہا ہے۔

وچاسپتی (Vachaspati)نے 1510ء کے قریب میتھلا (بہار) میں اپنی کتاب"وی وداچنتامنی" (Vivadachintamani)تصنیف کی۔بنگال میں 1567ء کے قریب نوادیپ کے راگھوسندن نے اپنی اٹھائیس تحریروں پر مشتمل کتاب"اسمرتی تتوا (Smrititatta)"تصنیف کی۔یہ کتاب رسوم اور وراثت کے متعلق مسائل پر بہت معتبر مانی جاتی ہے۔اسی طرح کملاکار بھٹ (Kamalakara Bhatta)کی 1612ء میں لکھی گئی کتاب "نمایاسندھو (Nimayasindhu) "کو مہاراشٹر میں مذہبی اور قانونی امور کے تعلق سے معتبر تصور کیا جاتا تھا۔جہانگیر (1605-1627) کے عہد میں اس کے اہم امیر "بیر سنگھ" کی سرپرستی میں متر امصرانے قانون سے متعلق کی بات کی جو ایک انسائیکلوپیڈیا نما کتاب تصنیف کی تھی،وہ بھی قابل ذکر ہے۔

ان تحریروں میں پیش کردہ نظریوں سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ برہمنوں کو روایتی طور پر جو ایک اعلیٰ مقام دیا گیا تھا یا گزرے زمانہ کی اسمرتیوں میں ذات پات کے نظام کی بابت جو قواعد وضع کئے گئے تھے ان سے کسی بھی قسم کا انحراف پیدا ہو رہا تھا۔عام طور پر ان سب تحریروں میں ان بندشوں کو دہرایا بلکہ بڑھا کر بیان کیا گیا ہے جو پرانی اسمرتیوں میں نچلی جاتیوں اور عورتوں پر عائد کی گئی تھیں۔راگھونندن نے یہاں تک کہہ دیا کہ برہمن اکیلی ایسی جاتی ہے جس کو دوبارہ پیدا ہونے والی یعنی اونچی جاتی مانا جاسکتا ہے۔اس کے مطابق چھتری اور ویشیہ جاتیوں کے لوگ اس کے زمانے کے آنے تک شودروں کے درجہ پر پہنچ چکے تھے۔

ویدانت کے میدان میں شنکر آچاریہ کی علمی روایت کافی مضبوط تھی۔اس عہد میں ویدانت کے متعلق کئی تحریریں سامنے آئیں۔"دبستان مذاہب" کے مختلف بیانوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کے ویدشنکر آچاریہ کی وحدانیت کا تصور کئی فرقوں کے نظریوں کو متاثر کرچکا تھا۔سدرآنند کی کتاب ویدانت سارا (Vedantasara)جو1500 تک لکھی گئی تھی،سانکھیا (Samkhya)کے اصولوں سے متاثر نظر آتی ہے۔دوسری طرف"سانکھیا سارہ (Samkhyasara) "کا مصنف وجنان بھکشو (Vijn anabhikh)کے قریب کی اپنی تحریر میں "ویدانت" کی سچائی کو تسلیم کرتا ہے اور یہ تجویز کرتا ہے کہ سانکھیا کی

ثنویت (Samkhya Duality) حقیقت کے ایک مخصوص پہلو سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح کی ویدانت اور شیوا کے پیروؤں کے اعتقادات کے درمیان مفاہمت کی کوشش ویلور (Vellore) کے مشہور مصنف آپایادیکشا (Appaya Dikshita) کی ہے جو 1520-92ء کے دوران زندہ تھے۔ کسی قدر بعد کے زمانہ میں ایسا ہی رجحان شیوا کے پیرو شیونانر (Shivananar) کی تحریروں میں ملتا ہے۔

عہد شاہجہانی کی اہم کتاب "دبستان مذاہب" میں وسیع پیمانہ پر جاری تانتر کے اعتقادات اور اعمال کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں تانترک لٹریچر کو خاصہ فروغ ملا۔ وارانسی کے مہی دھار (Mahidhara) نے 1589ء میں منتر مہودادی (mahodadhi-Mantar) تصنیف کی۔ بنگال میں 1571ء کے بعد پورن آنند نے فلسفہ اور جادوی رسموں کے بارے میں اپنی کتاب لکھی۔ اگلی صدی میں نودیپ کے کرشن آنند موا گیش (Krishnananda Agamavagisha) نے اپنی کتاب "تانتر سار (Tantrasara) " تصنیف کی جس کا معتبر تحریروں میں شمار ہوتا ہے۔

17.4 بھکتی سے متاثر فرقے

مغل عہد میں ہندو مذہب اور اسلام کے ملاپ سے بہت سی تحریکات وجود میں آئیں، ان میں سب سے نمایاں تحریک بھکتی ہے۔ بھکتی تحریک کی اہم شخصیت تلسی داس ہیں،، جنہوں نے اپنی کتاب "رام چرت مانس" میں رامائن کی کہانی کو بڑے مقبول انداز میں پیش کیا۔ تلسی داس بھکتی کے شوق اور ولولے سے اپنی شاعری میں رام چندر جی کی بھکتی کی ہے، اور ان کا قصہ بہت تفصیل سے لکھا ہے، وہ رام چندر جی کو اوتار مانتے ہیں۔ اسی طرح بنگال کے رہنے والے برہمن پروہت چیتنیہ نے کرشن اور رادھا کی پرستش شروع کی انہوں نے بھکتی کے ذریعہ اپنے مالک کو یاد کرنے کا طریقہ شروع کیا، ان کے طریقہ میں اپنے خداوند کے نام کے تکرار کے ذریعے اپنے آپ کو ایسی ذہنی اور جذباتی حالت میں پہنچا دیتا تھا جہاں وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس نے بندرابن میں کرشن کی رفیقہ کی جگہ حاصل کرلی ہے اور وہ عشق کے ان تمام مدارج کا تجربہ کرتا ہے جن سے کرشن گزرے تھے۔ ان ذہنی تجربات کے ذریعے ایک بھکت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ وصال کی کیفیت کا تجربہ کرتا تھا۔ گرچہ چیتنیہ کے زیادہ تر پیروکار بنگال میں ہی تھے لیکن انہوں نے اپنے نمائندوں کو جنہیں گوسوامی کہا جاتا تھا، بندرابن میں متعین کیا تھا۔ ان گوسوامیوں نے اپنی سنسکرت تحریروں کے ذریعے اس مخصوص مذہبی رجحان کو فلسفیانہ اساس دی اور اس کے رسوم طے کئے۔ اپنے پیروکاروں کے لئے چیتنیہ خود بھی کرشن اور رادھا کے اوتار کا درجہ رکھتے تھے۔

آسام میں ایک دوسرا ویشنو فرقہ شروع ہوا جو چیتنیہ کے فرقے سے ملتا جلتا تھا۔ اس کی ابتداء چیتنیہ کے ایک ہم عصر شنکر ادیو نے کی تھی جن کی وفات 1568ء میں ہوئی۔ شنکر ادیو نے بتوں کی پرستش سے گریز کرتے ہوئے ایک خداوند مطلق سے رجوع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ خدا کی ہر عبادت کرشن کی محبت سے سرشار ہوگی۔ ولبھ چاریہ (وفات 1531ء) اور ان کے بیٹے وٹھل ناتھ (وفات 1576ء) نے پشٹی مارگ یعنی خدا کے فضل سے عبادت ایک مذہب کی تبلیغ کی۔ اس دور میں سورداس 1545ء "سور سروالی" نامی کتاب مقامی بولی برج میں تصنیف کی۔ اس تحریر میں کرشن اور رادھا کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ دونوں خدا کے مظہر نظر آتے ہیں۔ یہ فرقہ ان کے ماننے والے گجرات اور راجستھان میں کافی تعداد میں ہیں۔ اس کے تحت ولبھ چاریہ کی اولاد کو بڑی

مقبولیت حاصل ہوئی، انہیں اب کرشن کا اوتار سمجھا جانے لگا اور انہیں "مہاراج" کے لقب سے مخاطب کیا جانے لگا۔ ان مریدوں میں تاجروں اور امیر طبقے کے لوگ زیادہ تھے۔ رادھا ولبھی فرقے کی بنیاد ہیتا ہری ونش (وفات 1553ء) نے ڈالی تھی۔ یہ فرقہ خدا کی تثنیت میں رادھا کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

مہاراشٹر کے علاقے میں ویشنو تحریک پھیلی، اس تحریک میں بھی وحدانیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے، ان کے ذریعہ وحدانیت کی طرف مائل ہونے کے ساتھ اس میں کئی قدامت پسند عناصر بھی موجود تھے۔

ایکناتھ (وفات 1599ء) نے بھکتی کے ایسے اصول وضع کئے، جن کی رو سے ہر ذات کے مردوں اور عورتوں کو ایک جگہ جمع ہو کر خداوند کی حمد وثنا کرنے اور کیرتن میں شریک ہو کر حال ووجد کا مزہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔

تکارام (وفات 1649ء) جن کا پیشہ کاشت کاری تھا اور شودر ذات سے تعلق رکھتے تھے، ممکن ہے کہ چینتیہ فرقے سے متاثر رہے ہوں، لیکن اپنی عبادت میں وہ "ویتھوبہ" دیوتا سے رجوع کرتے تھے۔ تکارام کے خداوند ٹھل اور چینتیہ کے کرشن کی بہ نسبت وحدانیت پرست کبیر کے رام سے زیادہ مشابہ تھے۔ وہ اپنی گیتوں میں یہ کہتے تھے کہ ہر پجاری چاہے اس کا سماجی درجہ کتنا ہی نیچا کیوں نہ ہو، اپنے خداوند تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ کا نام استعمال کرنے میں بھی انہیں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

اس سلسلے میں رام داس (وفات 1681ء) کا رویہ کسی قدر مختلف ہے۔ وہ ایک خداوند کی شکل میں رام کی پرستش کے ساتھ "دھرم" کی بھی تائید کرتے تھے۔ "دھرم" سے ان کا مطلب "مہاراشٹر دھرم" تھا، جس کی رو سے برہمنوں اور دیوی دیوتاؤں کی حرمت برقرار رکھنا ضروری تھا۔ انہوں نے مٹھ یعنی سنیاسیوں کے مراکز قائم کئے۔ جنہیں مراٹھا حکمراں شیواجی (وفات 1680ء) کی سرپرستی حاصل تھی۔

17.5 کبیر اور تحریک وحدانیت

بھکتی تحریک کی ایک بڑی شخصیت کبیر داس (وفات 1518ء) تھے، وہ بنارس کے رہنے والے تھے اور جولاہا خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کی تعلیمات نے ہندوستان کی مذہبی فکر میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ان کی شاعری میں ایک طرف تو ویشنو، ناگ پنتھی اور بعض اوقات تانترک اعتقادات کے پردے میں بے پناہ وحدانیت دیکھنے کو ملتی ہے، دوسری طرف ان کے یہاں بعض ایسے اسلامی اعمال پر بھی تنقید نظر آتی ہے جو ان کی نظر میں عقل کے مطابق نہیں تھے۔ اپنے خیالات اودھی زبان میں پیش کئے، جس کو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی سمجھتے تھے۔ کبیر نے اپنے خیالات کو کسی بھی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہو، ان کی فکر کی ندرت نے بلاشبہ اس عہد کے لوگوں کو بہت بڑے پیمانے پر متاثر کیا تھا۔

کبیر نے ایک ایسی وحدانیت کی تبلیغ کی، جس میں بت پرستی یا کسی بھی قسم کی مذہبی رسوم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کے مطابق خدا کی غلامی نہ کہ اس سے عشق نجات کی سچی راہ ہے، گو کہ اس سلسلے میں عشق کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ کسی قدر بعد میں آتا ہے، یہ بات اس دعوے کو کمزور کرتی ہے کہ کبیر نے اپنے خیالات ویشنو بھکتی اور اسلامی تصوف سے مستعار لئے ہیں۔ کبیر کے مطابق

ایک انسان کو اس کے خدا پر ایمان اور اپنے اعمال کی بناپر ہی پر کھا جا سکتا ہے۔ کبیر نے پاک اور نجس کے رسمی تصورات، اسمرتی کے قانون اور ذات پات کے نظام کو بڑی قطعیت کے ساتھ کیا ہے۔ سولہویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی ایک تحریر میں ان کی تعلیمات کو مختصر بیان کیا گیا ہے۔ وہ ذات پات کی تفریق کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ وہ برہمنوں کے سماجی طبقاتی نظام کے بھی منکر تھے۔ اسی طرح سے انہوں نے اپنے دوہوں میں مختلف مذاہب کے آپسی جھگڑوں کا ذکر حقارت آمیز انداز میں کیا ہے۔

کبیر کے سامنے عام انسان تھے، ان کی تمثیلوں اور استعاروں کو ایسے ہی لوگوں کی زندگیوں اور ان کی زحمتوں سے مستعار لیا گیا تھا اور ان کی زبان وہی تھی جو یہ لوگ بولتے تھے۔ لیکن وہ عورتوں کے خلاف بعض ان تعصبات سے متاثر تھے، جو ان کے اپنے سماجی ماحول، خصوصاً غریب لوگوں کی دنیا میں پائے جاتے تھے۔ اس کے باوجود بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کبیر نے اپنے بنانے والے کی دنیا میں غریبوں اور دبے کچلے لوگوں کے لئے ایک نئی قسم کی منزلت کا سراغ لگالیا تھا۔ اسی لئے ان کے بعد بہت سے ایسے لوگ بھکت اور گرو کی شکل میں سامنے آئے جو ان کی ہی طرح غریب تھے، ایک جاٹ کسان دھنا۔ اسی طرح سولہویں صدی کے بھگت روی داس جو جانوروں کی کھالوں کا کام کرتے تھے اور سائیں جو حجام تھے، کبیر کو اپنا پیش رو قرار دیتے تھے۔ کبیر کے بارے میں اسی طرح کا خیال داؤد دھہن کا تھا۔ جس کے مریدوں کی خاصی تعداد راجستھان میں پائی جاتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد تقریباً 1657ء میں ہریانہ میں ست نامی فرقہ نمودار ہوا، جو اپنے آپ کو کبیر کا پیرو قرار دیتے تھے، اس گروہ میں کسان اور چھوٹے سرمایہ دار تاجر شامل تھے۔ ان تمام بھکتوں یا گروہوں کے مرید اپنے گروہوں کو پنتھ کا نام دیتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جہاں ایک طرف اپنے گروؤں کے اشعار اور افکار محفوظ رکھے ہوئے تھے، وہیں دوسری طرف انہوں نے اپنے لئے نئی تعلیمات وضع کرلی اور اپنے ابتدائی گروؤں کو اوتار کا درجہ دینے لگے۔ اس طرح انہوں نے اپنے وحدانیت پرست فرقوں کو ذات کی شکل دے دی۔ یہاں تک کہ کبیر کے لئے جو ایک بنکر کی اولاد تھے، برہمنی ولدیت تلاش کی جانے لگی۔ غرض بھکتوں کے اصل پیغام کو اس طرح بدلنے کی کوشش سے یہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مذہبی ارکان اور ذات پات کے نظام کی جڑیں کتنی مضبوط تھیں۔

17.6 جین مذہب

مغل عہد حکومت میں جین مذہب کے خاص اثر کا علاقہ گجرات تھا، پھر بھی اس مذہب کے لوگ دوسری جگہوں پر بھی مل جاتے تھے۔ جین مذہب کی تحریریں گجراتی، سنسکرت، پراکرت، برج، کنڑ اور دوسری زبانوں میں ملتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ یا تو مقدس ہستیوں کے حالات پر مبنی تحریریں ہیں یا پھر ہر کتاب میں یکساں باتیں دہرائی گئی ہیں۔ مغل عہد حکومت میں جدلیات کے بارے میں جینیوں کا تصور سب سے پہلے یشو وجیاجی نے 1670ء میں لکھی اپنی کتاب ''جین ترک بھاشا'' میں پیش کیا۔ مغل عہد میں یشو وجیاجی نے کئی اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ وجے نگر سلطنت میں جینیوں کے دونوں فرقے شویتا مبر اور دیگامبر پھل پھول رہے تھے۔ جین پروہتوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ہے کہ اکبر کے دربار میں ان کے بڑے اثر ورسوخ تھے۔ اس عہد میں جین فرقے کے عام لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں بنیا اور بوہرہ ذاتوں کے تاجروں تک محدود ہوتے گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اناج فروخت کرتے تھے اور کچھ نوکری پیشہ بھی تھے۔

17.7 سکھ مذہب

سولہویں صدی عیسوی میں سکھ مذہب دنیا کے منظرنامے پر ظاہر ہوا اور اب اس کا شمار دنیا کے چند معروف مذاہب میں ہوتا ہے۔اس مذہب کی ابتداء گرونانک کے مریدوں پر مشتمل ایک فرقے کی طرح ہوئی تھی۔ گرونانک پنجاب کے ایک کھتری تھے۔اس فرقے کے وجود میں آنے کی تاریخ بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اس زمانے کے دوسرے وحدانیت پرست عوامی فرقوں کی تھی۔ سکھوں کی مقدس کتاب "گروگرنتھ صاحب" میں گرونانک اور بعد کے دوسرے گروؤں کا کلام شامل ہے،اسے گرو ارجن دیونے 1604ء میں مرتب کیا تھا۔اس کتاب میں سکھ گروؤں کے علاوہ مسلمان صوفی شیخ فرید اور نام دیو،کبیر،رام دیو اور بعض دوسرے بھگتوں کے کلام اسی طرح شامل ہیں، جس طرح ان کو دادو پنتھیوں کی کتاب "پنچ وانی" اور جب داس کی "سر بنگی" میں جگہ ملی ہے۔اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کم سے کم سترہویں صدی کی ابتدا تک گرونانک کے مریدوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ وہ وحدانیت سے عبارت رجحان کا ایک حصہ ہیں۔ گرچہ چند ایسی باتیں ضرور تھیں، جو نہ صرف طرز بیان کی رعایت سے بلکہ بعض اہم مسائل پر بھی اس عمومی رجحان میں شامل عناصر کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھیں۔

گرونانک کی تعلیمات اور ان کے نظریات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان رکھتے تھے،ان کے نظریے کے مطابق خدا اور اس کے ماننے والے کے درمیان ایک بہت ذاتی قسم کا رشتہ ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے رب کی خدمت اور اس سے محبت کے ذریعے اس کے لطف و کرم سے نوازا جائے گا۔اس کے ساتھ یہ تصور بھی ہے کہ خدا کی کوئی شکل نہیں ہے۔ مگر وہ ہر جگہ موجود ہے۔اس کو کسی بھی مادی صورت میں پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے ان کی تعلیمات میں بت پرستی اور اس سے متعلق رسوم کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے۔نانک نے اخلاقیات پر بھی بہت زور دیا ہے،خاص طور پر دوسرے انسان کے ساتھ مہربانی کے سلوک کو اہمیت دی گئی ہے۔انہوں نے پیدائشی فضیلت کے غرور،ذات پات کے درمیان اونچ نیچ کے فرق اور اس کے پیچھے کار فرما پاک اور نجس کے تصورات کی سخت مذمت کی ہے۔ان کی تعلیمات کے مطابق نجات "نروان" یا "سچ کھنڈ" میں پہنچ کر ہی ملتی ہے۔جہاں بالآخر انسان اپنے رب کو پوری طرح محسوس کرپاتا ہے۔

یہ واضح نہیں ہے کہ گرونانک اس فرقہ کو کس حد تک ایک تنظیم کی شکل دی تھی اور یہ بھی پوری طرح صاف نہیں ہے کہ ان کے ارشادات یعنی 'جپ جی' میں لفظ 'گرو' کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے،اس کا مطلب 'خدا' ہے یا صرف ایک 'مرشد' جو روحانیت یا خدا کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن جلد ہی اس فرقے میں دو طرح کے حالات پیدا ہوگئے،اول گروؤں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو نانک کے جانشین کہلائے۔ان کا مرتبہ بلند ہو کر سچ گرو کے اوتار کے مقام تک پہنچ گیا تھا۔ہر مرید سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ "گرو" کی مکمل اطاعت کرے۔اسی رعایت سے ان کے مرید کو "سکھ گرو" کہا جاتا تھا۔اس حالت کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس فرقے کا اثر جاٹ کسانوں میں تیزی سے پھیلا۔ گرچہ سکھ مذہب کے سبھی گرو کھتری ذات سے تعلق رکھتے تھے لیکن سترہویں صدی میں ان کے 'مسند' یعنی اہم نائب زیادہ تر جاٹ تھے۔

جہاں گیر کے زمانے میں سکھوں کا ٹکراؤ مغلوں سے ہو گیا اس کے بعد وہ ایک ہتھیار بند طاقت ور گروہ کی حیثیت سے ابھرنے

کے لئے میدان تیار ہو گیا۔1606ء میں گرو ارجن دیو کی شہادت کے بعد مغل حکام کے خلاف جنگ کو زیادہ عرصے تک ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ سکھ گروؤں کی فوجی طاقت آخری گرو، گرو گوبند سنگھ (1666-1708) کے عہد میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔1699ء میں انہوں نے اپنے مریدوں کو ایک نئی طرح کی جنگجو تنظیم خالصہ کی شکل دے دی۔ اب یہ لازمی قرار دیا گیا کہ ہر سکھ اپنے ساتھ ہمیشہ چند چیزیں رکھے گا، جن میں کرپان شامل تھی، جو اس عہد میں ایک سپاہی پیشہ فرد کی پہچان بن گئی تھی۔

17.8 اسلام

عہد مغلیہ میں اسلام سرکاری مذہب تھا اور زیادہ صاحب اقتدار مسلمان ہی تھے، گرچہ دیگر مذاہب کو بھی آزادی حاصل تھی لیکن سماجی اور تہذیبی طور پر اسلام کا ہی غلبہ تھا۔ مغلیہ عہد میں اسلام کی جو صورت گری ہوئی تھی وہ تصوف کے زیر اثر تھی صوفیاء کرام کے کئی سلسلے ملک میں رائج تھے بعض سلسلوں کو توبڑا عروج حاصل ہوا تھا۔

عہد مغلیہ میں وحدۃ الوجودی تصوف کا زمانہ تھا ابن عربی کے افکار پوری طرح معاشرے میں رائج تھے اور یہ اثرات اتنے زیادہ تھے کہ اسی دور میں وہ نظریہ بھی پیش کیا گیا جس کو وحدۃ الشہود کہا جاتا ہے، یہ نظریہ دراصل ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود کے رد کے طور پر متعارف ہوا، اس نظریہ کو عہد اکبری اور عہد جہاں گیری کی مشہور شخصیت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے پیش کیا تھا۔ ابن عربی کے نظریہ کی رو سے نظر آنے والی متنوع صورت اور اشکال محض ایک فریب نظر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ نظریہ ''انسان کامل'' کا تصور بھی پیش کرتا ہے۔ اس تصور کے ذریعہ ابنِ عربی کسی مرشد کامل یا شیخ کے مثالی رول کی توضیح کرتے ہے۔ اس کے خیال میں مرشد اپنی جگہ پر ایک کائنات ہے جس میں وہ خود اپنے آپ کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا کشف ہے جس سے مہدی کا تصور اگر لکھنا نہیں ہے تو کم سے کم مضبوط ضرور ہوتا ہے۔

ان دو متضاد نظریات کے علاوہ اس عہد میں مہدوی تحریک بھی پیدا ہوئی۔ سید محمد جون پوری (و:1505ء) ایک ایسے عالم تھے جنہوں نے بہت دور کے سفر کئے تھے۔ انہوں نے اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس امید میں کہ مہدی کے بتائے ہوئے راستے اور اخلاقی اطوار کو اختیار کر کے نجات حاصل کی جا سکتی ہے، بہت سے لوگ اس نئے فرقہ میں شامل ہوتے تھے۔

اکبر اور اس کی مذاہب سے بالا فرمان

اکبر (1556-1605) کے عہد میں خیالات کی سطح پر جو زبردست نئے افکار و نظریات پیدا ہوئے ان کی ابتداء کسی حد تک ان ہی دو فکری محرکات (یعنی وحدت الوجودی) اور ''مہدویت'' میں تلاش کی جا سکتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اکبر کی ابتدائی مذہبی، دلچسپی روایتی اسلام کے دائروں میں ہی تھی۔ اس نے مشہور شہر فتح پور سیکری، جہاں سب سے شاندار عمارت جامع مسجد کی ہے، 1570ء میں شیخ سلیم چشتی (وفات 1572ء) کے اعزاز میں تعمیر کروایا تھا۔1570ء میں شیخ تاج الدین نے، جو ابن العربی کے خیالات کے حامی تھے ان کے نظریات کو دربار میں متعارف کروایا۔

شیخ مبارک (وفات 1593ء) جو نہ صرف شہاب الدین مقتول کی اشراقی تعلیمات سے واقفیت رکھتے تھے بلکہ ان کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ مہدویت سے متاثر تھے۔

اسی دوران دربار میں ان کا اثر بھی بڑھنا شروع ہو گیا تھا، 1582ء میں اکبر نے حکم جاری کیا کہ "تاریخ الفی" مرتب کی جائے جو پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد گزرے ہزار برسوں کی تاریخی واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن بعض لوگ یہ بھی کوشش کر رہے تھے کہ اکبر کو ایک مصلح اور مجتہد کے طور پر پیش کیا جائے اور دوسری طرف اس کو ابن العربی کی روایت سے انسان کامل کے پیکر میں دیکھنے کی بھی کوشش تھی۔ انسان کامل کے تصور کو استعمال کرنے کی ایک ابتدائی کوشش یہی تھی جو 1579ء کے محضر نامے میں ملتی ہے۔ یہ ایک بیان تھا جس پر دربار کے علماء کے دستخط تھے۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اکبر کو مسلم قانون کی تعبیر و توضیح کرنے کا حق حاصل ہے اور تمام مسلمانوں کے لئے اس تعبیر و توضیح کو تسلیم کرنا لازمی ہو گا۔

لیکن وحدت الوجود کے بڑھتے ہوئے اثرات کے نتیجہ میں جلد معاملات اس صورت حال سے بہت آگے نکل گئے جس میں محضر کے ذریعہ شہنشاہ کو بعض محدود قسم کے اختیارات دیئے گئے تھے۔ اکبر کی موجودگی میں اب سنی علماء کے نمائندوں کے درمیان مباحث شروع ہوئے جو فتح پور سیکری میں واقع ایک مخصوص عمارت "عبادت خانہ" میں پیش آتے تھے۔ پھر ان مباحث میں مختلف فرقوں (شیعہ سنی اور صوفی) کے مسلم علماء کے علاوہ معقولات اور فلسفہ کے عالم بھی شریک ہونے لگے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد برہمن عالم ہندو سنیاسی، جینی، پارسی اور عیسائی (جیسویٹ) بھی شریک ہونے لگے۔ عیسائی اکبر کے دربار میں پہلی بار 1580ء میں پہنچے تھے۔

ان مباحث کے نتیجہ میں اکبر کو یقین ہو گیا کہ اسلام کی کوئی ایک تعبیر ایسی نہیں تھی جو پوری طرح یا قریب قریب صحیح ہو۔ اسے اس بات پر بھی یقین آ گیا تھا کہ کوئی ایک مذہب اکیلا سچا مذہب نہیں ہے بلکہ اس کے خیال میں سب مذاہب حق کے ایک مرکز سے کسی نہ کسی حد تک روشنی حاصل کرتے ہیں۔ وہ یہ سوچتا تھا کہ اللہ کی طرف سے چنے ہوئے انسان کی حیثیت میں اس کی ذمہ داری تھی کہ مختلف مذاہب اور گروہوں کے درمیان بے مقصد تنازعوں کو ختم کرنے کے لئے ان کے درمیان "صلح کل" قائم کرے۔

اکبر نے اپنے نظریات کے ماننے والوں کے لے یہ تجویز کیا تھا کہ وہ اپنے بادشاہ اور پیر و مرشد کے سامنے مکمل اطاعت کریں۔ ان کے لئے جو ضابطہ بنایا گیا تھا اس کو مختصراً جہانگیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس طریقے میں یہ واجب ہے وہ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے عداوت میں اپنے اوقات ضائع نہ کریں۔ تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں انہیں صلح کل کی راہ پر گامزن رہنا چاہیئے۔ انہیں کسی جانور کو اپنے ہاتھ سے مارنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ نہ ہی انہیں میدان جنگ یا شکار کے علاوہ کسی اور جگہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر جانا چاہیئے۔ سورج اور چاند کی عزت کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ دونوں ایزدی روشنی پھیلاتے ہیں۔ خدا کو ہر حال میں خالق حقیقی اور علت دائم تسلیم کرنا چاہیئے اور ان میں سے ہر ایک کو چاہے وہ اکیلے میں ہوں یا اوروں کے ساتھ، اس بات پر یوں مرکوز رہنا چاہیئے کہ دھیان ایک لمحہ کے لئے بھی خدا سے ہٹنے نہ پائے۔ اس بات کی کوئی سند نہیں ہے کہ اکبر دین الٰہی نام کا ایک نیا مذہب رائج کرنے کا خواہش مند تھا۔

آئین اکبری میں ابوالفضل نے فلسفہ کے مختلف ہندو مدارس، ان کی دینیات، اعتقادات، قوانین وغیرہ کا بھی نہایت درست اور دلنشیں انداز میں ذکر کیا ہے جو قدیم تحریروں کے از سر نو مطالعہ پر مبنی تھا۔ اس کے مطابق قدیم تحریروں کا ترجمہ کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی تھی۔ ان تحریروں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوا کہ اسلام اور ہندوازم کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ بقول ابوالفضل گو کہ بعض مطالب اور دلائل میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن یہ ظاہر ہو گیا کہ ہندو بھی خدا کی عبادت اور وحدت گزینی میں یقین رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کرم (Karma) کے نظریہ کی منطق کو بہتر طریقہ سے سمجھا جا سکا۔ اس کے بعد جہانگیر کے عہد میں ویدانت کے اندر وحدت الوجود کے عنصر کی رعایت سے یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید وہ تصوف سے واقفیت کا مظہر ہے۔

اسلام کی سمت سے ہندوازم کی شناخت کی کوششوں کا نقطۂ عروج شاہجہاں کے بڑے بیٹے داراشکوہ کی دانشورانہ کارگزاریوں میں ملتا ہے۔ داراشکوہ نے اپنی دانشورانہ روش کی ابتداء مسلم تصوف کے مطالعہ سے کی جس کے دوران وہ میاں میر (فوت 1636ء) اور ملاشاہ بدخشی (فوت 1661ء) کے ذریعہ قادریہ سلسلہ سے متعلق ہو گیا تھا۔ اس کی ابتدائی تحریریں مسلم صوفیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن وحدانیت کے تصور اور صوفیوں کے اطوار میں اس کی دلچسپی نے بالآخر اس کو 1654-55ء میں "مجمع البحرین" تصنیف کرنے پر آمادہ کیا۔ اس تحریر میں داراشکوہ نے ہندو روحانیت پر مرکوز بیانات میں استعمال ہونے والے اہم الفاظ اور تصورات کی توضیح کی ہے۔ اس توضیح میں داراشکوہ کا اصرار ہے کہ تلاش حق کرنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبان کے علاوہ ہر چیز یکساں ہے۔ 1657ء میں اس نے باون اپنشدوں کا ترجمہ "سرالاسرار" کے عنوان سے کیا۔ اس کتاب میں سنسکرت کی بعض نہایت وقیع تحریروں کا نہایت صحیح ترجمہ ملتا ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تحریر کی گئی یہ اس کی سب سے اہم کوشش تھی۔ بعض لحاظ سے یہ ایک یادگار واقعہ تھا کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ اپنشدوں کا یہی ترجمہ تھا جس کو انٹیکوٹیل دوپیرون (Antiquetil Duperron) نے 1801-02ء میں لاطینی زبان میں منتقل کیا اور اس ترجمہ کے ذریعہ ہندو مذہب کے فلسفے کو عالمگیر شناخت ملی۔ 1655-56ء میں داراشکوہ کی ایماء پر حبیب اللہ نے "یوگ واسشت" کا ایک نیا ترجمہ کیا۔

اس عہد کی علمی فضا کی نمائندگی "دبستان مذاہب" کرتی ہے۔ اس کو 1653ء میں ایک ایسے مصنف نے تالیف کیا جسے اپنا نام اور مذہب ظاہر کرنے میں تامل تھا لیکن اس نے اپنی اس تحریر میں کئی ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پارسی فرقہ تعلق رکھتا تھا اور یہ کہ اس کا تخلص "موبد" تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ تمام مذاہب کا مطالعہ سچائی پر مبنی اور ہر قسم کے تعصب سے مبرا ہو کر کرے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب میں پارسی، ہندو، بدھ (تبتی)، یہودی، عیسائی اور اسلام جیسے مذاہب کے حال کے ساتھ ان میں سے ہر مذہبی روایت کے اندر موجود مختلف فرقوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس موضوع پر زیادہ تر مواد مصنف نے خود دیکھا کیا تھا۔ اس مقصد سے اس نے ہر فرقہ کی نمائندہ تحریروں کے مطالعہ کرنے کے علاوہ ان فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے گفتگو کے ذریعہ بھی اطلاعات جمع کی تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسے کئی زبانوں پر خاصا عبور تھا۔ یہ کہنا مشکل ہو گا کہ اس قسم کی تحریر اس عہد کی کسی اور زبان میں بھی لکھی گئی۔ گو کہ "دبستان مذاہب" کا مصنف پارسی فرقہ سے متعلق مانا جاتا فرد ہے، لیکن یہ کتاب اس نے فارسی میں لکھی جس کے پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ اس کتاب کے بہت سے مخطوطے موجود ہیں، اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فارسی پڑھنے والوں میں

(جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی) یہ تحریر بہت مقبول ہوئی۔

17.8.1 اکبر کی مذہب اسلام سے دلچسپی

اکبر 1543ء میں پیدا ہوا اور 13 برس کی عمر میں تخت نشین ہو گیا اس کے بعد 18 بیس سال تک اس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادے خوش اعتقاد اور پابند مذہب تک کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ارکان مذاہب کی دل وجاں سے بجا آوری کرتا تھا، اس نے اپنے باپ کی صحرانوردی کے زمانے میں دنیا کا سرد گرم چکھا تھا اور طبیعت میں سوز و گداز اور روحانی رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ جب بارہ برس کی مایوسی اور سرگردانی کے بعد پھر تاج و تخت نشین ہوا اس نے اسلام کے اشاعت کے لئے اپنی کوششیں دوگنی کر دیں۔

اس زمانے میں شاہان سور نے علماء کو بڑا اقتدار دے رکھا تھا۔ اس میں ملک کی مصلحت بھی تھی اور طبیعت کا لگاؤ بھی۔ اکبر نے یہ سلسلہ اور وسیع کر دیا۔ جابجا قاضی و مفتی مقرر کیے۔ مخدوم الملک شیخ الاسلام کی قدر و منزلت بڑھا دی اور صدر الصدور کو وہ اختیار دے دیئے جو کہ اس سے قبل کبھی کسی کو نہیں ملے تھے۔

مخدوم الملک شیخ الاسلام، اس کے مشیر اور سلطنت کے رکن بھی تھے، صدر الصدور شیخ عبد النبی کا بھی وہ دل و جان سے معتقد تھا۔ کبھی کبھی حدیث سننے ان کے گھر جاتا تھا، اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا تاکہ جامی کی چہل حدیث ان سے پڑھے۔ صدر الصدور شیخ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے تھے اور تقویٰ و پرہیزگاری میں فرد تھے۔ ان کی تعلیم و تلقین اور فیض صحبت سے اکبر کو یہ مقام حاصل ہوا کہ نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف اکبر خود اذان دیتا تھا۔ امامت کرتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو بھی دیتا تھا۔

عبادت خانے اور خانقاہیں

اکبر شیخ سلیم چشتی کے بڑے معتقد تھے۔ اور جب جہانگیر کی ولادت ہونے والی تھی تو حصول برکت کے لئے اس کی والدہ کو شیخ کے حجرے میں بھیج دیا اور اکبر کو بچہ پیدا ہوا تو اپنے بزرگ سلیم چشتی کی نسبت سے بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ اس کے دو برس بعد اکبر نے فیصلہ کیا کہ جو جگہ اتنی روحانی اور برکتوں کا سرچشمہ ہے وہاں ایک عظیم الشان شہر تعمیر ہونا چاہئے۔ چنانچہ 1571ء میں فتح پور سیکری کی شاندار عمارتیں بننی شروع ہوئیں اور یہ معمولی گاؤں شہنشاہ ہند کا پایہ تخت ہو گیا۔

یہاں اکبر ایک پرانے حجرے میں اپنا اکثر وقت مراقبوں، دعاؤں اور عبادتوں میں گزارتا، مذہبی امور میں بالآخر اس کی دلچسپی اتنی بڑھ گئی کہ 1578ء میں اس نے شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی، جس کا نام عبادت خانہ رکھا گیا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد شیخ کی خانقاہ سے آکر یہاں دربار منعقد ہوتا تھا۔ جس میں مشائخ وقت علماء و فضلاء اور چند مقرب درگاہ شریک ہوتے تھے اور خداشناسی اور حق پرستی کی اور روایتیں بیان ہوتی تھیں۔

اکبر نے عبادت خانے کی مجالس کا اہتمام خاص مذہبی ذوق سے کیا تھا، لیکن بالآخر اس نے اسے بدمذہبی کا راستہ دکھایا۔ اس کے ایک اس وقت کے علماء اور فضلاء کی کمزوریاں تھیں جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پہلی ہی نشست میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ

فلاں آدمی صف میں مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے اور میں اس سے نیچے کیوں رہوں۔اس طرح کے روزبروز جھگڑے ہونے لگے جس سے بادشاہ کادل کھٹاہوااوراس نے حکم صادر کیاجو کوئی مجلس میں نامعقول بات کرے اسے مجلس سے باہر نکال دیاجائے ملابدایونی کواس نیک کام پر معمور کردیاگیا۔

اکبر کی اس مجلس میں ملک بھر سے علماء آتے تھے جو اپنے علم کی تسکین کے بجائے دوسرے پر کیچڑاچھالنا اپنا نصب العین سمجھتے تھے جس سے ان کی اناکو تسکین اوردوسروں کی تضحیک وتوہین ہوتی تھی۔اس طرح کے معاملات کی جب کثرت ہونے لگی تو اکبر بادشاہ کاان دونوں فریق سے بدظن ہوگیا۔ملایزدی نے صحابہ ؓکرامؓ کے خلاف کہاتو بادشاہ نے ابتدائے اسلام کی تاریخ پڑھوانی شروع کی۔اس زمانے کے اختلافات اور صحابہ کبارؓ کے بارے میں معترضوں مثلاً (شیعہ اہل فکر) کے طعن وتشنیع دیکھ کر بادشاہ کااعتقاد صحابہ ؓکرامؓ میں بھی نہ رہااور مذہب کی بناصحابہ کی منقولہ روایات پر نہیں بلکہ عقل پر رکھی گئی۔

17.8.2 صوفی تحریک اوراسلامی نظام تعلیم

جیسا کہ پہلے ذکر ہواہندوستان کے اندر تصوف وروحانیت کی روایت مستقل قائم تھی،مغلیہ عہد میں اس کے اندر بڑاعروج ہواصوفیہ نے ہندوستان کے اندر گنگا جمنی تہذیب قائم کی سب کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کے اندر مذہب کا اقدار سکھایا۔

شروع میں،صوفی رہنمایعنی(شیخ،خواجہ ،پیریابابا) اپنے پیروکاروں کو تصوف کے طریقے سکھانے اور تربیت دینے کے لئے اپنی رہائش گاہوں میں رہتے تھے، جنہیں خانقاہ یاجماعت خانہ کہاجاتا تھا،وہ خوداپنی روحانی خوبیوں کی وجہ سے خداکے قریب سمجھے جاتے تھے،اوراس طرح لوگوں کاایک ہجوم ان سے فیض یاب ہوناچاہتاتھا،بعد کی صدیوں میں،ماضی کے نامور صوفیاء کے مزارات مقبول صوفی روحانیت کامرکزبن گئے۔صوفیاء کی ان خانقاہوں اور درسگاہوں نے معاشرے میں رائج ہر قسم کی تفریق اوردرجہ بندی کوتوڑکر زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کواپنی طرف متوجہ کیااوران کی دعاؤں اوردکھ بھرے قصے سننے کے لئے ایک روحانی پلیٹ فارم مہیاکیا۔

آج کی ہندوستانی کلاسیکی موسیقی قرون وسطیٰ کے صوفیوں کاتحفہ ہے اوراسی تناظر میں نظام الدین اولیاء کے پسندیدہ شاعرامیر خسروکانام بارباآتاہے۔بڑے سے بڑے قوال بھی اپنے آپ کو خسروکی اولاد کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔اس کے علاوہ صوفیاء نے ہندوستانی مقامی زبانوں اور ادب(پنجابی،اردو،ہندی وغیرہ) کے عروج وترقی میں بھی اہم کردار اداکیا۔اس طرح صوفیاء نے زبان، ادب،موسیقی،یوگ اور توحید وغیرہ کے ذریعے لوگوں کوجوڑنے کاکام کیا۔کبیر اور باباناںک جیسے سنتوں اور گروؤں نے بھی قرون وسطیٰ میں اس کام کو آگے بڑھایا۔دیگر بھکتی سنتوں، خاص طور پر نرگن روایت کی پیروی کرنے والے گروؤں نے بھی اس عمل میں نمایاں حصہ لیا۔

صوفیاء کے غیر مسلموں کے ساتھ قریبی تعلق کاایک نتیجہ ان کے عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد کی تبدیلی مذہب بھی تھا،جوصدیوں تک جاری رہنے والے ثقافتی عمل کے ذریعے ممکن ہوا،حالانکہ اکثرصوفیوں نے یہ کام کسی ایجنڈے کے تحت نہیں

کیا، اور نہ ہی اس کے لیے مسلمان سلاطین اور شہنشاہوں کی طاقت کو اس کے لئے استعمال کیا۔ اس کے برعکس زیادہ تر صوفیوں نے اقتدار کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے خود کو اقتدار کے لالچ سے دور رکھا، لیکن کچھ سلسلہ (جیسے نقشبندی) نے اقتدار کے قریب ہو کر اسے ذاتی طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی سیاست اور معاشرے میں صوفیاء کی اہم موجودگی کو سمجھنے کے لئے ان کے ادب کا ایک وسیع ذخیرہ کافی ہے۔ صوفیاء کے فارسی اور مقامی یا علاقائی زبانوں میں کیا گیا ادب خاص طور پر اہم ہے، صوفیاء کے ملفوظات (روحانی مکالمے)، ان کے مکتوبات (خاص طور پر پیروکاروں کی تربیت کے لئے لکھے گئے خطوط)، صوفیانہ تحریریں جو روحانی روایات پر فکری طور پر عکاسی کرتی ہیں، صوفیاء کی عقیدت، سوانح عمری (تذکرے) اور خود صوفیاء کے بنائے ہوئے روحانی گیت۔ صوفیاء نے عظیم داستانیں لکھنے کی ایک نئی روایت شروع کی، جس میں پرانی داستانوں اور عشقیہ داستانوں کا احاطہ کیا گیا، جن کی کچھ شکلیں عقیدت واحترام سے لبریز عوام کے جذبات کو متاثر کرتی تھیں۔ بدقسمتی سے بعد میں یہ جذبات سیاسی زیادتی کا شکار ہوتے چلے گئے۔

مسلسل پچاس سالوں تک ہندوستان پر حکومت کرنے والے قابل فخر مسلم بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر پر تو خاص طور سے فرقہ پرستوں کی نظر عنایت مرکوز رہی ہے۔ شروع سے ہی ہمارے نام نہاد تاریخ نگاروں نے ان کے طرز حکومت کا مشروط ذہن کے ساتھ محاسبہ اور محاکمہ کیا ہے اور اس طرح ان کے اوپر بھی نفرت وتعصب کا لبادہ ڈال دیا گیا ہے، عموماً یہ بات مشہور کر دی گئی ہے کہ اس نے لاکھوں ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا، لاکھوں غیر مسلموں کو تہ تیغ کیا، کئی مندروں کو توڑا، انہیں سیاسی، معاشی اور اقتصادی سطح پر لاچار کمزور کیا، لیکن سچی اور حقیقی تصویر کچھ اور ہے۔ تاریخی اوراق اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ وہ بڑے ہی انصاف پسند اور رعایا پرور تھے، ان کی عالم گیر اور قابل رشک رواداری سے متاثر ہو کر ایک ہندو مورخ لکھتا ہے:

”کاشی پریاگ اور دوسری عبادت گاہوں کے لئے اس نے جو جاگیریں وقف کی ہیں اور ہندو پیشواؤں کے ساتھ جو رعایتیں کی ہیں، ان سے اس کی انصاف پسندی ثابت ہوتی ہے“۔ (تاریخ:658)

17.8.3 اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں مذہبی حالات اور تعلیم

اورنگ زیب اپنے مذہب اور اسلامی مسلمات سے انحراف اور روگردانی کو برداشت نہیں کرتے تھے، مگر یہ حقیقت بھی بجا ہے کہ انہوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کوئی سرکاری یا نیم سرکاری تنظیم نہیں قائم کر رکھی تھی۔ جس سے اسلام کی توسیع و تبلیغ کا کام لیا جاتا رہا ہو، چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے:

”اس نے کبھی بھی غیر مسلم کو بالجبر مسلمان نہیں بنایا، بلکہ اس نے غیر مسلموں کی دلداری کی انتہائی کوشش کی ہے“۔ (پریچنگ آف اسلام:10)

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں تمام مذاہب پوری طرح تحفظ کے زیر سایہ تھی، اورنگ زیب کے دور حکومت میں غیر مسلموں کو بڑے اعزازات و مناصب بھی دیئے گئے، حاکم، فوجی، فوج کے اعلی عہدیدار بڑے بڑے جاگیر دار جیسے قابل قدر عہدے ان کے سپرد کئے گئے۔ ان کے علاوہ دیگر تمام مغل بادشاہوں نے بھی ہندوؤں کے ساتھ روادارانہ برادرانہ سلوک کیا ہے

اورانہیں برابر کا شہری سمجھتے ہوئے ہر طرح کے جائز حقوق سے نوازا ہے، غیر مغل مسلم بادشاہ شیر شاہ سوری بھی بڑا انصاف پرور اور رواداد تھا۔ وہ خود کو ہر مذہب کا حاکم اور سرپرست تصور کرتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ اگر کسی نے بھی میری رعایا کے کسی فرد پر ظلم کیا تو میں اس پر بجلی بن کر گروں گا اور اس کو مٹا کر ہی دم لوں گا۔ شیر شاہ سوری کے فرمان میں یہ درج تھا کہ۔ ''غیر مسلموں کی عبادت گاہیں بالکل محفوظ رہیں۔ ان عبادت گاہوں کی جو مسلم حاکم حفاظت نہیں کرے گا اسے معزول کر دیا جائے''۔ (ٹی لیون:37)

اورنگ زیب نے عام طور پر روایتی اسلام کے شرعی احکام کو زیادہ اہمیت دی۔ یہ بات ''فتاویٰ عالمگیری'' ایسی اسلامی قانون سے تعلق رکھنے والی عربی کتاب تیار کروائی جانے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کو شیخ نظام نے عالموں کی ایک پوری جماعت کی مدد سے عربی زبان میں اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ مختلف مسائل پر فقہا کی آراء کا ایسا مجموعہ بن جائے جن کو موضوعات کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔

مقتدر مسلم مفکر اور فقیہ شاہ ولی اللہ (1702-1762) مغل سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے بعد سامنے آئے۔ کسانوں اور اہل حرفہ پر ہونے والے مظالم کا انہوں نے نہ صرف ذکر کیا بلکہ وہ اس صورت حال کو مغل سلطنت کے زوال کے اسباب میں شامل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تحریروں کو مخصوص اہمیت حاصل ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ کسانوں اور اہل حرفہ پر ہونے والے مظالم کی اصل وجہ حکمراں جماعت کی بڑھتی ہوئی عیش پسندی تھی۔ بعض اوقات شریعت کے نفاذ کو مخصوص سماجی عوامل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان امور پر ان کے اکثر بیانات سے ایک قسم کی سادہ لوحی جھلکتی ہے۔ مثلاً وہ فرماتے کہ سود کو اس لئے حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کا امکان ہے کہ سود خوری کے منافع کی لالچ میں لوگ کاشت کاری اور دست کاری ترک نہ کر دیں۔

بعض دوسرے معاملات میں مثلاً شیعہ اعتقادات کے بارے میں ان کے بیانات اہل سنت کے راسخ العقیدہ حلقوں جیسے ہی ہیں۔ ان کے خیال میں ایک ایسی حکومت میں جہاں شریعت کی پابندی ہوگی۔ وہ اپنے کو مرشد یعنی روحانی رہنما قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے (دلائل کے بجائے اپنے وجدان سے ''وحدت الوجود'' کے تصور اور سرہندی کے ''وحدت الشہود'' کے درمیان نظریاتی دوری کو ختم کر دیا ہے۔ ان کے بعد ہندوستان کی اسلامی نظر میں وحدت الوجود کا اثر کم ہوتا چلا گیا۔

عہد وسطیٰ میں مسلم حکمرانوں کی رواداری، رعایا نوازی اور خیر سگالی کی یہ ایک جھلک ہے۔ اس کا تفصیلی مطالعہ بہت سے مخفی گوشوں سے پردہ اٹھائے گا۔ جس کو الزامات کی دبیز چادر میں ڈھک دیا گیا ہے۔ اگر ہم کھلے ذہن کے ساتھ ہندوستان کے عہد مغلیہ کے نظام ہائے حکومت اور اس وقت کے حکام کی روشن زندگیوں کے خدوخال کا مطالعہ کریں تو ہمارے مؤرخین اور سیاست دانوں کو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی کہ محمود غزنوی سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سارے مسلم حکمراں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی سماج کے حقوق وواجبات کے تیئں مخلص اور روادار تھے۔ انہوں نے طبقاتی اور سماجی بنیادوں پر حکومت نہیں کی ہے، بلکہ مساوات اور برابری ان کی حکومت کا نشان تھا۔

17.9 عیسائیت

ہندوستان میں مغل دور حکومت میں پائے جانے والے مذاہب میں ایک اہم نام عیسائیت کا بھی ہے۔ یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد

اور خاص طور پر نو آبادیاتی عہد کی ابتدا میں دنیا میں عیسائیت کا عروج بڑے پیمانے پر شروع ہوا، لیکن ان تمام سے پیش تر کیرالا کے ساحل پر ایک لمبے عرصہ سے عیسائی اور یہودی مذہب کے لوگ رہتے چلے آرہے تھے اور بحر احمر سے ہونے والی تجارت کے ذریعے ان لوگوں کا عیسائیت اور یہودی مذہب کی مشرقی شاخوں سے تعلق قائم رہا۔ پرتگالی تاجروں کے ساتھ ہندوستان میں کیتھولک عیسائیت کا بھی ظہور ہوا۔ فرانسس زیویر (1506-1552) پہلا عظیم کیتھولک مبلغ تھا جو ہندوستان آیا۔ اٹلی کے رہنے والے ایک دوسرے عیسائی مشنری رابرٹ ڈی نوبلی (1577-1656) نے عیسائیت کو ہندوستانی طرز میں پیش کرنے کی غرض سے اونچی ذاتوں اور دلتوں کے لئے الگ الگ کلیسے قائم کئے۔

عیسائیت سے متعلق تحریروں کو ہندوستانی زبانوں میں شائع کرنے کے لئے عیسائی مشنریوں نے چھاپہ خانے کا استعمال کیا۔ 1557ء میں گوا کو آرچ دیوسیز (Archdiocese) یعنی ایک آرچ بشپ کے رہنے کے مقام کا درجہ مل گیا۔ پرتگال کے زوال کا اثر ہندوستان کے کیتھولک کلیسا کی کارکردگی پر بھی پڑا۔ سیرین عیسائیوں کے کئی گروہوں نے جو پرتگالیوں کے زیر اثر پاپائے روم کو اپنا سربراہ تسلیم کر چکے تھے۔ 1653ء میں دوبارہ انٹیوک (Antioch) سے اپنا تعلق قائم کر لیا۔ 1759ء میں پرتگال نے بھی عیسائی سلسلے کو غیر قانونی قرار دے دیا، لیکن ایک لمبے عرصے تک کیتھولک عیسائی فرقہ ہی نصرانی عقائد کا واحد ایسا گروہ تھا، جس سے ہندوستان کے لوگ واقف تھے۔ "دبستان مذاہب" کے نصرانی عقائد کے باب میں کیتھولک تعلیمات کا بہت ہی صحیح اور تفصیلی بیان ملتا ہے لیکن اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک سے قطعی ناواقف تھا۔

مارٹن لوتھر کی تعلیمات کو پھیلانے والے پہلے مشنری ڈنمارک کے تاجروں کے ساتھ 1706ء میں تامل ناڈو کے ٹرانکوبر نامی مقام پر پہنچے۔ ان مشنریوں میں ایک زی گینبالگ (Ziegenbalg) تھا، جس نے 1714ء میں چاروں آسمانی کتابوں کا تامل زبان میں ترجمہ کیا۔ ابتدائی ادوار میں ہندوستان میں فروغ پانے والے ہندو اور مسلم دونوں قسم کے مذہبی افکار پر عیسائیت کا بہت کم اثر پڑا۔ انیسویں صدی کے اوائل سے عیسائیت کے اثرات کسی قدر اہمیت اختیار کر چکے تھے۔

اس میں خلاصہ کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغل دور حکومت میں حکمرانوں نے اپنی عوام کو انصاف کی فراہمی کے لئے بڑے پیمانے پر کوششیں کیں۔ اس کے لئے انہوں نے مغل انتظامی ڈھانچے کی بنیادی اکائی یعنی گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک مختلف قسم کی عدالتوں کا سلسلہ قائم کیا تاکہ عوام الناس کو انصاف کے حصول میں کسی بھی قسم کی پریشانی اور ایذا نہ پہنچے۔ ان عدالتوں کو فعال بنانے کے لئے انہوں نے ان میں مختلف قسم کے افسروں، عہدیداروں اور کارکنان کا تقرر کیا۔ تاکہ عوام کو اپنے معاملات کا فوری حل مل سکے۔ مغل دور کی سماجی حالت کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی تاریخ کے پچھلے ادوار کی طرح اس دور میں بھی معاشرہ مختلف طبقات میں منقسم رہا۔ گرچہ مغلوں نے سماج کے طبقاتی نظام کے ان بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن انہیں اپنے اس مقصد میں کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی اور لوگ اونچی نیچی ذاتوں میں ہی منقسم رہے۔ حرفے اور پیشے کی بنیاد پر ہی لوگوں کی پہچان ہوتی رہی۔ مغل عہد حکومت کی مذہبی حالت بہت حد تک قابل رشک شمار کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں اس عہد کی سب سے اہم بات مذہبی تکثیریت ہے۔ مغلوں نے عوام الناس کو یہ اختیار دیا کہ وہ اپنے ارادہ اختیار کے اعتبار سے جس مذہب کو چاہیں مانیں، جس کی چاہیں

عبادت کریں، اس عہد میں مذہبی افکار و نظریات کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ نئی تحریکیں وجود میں آئیں اور انہوں نے لوگوں کو مذہب کے معاملات میں کھل کر غور و فکر کا موقع فراہم کیا۔

17.10 کلیدی الفاظ

مؤرخین	:	تاریخ لکھنے والے۔ تاریخ داں
مہم جو	:	جنگ جیتنے والے
خدوخال	:	حالات
طلب	:	چاہنا۔ حاصل کرنا
خیر سگالی	:	اچھا خیال کرنا

17.11 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مغل عہد حکومت کی مذہبی حالت بہت حد تک قابل رشک شمار کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں اس عہد کی سب سے اہم بات مذہبی تکثیریت ہے۔ مغلوں نے عوام الناس کو یہ اختیار دیا کہ وہ اپنے ارادہ اختیار کے اعتبار سے جس مذہب کو چاہیں مانیں، جس کی چاہیں عبادت کریں، اس عہد میں مذہبی افکار و نظریات کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ نئی تحریکیں وجود میں آئیں اور انہوں نے لوگوں کو مذہب کے معاملات میں کھل کر غور و فکر کا موقع فراہم کیا۔
- مغل دور حکومت کے وجود میں آنے سے ہندوستان میں اسلامی تعلیم کا فروغ ہوا۔ نئے مدارس کھولے گئے اور مسجدوں میں امام و موذن کی تقرری کا سلسلہ شروع ہوا۔
- بہت سارے دینی و ملی کام جو ابھی نامکمل تھے اکبر اور جہانگیر کے عہد میں اسے پایہ تکمیل تک پہونچانے کی کوشش کی گئی۔
- تعلیم کا نظام دینی و عصری تعلیم حاصل کرنے کا باقاعدہ طور سے اسی دور حکومت میں رواج ہوا۔
- نئے تاریخی عمارتیں بنائی گئی اور مسجد و مدرسے بنائے دہلی اور قرب و جوار کے علاقے میں باقاعدہ منظم طریقے سے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔
- اس دور حکومت میں دیگر مذاہب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ مذہبی پیشوا علمائے کرام کی باقاعدہ تنخواہ کا اہتمام ہوا۔

17.12 نمونہ امتحانی سوالات

17.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. بابر کہاں سے آیا تھا۔

(a). ایران (b). فرغانہ (c). ترکی (d). عراق

2. شیر شاہ سوری نے چونسا کی جنگ میں کس کو شکست دی۔

(a). اکبر (b). شاہجہاں (c). ہمایوں (d). جہانگیر

3. صلح کل کی پالیسی کس بادشاہ کی دین ہے۔

(a). ہمایوں (b). اکبر (c). شاہجہاں (d). جہانگیر

4. ”رام چرت مانس“ کس کی تصنیف ہے۔

(a). تلسی داس (b). کبیر داس (c). رحیم داس (d). پورن آنند

5. جین مذہب کے ماننے والے خاص علاقے ؟

(a). گجرات (b). آسام (c). مہاراشٹر (d). رائے پور

6. سکھ مذہب کے بانی کون ہیں ؟

(a). گرورام داس (b). گرونانک (c). گروانگد (d). گروگوبند

7. دین الٰہی کس بادشاہ نے شروع کیا؟

(a). اکبر (b). ہمایوں (c). خرم (d). شیر شاہ

8. وحدۃ الشہود کا سہرہ کس کے سر ہے ؟

(a). شیخ سلیم چشتی (b). شیخ احمد سرہندی (c). شیخ عبد النبی (d). عبداللہ مبارک پوری

9. شیخ سلیم چشتی کا مزار کہاں ہے ؟

(a). آگرہ (b). دہلی (c). فتح پور (d). اجمیر

10. ہندوستان کے کس حصہ میں عیسائی پہلے سے آباد تھے ؟

(a). مہاراشٹر (b). گجرات (c). کیرلہ (d). آسام

17.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. بابر کی مذہبی پالیسی پر ایک نوٹ لکھیے ؟

2. دین الٰہی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. دبستان مذاہب پر ایک نوٹ لکھیے؟
4. مغل عہد میں مذہبی آزادی پر اظہار خیال کریں؟
5. مخلوط تہذیب کے فروغ میں مغلوں کے کردار کو بیان کیجیے۔

17.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مغل دور میں مذہب اسلام کی تاریخ پر نوٹ لکھیے۔
2. مغل عہد میں تصوف کے فروغ میں مغل حکمرانوں کی سرپرستی پر نوٹ لکھیے۔
3. صوفی تحریک کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔

17.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. رودِ کوثر (اسلامی ہندوپاکستان کے مذہبی اور علمی تاریخ، عہد مغلیہ) شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامی کلب لاہور 1975ء
2. دبستان مذاہب، لکھنؤ منشی نول کشور پریس، 1881ء
3. آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، ڈاکٹر مبارک علی، آگہی پبلی کیشنز پاکستان سندھ، 1984ء
4. ہندوستان پر مغلیہ حکومت، شوکت علی فہمی، دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
5. فسانہ سلطنت مغلیہ، سیاح منورچی کی یادداشت، مترجم، خان بہادر اور منظر علی خان

اکائی 18: مغل حکومت (علوم کی ترقی)

اکائی کے اجزا:

18.0 تمہید

18.1 مقاصد

18.2 مغل حکومت میں علوم کی ترقی

18.3 منطق وفلسفہ

18.4 حدیث وفقہ

18.5 تراجم

18.6 جغرافیہ

18.7 ریاضی وفلکیات

18.8 سائنس وٹیکنالوجی

18.9 مدارس

18.10 طب

18.11 فن تعمیر

18.12 جہاز سازی

18.13 کپڑے کی صنعت

18.14 کلیدی الفاظ

18.15 اکتسابی نتائج

18.16 نمونہ امتحانی سوالات

18.16.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

18.16.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

18.16.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

18.17 تجویز کردہ اکتسابی مواد

18.0 تمہید

مغلیہ عہد کے ہندوستان میں علمی میدان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مغل حکمرانوں بالخصوص اکبر وغیرہ نے علم کے فروغ کے لئے ملک کے مختلف حصوں جیسے دہلی، لاہور، آگرہ اور سیالکوٹ وغیرہ میں علم وآگہی کے مکاتب، مدارس اور مراکز وغیرہ قائم کیے۔ ان میں دور دراز علاقوں سے طلبہ آتے تھے اور اسلامی علوم، طب، ریاضیات، فلکیات اور فنون لطیفہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مغل عہد کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس دور کے تمام ہی حکمراں تعلیم سے دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ علوم کی متعدد شاخوں میں نمایاں کامیابی اس دور کا مستقبل بنی اور ہندوستان کی سرزمین کو ان حکمرانوں نے علم کی دولت سے سرفراز کیا۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس اکائی کا بنیادی خاکہ عرفان حبیب کی کتاب ''عہد وسطیٰ کا ہندوستان ایک تہذیب کا مطالعہ'' سے اخذ کیا گیا ہے۔

18.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد عہد مغلیہ میں ہوئی مختلف علوم کی ترقی کے بارے میں جاننا ہے۔ ساتھ ہی مغل حکمرانوں کی علم سے دلچسپی سے طلباء کو روشناس کرانا ہے۔ علوم کے بڑے بڑے مراکز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے جو اس دور میں علم وآگہی کا مرکز تھے۔ علوم کی ترقی کے لئے مختلف مدارس کے قیام سے روشناس ہونا اور علوم کے فروغ میں امراء اور شرفاء کے کردار کے بارے میں جاننا ہے۔

18.2 مغل حکومت میں علوم کی ترقی

ہندوستان میں مغل دور جو سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک قائم رہا علوم کی ترقی کا عینی شاہد ہے۔ تعلیم کی ترقی مغل بادشاہوں کی ذاتی دلچسپی کی بدولت ہوئی۔ یہ ترقی صرف ان کا ہی شیوہ نہیں تھا بلکہ ان کے امراء اور شرفاء بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں نہ صرف دینی علوم میں ترقی ہوئی بلکہ جدید علوم میں بھی کامیابی ملی۔ ابوالفضل نے ''آئینِ اکبری''میں مندرجہ ذیل مضامین کی فہرست دی ہے جو اُس کے بیان کے مطابق اکبر چاہتا تھا کہ طلباء مدرسوں میں پڑھیں۔ یہ مضامین ہیں، اخلاقیات، حساب، محاسبی، زراعت، مساحت، علم ہندسہ (Geometry) فلکیات (Astronomy)، علم رمل (Geomancy) امورِ خانہ داری، حکمرانی کا آرٹ، طب، منطق، علوم قدرت، ریاضی، علم الہیات اور تاریخ کے علاوہ ہندوستانی علوم مثلاً ویاکرن، نیائے، ویدانت اور پتن جلی (یعنی قواعد، منطق اور ویدانتک فلسفہ) اکبر نے جو کچھ تجویز کیا تھا اُس کو عملی جامہ پہنانا ایک مشکل کام تھا، لیکن ابوالفضل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ان مضامین کے پڑھائے جانے سے مدرسوں میں نئی جان آگئی تھی۔ اس عہد میں جن علوم کی ترقی ہوئی وہ اس طرح ہیں:

18.3 منطق و فلسفہ

مغل بادشاہوں کو فلسفہ سے خاصی دلچسپی تھی اسی وجہ سے ان کے دربار میں ایسے علماء کا ایک بڑا حلقہ موجود تھا جو اس علم میں مہارت رکھتے تھے۔ ٹامس رونے 1616ء میں یہ تسلیم کیا تھا کہ مغل دربار کے مسلمان عالم فلسفہ اور ریاضی میں کسی قدر درک رکھتے ہیں، اُن میں (بعض) مشہور منجم ہیں، اور اَرستو، اقلیدس، ابی سینا اور دوسرے مشہور مصنفوں کے بارے میں گفتگو کرسکتے ہیں- زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اِس دور میں سائنٹفک طرزِ فکر کو کسی قدر بڑھاوا ملا تھا۔

ہمایوں عقلی علوم کا دلدادہ تھا لیکن اکبر کو خاص طور پر مذہبی علوم میں دلچسپی تھی، اور وہ مذہبی آزادی کا حامی بھی تھا۔ اس کے دور کے مدارس کے نصاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مذہبی اور عقلی علوم کے مرکز ہوا کرتے تھے جن میں حسب ذیل مضامین شامل تھے: نحو، منطق، فلسفہ، کلام، فقہ، اصول ، بلاغت، ہئیت و حساب، طب، حدیث، تفسیر، تصوف و سلوک۔ اکبر کے دور میں یہ فتح اللہ شیرازی کی محنت اور اکبر کی سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ نصاب میں پہلی مرتبہ فلسفہ، ہئیت و حساب اور طب اختیاری علوم کی حیثیت سے داخل ہوئے۔۔ ہندوستان میں معقولات کا رواج میر فتح اللہ شیرازی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ اپنے علمی ذوق کو عام کرنے کے لئے انہوں نے کثرت سے اس ملک میں اپنے شاگرد پیدا کئے، بالخصوص امیر زدگان حکومت کے طبقے میں۔ دربار کے امیروں کے بچوں کو وہ پابندی کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے۔ اور اپنے فلسفیانہ اور منطقیانہ مذاق کو بجائے عوام کے اس ملک کے خواص اور امیر زادوں میں انہوں نے پھیلایا۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقات پر فارسی ادب کی نظم و نثر کا زیادہ اثر تھا۔ ان کا علمی مذاق فارسی کے محاضرات و قصص وحکایات و تاریخی روایات کے مطالعے تک محدود تھا۔ لیکن میر فتح اللہ نے ادبی مذاق کے ساتھ ساتھ معقولات کا چسکا بھی امیروں کو لگا دیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ چسکا عوام کو بھی لگ گیا۔ ہندوستان کے عام علمی خانوادے بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ ملا نظام الدین کا تعلیمی سلسلہ فتح اللہ شیرازی پر منتہی ہوتا ہے۔ عقلیت کی جو لہر سکندر لودھی کے عہد (1517-1489ء) میں اٹھی تھی اور اکبری عہد میں جس نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی وہ عالمگیر کے عہد میں درس نظامی کی شکل میں اپنے انجام کو پہنچی۔ یہ درس مندرجہ ذیل علوم اور کتب پر مشتمل تھا:

1. صرف: میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ
2. نحو: نحو میر، شرح مات عامل، ہدایت النحو، کافیہ، شرح جامی
3. منطق: صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلّم العوم
4. حکمت: میبذی، صدرا، شمس بازغہ
5. ریاضی: خلاصت الحساب، تحریر اقلیدس، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمینی
6. بلاغت: مختصر المعانی، مطول
7. فقہ: شرح وقایہ، ہدایہ
8. اصول فقہ: نور الانوار، توضیح، تلویح، مسلم الثبوت

9. کلام: شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف

10. تفسیر: جلالین، بیضاوی

11. حدیث: مشکوۃ المصابیح

گیارہ علوم اور تینتالیس کتب پر مشتمل اس نصاب میں معقولات کی کتابوں کی تعداد بیس تھی، منطق میں آٹھ، حکمت میں تین، کلام میں چار اور ریاضی میں پانچ۔ نصاب کا تقریباً نصف حصہ معقولات پر مشتمل تھا اور اس کی حیثیت لازمی تھی اختیاری نہیں۔

18.4 حدیث وفقہ

اس دور میں جتنے اہل علم پیدا ہوئے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ اس دور میں حدیث اور فقہ کے حوالے سے کئی اہم شخصیات ہیں، جن میں سے ایک شیخ عبد الحق محدث دہلوی ہیں۔ انہوں نے فقہ اور حدیث میں نمایاں کارنامے انجام دئے۔ عربی وفارسی میں ایک سو سے زیادہ رسائل تیار کئے۔ علم حدیث کے موضوع پر بہت سی کتابیں تحریر کیں۔ حدیث کی مشہور کتاب مشکاۃ المصابیح کی شرح لکھی۔ مدارج النبوت یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لکھی۔ شیخ عبد الحق دہلوی کی حدیث میں اشاعت کی وجہ سے بر صغیر پاک وہند میں متعدد محدثین پیدا ہوئے ان میں ایک ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق دہلوی ہیں انہوں نے تیسیر الباری شرح البخاری لکھی۔ اسی فہرست میں ایک مشہور عالم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام آتا ہے۔ آپ نے علم حدیث میں اہم کارنامے انجام دئے۔ اس دور کی علم حدیث کی کچھ اہم کتابیں اس طرح ہیں: فیض الباری شرح البخاری، سراج النبوت شرح شمائل ترمذی، نور القاری شرح بخاری وغیرہ۔

اس دور میں فقہ کے میدان میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے جن میں سے سب سے اہم کام اورنگ زیب کے دور میں ہوا ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کو فقہ اسلامی سے خاص شغف تھا۔ اس نے علمائے حنفی کی ایک پوری جماعت کو فقہ کی کتاب لکھنے پر مامور کیا۔ جس کا نام بعد میں فتاویٰ عالم گیری رکھا گیا۔ جو حنفی فقہ کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ فتاویٰ بابری، فتح المذاهب، تیسیر الاحکام وغیرہ۔ اس کے علاوہ فقہ شافعی کی بھی کئی کتابیں اس دور میں تالیف کی گئیں جن میں کفایت المبتدی، المطالع البدریہ وغیرہ شامل ہیں۔

18.5 تراجم

مغل دور میں تراجم کی تحریک نے علوم کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا خاص طور پر سنسکرت زبان کو بھی بہت ترقی ملی۔ سنسکرت کی سرپرستی اور اس میں اشتراک اکبر کے دربار میں اپنے انتہائی نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ اس کے دربار کے کچھ امراء فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں لکھتے تھے مثلاً راجہ منوہر داس یا ٹوڈر مل نے بھگوت گیتا کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر کے مسلمان امراء میں عبد الرحیم خان خاناں، ابو الفضل اور فیضی سنسکرت میں کچھ شد بد رکھتے تھے اور انہوں نے اس سے تراجم بھی کئے۔ دوسرے دانشوروں اور مصنفوں نے جن میں بدایونی بھی شامل ہیں سنسکرت کی کتابوں کا پنڈتوں کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر کے زیر نگرانی سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کا پروگرام لازمی طور پر اس کی اپنی ذہنی ترقی واصلاح کے دور رس منصوبے کا ایک حصہ تھا جس میں عربی، ترکی اور کشمیری

زبانوں سے ترجمہ کرانا بھی شامل تھا۔ وہ ہندو و دوان جو مسلمان مترجموں مثلاً فیضی، ابو لفضل، حاجی ابراہیم سرہندی، بدایونی، نقیب خان، ملا شاہ اور محمد سلطان تھانیسری کی مدد کے لئے رکھے گئے تھے ان میں کشن جوشی، گنگادھر، مہیش مہانند، دیوی مصرا، مدھوسودن مصرا، چتر بھوج اور بھاون شامل تھے۔ اس مشترکہ مہم کے نتیجے میں سنسکرت کی کلاسکی مذہبی کتابیں اور دیگر مابعد الطبیعاتی تصانیف فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ اس میں پرانوں کے بھی کچھ اجزاء شامل تھے۔

اکبر نے سنسکرت اور دوسری زبانوں کی بعض کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا، 1582ء میں ملاعبد القادر، نقیب خاں اور ایک نو مسلم برہمن کو حکم دیا گیا کہ مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ اس کتاب کے اٹھارہ حصے ہیں۔ ملاعبد القادر بدایونی نے چار سال کی محنت سے رامائن کا فارسی ترجمہ مکمل کیا۔ اتھرو وید کا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے، لیلاوتی کا ترجمہ فیض نے، علم ہئیت کی ایک کتاب تاجک کا ترجمہ مکمل خاں گجراتی نے، واقعات بابری (ترکی) کا ترجمہ فارسی میں عبد الرحیم خان خاناں نے، تاریخ کشمیر کا ترجمہ مولانا شاہ محمد آبادی نے، جامع رشیدی کا ترجمہ ملاعبد القادر نے اور مجمع البلدان (عربی) کا ترجمہ احمد ٹھٹھوی، قاسم بیگ، شیخ منور اور ملاعبد القادر نے کیا۔ سنسکرت کی کتاب ہری بنس کا ترجمہ نصر اللہ مصطفیٰ نے اور پنچ تنتر کا ترجمہ مولانا حسین واعظ نے کلیلہ و دمنہ کے نام سے مکمل کیا۔ زیچ الغ بیگ کا ترجمہ امیر فتح اللہ شیرازی کی نگرانی میں اور کشن جوشی، گنگادھر اور مہیش مہانندا کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں ابو الفضل کی نگرانی میں کرایا گیا۔ تاریخ الفی نقیب خاں اور مولانا احمد ٹھٹھوی نے لکھی۔ لیکن اس کی تکمیل جعفر بیگ اور آصف خاں نے کی۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانے میں بھی جب کہ مغل بادشاہ بے بس ہو گئے تھے فرخ سیر کے عہد میں درباری شاعر نواز نے کالی داس کی شکنتلا کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ بکاؤلی کا قدیم قصہ فارسی آمیز مروجہ ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

18.6 جغرافیہ

ہمایوں کو علم جغرافیہ کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنے استعمال کے لئے زمینی اور آسمانی کرّے (گلوب) تیار کرائے تھے۔ جغرافیہ میں ابو الفضل کی گہری دلچسپی کا اندازہ مغل سلطنت کے صوبوں کی اُن تفصیلات سے لگایا جاسکتا ہے جو "آئینِ اکبری" میں درج ہیں۔ جس باریکی سے مختلف قسم کی اعداد و شمار کا جائزہ لیا گیا ہے وہ اپنی جگہ پر اِس تحریر کا ایک غیر معمولی پہلو ہے۔ "آئینِ اکبری" میں ہمیں نہ صرف زرعی ٹیکس سے تعلق رکھنے والے حسابات کی نقل ملتی ہے بلکہ کئی دوسرے قسم کی اعداد و شمار بھی دستیاب ہوتے ہیں، مثلاً قیمتیں، اجرتیں، زرعی ٹیکس کے نرخ، آراضی اور مختلف سرکاروں اور محالوں کی جمع کے اعداد، اس کے علاوہ زمینداروں کے ہتھیار بند نوکروں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کا علاقہ وار گوشوارہ وغیرہ مزید ایسی اعداد و شمار ہیں جو اتنے بڑے پیمانے پر اِس سے پہلے کی فارسی تحریروں میں مہیا نہیں کی گئی تھیں۔ ایک اور قابلِ ذکر کام صادق اصفہانی کا اٹلس تھا جو اُس نے 1647 میں جونپور کے مقام پر تیار کیا۔ اِس اٹلس میں کل 33 نقشے ہیں جو مشرقی نصف الارض پر مرکوز ہیں۔ ان نقشوں کو بطلیموس (Ptolemic) اصولوں کے مطابق بنایا گیا ہے۔ یعنی اِن میں ایسے نلکی نما (Cylindrical) پروجیکشن کو بروئے کار لایا گیا ہے جس میں تناظر معدوم ہو جاتا ہے۔ اس دوران یورپی نژاد لوگوں کی ہندوستان میں

موجودگی کے باوجود اِن نقشوں میں کسی بھی قسم کے یورپی اثرات نہیں ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ سرٹامس رو 1617ء جہانگیر کو "میر کٹر کے عالمی نقشے" (Mercetor's Maps of the world) بطور تحفہ پیش کئے تھے لیکن مغل دربار نے اِن نقشوں میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اور اِن کو واپس کر دیا گیا۔

18.7 ریاضی وفلکیات

اس دور میں علومِ ریاضی اور فلکیات پر مخصوص توجہ دی گئی۔ بھاسکر آچاریہ کی مشہور کتاب "لیلاوتی" کا فارسی میں ترجمہ (اکبر کے درباری شاعر فیضیؔ نے) 1587ء میں کیا۔ ایک ایرانی تارک الوطن فتح اللہ شیرازی (م 1588ء) کی مغل دربار میں بہت پذیرائی ہوئی کیونکہ وہ ریاضی اور فلکیات میں دسترس رکھتا تھا۔ اُس کو ایک صحیح نظام تقویم یا کلینڈر (یعنی اِلٰہی کلینڈر) تیار کرنے کی ذمہ داری دی گئی جو 1584ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سرکاری کلینڈر قرار دیا گیا۔ فتح اللہ نے کئی اہم تکنیکی آلات ایجاد کئے تھے جن میں بعض کو ابولفضل نے اکبر کی طرف منسوب کیا ہے۔ بابر کو بھی فلکیات سے دلچسپی تھی۔ 1634-35ء میں شاہجہاں کی زیر سرپرستی عطا اللہ رشدی نے بھاسکر آچاریہ کی الجبرا پر کتاب "بیج گنت" (Bijganit) کا ترجمہ کیا۔ مغل دربار سے متعلق ایک اہم امیر اور آمبیر کے راجہ سوائی جے سنگھ (و: 1743ء) کی فلکیات کے میدان میں کارگزاریاں ہندوستانی سائنس کے ایک روشن پہلو اور چند بنیادی خامیاں دونوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اُنہوں نے دہلی، جے پور، اوجین، متھرا اور وارانسی میں مشاہدہ گاہیں تعمیر کیں جن میں اینٹ اور چونے کی مدد سے بڑے بڑے "آلات" تعمیر کئے گئے۔ ان آلات کی تعمیر کرنے میں جے سنگھ سوائی کے سامنے سمرقند میں الغ خان کے پندرہویں صدی میں بنوائے ہوئے آلات کی مثال تھی۔ اینٹ گارے کے ان آلات کی تعمیر کے پیچھے جواز یہ تھا کہ لکڑی اور لوہے کے بنے ہوئے چھوٹے سائز کے آلات، مثلاً اسطرلاب میں، غلطی کا امکان زیادہ رہ جاتا ہوگا۔ جے سنگھ سوائی کو یورپ میں درج کئے گئے مشاہدات کی صحت کے بارے میں معلوم ہوا تو اُس نے ڈی لاہیر (de La Hire) کے مشاہدات کا وہ ریکارڈ حاصل کر لیا اور اُس کی مدد سے اُنہوں نے العطاف (refraction) کا ٹیبل تیار کر لیا۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ اُن کی تحقیق کے نتائج ڈی لاہیر کے ریکارڈ سے زیادہ درست ہیں۔ جے سنگھ کے ماہرین فلکیات نے ایک یورپی دوربین کی مدد سے زہرہ کا اُس حالت میں مشاہدہ کیا جب وہ چاند کی روشن سمت میں ہوتا ہے۔ ان مشاہدات کے نتائج اُن کی اہم کتاب "زیج محمد شاہی" (1734ء) میں بیان کئے گئے ہیں۔ گو کہ عام طور پر جے سنگھ نے "مسلم فلکیات" سے ہی استفادہ کیا تھا. "مسلم فلکیات" کی اطلاعات سنسکرت میں بھی منتقل ہوئیں۔ اِس کا اندازہ اُن سنسکرت ناموں سے لگایا جاسکتا ہے جو اُنہوں نے اپنی مشاہدہ گاہوں کے آلات کو دیے، فلکیات اور ریاضی پر کئی عربی اور فارسی تحریروں سے سنسکرت عالموں کو واقفیت تھی)۔ کائنات کے بارے میں جے سنگھ کا نقطہ نظر پوری طرح بطلیموس (Ptolemy) کے نظریہ پر منحصر ہے۔ وہ بنیادی مباحث سے اس حد تک بے نیاز ہیں کہ اپنی کتاب میں اُنہوں نے اکثر الغ بیگ کی تین سو برس پہلے لکھی گئی "زیج" (1437-38ء) سے پورے پورے پیراگراف نقل کر لئے ہیں۔ اُس نے کہیں بھی کوپرنیکس کے نظریہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یورپی نژاد لوگوں نے، جن سے اُنہوں نے اطلاعات حاصل کیں، اُنہیں کوپرنیکس کے نظریہ کی بابت کچھ نہیں بتایا تھا۔ کوپرنیکس کا ذکر نہ ملنے کی بنا پر وہ مخصوص مقامات پر سیاروں کے پہنچنے کے اوقات تعین کرنے میں ہی دلچسپی رکھتے تھے جو

بنیادی طور پر نجومی کاروبار کا حصہ ہے۔ اس میں سیاروں کے گھومنے کے اصل راستوں کو متعین کرنا ظاہر ہے غیر ضروری تھا۔

18.8 سائنس و ٹیکنالوجی

سائنس میں دلچسپی کے جو امکانات اکبر کے عہد (1556-1605ء) میں نظر آتے تھے، سترہویں صدی میں وہ پورے نہ ہو سکے۔ کم و بیش سائنس اپنی رِوایتی حدود میں مقید رہی اور کوئی خاص ایجاد ممکن نہ ہو سکیں۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں، جو اُس نے تخت پر آنے کے بعد یعنی 1605-27ء میں لکھی تھی، نباتات اور جانوروں کے بارے میں بہت سے مشاہدات درج کئے ہیں جن کی بنا پر اِسے نیچر کے ایک واقف کار (Naturalist) کا درجہ دیا گیا ہے۔

اکبر کے عہد کی ایجادوں میں سب سے پہلے اُن آلات کا ذکر ضروری ہے جن میں گراری دار چرخیوں (Gear – Wheels) کو استعمال کیا گیا، سولہویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بابر نے پانی نکالنے کے ایک طریقہ کا ذکر کیا جس میں کیلیوں دار پہیوں پر مشتمل گراری کام کرتی تھی، اس کو ہندوستانی انگریزی میں "پرشین وھیل" (Persian Wheel) کہا گیا۔ ٹیکنالوجی کی تاریخ کے ماہر اِسے "ساقیہ" کے نام سے جانتے ہیں۔ مغل عہد کے کئی مصوروں نے ساقیہ کی تصویر بنائی ہے کیلوں دار پہیوں پر مشتمل گراری جو یہاں ملتی ہے وہ کئی دوسرے اُن آلات میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے جن کی ایجاد کا سہرا درباری مورخ نے اکبر کے سر باندھا ہے۔

اسی طرح پانی نکالنے کا وہ پیچیدہ نظام بھی ہے جو فتح پور میں لگایا گیا تھا۔ اس میں کئی گراری دار پہیوں کی مدد سے پانی اوپر پہنچایا جاتا تھا، اکبر کو یہ منسوب کیا گیا ہے کہ اُس نے شورہ کی مدد سے پانی کو ٹھنڈا کرنے کی ترکیب ایجاد کی جو اِس کے بعد ہندوستان میں بہت عام ہو گئی۔ پانی کو ٹھنڈا کرنے کی یہ ترکیب ہمارے یہاں یورپ میں خنک سازی کے ایسے ہی طریقوں کے آنے سے پیشتر رائج ہو چکی تھی۔ بادشاہ کی "ایجادوں" کے دائرہ میں بندوق سے متعلق امور بھی آ گئے تھے۔ اکبر کے ہتھیار خانہ میں ایک بندوق بنائی گئی، جو ابوالفضل کے مطابق، خود شہنشاہ کی "کار آگہی" کا ثبوت تھی۔ اس بندوق کو فلیتہ کی بغیر، محض "ماشہ" (Trigger) دبا کر سر کیا جا سکتا تھا۔ اکبر کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے پوری دنیا میں وہ پہلا شخص تھا جس نے "جہاز کا اونٹ" (Ship's Camel) نامی ترکیب ایجاد کی۔ یہ دراصل بہت وسیع پلیٹ فارم تھا جو سمندری جہاز تعمیر کرنے کی غرض سے کشتیوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر بنایا جاتا تھا تاکہ تکمیل کے بعد بآسانی سمندر تک پہنچایا جا سکے۔

ایسے مکینکی آلات میں سب سے اہم ایک مخصوص قسم کا پینچ (Srew) تھا جو اُلٹے سے سیدھے کی طرف گھمایا جاتا تھا۔ اُس کو بنانے کے لئے کھانچے کاٹنے کے بجائے ایک کیل پر دھات کا بنا ہوا تار لپیٹ دیا جاتا تھا۔ ایسے پینچ کا ذکر پہلی بار 1666ء میں ملتا ہے۔ یہ پینچ ایک ایسی چیز ہے جس کی مدد سے دو مختلف ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے (Fastening) کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

18.9 مدارس

علوم کی ترقی کے لئے مغل عہد میں بہت سے اہم مدارس موجود تھے۔ اس دور کے اہم مدارس میں سے کچھ کا ذکر اس طرح ہے:

ہمایوں کے عہد حکومت میں شیخ زین الدین ایک مصنف اور اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں معمے اور تاریخیں نکالنے اور نظم و نثر فی البدیہہ لکھنے میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔انہوں نے دہلی میں ایک شاندار کالج قائم کیا تھا جس کے قریب ہی اپنی وفات کے بعد وہ مدفون کئے گئے۔ان کی یادگار میں آگرہ میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ اس بات کے بھی ثبوت ملتے ہیں کہ ہمایوں کا مقبرہ بھی ایک زمانے میں بطور ایک مدرسے کے استعمال ہوتا تھا۔یہ بات کہ اس کے اندر کسی زمانے میں ایک مدرسہ تھا۔حسب ذیل یوروپین مصنفین کے بیانات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔"مقبرے کی چھت پر جو کالج قائم تھا وہ ایک زمانے میں بہت مشہور سمجھا جاتا تھا، اور بڑے بڑے صاحب علم اور با اثر اشخاص اس کی نگرانی کے لئے مقرر کئے جاتے تھے لیکن ایک عرصے سے اس کی وہ شہرت نہیں رہی ہے اور گزشتہ 150 برس سے وہ کمرے جو کبھی اساتذہ و طلباء سے بھرے رہا کرتے تھے بالکل خالی پڑے ہوئے ہیں۔اکبر کی رضاعی ماں ماہم انگہ نے دہلی میں ایک کالج مع ایک مسجد کے تعمیر کرایا اور اسے نہایت اچھے ساز و سامان اور لائق اساتذہ سے آراستہ کرایا۔یہ ایک نہایت شاندار عمارت تھی جو پتھر کے ٹکڑوں اور پلاستر سے بنی تھی اور جس پر سرخ رنگ پتھروں سے بیل بوٹے بنے تھے۔اس کا دروازہ جس کا کچھ حصہ اب گر گیا ہے، کسی زمانے میں بہت عمدہ رہا ہوگا۔ماہم انگہ کے مدرسے کے علاوہ اس زمانے میں دہلی میں ایک اور مدرسہ تھا۔جو خواجہ معین الدین کا مدرسہ کہلاتا تھا۔جہاں طلباء کی تعلیم کے لئے بہت اچھے اچھے اساتذہ رکھے گئے تھے۔

سلطنت مغلیہ کے پورے دور میں گجرات کی علمی شہرت ہمیشہ قائم رہی۔1623ء میں گجرات کے دیوان محمد صفی نے قلعہ ایرک کے سامنے اور مدرسہ سیف خاں کے بازو میں کئی مدرسے قائم کئے۔صادق خاں جو سولہویں صدی میں ایک بڑے ماہر تعلیم گزرے ہیں انہوں نے بھی ایک مدرسہ قائم کیا جہاں شیخ وجیہہ الدین درس دیا کرتے تھے۔اورنگ زیب کے دور میں اکرام الدین جو تعلیم کی ترقی کے لئے ممتاز تھے انہوں نے 1797ء میں احمد آباد میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے کی لاگت سے ایک مدرسہ بنوایا۔مولوی عبد الحکیم نے سیالکوٹ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔قاضی رفیع الدین نے ایک مدرسہ قاضیوں کی مسجد کے پاس قائم کیا۔

عالمگیر کے دور میں سیالکوٹ پنجاب علم کا مرکز بن گیا۔این این لا لکھتے ہیں "کہ سیالکوٹ علم کا ایک بڑا مرکز تھا۔ملک کے مختلف حصوں سے اہل علم یہاں آکر آباد ہوگئے تھے"۔اس شہر کے تعلیم کا مرکز بننے کی ایک بڑی وجہ تو لوگوں کی نجی کوششیں تھیں۔دوسرے یہاں کاغذ نہایت آسانی سی دستیاب ہوتا تھا۔اورنگ زیب کے بعد ان کے جانشینوں کے انحطاط پذیر زمانے میں بھی تعلیم کے سلسلہ میں نجی کوششوں کی جو شمعیں جلائی گئی تھیں وہ کلیتاً گل نہیں ہوئیں۔چنانچہ بہادر شاہ کے زمانے میں تین نجی ادارے قائم تھے۔غازی الدین جو اورنگ زیب کے عہد میں ایک بہت محبوب افسر تھے اور بہادر شاہ کے زمانے میں ممتاز لوگوں میں سمجھے جاتے تھے، انہوں نے دہلی میں اجمیری دروازہ کے پاس ایک مدرسہ، ایک مسجد اور ایک مقبرہ بنوایا تھا۔1711ء میں فیروز جنگ نے ایک مدرسہ دہلی میں قائم کیا تھا۔اسی زمانے میں قنوج میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا جس کا نام فخر المربی تھا۔فیروزآباد میں ولی اللہ نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔

بہادر شاہ کے زمانہ میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ کی بنیاد شرف الدولہ نے ڈالی تھی جو اپنے علمی امتیازات کی وجہ سے خاص طور پر شہرت رکھتے تھے۔شاہ عالم ثانی کے زمانے میں بھی بہت سے ممتاز علمی اشخاص گزرے ہیں مثال کے طور پر حسن رضا خاں جو ایک مشہور ماہر

تعلیم تھے۔ انہوں نے فرخ آباد میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ غرض اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد مغلیہ میں ان مدارس نے علوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

18.10 طب

ہندوستان میں رائج طبِ یونانی تقریباً اُسی نوعیت کی تھی جیسی کہ ہمعصر ایرانی طب، اِس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اُس دور میں ایرانی طبیبوں کا ہندوستان آنا برابر جاری تھا۔ یہ ایک تعجب خیز بات ہے کہ آتشک کے علاج میں دار چینی کے استعمال (گو کہ اُس کے فوائد مسلمہ نہیں ہیں) کو یورپ اور ہندوستان دونوں جگہ تقریباً ایک ہی زمانہ میں (یعنی سولہویں صدی کے نصف اوّل میں) اہم نئی کامیابی قرار دیا گیا۔

آیورویدک طریقہ علاج ابتداء سے ہی ایک کار آمد متوازی طبی طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے امیر، دانشمند خان، اپنی علم دوستی کے لئے مشہور تھے، انہوں نے برنیر کو دہلی میں (1659-66ء) اپنا ملازم رکھ لیا تھا۔ برنیر نے دانشمند خان کو خون کے بہاؤ کی بابت ہاروے کا نظریہ تفصیل سے سمجھایا۔ اُس نے اُنہیں غذا کے ایک جز "کیل" (Chyle) کے خون میں تبدیل ہو جانے کی بابت ژین پی کیوٹ (Jean Pacquet) کی دریافت سے بھی متعارف کیا۔ اپنے سرپرست کو اِن ایجادات سے بخوبی واقف کروانے کے لئے برنیر نے ایک بھیڑ کا آپریشن کیا۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یورپین نژاد افراد اچھے طبیب ہوتے ہیں۔ لوگوں کے اِس خیال کا نتیجہ تھا کہ نکولائی مانوکی (Niccoloao Manucci) ایسے طب سے قطعی نابلد شخص نے جب 1660ء میں پریکٹس شروع کی تو جلد ہی لاہور میں اُس کی بہت شہرت ہو گئی اور بڑی آمدنی بھی ہونے لگی لیکن یورپی علم ادویہ کی شہرت اور دانشمند خان کے اظہارِ تجسس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ یورپی علاج کے طریقوں کو، یونانی طب کا حصہ بنالینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بس یورپ سے آنے والی چند نئی ادویہ میں کچھ دلچسپی ضرور دکھائی گئی۔ دوسری طرف یہ نوٹ کئے جانے کے لائق بات ہے کہ چیچک کے ٹیکہ کی قدیم رسم جس کو اٹھارویں صدی میں ترکی سے لیکر بنگال تک پرانے چلن کے لوگ اکثر اپنائے ہوئے تھے، پوری طرح نظر انداز کر دی گئی۔ اس زمانہ کی یونانی طب اور آیورویدک تحریروں میں اس ٹیکہ کا ذکر مفقود ہے۔

18.11 فن تعمیر

مغل بادشاہوں نے فن تعمیر سے خاص دلچسپی دکھائی جس کا اندازہ اس دور کی ان عمارتوں کا مشاہدہ کرنے سے ہوتا ہے جو اب تک موجود ہیں۔ جن میں کچھ مشہور تعمیرات اس طرح ہیں: تاج محل، بلند دروازہ، جامع مسجد دہلی، لال قلعہ آگرہ و دہلی، ہمایوں اور جہانگیر کے مقبرے وغیرہ۔ تعمیرات کے میدان میں دوہرا، پیاز نما، گنبد (جو تاج محل کے مشہور گنبد میں اپنے نقطہ عروج پر نظر آتا ہے) بنانے کی صلاحیت پیدا ہونا محراب کے اصول کو تعمیرات میں استعمال کرنے کی صلاحیت میں ایک قابلِ ذکر پیش رفت کی نشان دہی کرتا ہے۔ یقینی طور پر یہ نئی کاریگری وسط ایشیا سے ہندوستان آئی تھی لیکن یہاں آنے کے بعد اس میں کسی قدر بہتری بھی ہوئی۔ اِسی قسم کی مہارت پانی کو دور تک لے جانے کی غرض سے بنائی گئی اونچی نالیوں کی تعمیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے نمونے شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی مشہور مغربی جمنا نہر

(West Yamuna Canal) کے بعض حصوں میں ملتے ہیں۔

18.12 جہاز سازی

جہاز بنانے کی صنعت میں، عام خیال کے بر خلاف، ناریل کے ریشوں سے جوڑ پُر کرنے کے بجائے اکبر کے آخری زمانہ سے خاصے پیمانہ پر لوہے کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ امکان یہ ہے کہ لوہے کا ایسا استعمال کافی پہلے سے چلا آرہا تھا- سترہویں صدی کی ابتدا سے جہازوں کے بنیادی ڈھانچہ میں تبدیلی آگئی تھی۔ اس کے بعد یک مستولی جہاز کے بجائے اب انگریزی اور ولندیزی طرز کے سہ مستولی جہاز تیار کئے جانے لگے۔

18.13 کپڑے کی صنعت

کپڑے کی بنائی کے کام میں پھولوں سے سجی ہوئی بُنائی لوم کے اندر موجود کشیدہ کاری کے فریم کی مدد سے پیدا کی جانے لگی۔ یعنی اس کے لئے تیلیاں ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اِروِن (Irwin) کے اِس خیال کو تسلیم کرنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں کپڑے کی چھپائی کی ابتداء سترہویں صدی میں ہوئی۔ اُن کی رائے کے بر خلاف، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنعت ہندوستان میں بہت پہلے سے موجود تھی اور سترہویں صدی میں یہ ہندوستان سے ایران اور یورپ پہنچی۔ اسی کے نتیجہ میں چھپائی اور چھپے ہوئے کپڑے کے لئے استعمال ہونے والے ہندوستانی الفاظ "چھاپہ" یا "چھاپ" اور "چھینٹ" یا "چٹ" ایران کی زبان کا حصہ بن گئے۔ اٹھارہویں صدی کے دوران انگلینڈ میں کپڑا چھاپنے کی جو صنعت وجود میں آئی وہ ہندوستانی کپڑے کی چھپائی کے طرز پر ہی شروع ہوئی تھی۔

18.14 کلیدی الفاظ

منجم	:	ستاروں کا علم رکھنے والا
معقولات	:	عقل سے تعلق رکھنے والے
مابعد الطبعیات (Meta physics)	:	فلسفہ کی ایک شاخ جس میں دینیات اور الٰہیات سے بحث کی جاتی ہے۔
پران	:	ہندو مذہب کی قدیم کتب
مستولی	:	زور آور، قابض
تقویم	:	تعین، تاریخ، ماہ و سال
آتشک	:	جنسی بیماری

18.15 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ہندوستان میں مغل دور جو سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک قائم رہاعلوم کی ترقی کا عینی شاہد ہے۔ تعلیم کی ترقی مغل بادشاہوں کی ذاتی دلچسپی کی بدولت ہوئی۔ یہ ترقی صرف ان کا ہی شیوہ نہیں تھابلکہ ان کے امراءاور شرفاء بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں نہ صرف دینی علوم میں ترقی ہوئی بلکہ جدید علوم میں بھی کامیابی ملی۔
- مغل دور میں تراجم کی تحریک نے علوم کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا خاص طور پر سنسکرت زبان کو بھی بہت ترقی ملی۔ سنسکرت کی سرپرستی اور اس میں اشتراک اکبر کے دربار میں اپنے انتہائی نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ اس کے دربار کے کچھ امراء فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں لکھتے تھے مثلاً راجہ منوہر داس یا ٹوڈر مل نے بھگوت گیتا کا فارسی میں ترجمہ کیا۔
- ہمایوں کو علم جغرافیہ کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنے استعمال کے لئے زمینی اور آسمانی کرّے (گلوب) تیار کرائے تھے۔ جغرافیہ میں ابوالفضل کی گہری دلچسپی کا اندازہ مغل سلطنت کے صوبوں کی اُن تفصیلات سے لگایا جاسکتا ہے جو ''آئینِ اکبری'' میں درج ہیں۔ جس باریکی سے مختلف قسم کی اعداد و شمار کا جائزہ لیا گیا ہے وہ اپنی جگہ پر اِس تحریر کا ایک غیر معمولی پہلو ہے۔ ''آئینِ اکبری'' میں ہمیں نہ صرف زرعی ٹیکس سے تعلق رکھنے والے حسابات کی نقل ملتی ہے بلکہ کئی دوسرے قسم کی اعداد و شمار بھی دستیاب ہوتے ہیں۔
- سائنس میں دلچسپی کے جو امکانات اکبر کے عہد (1556-1605ء) میں نظر آتے تھے، سترہویں صدی میں وہ پورے نہ ہو سکے۔ کم و بیش سائنس اپنی رِوایتی حدود میں مقید رہی اور کوئی خاص ایجادیں ممکن نہ ہو سکیں۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں، جو اُس نے تخت پر آنے کے بعد یعنی 1605-27ء میں لکھی تھی، نباتات اور جانوروں کے بارے میں بہت سے مشاہدات درج کئے ہیں جن کی بناپر اِسے نیچر کے ایک واقف کار (Naturalist) کا درجہ دیا گیا ہے۔

18.16 نمونہ امتحانی سوالات

18.16.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. آئینِ اکبری کا مصنف کون تھا؟

(a). فیضی (b). ابولفضل (c). بیر بل (d). اکبر

2. آمیر کے کون سے راجہ نے دہلی، جے پور، متھرا اور وارانسی میں مشاہد گاہیں تعمیر کروائی تھیں؟

(a). مان سنگھ (b). جے سنگھ (c). شیر شاہ (d). رانا سانگا

3. جہاز کا اونٹ نامی ترکیب کس نے ایجاد کی؟

(a). بابر (b). اکبر (c). ہمایوں (d). جہانگیر

4. پودوں کو قلم لگانے کے فن کو کس باشاہ کے دور میں ترقی ملی؟

(a). اکبر (b). اورنگ زیب (c). بہادر شاہ (d). جہانگیر

5. مہابھارت کا فارسی ترجمہ ملا عبد القادر، نقیب خاں اور ایک نومسلم برہمن نے کس کے کہنے پر کیا؟

(a). شیر شاہ (b). بابر (c). اکبر (d). شاہ عالم

6. فتاوی عالمگیری کس کے عہد میں تیار کی گئی؟

(a). اورنگ زیب (b). شاہ جہاں (c). اکبر (d). بابر

7. اکبر کی رضاعی ماں ماہم انگہ نے کس شہر میں مدرسہ تعمیر کروایا تھا؟

(a). آگرہ (b). لاہور (c). سیال کوٹ (d). دہلی

8. مدرسہ حسن رضا خاں کس بادشاہ کے دور میں قائم تھا؟

(a). شاہ عالم ثانی (b). اورنگ زیب (c). شاہ جہاں (d). بہادر شاہ

9. مدرسہ خواجہ معین کس شہر میں تھا؟

(a). دہلی (b). کلکتہ (c). جے پور (d). لاہور

10. شورہ کی مدد سے پانی کو ٹھنڈا کرنے کی ترکیب کس بادشاہ نے ایجاد کی؟

(a). اکبر (b). شاہجہاں (c). بابر (d). ہمایوں

18.16.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مغل دور میں مدارس کی ترقی پر نوٹ لکھیں۔
2. مغل دور میں علوم کی ترقی میں اکبر کے کردار کا تجزیہ پیش کریں۔
3. مغل دور میں ترجمے کی تحریک کا جائزہ لیں۔
4. مغل دور میں صنعت کی ترقی کا تجزیہ کریں۔
5. مغل دور میں علم کے مراکز پر ایک نوٹ لکھیں۔

18.16.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6. مغل دور میں علوم کی ترقی پر مفصل لکھیں۔

7. مغل دور میں سائنس کی ترقی پر نوٹ لکھیں۔

8. مغل دور میں تراجم کی ترقی پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

18.17 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. عہد وسطیٰ کا ہندوستان ایک تہذیب کا مطالعہ : عرفان حبیب

2. مسلم ثقافت ہندوستان میں : عبدالمجید سالک

3. تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں : ایس۔ ایم۔ جعفر

4. برصغیر پاک وہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام : پروفیسر بختیار حسین صدیقی

5. اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں : مولانا سید عبدالحی ندوی

اکائی 19: مغل حکومت (فنون لطیفہ اور فن تعمیر)

اکائی کے اجزا:

19.0 تمہید

19.1 مقاصد

19.2 مغل حکومت میں فنون لطیفہ

19.2.1 فن خطاطی

19.2.2 فن موسیقی

19.2.3 فن مصوری ورقص

19.3 فن تعمیر

19.4 صنعتی فنون

19.5 کلیدی الفاظ

19.6 اکتسابی نتائج

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

19.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

19.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

19.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

19.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

19.0 تمہید

فنون لطیفہ اور ان کے مختلف نمونے اپنے عہد، ملک و قوم، مذہب وملت اور علاقے کی تہذیبی وتمدنی عروج کا آئینہ ہوتے ہیں۔ برصغیر ہند میں مسلم فنون لطیفہ اور فن تعمیر بالخصوص مغل عہد کی شاندار باقیات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ مختلف فنون کی ترقی میں اس عہد

کے حکمراں اور امرا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ برصغیر ہند کے طول و عرض میں اب بھی ان کے نمونے بکھرے پڑے ہیں۔ فنون لطیفہ کے ان نمونوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے اپنے عہد میں ایسے فنون کی سرپرستی کی، جن کا تعلق انسانوں کی بنیادی ضرورتوں سے تھا تاکہ ان کے فروغ کے ذریعہ نہ صرف انسانی ضرورتوں کی تکمیل ہو بلکہ معاشرہ اور مملکت دونوں ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔ انہوں نے اپنے فنون میں فطرت کو سجانے اور سنوارنے کے ساتھ ساتھ اپنے مذہبی جذبات کی تکمیل بھی کی۔ فنون لطیفہ اور فن تعمیر میں زینت و آرائش اور لطافت و شگفتگی سے مغلوں کا خاص شغف ظاہر ہوتا ہے۔ اس عہد کے فن کاروں اور ماہرین نے اپنے فنون میں فطری مناظر کے نقش و نگار سے حسن اور آیات قرآنی کے استعمال اور خطاطی سے تقدس پیدا کیا۔

19.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو مغل حکومت کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کے ایک اہم گوشے یعنی فنون لطیفہ اور فن تعمیر کی ترقیات سے روشناس کرانا ہے تاکہ آپ مغل حکومت میں ظہور پذیر ہونے والے فنون لطیفہ کے مختلف نمونوں کا نہ صرف ادراک کر سکیں بلکہ وہ مختلف فنون اور فن عمارت سازی کی خصوصیات سے بھی آگہی حاصل کر سکیں۔ اس اکائی کا مقصد یہ بھی ہے کہ فنون لطیفہ میں مغل دور کے ان کارناموں سے آپ کو متعارف کرایا جائے، جن کا ظہور مغل حکومت میں ہوا تاکہ آپ اس بات کو سمجھ سکیں کہ وہ کون سے اجزائے ترکیبی تھے، جن سے مغل دور کے فنون کو ترقی ملی اور کن ماہرین فنون نے اس سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیے؟ مغل عہد کے حکمرانوں اور ماہرین نے کس قسم کے فنون کو فروغ دینے میں دلچسپی دکھائی؟ تاکہ مغل دور کی تہذیبی و ثقافتی ترقی سے واقف ہو سکیں۔

19.2 مغل حکومت میں فنون لطیفہ

فنون لطیفہ کے مختلف نمونوں کے اظہار اور ان کی ترقی کے اعتبار سے مغل عہد ہندوستانی تاریخ کا اہم دور رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ شمار کی جاسکتی ہے کہ اس عہد کے حکمرانوں نے فن لطیفہ کے فروغ میں دل چسپی لی، جسے ان کی مذہبی اور فطری ضرورتوں کا تقاضہ بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ فنون لطیفہ اور فن تعمیر میں ان کے شغف کو دیکھتے ہوئے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس میں ان کے رہائشی علاقوں، ماحول اور تعلیم و تربیت نے بھی معاونت کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مغل عہد میں فن لطیفہ کے تمام نمونوں کو فروغ حاصل ہوا، جن میں آرائشی اور صنعتی دونوں قسم کے فنون شامل ہیں۔ مغل عہد میں ترقی پانے والے چند اہم فنی نمونوں کا تذکرہ نیچے درج کیا جارہا ہے۔

19.2.1 فن خطاطی

برصغیر ہند میں عربوں کی آمد کے ساتھ ہی عربی رسم الخط کا استعمال شروع ہوا۔ شمالی ہندوستان بالخصوص دہلی میں ترک حکومت کے قیام کے ساتھ عربی و فارسی رسم الخط کے مختلف نمونوں کو فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغل حکومت کے قیام سے پہلے برصغیر میں بڑے پیمانے پر عربی و فارسی کے مختلف رسم الخط رواج پا چکے تھے۔ ہندوستان کے مغل حکمراں درحقیقت فن خطاطی میں ہرات کے ثقافتی ورثے کے قدرداں اور محافظ تھے۔ بیشتر مغل حکمراں خطاطی کے ماہر اور خوش نویس تھے، شاہ جہاں، داراشکوہ، اورنگ

زیب یہاں تک کہ آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر ماہر خطاط تھے۔ بادشاہوں کے ساتھ ساتھ مغل امرا بھی خطاطی کے بڑے قدرداں تھے۔ وہ اس فن کے ماہرین کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، انہیں انعام واکرام سے نوازتے، ان سے خوش خط کتابیں تحریر کرواتے اور خطاطی کی ترقی میں کوشاں رہتے۔ مغل عہد میں خط نستعلیق کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا، ساتھ ہی خط نسخ اور خط ثلث کے نمونے بھی اس عہد میں نظر آتے ہیں۔ مغل حکومت کا بانی بابر خطاطی کا نہ صرف بڑا قدرداں تھا بلکہ اس فن میں مہارت بھی رکھتا تھا۔ اس نے خود ایک خط ایجاد کیا، جو تاریخ میں 'خط بابری' کے نام سے مشہور ہوا۔ بابر کے ساتھ چند علما اور خطاط بھی ہندوستان آئے، جو دبستان ہرات کے اساتذہ تھے۔ مغل عہد کے ابتدائی خطاط میں مولانا شہاب معمائی ہروی، زین الدین خوافی اور علی الکاتب شامل ہیں، جنہوں نے عہد بابری اور ہمایوں میں اس فن کو ترقی دی۔

اکبر نے خطاطی کی بڑے پیمانے پر حوصلہ افزائی کی؛ خطاطی کے ماہرین کو جاگیریں، منصب اور خطابات عطا کیے اور دفتر انشا میں عہدے دیے۔ اکبر پہلا حکمراں ہے، جس نے فتح پور سیکری میں فنون لطیفہ بالخصوص خطاطی اور مصوری کے فروغ کے لیے ایک شعبہ قائم کیا۔ اکبر کے قائم کردہ شعبے سے لاتعداد ماہرین اور فن کار وابستہ تھے۔ ان میں خطاطی کے وہ ماہرین بھی شامل تھے، جو ہمایوں کے ساتھ ایران سے تشریف لائے تھے۔ ان ماہرین میں عبدالصمد شیریں رقم، میر سید علی تبریزی مصور اور بایزید بن میر نظام دوری کا نام شامل ہے۔ ان کے علاوہ اس عہد کے دوسرے ماہرین خطاطی میں میر محمود معصوم بھکری، نوراللہ قاسم ارسلان، مولانا محمد باقر، محمد امین مشہدی، مولوی عبدالحیٔ، میر حسین کلنگی، محمد حسین کشمیری زریں رقم، عبداللہ مشکیں رقم، عبدالرحیم عنبریں رقم، عنایت اللہ شیرازی، عبدالرحیم خان خاناں اور منعم خاں خان خاناں کے نام شمار کیے جاتے ہیں۔ عہد اکبری کے سب سے باکمال خطاط عبدالصمد شیریں رقم ہیں۔ خط نستعلیق میں لاثانی تھے، ساتھ ہی خط خفی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ خشخاش کے دانے پر سورہ اخلاص لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا، اس موقع پر بادشاہ نے شیریں قلم کا خطاب دیا۔ اسی عہد میں 'داستان امیر حمزہ' کی کتابت کا کام عبدالصمد شیریں رقم کے ذریعہ خط نستعلیق میں انجام دیا گیا۔ دور اکبری کے دوسرے ممتاز خطاط محمد حسین کشمیری زریں رقم تھے۔ اکبر نے ان کو شہزادوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیا تھا۔ ابوالفضل نے ان کو جادو رقم کے نام سے یاد کیا ہے۔ محمد حسین کشمیری نے اکبر کے حکم سے شیخ سعدی کی گلستاں کا ایک خوب صورت نسخہ خط نستعلیق میں اور آئین اکبری کا ایک مکمل نسخہ نہایت ہی عمدہ خط میں تیار کیا تھا۔ اکبر کے عہد میں تیار ہونے والی عمارتوں بالخصوص فتح پور سیکری کے زیادہ تر کتبے میر معصوم بھکری، محمد حسین کشمیری، قاسم ارسلان، مولانا محمد باقر، محمد امین مشہدی اور مولوی عبدالحیٔ کی فنی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔

جہاں گیر فنون لطیفہ کا بڑا قدردان اور مختلف فنون کا نقاد تھا۔ مغل حکمرانوں میں اس سے بڑا فنون لطیفہ کا قدردان کوئی نہ تھا۔ عہد اکبری کے شعبہ کتبہ سازی و کتاب سازی اور کتاب داری کو اس دور میں خوب فروغ حاصل ہوا، ساتھ ہی سابقہ ادوار کے تمام فن کاروں بالخصوص خطاطی کے ماہرین کو ان کے مقام و مرتبے پر نہ صرف برقرار رکھا گیا، بلکہ ان کی سرپرستی بھی کی گئی۔ اس عہد کے زیادہ تر خطاط وہی رہے، جو اکبر کے دور سے متعلق تھے۔ ان کے علاوہ خواجہ شریف، جو معتمد خاں کے نام سے مشہور ہیں، اس عہد کے اہم اور جہاں گیر کے

محبوب خطاط میں شمار ہوتے تھے۔ جہاں گیر کے عہد میں خطاطی کی ترقی کا ایک اہم نمونہ سکہ سازی کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ مغل تاریخ میں پہلی مرتبہ اسی عہد میں سکوں پر اشعار لکھے گئے اور تحریر کے لیے خط نستعلیق کا استعمال ہوا۔ مختلف فنون کے ماہرین بالخصوص خطاطی کے ماہرین کا جو رشتہ اکبر اور جہاں گیر کے زمانے سے چلا آرہا تھا، شاہ جہاں نے نہ صرف اس کو برقرار رکھا، بلکہ اسے مزید تقویت بخشی۔

اس عہد کے سب سے مشہور خطاط عبدالرشید دیلمی ہیں، جو ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ انہیں خط نستعلیق میں امامت کا درجہ حاصل تھا۔ اس خط میں ان کی مہارت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ خط نستعلیق کا آغاز خواجہ میر علی تبریزی سے اور خاتمہ عبدالرشید دیلمی پر ہوا۔ خط نستعلیق میں وہ ایک خاص طرز کے بانی ہیں، جسے شیوئے رشید یا طرز رشید کہا جاتا ہے۔ اس عہد کے ایک دوسرے نامور خطاط حکیم رکن الدین مسعود، جو حکیم رکنا کاشی کے نام سے مشہور ہیں، ایران سے تشریف لائے۔ انہوں نے شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں کو اپنی فن کارانہ صلاحیتوں سے آراستہ کیا۔ ان دونوں کتابوں کے مصور اوراق شاہ جہاں کے عہد کے ثقافتی ماحول کو پیش کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ اس فن کے اہم ماہرین میں میر محمد صالح، میر محمد مومن، محمد مراد کشمیری شیریں قلم، مولانا منیر لاہوری، امانت خاں شیرازی کتاب نویس اور استاد نوراللہ دہلوی کے نام شامل ہیں۔ اس عہد کی عمارتوں میں استعمال ہونے والے خطاطی کے نمونوں میں امانت خاں شیرازی کے ذریعہ تاج محل پر خط ثلث میں کندہ کی گئیں قرآنی آیتیں اور طغرے لاثانی تصور کی جاتی ہیں۔ اورنگ زیب خط نسخ اور خط نستعلیق کا ماہر تھا، اس نے خطاطی کی تعلیم عبدالرشید دیلمی اور سید علی خاں جواہر رقم سے حاصل کی تھی۔ خطاطی کو اس عہد میں بھی فروغ ملتا رہا۔ اس عہد کے اہم ماہرین میں سید علی جواہر رقم، ہدایت اللہ زریں رقم، عبدالباقی حداد یاقوت رقم اور محمد عارف یاقوت رقم کا نام شمار کیا جاتا ہے۔ خطاطی مغل عہد زوال میں بھی ترقی پذیر رہی۔ اس عہد میں خط نستعلیق کے ساتھ ساتھ خط نسخ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ خط نسخ کے ممتاز ماہرین میں میر بندہ علی مرتعش رقم، منشی ہادی علی، منشی حامد علی اور منشی محمد ممتاز علی نزہت رقم شامل ہیں۔ مغل حکومت کے آخری دور کے نامور خطاط میں عمادالملک غازی الدین خاں فیروز جنگ، سید محمد امیر رضوی عرف میر پنجہ کش، آغا مرزا، بدرالدین مہر کن، بہادر شاہ ظفر اور غلام محمد ہفت قلمی کے نام شمار کیے جاتے ہیں۔

19.2.2 فن موسیقی

مغل عہد میں جن فنون کو ترقی ملی، ان میں فن موسیقی ایک اہم نام ہے۔ اس فن کے تعلق سے بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے قیام سے پہلے فن موسیقی کو جس قدر عظمت و شوکت اور مقبولیت حاصل ہوئی، وہ مغل عہد کی حیرت انگیز ترقیات اور سرپرستیوں کے مقابلے میں ماند پڑ گئی۔ روایتی طور پر یہ خیال ہے کہ کلاسیکی موسیقی میں 'کناڑا زبان' کی جگہ شمالی ہندوستان کی زبان اور خاص طور پر گوالیار کی بولی کا استعمال پندرہویں صدی کے اواخر گوالیار کے راجہ مان کے زمانے سے شروع ہوا۔ اب اس عہد میں 'دھرپد' موسیقی کی سب سے مقبول طرز بن گیا۔ اس کے بعد سولہویں صدی کے اوائل سے ایک نیا طرز وجود میں آیا، جس کو 'خیال' کا نام دیا گیا۔

بابر نے موسیقی کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ کابل میں اس کے دربار میں موسیقی کے تین نام ور ماہر موجود تھے، یعنی قل

محمد عودی، حسین عودی اور شیخ نایی۔ یہ تینوں موسیقار مشہور شاعر اور مطرب میر علی شیر نوائی کے تربیت یافتہ تھے۔ دربار بابری کے دوسرے موسیقار غلام شادی، میر ازو اور محمد ابو سعید تھے۔ ہمایوں بھی موسیقی کا حامی اور مربی تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ صوفیوں کا رقص حقیقت میں حکمت الٰہی کی جان ہے۔ ہمایوں کے عہد میں موسیقار اور گویے 'اہل مراد' میں شامل سمجھے جاتے اور ان کے اظہار کمال کے لیے دربار میں سوموار اور منگلوار کے دن مقرر تھے۔ اس عہد کے اہم مغنی اور موسیقار میر عبد اللہ قانونی، حاتم قانونی، استاد شاہ محمد سرنایی اور دوست محمد خوافی ہیں۔

مغل سلطنت میں موسیقی کے فروغ اور ترقی کے اعتبار سے اکبر کا عہد سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے۔ آئین اکبری میں اس دور کی درباری موسیقی کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ابو الفضل کے مطابق اس عہد کے موسیقار سات طائفوں میں منقسم تھے اور ہر گروہ کے لیے ایک دن مقرر تھا۔ اس نے موسیقی کے ان 36 ماہرین کے نام دیے ہیں، جو اکبر کی ملازمت میں تھے، ان میں مغنی اور سازندے دونوں شامل ہیں۔ آئین اکبری میں اکبر کو بھی اس فن کا ماہر بتایا گیا ہے اور یہ لکھا گیا ہے کہ اس نے دو سو لحن یا راگنیاں بنائی تھیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور 'جلال شاہی' اور 'مہ میر کرگت' تھیں۔ عہد اکبری کے موسیقاروں میں سب سے اہم نام تان سین کا ہے۔ اکبر کے دربار میں تان سین کی بڑی پذیرائی ہوئی، جو بہت سے راگوں کا موجد شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے موسیقی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تان سین کے ذریعے مغل عہد میں موسیقی کے ایک اسکول کی بنیاد پڑی۔ اس عہد کے دوسرے اہم موسیقار رام داس اور سور داس ہیں۔ مغل عہد میں ہندوستانی کلاسیکی موسیقی دھرپد کو بہت ترقی ملی۔ اس عہد میں موسیقی کو ہندو مسلم اتحاد کا ایک اہم ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اکبر کے عہد میں فن موسیقی کو نظری و عملی دونوں اعتبار سے فروغ حاصل ہوا۔ فن موسیقی پر اس عہد میں تحریر ہونے والی اہم کتابوں میں عنایت اللہ بن میر حاج الہروی کی 'تحفۃ الادوار'، قاسم بن دوست علی البخاری کی 'رسالہ در علم الموسیقی' اور تان سین کی 'سنگیت سر' کا نام لیا جاسکتا ہے۔

موسیقی کی ترقی میں اکبر کے جانشینوں جہاں گیر اور شاہ جہاں نے اسی کی پیروی کی، ساتھ ہی مغل امرا نے بھی موسیقی کے فروغ میں اہم کردار نبھایا۔ جہاں گیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر قسم کی موسیقی کا عاشق تھا، ساتھ ہی اس کا بھائی دانیال ہندی کے گیتوں کا خاص شائق تھا بلکہ ان گیتوں کے لحن سازوں کے لیے اشعار بھی تصنیف کیا کرتا تھا۔ 1616 میں جہاں گیر نے اپنے دربار کے ایک اہم سازندے شوقی کو آنند خاں کا خطاب عطا کیا۔ دربار میں شوقی کی بہت قدر و منزلت تھی، کیوں کہ وہ ہندی اور فارسی کی راگنیاں بہت ہی دل کش اور مسحور کن انداز میں بجا سکتا تھا۔ عہد جہاں گیری کے ایک اہم موسیقار علی خاں کا کروری تھے، جنھیں شہنشاہ نے نوبت خاں کا خطاب عطا کیا تھا۔ جہاں گیر کے دربار کے ایک دوسرے اہم موسیقار بختر خاں کلاونت تھے۔ اسی طرح میاں لال خاں گوالیاری، جو اکبر کے دربار سے بھی وابستہ رہ چکے تھے، عہد جہاں گیری کے ابتدائی دور کے اہم موسیقاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ تاریخی حوالوں میں اس عہد کے چند دوسرے موسیقاروں میں حمزہ، چتر خاں، پرویز داد، خرم داد اور ماکھو کے نام کا ذکر ملتا ہے۔ تزک جہاں گیری میں اس عہد کے نقار خانے کا بہت ہی تفصیلی اور اہم تذکرہ کیا گیا ہے، جس سے اس عہد میں فن موسیقی کی ترقی اور آلات موسیقی کی اقسام و کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شاہ جہاں کا عہد فن موسیقی کے فروغ اور عملیات کے لیے بہت ساز گار رہا۔ اس عہد تک موسیقی تمام طرح کے درباری اور عوامی جشن اور تیوہاروں کے موقع پر تفریح کا ذریعہ بن چکی تھی۔ شاہ جہاں دھرپد کا بہت شوقین تھا اور وہ خود بھی ایک اچھا مغنی تھا۔ اس عہد کے سب سے اہم موسیقار لال خاں ہیں، جنہیں 'گن سمندر' کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ اس عہد کے دوسرے موسیقاروں میں پنڈت جگن ناتھ، جنہیں 'کوی راج' کا خطاب دیا گیا اور سور سین کو شمار کیا جاتا ہے، جو اس عہد کے ایک اہم آلات موسیقی ساز رہے ہیں۔ اورنگ زیب کے ذریعے موسیقی کا جنازہ نکالنے سے متعلق تاریخی کتابوں میں بہت سی غیر مستند روایتیں موجود ہیں۔ مگر جدید تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے دربار میں مغنیوں پر پابندی عائد کی، نہ کہ موسیقی کے آلات پر۔ اورنگ زیب خود ایک باکمال وینا ساز تھا، ساتھ ہی اس عہد میں کلاسیکی موسیقی پر فارسی زبان میں متعدد کتابیں تحریر کی گئیں۔ اس بنا پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ملک میں فن موسیقی کا فروغ ہوتا رہا۔ مغل عہد کے دور زوال میں بھی فن موسیقی کو ترقی ملی۔ تاریخی حوالوں میں اس عہد کے مغل دربار کے مغنیوں، سازندوں اور رقاصاؤں کے ذکر کے ساتھ ساتھ فن موسیقی پر کتب نویسی کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ مغل عہد میں فن موسیقی کے فروغ میں صوفیا کا رول بھی اہم شمار کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں ان کی خانقاہوں اور درگاہوں پر ہونے والی قوالی کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔

19.2.3 فن مصوری ورقص

مغل فن مصوری کے تعلق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کا ظہور مصوری بالخصوص میناطوری مصوری کے ایرانی اور وسط ایشیائی مرکز کے زیر اثر ہوا، جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستانی مصوری کے اجزا بھی شامل ہوئے۔ مغل عہد کے یہ تصویری نمونے زیادہ تر میناطوری مصوری کی قسم سے تعلق رکھتے ہیں، ساتھ ہی خالص عکسی تصویریں بھی ہیں۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں تیار ہونے والے ان تصویری نمونوں میں عام طور پر شاہی دربار کے مناظر، شکار کے مناظر، میدان جنگ، قدرتی مناظر، شاہی زندگی اور اساطیری کہانیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ تصویری نمونے مغل حکمرانوں کی زندگی، ان کی تاریخی روایات، اس عہد کی تہذیب و ثقافت اور ان کی شوکت وعظمت کے بیان کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔ آج بھی لندن کے وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم میں مغل مصوری کا ایک بڑا اور متاثر کن ذخیرہ موجود ہے۔

مصوری اور میناطوری مصوری عہد سلطنت سے ہی ہندوستان کے مختلف درباروں اور علاقوں میں رائج تھی۔ مغل مصوری بلاشبہ وہ فن ہے، جس کی پرورش و پرداخت مغل حکمرانوں نے کی اور اسے اپنے شخصی مذاق کے مطابق ڈھالا۔ ہمایوں، جب اپنی جلاوطنی کے بعد دوبارہ ہندوستان آیا تو اپنے ساتھ دو بڑے ایرانی فن کاروں میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی کو بھی ساتھ لایا۔ ہمایوں کی ہدایت پر ان ایرانی فن کاروں نے مصوری کے بہت سے نادر نمونے تخلیق کیے، جن میں 'خمسہ نظامی' اور 'داستان امیر حمزہ' شامل ہیں۔ مصوری کے ان نمونوں میں ایرانی مصوری کے روایتی اسلوب کے برعکس ایک قسم کی جدت نظر آتی ہے۔ اس طرح فن مصوری میں ایک نئے طرز کی بنا پڑی، جسے تاریخ میں مغل مصوری کا نام دیا گیا۔ یہ مصوری جلد ہی حکمرانوں کے درمیان مقبول ہوتی چلی گئی۔ کیوں کہ اس کے ذریعہ انہیں اپنے آپ کو شاہانہ انداز میں عمدگی کے ساتھ پیش کرنے کا موقع ملا۔ یہ ان کی کامیابیوں اور بہادری کو بہتر و فن کارانہ انداز میں پیش

کرنے کا ذریعہ بھی تھا۔

مغل مصوری کی ترویج کے سلسلے میں اکبر کا عہد بہت اہم ہے۔ ابوالفضل نے اکبر کے نگار خانے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بہت سے نقاش اور مصور بادشاہ کے نجی تنخواہ دار ملازم تھے، وہ خود ان کے کاموں کا ہفتے میں ایک بار معائنہ کرتا۔ افراد اور قلمی نسخوں کو مصور کرنے کے معاملے میں بادشاہ کی ذاتی پسند کا دخل ہوتا۔ اکبر کے عہد میں جن مخطوطات کو مصور کیا گیا، ان میں وقائع وسوانح، تاریخ، کہانیاں اور افسانے، کتب حکایات اور فارسی و سنسکرت کے رزمیے شامل ہیں۔ مصوری کے حوالے سے اکبر کے زمانے کا سب سے قدیم مخطوطہ کہانیوں کی ایک کتاب 'انوار سہیلی' ہے۔ اس مخطوطے میں جانوروں کی تصویریں آزاد قلم اور طبعی ہیں۔ اس عہد کی مصوری کا دوسرا بڑا نمونہ 'رزم نامہ' ہے، جو مہابھارت کا فارسی ترجمہ ہے اور اس میں تصویروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ عہد اکبری کے ابتدائی منصوبوں میں 'طوطی نامہ' کو شمار کیا جاتا ہے۔ 52 اجزا پر مشتمل یہ ایک سلسلہ وار فارسی کہانی ہے۔ اس کہانی کو فن کارانہ انداز میں 250 مینا طوری مصوری کے نمونوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا بڑا مصوری کا منصوبہ 'داستان امیر حمزہ' کی تکمیل ہے، جس میں 1400 مصوری کے نمونے شامل تھے، مگر اب زیادہ تر ناپید ہو چکے ہیں۔ اکبر کے ذریعہ اس کام پر پچاس مصور متعین کیے گیے تھے اور یہ کام سید میر علی تبریزی اور عبدالصمد شیرازی کی نگرانی میں تقریباً 25 سال کی مدت میں مکمل ہوا۔ مصوری سے متعلق عہد اکبری کے دوسرے اہم نمونوں میں 'گلستاں'، 'داراب نامہ'، 'بہارستان' اور 'اکبر نامہ' کو شمار کیا جاتا ہے۔ اس عہد کے اہم مصوروں میں میر سید علی تبریزی، عبدالصمد شیرازی، دسونت اور بساون کا نام شامل ہے۔

جہاں گیر کے عہد میں مغل مصوری عروج پر پہنچ گئی۔ تزک جہاں گیری میں مصوری سے متعلق جہاں گیر کے اشاروں اور برطانوی سفرا اور یورپی سیاحوں کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فن میں جہاں گیر کو اکبر سے بھی زیادہ شغف تھا۔ جہاں گیر اپنے پسندیدہ مصوروں کو انعامات و خطابات عطا کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیتا۔ اس عہد کا سب سے اہم تصویری نمونہ 'جہاں گیر نامہ' ہے۔ تاہم، مرورِ زمانہ کے ساتھ مصوری عام ہوتی رہی۔ اس عہد میں مصوری کی ایک اہم پیش رفت شبیہ سازی ہے۔ جہاں گیر کے عہد میں بڑے پیمانے پر شبیہ سازی کے نمونے تیار ہوئے۔ ان تصویروں کو ایک جگہ مجلد کر لیا جاتا۔ ان تصویری نمونوں میں الگ الگ افراد یا چند لوگوں کی ایک ساتھ تصاویر ہوتیں۔ ان نمونوں کے محفوظ اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ ان تصویروں کے موضوع اکثر شہزادے اور امرا ہیں۔ کہیں کہیں مذہبی پیشواؤں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں اور کچھ تصویریں پھول پتیوں اور چرند و پرند کی بھی ہیں۔ اسی عہد سے مغل مصوری میں یورپی اثرات بھی رونما ہونے شروع ہوئے۔ مغل مصوری میں طرز اور اسلوب کا تغیر اگرچہ تدریجی شمار کیا جاتا ہے، مگر عہد اکبری اور جہاں گیری کی تصویروں میں نمایاں فرق ہے۔ مستثنیات سے قطع نظر کہا جا سکتا ہے کہ جہاں گیر کے عہد کی مصوری کا رجحان زیادہ تر سکون اور ٹھہراؤ کی طرف ہے۔ اس سے پہلے کی تصاویر میں جو اضطراب پایا جاتا ہے، وہ کسی حد تک اس عہد کی تصاویر میں مفقود ہے۔ عہد جہاں گیری کی تصاویر میں فنی کاریگری کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہیں۔ اس عہد کی تصویروں کے رنگ پہلے سے بہتر اور ان کے امتزاج میں زیادہ لطافت اور نفاست نظر آتی ہے؛ حسن ترتیب میں نمایاں ترقی ہے اور شبیہ سازی میں زیادہ احتیاط اور توجہ سے کام لیا گیا ہے، اس لیے وہ زیادہ پرکشش اور جاذب

نظر دکھائی دیتی ہیں۔ عہد جہاں گیری کے ممتاز مصوروں میں ہرات سے آنے والے آقا رضا ایرانی، ان کے بیٹے ابوالحسن، جنھیں 'نادر الزماں' کا لقب دیا گیا؛ منصور، جو چرند و پرند کے مشہور مصور تھے؛ گوردھن، بساون کے بیٹے منوہر، جو مجمع کی مصوری کے استاد تھے،؛ عنایت اور بچتر قابل ذکر ہیں۔

مصوری کو شاہ جہاں کے عہد میں بھی فروغ ملا، اسی وجہ سے جہاں گیر اور شاہ جہاں کے عہد کی مصوری میں تمیز کرنا آسان نہیں ہے۔ اس عہد میں بڑے پیمانے پر قدرتی مناظر اور باغات کی تصویر سازی کی گئی، جن میں جمالیاتی عنصر غالب ہے۔ فن مصوری کے اعتبار سے اس عہد کا سب سے اہم کارنامہ 'پادشاہ نامہ' ہے۔ اس عہد کی سادہ خطوط سے بنی ہوئی بعض نازک تصویریں لاثانی ہیں، جن میں چند رنگین بھی ہیں۔ اس عہد میں فن مصوری کے بعض نئے موضوعات بھی سامنے آئے، مثلاً گھریلو خدمت کاروں کے گروہ، گانے بجانے والوں کے گروہ یا رات کے وقت شکار کے مناظر کی تصویر سازی۔ شاہ جہاں کے بعد کے ادوار میں مصوری اگرچہ شاہی سرپرستی سے محروم رہی، تاہم مصوری پہلے سے عوامی حمایت حاصل کر چکی تھی اور اس نے بہت سے سرپرست بھی بنا لیے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ شاہی سرپرستی نہ ملنے کے باوجود بھی اورنگ زیب کے عہد میں مصوری کے بہت سے نادر نمونے منظر عام پر آئے، جنھیں اس عہد کے مصوروں نے انفرادی طور پر چند امراء کی سرپرستی میں تیار کیا تھا۔ مغل عہد زوال میں محمد شاہ کے عہد میں مصوری کو کچھ وقت کے لیے احیا ملا۔ اس عہد کے دو اہم مصوروں ندھامل اور کلیان داس، جو چترامن کے نام سے مشہور ہیں، کا تذکرہ تاریخی کتب میں ملتا ہے، جنھوں نے محمد شاہ کی سرپرستی میں مغل مصوری کو فروغ دیا۔ ان کے تصویری کارناموں میں بادشاہ کے درباری مناظر، شکار کے مناظر اور شاہی تقریبات شامل ہیں۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد مغل مصوری کے اثرات کے نتیجے میں ہندوستانی علاقوں میں بڑے پیمانے پر علاقائی مصوری کا ظہور ہوا اور مغل مصوری ان علاقائی درباروں میں پھلتی پھولتی رہی۔ ان علاقائی مصوری کے اسکولوں میں راجپوتانہ مصوری اور پہاڑی مصوری کا نام شمار کیا جاسکتا ہے۔

مغل مصوری کے نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح دربار میں آہستہ آہستہ وسط ایشیا کے سازوں اور رقاصی کی جگہ ہندوستانی سازوں اور رقص کے طریقوں نے لے لی۔ 'بابر نامہ' کی ایک تصویر میں بابر کو ہمایوں کی پیدائش کے موقعے پر جشن مناتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر میں چار مرد اور تین عورتیں مختلف قسم کے ساز بجاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ ایک مرد ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ایک عورت کے ساتھ، جو سر سے پیر تک ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہے، سازوں کی تال پر رقص کر رہے ہیں۔ رقص کے اس وسط ایشیائی منظر کا تقابل 'پادشاہ نامہ' کی ایک تصویر سے کیا جاسکتا ہے، جس میں شاہ جہاں کی بیالیسویں سال گرہ کی تقریب دکھائی گئی ہے۔ 'پادشاہ نامہ' کی تصویر میں پندرہ سے زیادہ مرد بیٹھے یا کھڑے ہوئے ساز بجا رہے ہیں اور تین مرد اور ایک لڑکا کچھ گا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے دس عورتیں ہیں، جن میں ایک کے سوا سبھی ہندوستانی لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ ان کے اوپری کپڑے اتنے شفاف اور باریک ہیں کہ ان کے نیچے وہ عورتیں، جو کسے ہوئے کپڑے پہنی ہوئی ہیں، صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان عورتوں میں سے ہر ایک رقص کی حالت میں ہے، لیکن رقص کرنے والوں میں کوئی مرد شامل نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دربار میں رقص کا فن عورتوں تک محدود تھا، جو 'لولیان' یا 'کنچنیاں' وغیرہ جیسے ناموں سے پکاری جاتی تھیں اور دربار تک پہنچنے سے پہلے انہیں بڑے پیمانے پر تربیت دی جاتی تھی۔ جہاں گیر کے ایک امیر اسلام خاں فتح پوری کی

ملازمت میں ایسی عورتوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی تنخواہوں پر ہر مہینہ اسلام خاں 80,000/- روپیہ خرچ کرتا تھا۔

19.3 فن تعمیر

مغل فن تعمیر تقریباً تین صدیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے، جو سولہویں صدی میں ہمایوں کے مقبرے کی تعمیر سے شروع ہوکر انیسویں صدی کے نصف اول تک جاری رہتا ہے۔ مغل حکمرانوں نے برصغیر ہند میں بہت سے تعمیراتی نمونے چھوڑے۔ ان تعمیراتی نمونوں میں مساجد و مدارس، محل و قصور، مقبرے، مقبرے، شہروں کی بنا و آبادکاری، باغات و سرائے، شکار گاہ، سڑکوں و شاہراہوں کی تشکیل و درستی، نہروں، بندوں اور پلوں وغیرہ کی تعمیر شامل ہے۔ مغل دور کی عمارتوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغل فن تعمیر کے بنیادی اجزا اور اس کا اصل خمیر وسط ایشیا اور ایران سے اخذ کیا گیا تھا، جسے ہندوستان میں اس حکومت کے بانی بابر نے برتا۔

بابر کے یہاں باغات کے مقابلے محلوں کی اہمیت کم تھی۔ بابر نے مستقل طور پر کسی تعمیر شدہ محل میں رہائش کے بجائے باغات کے درمیان بنے ہوئے مکانات میں قیام کو ترجیح دی۔ اپنے مختصر عہد میں اس نے یا تو پہلے سے موجود باغات کی تجدید کی یا نئے تعمیر کیے۔ ہندوستانی سرزمین پر بابر کے ذریعے تعمیر ہونے والا پہلا باغ، 'چہار باغ' ہے، جو پنجاب کے علاقے میں واقع تھا۔ بابر نے آگرہ میں 'ہشت بہشت' نام سے ایک باغ تیار کرایا۔ یہ اس کی مرکزی رہائش گاہ اور عمومی دربار کے لیے استعمال ہوتا۔ اس باغ میں ایک حمام، باؤلی، دیوان عام اور بادشاہ کی ذاتی رہائش گاہ تھی۔ ایک باغ شہر کے پرانے قلعے میں تعمیر کیا گیا۔ تاریخی کتب میں بابر کے دو باغوں کا تذکرہ عام طور پر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک آگرہ میں واقع ہے، جو اب 'رام باغ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اصل نام 'گل افشاں باغ' تھا، مگر کچھ لوگ اسے 'آرام باغ' بھی کہتے ہیں۔ دوسرا باغ 'باغ نیلوفر' دھول پور موجودہ راجستھان کے بھرت پور ضلع میں واقع ہے۔ بابر کے دور میں بہت سی عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن اس عہد کی موجود عمارتوں میں صرف چند مسجدوں کا نام لیا جاسکتا ہے، ایک پانی پت میں واقع ہے اور دوسری سنبھل میں۔ عہد بابری میں ہی ایک مسجد ایودھیا میں بھی تعمیر کی گئی، جس کا تعمیری کام اس کے ایک امیر میر باقی کے ذریعے انجام دیا گیا۔ بابر کے عہد میں ہندوستانی ماہرین کے علاوہ وسط ایشیائی عمارت سازوں نے بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے، جن میں میر میرک غیاث اور استاد شاہ محمد کا نام قابل ذکر ہے۔

ہمایوں کو اپنے عہد کے سیاسی حالات کے پیش نظر بہت زیادہ عمارتیں تعمیر کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن اس کے باوجود بھی اس نے دہلی، آگرہ اور چند دوسرے شہروں میں تعمیراتی کام انجام دیے۔ مورخین آگرہ اور فتح آباد حصار میں اس کے ذریعے بنوائی گئی کچھ مسجدوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ دہلی میں 'دین پناہ' قلعہ بند شہر اور چند شاہی محلوں کی تعمیر اسی عہد کی بیان کی جاتی ہے، جسے اب قلعہ کہنہ یا پرانا قلعہ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمایوں کے دور حکومت میں گوالیار، آگرہ اور دہلی میں مزید روایتی محل تعمیر کیے گئے، مگر اب یہ محل حوادث زمانہ کے پیش نظر ناپید ہو چکے ہیں۔ مغل عہد کے ابتدائی ادوار یعنی بابر اور ہمایوں کے دور میں اس عہد کے امرا اور روسا کے ذریعہ بھی چند تعمیراتی کام

انجام دیے گئے، جن میں نظام الدین اولیا کے مقبرے کے احاطے میں واقع امیر خسرو کے مقبرے کی بحالی شامل ہے۔اس قسم کی دوسری عمارتوں میں پالم ہوائی اڈے کے پاس واقع غضنفر مسجد، مالویہ نگر میں شیخ فرید الدین گنج شکر کی یاد میں بنائی گئی خانقاہ قابل ذکر ہیں۔

حقیقی طور پر مغل فن تعمیر کی ابتدا عہد اکبری سے ہوتی ہے۔اکبر کے عہد میں سلطنت کے مختلف شہروں میں قلعوں، شاہی محلوں، مسجدوں، مقبروں، مدرسوں اور دوسری عمارتوں کا ایک انبوہ نظر آتا ہے۔اکبر کے عہد کی ابتدائی عمارتیں دہلی میں تعمیر ہوئیں۔دہلی کی عمارتوں میں مسجد و مدرسہ خیر المنازل، مقبرہ نظام الدین اولیا کی دوبارہ تعمیر، اتگہ خان کا مقبرہ، سبز برج، ادہم خان کا مقبرہ اور مسجد شیخ عبد النبی شامل ہیں۔اکبر کے دور کے تعمیراتی نمونوں میں پہلا اہم نمونہ ہمایوں کا مقبرہ ہے، جسے ہمایوں کی وفات کے بعد اس کی بیوہ حمیدہ بانو بیگم نے تعمیر کرایا۔یہ خوب صورت مقبرہ ایرانی ماہرین میرک مرزا غیاث اور میرک سید غیاث کی زیر نگرانی ہندوستانی کاری گروں کے ذریعے تعمیر کیا گیا۔مقبرے کی اصل عمارت چاروں طرف سے 45 میٹر لمبائی پر مشتمل اپنے خاکے کے اعتبار سے مربع نما ہے، جس کے اوپر سفید سنگ مرمر کا پیازی گنبد اور چاروں طرف چھتریاں اور کوشکیں ہیں۔مقبرے کی عمارت ایک بڑے اور اونچے چبوترے پر کھڑی ہے، جس کے تمام اطراف کی لمبائی 99 میٹر ہے۔مقبرہ سرخ ریتیلے پتھروں اور سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے، جو باہر سے سادہ اور اندر سے مزین ہے۔زمینی سطح پر ایک مرکزی ہشت پہلو ایوان ہے، جس میں قبر اور کتبہ ہے۔یہ مرکزی ایوان مزید آٹھ ذیلی ایوانوں سے گھرا ہوا ہے۔راہ داری کے ذریعے ان ذیلی ایوانوں کو مرکزی ایوان سے جوڑا گیا ہے۔مقبرہ کی بالائی سطح بھی زمینی سطح کے مشابہ ہے۔مرکزی عمارت کے چاروں طرف دیواروں سے گھرا ہوا ایک چوگوشہ باغ ہے۔اسے سیر اب کرنے کے لیے نالیاں ہیں، جو ایک دوسرے میں سے گزرتی ہوئی مختلف سمتوں میں نکل جاتی ہیں۔

اکبر کی عمارتوں کا دوسرا اہم مرکز آگرہ ہے۔اکبر نے آگرہ کے قلعے کو دوبارہ تعمیر کروایا، جس میں زیادہ تر لال رنگ کا ریتیلا پتھر استعمال کیا گیا۔اکبر کے عہد میں آگرہ کے قلعے میں تقریباً500 عمارتیں تعمیر کی گئیں، مگر ان میں سے آج صرف چند ہی محفوظ ہیں۔قلعے کی موجود عمارتوں میں اکبری محل، جہاں گیری محل، حوض جہاں گیری، شاہ جہانی محل، موتی مسجد، دیوان خاص، دیوان عام، مثمن برج، خاص محل اور شیش محل اہم ہیں۔عہد اکبری کی عمارتوں کا تیسرا اہم مرکز فتح پور سیکری ہے۔سیکری کے قلعے میں اکبر کے ذریعہ بڑے پیمانے پر عمارتیں تعمیر ہوئیں۔اہم عمارتوں میں جامع مسجد، بلند دروازہ، شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ، عیسیٰ خاں کا مقبرہ، دیوان عام، دیوان خاص، شاہی محل، پنچ محل، سرائے اور حمام ہیں۔فتح پور سیکری کی مسجد کا جنوبی داخلی دروازہ، جو بلند دروازہ کے نام سے مشہور ہے، 54 میٹر اونچا ہے اور کافی فاصلے سے دکھائی دیتا ہے۔یہ دروازہ سرخ ریتیلے پتھروں سے بنا ہے، جسے سفید اور سیاہ سنگ مرمر سے مزین کیا گیا ہے۔اکبر کے عہد میں صوبوں میں بھی قلعے، مسجدیں، محل اور دوسری عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ان میں اجمیر کا اکبری محل، الہ آباد کا قلعہ، لاہور کا قلعہ اور راجستھان، ہریانہ، اتر پردیش اور بہار و بنگال کے قلعے اور دوسری عمارتیں اہم ہیں۔عہد اکبری کے امرا نے بھی عمارت سازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس طرح مغل فن تعمیر کو دارالسلطنت سے دور دوسرے شہروں میں بھی پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

جہاں گیر نے اپنے دور میں بہت سے باغ، قلعے، مسجدیں، مقبرے، محل اور عمارتیں تعمیر کرنے کا حکم دیا۔اس عہد میں شہروں کی

آباد کاری، سرائے اور باغات کی تعمیر اور خانقاہوں کے لیے اوقاف متعین کرنے کے لیے امرا کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ سکندرہ میں واقع اکبر کا مقبرہ، جہاں گیر کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ چار باغ کے اندر واقع اکبر کا بڑا اور کثیر منزلہ مقبرہ جہاں گیر کا سب سے اہم تعمیراتی منصوبہ ہے۔ اس کی تکمیل 1612 سے 1614 کے درمیان ہوئی۔ مقبرہ دیواروں سے گھرے ہوئے ایک باغ میں واقع ہے، جسے آبی نالیوں کے ذریعہ چار بڑے حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ اکبر کا مقبرہ پانچ منزلہ ہے۔ مقبرے کی پہلی منزل اوپر کی چار منزلوں کے لیے ایک وسیع مربع چبوترہ کا کام کرتی ہے، جس کے اندر ایک مربع مرکزی ایوان میں قبر واقع ہے، پوری عمارت میں گنبد اور محراب دار ایوانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ایک لمبی تنگ راہ داری اندرونی گنبد اور قبر والے ایوان کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ مربع ایوان 18 میٹر اونچا ہے، جو مقبرے کی تیسری منزل تک پہنچتا ہے۔ مقبرے کی ابتدائی تین منزلیں اپنی سابقہ منزل سے چھوٹی ہیں۔ تمام منزلوں کی بیرونی دیواروں پر سرخ ریتیلے پتھروں کی نازک چھتریاں بنائی گئی ہیں۔ مقبرہ کی بالائی منزل بلا گنبد اور غیر مسقف سفید سنگ مرمر کا مربع دیواری نمونہ ہے۔ اس کے مرکز میں سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی منقش قبر کی تعویذ اور شمالی جانب باریک نقش و نگار سے مزین، ایک چراغ دان موجود ہے۔ مقبرے کے احاطے میں داخل ہونے کے لیے ایک بڑا دروازہ ہے، جو ایک بڑے جوف دار مرکزی محراب اور دہرے محراب دار بغلی محرابوں پر مشتمل ہے۔ دروازے کے اوپری چاروں کونوں پر سنگ مرمر سے بنے ہوئے چار مینار کھڑے ہیں۔ اس دروازے کی تزئین کاری اور اس پر خطاطی کا کام عبدالحق شیرازی نے کیا تھا، جو امانت خان کے نام سے مشہور ہوئے۔ جہاں گیر کے عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں میں آگرہ میں واقع اعتمادالدولہ کا مقبرہ بھی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ شمار کیا جاتا ہے، جس کی تعمیر سفید سنگ مرمر سے ہوئی ہے۔

شاہ جہاں کا دور مغل فن تعمیر کا عہد زریں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے بطور شہزادہ مختلف قسم کی عمارتوں اور باغات کی تعمیر میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی۔ حکمراں بننے سے پہلے کابل کے قلعے میں کئی رہائشی مکانات تعمیر کرائے، ساتھ ہی آگرہ کے قلعے میں کئی عمارتوں کی درستگی و تعمیر نو کی۔ اس نے احمد آباد میں شاہی باغ کی تعمیر کی اور اودے پور کی ایک پہاڑی پر کئی عمارتیں بنوائیں۔ دکن میں برہان پور کے قریب ایک مصنوعی جھیل پر ایک عمدہ شکار گاہ بنوایا۔ آگرہ کے قلعے کی عمارتوں میں کئی قابل ذکر اضافے کیے، جن میں موتی مسجد اور مثمن برج کافی اہم شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ مسجد زیادہ تر سنگ مرمر کی ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں دنیا کی خوب صورت ترین مسجد ہے۔ شاہ جہاں نے دہلی میں جمنا کے کنارے ایک شہر آباد کیا، جو شاہ جہان آباد کے نام سے مشہور ہے۔ لال قلعہ اسی نئے شہر کا ایک اہم حصہ تھا، جس کے اندر خوب صورت محل اور عمدہ عمارتیں ہیں۔ ان میں دیوان عام، دیوان خاص، شاہی محل، سبز برج، نقار خانہ، نہر بہشت، امتیاز محل، مسقف بازار اور دونوں داخلی دروازے قابل ذکر ہیں۔ شاہ جہاں نے اپنے عہد میں دہلی، آگرہ اور لاہور کے علاوہ سلطنت کے دوسرے شہروں میں بھی خوب صورت عمارتوں کا بڑے پیمانے پر اضافہ کیا۔ اس عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کے میر عمارت مشہور ماہر تعمیر استاد احمد تھے، خاص طور پر تاج محل، دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد انہی کے زیر نگرانی تعمیر ہوئے۔ دہلی کی جامع مسجد شاہ جہاں کا اہم تعمیری نمونہ ہے۔ وہ اسے مسجد 'جہاں نما' کہتا تھا۔ مسجد ایک پہاڑی پر واقع ہے، جسے بنیادی طور پر سرخ ریتیلے پتھروں اور سنگ مرمر سے تیار کیا گیا ہے، جابجا سنگ موسی کی آویزش ہے۔ مرکزی ایوان سرخ ریتیلے پتھروں اور سفید سنگ مرمر کے تراشوں سے بنا ہے۔ مرکزی ایوان میں 11

داخلی دروازے ہیں، مرکزی داخلی دروازہ محرابی شکل کا بہت ہی بلند و بالا ہے، جس کے دونوں جانب پانچ پانچ چھوٹے محرابی دروازے ہیں۔ ان تمام چھوٹے داخلی دروازوں کے اوپر سنگ مرمر کے فارسی کتبے ہیں، جن پر خطاطی کا کام نوراللہ احمد نے کیا تھا۔ ان داخلی دروازوں کے دونوں کونوں یعنی ایوان کے جنوبی و شمالی سروں پر 40 میٹر اونچے دو بلند و بالا مینار کھڑے ہیں۔ ان دونوں میناروں کے اندر اوپر جانے کے لیے زینے ہیں۔ سنگ مرمر سے بنے ہوئے تین پیازی گنبد مسجد کا تاج ہیں۔ مرکزی نماز گاہ کا فرش سنگ مرمر کا ہے، جس میں سنگ موسی کی پچی کاری سے مصلے بنے ہیں۔ صحن کے مرکزی حصے میں سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا 17 میٹر لمبا اور 15 میٹر چوڑا حوض ہے۔ مسجد میں داخلے کے لیے سرخ ریتیلے پتھروں سے بنے ہوئے تین عالی شان محرابی دروازے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں تین منزلہ مشرقی دروازہ شاہی اورامرا کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ بقیہ دو منزلہ دو دروازے مسجد کے جنوبی اور شمالی جانب واقع ہیں، جو عوام الناس کے استعمال میں تھے۔

آگرہ میں واقع تاج محل مغل یادگاروں میں سب سے اہم ہے۔ یہ مقبرہ شاہ جہاں کی ملکہ ممتاز محل کے لیے بنایا گیا تھا، مگر شاہ جہاں کی وفات کے بعد اسے بھی یہیں دفن کیا گیا۔ مقبرہ کی تعمیر 1632 اور 1643 کے درمیان ہوئی۔ تاج محل کی تعمیر میں حصہ لینے والے معماروں اور فن کاروں میں مکرمت خان، معمار عبدالکریم ، استاد احمد لاہوری اور خطاط عبدالحق شیرازی کے نام شامل ہیں۔ مقبرہ کے احاطے کی شمالی دیوار میں واقع سرخ ریتیلے پتھروں کا بنا ہوا 30 میٹر اونچا ایک شان دار دروازہ مقبرہ کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ دروازہ ایک جوف دار مرکزی محراب کے اندر واقع ہے۔ دروازے کے مرکزی پیش طاق پر سفید سنگ مرمر میں سنگ موسی سے مکمل سورۃ الفجر کی کندہ کاری کی گئی ہے۔ سفید سنگ مرمر سے تعمیر شدہ یہ مقبرہ ایک چہار باغ کے شمالی سرے پر دریا کے کنارے واقع ہے، جس کے دونوں جانب سرخ ریتیلے پتھروں سے بنی ہوئی ایک ہی طرز اور ساخت کی عمارتیں ہیں۔ مغربی عمارت مسجد ہے اور مشرقی عمارت مہمان خانہ۔ مقبرہ ایک اونچے سنگ مرمر کے مربع چبوترے کے درمیان واقع ہے، جو مقبرے کو باغ سے بلند کرتا ہے۔ اس چبوترے کے چاروں کونوں پر چار منزلہ سنگ مرمر کے مینار کھڑے ہیں۔ مقبرہ کے درمیانی بالائی حصے میں ایک پیازی گنبد ہے۔ مقبرہ اپنے منصوبے کے اعتبار سے مربع ہے، مگر چاروں کونوں کو صفائی کے ساتھ تراش کر کے بغدادی مثمن یا سلامی دار بنا دیا گیا ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف باہری حصے میں ایک مرکزی پیش طاق ہے، جس کے دونوں جانب گہری جوف دار محرابی جالیاں ہیں۔ مقبرہ کا منصوبہ غیر معمولی حد تک متوازن ہے، جو ایک نادر تعمیراتی اختراع شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی باہری دیوار مشجر آرائشی اشیا، پھول پتیوں و بیل بوٹوں کے نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ پھولوں کے مکمل پودوں کے ساتھ، پھول پتیوں سے آراستہ ڈالیوں کی کندہ کاری بڑی ہی نفاست کے ساتھ کی گئی ہے۔ کندہ کیے گیے پھولوں میں گلاب، گل لالہ کے علاوہ دوسرے پھول و پودے بھی شامل ہیں۔ زمینی سطح پر مقبرہ میں ایک مرکزی ہشت پہلو ایوان کے ساتھ آٹھ مضافاتی ایوان ہیں۔ مرکزی ایوان کے درمیان میں سنگ مرمر سے ممتاز محل کی قبر کی شان دار تعویذ بنی ہوئی ہے۔ ملکہ کی قبر کے مغرب میں اسی طرح مزین و آراستہ شاہ جہاں کی قبر کی تعویذ ہے۔ ان کے اطراف میں سنگ مرمر کی منقش جالیاں ہیں۔ مقبرہ کے بیرونی حصے کی طرح اندرونی حصے میں بھی مستطیل پٹیوں پر قرآنی آیتوں کی اس قدر خطاطی کی گئی ہے، جتنی اس سے پہلے کسی بھی مغل عمارت میں نظر نہیں آتی۔

اورنگ زیب کے عہد میں بھی عمارت سازی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عہد میں قدیم عمارتوں بالخصوص مسجدوں کی مرمت اور تزئین کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا گیا۔ اس دور میں نہ صرف مغل مساجد بلکہ ان مسجدوں کی بھی مرمت اور تزئین کی گئی، جو لودھی، تغلق، خلجی اور دکنی سلاطین کے عہد میں تعمیر ہوئی تھیں۔ اس عہد کی قابل ذکر عمارتوں میں دہلی کے لال قلعہ میں واقع موتی مسجد، لاہور کی بادشاہی مسجد اور اورنگ آباد میں واقع رابعہ درانی کے مقبرہ کا نام شمار کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں تعمیر ہونے والی زیادہ تر عمارتوں کے معمار استاد احمد کے بیٹے استاد عطاء اللہ تھے۔ مغل عہد زوال کی زیادہ تر عمارتیں دہلی میں تعمیر ہوئیں، ان میں مسجدوں اور مقبروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس عہد کی عمارتوں میں شاہ عالم بہادر شاہ کے ذریعے تعمیر ہونے والی موتی مسجد اہم ہے۔ یہ مسجد مہرولی میں قطب الدین بختیار کاکی کے مقبرہ کے پاس واقع ہے۔ عمارت سازی کے اعتبار سے عہد زوال کے حکمرانوں میں محمد شاہ کا دور بھی اہم شمار کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں شاہ جہان آباد میں کئی قابل ذکر اضافے ہوئے، جن میں روشن الدولہ کی تعمیر کردہ سنہری مسجد، فخر المساجد اور نواب شرف الدولہ مسجد و مدرسہ اہم ہیں۔ احمد شاہ کے دور کی عمارتوں میں قدسیہ باغ اور مسجد، قدسیہ بیگم اور جاوید خاں مسجد، جسے سنہری مسجد بھی کہا جاتا ہے اور شاہ مرداں اہم ہیں۔ مغل عہد زوال کی عمارتوں میں صفدر جنگ کا مدرسہ بھی تعمیری خصوصیت کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ ان کے علاوہ مغل عہد زوال میں مسجدیں اور چند عمارتیں اجمیر اور لاہور میں تعمیر ہوئیں۔ مغل سلطنت کی کمزوری کی وجہ سے علاقائی حکومتوں کا ظہور ہوا اور انہوں نے اپنی تعمیرات میں مغل طرز کو اپنایا۔ ان میں نوابین اودھ کے تحت لکھنؤ اور فیض آباد کی عمارتوں، نوابین بنگال کے تحت مرشد آباد کی عمارتوں اور بنارس و پٹنہ کی چند دوسری عمارتوں کو شمار کیا جاسکتا ہے، جو مغل حکومت کے عہد زوال میں تعمیر کی گئیں۔ اسی طرح علاقائی ہندو راجپوت حکومتوں جیسے بھرت پور، جودھ پور اور جے پور کی تعمیرات میں بھی مغل طرز تعمیر کے اثرات اور اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

19.4 صنعتی فنون

مغل عہد میں فنون کے ان نمونوں نے بھی شاہی سرپرستی حاصل کی اور فروغ پایا، جن کا تعلق صنعت و حرفت سے ہے۔ ایسے فنون کے فروغ میں حکومت نے خصوصی دلچسپی لی، کیوں کہ ان کا تعلق حکومت اور عوام الناس کی نہ صرف معاشی زندگی سے تھا، بلکہ وہ کسی حد تک بنیادی ضرورت بھی شمار ہوتی تھیں۔ ان فنون میں پارچہ بافی، قالین بافی، کوزہ گری، شیشہ سازی، فلزکاری، لکڑی اور چمڑے کے فنون، ہاتھی دانت، سنگ تراشی و گچ کاری اور سکہ سازی وغیرہ کو شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند صنعتی فنون کا تذکرہ درج ذیل ہے:

فن پارچہ بافی: مغل عہد پارچہ بافی کا اہم دور رہا ہے۔ اس کا سبب زراعتی ترقی کی وجہ سے خام مادوں کی وافر مقدار میں فراہمی اور صنعتی تیاری کے لیے بڑے پیمانے پر کاریگروں، فن کاروں اور مزدوروں کی موجودگی ہے۔ مغل پارچہ بافی کے نمونے اعلیٰ معیار، نفاست اور خوب صورتی کے لیے مشہور تھے۔ اس عہد میں تیار ہونے والے نمونے نہ صرف روایتی اور عام استعمال کے کپڑے ہوتے، بلکہ ان کا تعلق کپڑوں کی ان اقسام سے بھی تھا، جو صاحب حیثیت اور ثروت کی علامت سمجھے جاتے۔ سوتی، ریشمی، اونی غرض کہ تمام اقسام کے کپڑوں کی بنائی ہوتی۔ پارچہ بافی کے لیے مختلف قسم کے تکنیک استعمال ہوتے، جن میں بنائی، زردوزی اور چھپائی اہم ہیں۔ نفیس ترین سوتی کپڑوں کا اہم مرکز ڈھاکہ تھا۔ صرف اس علاقے میں 40 اقسام کے کپڑے تیار ہوتے، جنہیں شبنم، آب رواں، ململ خاص، شنگتائی اور شربتی جیسے شاعرانہ

ناموں سے یاد کیا جاتا۔ سرونج میں ایک ململ تیار ہوتا، جسے آب رواں کہا جاتا۔ برہان پور ایسے سوتی کپڑوں کے لیے مشہور تھا، جس میں ریشم، سونے یا چاندی کے تاروں سے کپڑے کے طول میں دھاریاں بنائی جاتیں۔ بعض کپڑوں میں سوتی، ریشمی، نقرئی اور طلائی ٹکڑے ایک ساتھ بنے جاتے۔ آرائش کے لیے مختلف نقش و نگار بنائے جاتے۔ نفیس ترین اور قیمتی کپڑوں میں دونوں جانب یکساں آرائش ہوتی۔ یہ نقوش مشجر، پھول پتیوں، بیل بوٹوں یا ریاضی کے اشکال ہوتے، جنہیں باریک کتان اور ریشم کے دھاگوں کے امتزاج سے بنا جاتا۔ ریشمی اور دوسرے پارچہ بافی کے مشہور علاقے مرشد آباد، سورت، اورنگ آباد، لاہور، آگرہ اور فتح پور تھے۔ اس عہد میں کپڑوں کی بنائی ایک انتہائی فن کارانہ اور محنت طلب عمل تھا۔ پارچہ بافی میں استعمال ہونے والی اشیا اعلیٰ معیار کی ہوتیں اور بنکر بھی اپنے فن کے ماہر ہوا کرتے۔

فن قالین بافی: اکبر نے متعدد شہروں بالخصوص آگرہ، فتح پور اور لاہور میں قالین بننے والے آباد کیے تھے۔ مغل عہد کی قالینوں پر وسط ایشیائی اور ایرانی اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، مگر انہیں نقالی کا نام نہیں دیا جاسکتا، بلکہ ان کی تزئین و آرائش اور نقش و نگار میں واضح فرق موجود ہے۔ اسی طرح ان فارسی قالینوں کے اثرات سے ماورا چند ایسے نمونے بھی نظر آتے ہیں، جن پر ایک مصورانہ طرز اپناتے ہوئے، زیادہ آزادانہ ترکیب اور فطری انداز میں جانوروں کی تصاویر، شکار کے مناظر، عمارتوں اور ممتاز شخصیتوں کی تصاویر اور بعض اوقات ہندو دیو مالائی کہانیوں کی منظر کشی کی گئی۔ جنوبی ایران اور شمالی ہند کی ترقی پذیر تجارت نے قالین بافی میں ایک صاف ستھری پارچہ بافی کی طرز پیدا کرنے میں مدد دی، جس کی خصوصیت سخت پابندی کے ساتھ نقش و نگار کے ایک ہی نمونے کا اعادہ ہے، جو ایک قسم کی ہندوستانی قالینوں کا خاصہ رہی ہے۔ ہندوستانی قالین بافی کی جزئیات میں ایرانی قالینوں کے برعکس بعض انواع میں تناسب کا فقدان نظر آتا ہے اور بعض میں افراط۔ اسی طرح بنیادی رنگ کے تعین کے لیے بعض قسم کے سرخ رنگوں کے استعمال کے ساتھ ثانوی آرائش پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ مثلاً زمین کو پررونق بنانے کے لیے سفوف کی افشاں یا انگور کی بیلوں کے استعمال کا فقدان نظر آتا ہے اور پھول پتیوں کے چند مخصوص خیالی خاکے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ چند ایسی جزئیات ہیں، جو مغل عہد کی ہندوستانی قالینوں کو ایرانی قالینوں سے ممیز کرتی ہیں۔

فن فلزکاری: مغل عہد میں فلزکاری اور زیورات سازی ایک ترقی یافتہ فن تھا۔ مغل حکمراں اور امرا فلزات اور زیورات سازی کے ماہرین کی سرپرستی کرتے۔ اس عہد میں سونے اور چاندی جیسی قیمتی فلزات کے ساتھ ہیرے، زمرد، یاقوت اور نیلم جیسے قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کے استعمال کے ذریعہ فلزکاری کو ترقی دی گئی۔ فن کار فلزکاری میں مہارت کے ساتھ سونا، چاندی اور دوسری قسم کی فلزات میں پیچیدہ نقش و نگار بنانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے۔ مغل حکمرانوں اور امرا کو مرصع زیورات پہننے کا شوق تھا، جو اکثر موتیوں اور قیمتی جواہرات سے مزین ہوتے۔ مغل ماہرین نے ہتھیاروں کو مزین و مرصع کرنے میں بھی اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ مغل فلزکاری کی اہم مثال تخت طاؤس ہے۔ یہ تخت سونے سے بنا تھا، جس میں ہیرے، زمرد اور یاقوت جیسے قیمتی پتھروں کا جڑاؤ کام کیا گیا تھا۔ مغل فلزکاری کی دوسری مثالوں میں چاندی کے ذریعے تیار ہونے والی شان دار اشیا شامل ہیں، جس کے اہم مراکز دہلی، آگرہ اور جے پور تھے۔ پیتل اور تانبے کے خوب صورت برتن بیدر میں تیار ہوتے۔ مغل صناعوں نے گھریلو اور مذہبی رسوم میں استعمال ہونے والے ظروف کی صنعت جاری رکھی۔ ان میں تانبہ اور دوسری دھاتیں استعمال ہوتیں اور آرائش کے لیے عموماً چاندی کی قلعی کی جاتی۔ سونے چاندی کے زیورات میں

آرائش جواہرات اور میناکاری سے ہوتی۔ مغل فن کار اپنی شان دار میناکاری کے لیے بھی مشہور تھے۔اس میں مختلف اشیا جیسے گل دان، پیالیاں اور طشتریاں وغیرہ پر پیچیدہ نقوش اور آرائشی نمونے بنانے کے لیے ان کی اوپری سطحوں پر رنگین پگھلے ہوئے شیشے کی قلعی کی جاتی۔ مجموعی اعتبار سے مغل دور فلزکاری اور زیورات سازی کا ایک اہم دور رہا ہے، جس کے ہنر مند فن کاروں نے اس فن کے بہترین نمونے تیار کیے۔

فن کوزہ گری اور سفال گری: مغل عہد میں کمہار دیہی زندگی کا لازمی جز تھے۔ان کے ذریعہ تیار ہونے والی اشیا کی عوامی زندگی میں بڑی مانگ تھی۔اس عہد کے کاریگر کوزہ گری میں مہارت رکھتے تھے، خاص طور پر پٹنہ کے کمہار اپنے مٹی کے برتنوں کے لیے مشہور تھے۔ان کے ذریعہ بنائے گئے برتن خوب صورت اور سبک ہوتے، انہیں ہر جگہ نایاب اشیا کے طور پر بھیجا جاتا۔ ان برتنوں میں طشتری، کٹوری، پیالی، صراحی، ٹرے اور قعب وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ان برتنوں کو سفال گری کے ذریعہ منقش و مزین کیا جاتا، آرائش کے لیے بیل بوٹوں، پھول پتیوں اور ریاضی کی اشکال کا استعمال ہوتا۔ برتنوں کے علاوہ اس عہد کے فن کار مختلف قسم کی روغنی ٹائلیں بھی تیار کرتے، جنہیں اس عہد کی عمارت سازی میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ان ٹائلوں کو عام طور پر نیلے، پیلے، ہرے اور سفید رنگوں سے مزین کیا جاتا، تزئین کاری کے لیے ان پر عربی طرز آرائش و زیبائش کا عمومی استعمال ہوتا۔اس عہد میں ہفت رنگی ٹائلیں بھی بڑے پیمانے پر استعمال ہوئیں۔ان روغنی ٹائلوں کا استعمال مسجد خیر المنازل، سبز برج، اتگہ خاں کا مقبرہ، لاہور کی وزیر خاں کی مسجد اور لاہور قلعے کی دیواروں میں کیا گیا ہے۔

ہاتھی دانت اور ہڈیوں کا فن: مغل عہد میں ہاتھی دانت کا فن بہت عام تھا اور اس سے مختلف قسم کی اشیا تیار ہوتیں۔ ہاتھی دانت کا کام ڈبوں، قلم دانوں، کھلونوں اور صندوقچوں پر ہوتا۔اس فن کے مشہور مراکز دہلی، لکھنؤ، مرشد آباد، احمد آباد اور سری نگر تھے۔ ہاتھی دانت سے زیورات بھی بنائے جاتے۔ چھریوں، چاقوں یہاں تک کہ تلواروں کے دستوں پر بھی ہاتھی دانت کا کام ہوتا۔زیوردان اور عطردان ہاتھی دانت سے مزین ہوتے۔ تسبیح، بٹن اور سرمے دانیاں ہاتھی دانت اور ہڈیوں سے بنائی جاتیں اور میز و کرسیاں بھی ہاتھی دانت سے آراستہ ہوتیں۔

شیشے اور بلور کا فن: فن کاری کے اعتبار سے شیشہ اور بلور مغل عہد کی ایک ترقی پذیر صنعت تھی۔اس عہد کے ہندوستان میں بعض شہروں میں بلور کے ظروف بنائے جاتے تھے، جن پر اکثر بیل بوٹوں اور جانوروں کی تصویریں ہوتیں۔بلور سے مختلف قسم کی آرائشی اشیا تیار کی جاتیں، جیسے شمع دان، گل دان وغیرہ۔اس صنعت پر ایرانی اثر نمایاں رہا، لیکن اس کے باوجود بھی عمدگی اور نفاست میں ہندوستانی فن کاروں نے کمال پیدا کیا۔ شیشے سے مختلف قسم کی اشیا بنانے کے ساتھ اس کے ٹکڑوں سے شاہی محل، امرا کے مکانات، مساجد کی دیواروں اور چھت کے اندرونی حصے کو بھی مزین کیا جاتا۔ آگرہ کے قلعے کا شیش محل اور شاہی قلعہ لاہور کا شیش محل اسی فن کے بہترین نمونے ہیں۔ہندوستان کے بعض شہروں میں کانچ کے زیورات بھی بنائے جاتے۔ فیروزآباد کی کانچ کی چوڑیاں آج بھی پورے ملک میں مشہور ہیں۔

فن سکہ سازی: مغل دور کی سکہ سازی بھی فنی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ ہمایوں کے دور کا سکہ مدور ہوتا اور اس پر خط طغرا میں

کندہ کاری کی جاتی۔ سکے کے ایک جانب 'الخاقان الاعظم محمد ہمایوں خلد اللہ ملکہ' اور دوسری طرف 'کلمۂ طیبہ' لکھا ہوتا۔ اکبر کے عہد کے سکے مدور اور مربع تھے اور ان پر خط ثلث، طغرا اور نستعلیق میں کندہ کاری ہوتی۔ ایک جانب 'جلال الدین محمد اکبر شاہ غازی' اور دوسری جانب 'کلمۂ طیبہ بصدق ابو بکر بعدل عمر' لکھا ہوتا۔ اکبر کے عہد میں سونے، چاندی اور تانبے کے مختلف اوزان کے سکے ڈھالے جاتے، جنہیں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا۔ ہر سال جشن نوروز کے موقع پر نیا سکہ جاری کیا جاتا۔ جہاں گیر نے اپنے عہد میں مختلف اوزان کے سکے ڈھلوائے اور وزن میں کمی وزیادتی کی بنیاد پر ان کے نام مقرر کیے۔ نور شاہی، نور سلطانی، نور دوست اور نور کرم سونے کے سکے تھے، جب کہ کوکب طالع، کوکب اقبال، کوکب مراد اور کوکب سعید چاندی کے سکے تھے۔ ان کے ایک طرف کلمہ طیبہ اور دوسری طرف آصف خان کا شعر کندہ ہوتا۔ شاہ جہاں کے عہد کا سب سے بڑا طلائی سکہ دو سو تولے کا تھا، جس کے ایک جانب کلمہ طیبہ، ضرب دارالخلافہ شاہ جہان آباد اور ایک رباعی کندہ ہے اور دوسری جانب 'صاحب قران ثانی شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ' اور ایک دوسری رباعی کندہ ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے طلائی سکے سو تولہ کے ہوتے، جس کے ایک جانب 'عالم گیر بادشاہ غازی اورنگ زیب محمد ابو المظفر محی الدین' اور دوسری جانب سن جلوس اور ضرب دارالخلافہ شاہ جہان آباد کے علاوہ کوئی شعر ہوتا۔ معزالدین جہاں دار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، محمد شاہ، عالم گیر ثانی، شاہ عالم اور بہادر شاہ کے سکے مدور تھے۔ سکے کے ایک جانب خط نستعلیق میں بادشاہ کا لقب اور دوسری طرف سن جلوس اور دار الضرب کا نام کندہ ہوتا۔

فن سنگ تراشی و گچ کاری: مغل دور سنگ تراشی و گچ کاری کا عہد عروج رہا ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ سنگ تراشی اور سنگ مرمر کی پچی کاری کا حسین مرقع ہے۔ سیکری میں واقع شیخ سلیم چستی کا مقبرہ سنگ مرمر سے بنا ہے اور اس پر ہندسی اشکال میں نقاشی کی گئی ہے۔ جیمز فرگوسن کے بقول فتح پور کی یہ عمارت ایک شاعری ہے، جو سنگ مرمر میں کی گئی ہے۔ جالندھر کی نور محل کی سرائے اور لاہور کا انار کلی کا مقبرہ گچ کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ نور جہاں کے ذریعہ تعمیر ہونے والا جہاں گیر کا مقبرہ مغل سنگ تراشی کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس عمارت میں سنگ مرمر کی پچی کاری اور قبر کی تعویذ پر کندہ کیے گئے اسمائے حسنیٰ قابل دید ہیں۔ آگرہ میں واقع اعتماد الدولہ کا مقبرہ بھی مغل سنگ تراشی اور کاری گری کا عمدہ نمونہ ہے، جس میں مختلف قسم کے قیمتی نگینوں کی کندہ کاری کی گئی ہے۔ شاہ جہاں کے دور میں سنگ تراشی اور گچ کاری کا فن اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا۔ لاہور میں واقع مسجد وزیر خاں اس عہد کی ایرانی طرز کی گچ کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اسی طرح شاہ جہاں کے عہد میں آگرہ کے قلعے میں تعمیر ہونے والی عمارتیں سنگ تراشی کا حسین مرقع ہیں، جن میں محل سرا، دیوان خاص کا ایوان اور موتی مسجد اہم ہیں۔ سنگ تراشی، سرخ ریتیلے پتھروں، سنگ مرمر و دوسرے رنگ کے پتھروں کی باہمی آمیزش اور طرز تعمیر کی نفاست و خوب صورتی کے اعتبار سے دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد لاثانی ہیں۔ فن سنگ تراشی، تناسب اجزا، تعمیری حسن اور نفاست و نزاکت کے ساتھ سنگ مرمر میں کندہ قیمتی نگینوں کی مرصع کاری اور آرائش وزیبائش کے اعتبار سے آگرہ میں واقع ممتاز محل کا مقبرہ ایک بے مثال تعمیری نمونہ ہے۔ مغل عہد میں بشمول دہلی و آگرہ ہندوستان کے متعدد شہروں میں بہت سی عمارتیں اینٹوں اور معمولی پتھر کی بنی ہوئی ہیں، جن پر گچ کاری کے ذریعہ اعلیٰ قسم کے نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ عمارتوں کی کثرت اور نقش ونگار کی افراط کے اعتبار سے لکھنو بہت اہم ہے، یہاں کی بیش تر عمارتیں گچ

کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

چند متفرق فنون: مغل تاریخ میں چمڑے کی دباغت اور اشیا کی تیاری، ایسا فن تھا، جس سے عام طور پر معاشرہ کا نچلا طبقہ منسلک تھا۔ گھوڑوں کی زین، پانی کے مشکیزے، جوتے، کمر بند، جیکٹ چمڑے سے تیار ہوتے۔ سرہند کا علاقہ زین، جوتے، ترکش اور ساق بند بنانے کے لیے مشہور تھا۔ سنبھل میں گینڈے کی کھال سے بہترین قسم کے ڈھال بنائے جاتے، کھمبات میں ڈھال کچھوے کے خول سے بنتا تھا۔ کھمبات لکڑی کی فن کاری اور اس سے بنی ہوئی اشیا کے ساتھ عطریات اور خوشبوؤں کے لیے بھی مشہور تھا۔ بڑودہ کی بنی ہوئی لکڑی کی اشیا بصرہ تک برآمد کی جاتیں۔ احمد آباد اور سنبھل کاغذ سازی کے اہم مراکز تھے۔ سیال کوٹ اور سرہند میں کئی قسم کے کاغذ تیار ہوتے تھے۔ فنون لطیفہ اور فن تعمیر میں مغل عہد کے کارناموں اور خدمات کی فہرست بہت لمبی ہے، مذکورہ بالا تحریر اس کا ایک بہت ہی مختصر نمونہ ہے۔

19.5 کلیدی الفاظ

فن خطاطی	:	لکھنے اور کتابت کا فن
صنعتی فنون	:	ایسے فن جن کا تعلق صنعت و حرفت سے ہو، جیسے کپڑا بننے کا فن، قالین بنانے کا فن وغیرہ
کندہ کاری	:	پتھروں پر کھدائی کر کچھ لکھنا یا نقش و نگار بنانا

19.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- فنون لطیفہ کے شعبے میں مغلوں نے بہت ہی اہم اور یادگار نمونے چھوڑے ہیں۔ اس عہد میں تیار ہونے والے نمونے یعنی خطاطی، موسیقی، مصوری، فن تعمیر اور صنعتی فنون اپنی منصوبہ سازی اور فنی تفصیلات کے اعتبار سے دل کش، جامع، ہمہ گیر اور ترقی یافتہ تھیں۔ اسی لیے ان کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے اور یہ فنی نمونے آج بھی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔
- مغل فنون لطیفہ کے بنیادی اجزا وسط ایشیا اور ایران کے ساتھ ساتھ عرب اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اخذ کیے گئے۔ مغل حکمرانوں نے ان تمام اجزا سے ایک ایسا مرکب تیار کیا، جو بعد میں مغل فنون لطیفہ کے نام سے جانا گیا۔ اس فنون لطیفہ میں مختلف علاقائی نمونوں کے ساتھ فکر اسلامی کی وحدت بھی شامل تھی اور اسی فکر نے ان تمام اجزا کو خالص بنا کر ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔
- مغل حکمرانوں نے فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے فروغ میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا۔ ان کی دلچسپی کے نتیجے میں مغل فنون لطیفہ کے مختلف نمونے نہ صرف ایک لمبے عرصے تک ترقی پذیر رہے، بلکہ اپنے دیرپا اثرات بھی مرتب کیے، جن کی مثالیں ہمیں برصغیر کے مختلف علاقوں میں ملتی ہیں۔ خاص طور پر مختلف میوزیم میں محفوظ یہ فنی نمونے اپنے فن کاروں کی صناعی کا آئینہ دار ہیں۔
- فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے فروغ کے سلسلے میں اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے عہد کو خصوصیت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ مغل عہد کے زیادہ تر فنی و تعمیراتی نمونے اور یادگاریں انہی ادوار سے متعلق ہیں۔

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

19.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مغل عہد میں کس خط کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا؟

(a). خط نسخ (b). خط نستعلیق (c). خط ثلث (d). خط کوفی

2. 'خط بابری' کا موجد کون ہے؟

(a). بابر (b). جہاں گیر (c). شہاب معمائی ہروی (d). عبدالصمد شیریں رقم

3. اکبر کے عہد میں موسیقار کتنے طائفوں میں منقسم تھے؟

(a). تین (b). پانچ (c). سات (d). نو

4. 'گن سمندر' کا خطاب کسے عطا کیا گیا تھا؟

(a). دوست محمد خوافی (b). تان سین (c). رام داس (d). لال خاں

5. 'طوطی نامہ' کا تعلق کس فن سے ہے؟

(a). فن مصوری (b). فن موسیقی (c). فن تعمیر (d). فن کوزہ گری

6. فن مصوری کا اہم نمونہ 'رزم نامہ' کس عہد میں تیار ہوا؟

(a). بابر (b). اورنگ زیب (c). اکبر (d). شاہ جہاں

7. ہمایوں کا مقبرہ کس نے تعمیر کرایا؟

(a). جہاں سلطان بیگم (b). سکینہ بانو بیگم (c). حمیدہ بانو بیگم (d). امینہ بانو بیگم

8. اورنگ زیب کے ذریعہ بادشاہی مسجد کہاں تعمیر کی گئی؟

(a). لاہور (b). دہلی (c). آگرہ (d). اورنگ آباد

9. فتح پور سیکری میں واقع شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ کس پتھر کا بنا ہوا ہے؟

(a). سنگ سرخ (b). سنگ مرمر (c). سنگ رخام (d). سنگ موسی

10. آگرہ کے قلعہ میں واقع موتی مسجد کی تعمیر کس بادشاہ کے عہد میں ہوئی؟

(a). شاہ جہاں (b). اکبر (c). جہاں گیر (d). اورنگ زیب

19.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. برصغیر ہند میں فنون لطیفہ کی ترقی کے حوالے سے بابر کی خدمات پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
2. فن خطاطی کے فروغ میں عہد اکبری کے کارناموں کی وضاحت کریں۔
3. مغل حکومت میں فن موسیقی کے آغاز اور اس کی ابتدائی ترقی کا مختصراً جائزہ پیش کریں۔
4. مغل فن مصوری میں جہاں گیر کے کارناموں کی وضاحت کریں۔
5. ابتدائی مغل تعمیری نمونوں کا اختصار کے ساتھ تجزیہ کریں۔

19.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. فن خطاطی کے حوالے سے ہندوستانی فنون لطیفہ میں مغلوں کی خدمات کا جائزہ پیش کریں۔
2. "مغل تاریخ میں تعمیری ترقیات کے اعتبار سے اکبر کا دور بہت اہم شمار کیا جاتا ہے۔" وضاحت کریں۔
3. مغل فن موسیقی اور مصوری میں عہد شاہ جہانی کے کارناموں کا تجزیہ کریں۔

19.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 15، دانش گاہ پنجاب، لاہور، طبع اول، 1964ء متعلقہ ابواب
2. ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، جدید ایڈیشن، 2013ء
3. جیمس فرگسن: اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، اردو ترجمہ: سید ہاشمی فرید آبادی، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، 1932ء
4. Stuart C Welch: The Art of Mughal India, Painting and Precious Objects, Asia House Gallery, New York City, 1963
5. Shanti Swarup: The Art and Crafts of India and Pakistan, D B Taraporevala Sons & Co. PVT LTD, Bombay, India 1957
6. Percy Brown: Indian Architecture (Islamic Period), D B Taraporevala Sons & Co. PVT LTD. Bombay, Seventh Reprint 1981

اکائی 20: 1857ء کی جنگ آزادی

اکائی کے اجزا:

20.0 تمہید

20.1 مقاصد

20.2 جنگ آزادی کی نوعیت

20.3 جنگ آزادی کے اسباب

20.3.1 سیاسی اسباب

20.3.2 معاشی اسباب

20.3.3 سماجی وتعلیمی اسباب

20.3.4 مذہبی اسباب

20.3.5 ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک

20.4 اٹھارہ سوستاون کی جنگ آزادی

20.5 ناکامی کے اسباب

20.6 اثرات

20.7 اکتسابی نتائج

20.8 کلیدی الفاظ

20.9 نمونہ امتحانی سوالات

20.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

20.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

20.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

20.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

20.0 تمہید

سترہویں صدی کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بغرض تجارت ہندوستان میں قدم رکھا اور مغل حکمرانوں نے کمپنی کا نہ صرف خوش دلی سے استقبال کیا بلکہ انگریزوں کو مختلف رعایتیں بھی دیں۔ انگریزوں نے جب مقامی حکمرانوں کی سیاسی کمزوریاں دیکھیں تو انہوں نے اس ملک پر قابض ہونے کا ارادہ کر لیا اور اس سلسلے میں ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب انہیں کسی علاقے پر قبضہ کرنا ہوتا تو اس کا ایک حصہ اپنے پاس رکھتے اور عوام کو مطمئن کرنے کے لیے باقی حصوں پر کسی محکوم و مجبور نواب یا بادشاہ کی حکومت قائم کرا دیتے تھے۔ شاہِ دہلی، والیِ اودھ، نظامِ دکن، مرہٹہ ریاستیں اور پنجاب کی سکھ ریاستیں اس کی واضح مثالیں ہیں، بہر حال پھر جب مناسب وقت آتا تو اس علاقے پر مکمل طور سے قابض ہو جاتے تھے۔ لارڈ ویلزلی اور لارڈ ڈلہوزی وغیرہ نے اس پالیسی پر خصوصی طور سے عمل کیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یا تو انگریزی حکومت قائم تھی یا ایسے مقامی نوابوں اور راجاؤں کی عمل داری تھی جو مکمل طور سے انگریزوں کے قبضے میں تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کے بعد یہاں کی دولت کو مختلف حیلوں، بہانوں اور معاہدوں سے لوٹنا شروع کیا اور اس کے عہدے داروں نے عوام پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ انگریزی علاقہ ہو یا مقامی حکومت، عدم استحکام کی وجہ سے ہر جگہ بے اطمینانی، انتشار اور افراتفری کا ماحول تھا۔ انگریزوں کی سرپرستی میں طوائف الملوکی اور چھوٹی ریاستوں کے جابرانہ نظام نے بے روزگاری، معاشی مسائل اور صنعت و حرفت کی بربادی کو جنم دیا تھا۔ اس ملک کے عام و خواص سب ہی غیر مطمئن تھے، نیز ہر شخص آنے والے کسی بڑے طوفان کا منتظر تھا اور یہ طوفان 1857ء میں جنگ آزادی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس اکائی میں اسی موضوع کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس اکائی کو لکھنے میں سرسید اور غلام رسول مہر کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، البتہ اس موضوع پر معاصر تذکروں اور رسالوں میں سرسید احمد خان کا رسالہ اسباب بغاوت ہند، مرزا غالب کا دستنبو، معین الدین اور منشی لال جیون کے روزنامچے اور ظہیر الدین ظہیر دہلوی کی کتاب داستان غدر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

20.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ 1857ء کی جنگ آزادی کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ آزادی کی جنگ اچانک برپا ہو گئی تھی یا اس کے پیچھے کوئی تحریک تھی؟ اس کے اہم مراکز کون تھے؟ اس کی ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے تھے؟

20.2 جنگ آزادی کی نوعیت

1857 کی جنگ آزادی کی نوعیت کے حوالے سے مؤرخین میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل مغرب بالخصوص برطانوی مؤرخین نے اسے صرف 'فوجی بغاوت' یا 'غدر' تصور کیا ہے اور اسے اس سے زیادہ اہمیت دینے کو وہ راضی نہیں ہوئے۔ ان کا ماننا ہے کہ اس بغاوت میں حب الوطنی یا قوم پرستی کا کوئی جذبہ شامل نہیں تھا اور نہ ہی اسے عوام کی حمایت حاصل تھی۔ ٹی- آر- ای- ہومس (Thomas Rice Edward Holmes 1855-1933) کی رائے ہے کہ اس فوجی بغاوت سے ہندوستانی حکمراں فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، کیوں کہ انگریزوں کی حکومت سے انہیں ہی سب سے زیادہ نقصان ہوا تھا، نیز عوام اس بغاوت میں اس لیے شامل ہوئی تھی کہ ان کے سیاسی و مذہبی مفاد کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ان آراء کے برعکس ہندوستانی اور بعض دیگر انصاف پسند مؤرخین نے اسے 'آزادی کی پہلی جنگ' یا 'قومی تحریک' قرار دیا ہے۔ اس فکر کے حاملین میں جان ہیرس، ایس این سین، ایس پی چودھری اور غلام رسول مہر وغیرہ شامل ہیں۔ سر سید احمد خاں اس بغاوت کے چشم دید گواہ تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'اسباب بغاوت ہند' میں اس تاریخی واقعہ کو ہندوستان کے تمام طبقات کی ایک عام بغاوت قرار دیا ہے اور انہوں نے اس کی ذمہ داری انگریزوں پر ڈالی ہے کہ برطانوی حکومت کی توسیع سلطنت کی پالیسی، معاشی استحصال اور ہندوستان کے مذہبی وثقافتی معاملات میں بے جا مداخلت کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخی واقعہ کو 'آزادی کی پہلی جنگ' کہنا ہی صحیح ہوگا کیوں کہ اگر اسے فوجی بغاوت تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فوجیوں کی بغاوت شہروں تک کیسے پہنچی؟ عوام نے انگریزوں کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ عوام نے مورچے بنا کر لڑائیاں کیوں لڑیں؟ ناکامی کے بعد عام شہریوں کا قتل عام کیوں کیا گیا؟ فاتح فوج کو لوٹ مار کی اجازت کیوں دی گئی؟ اس میں بہادر شاہ ظفر، بیگم حضرت محل، برجیس قدر، عظیم اللہ خان، شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں، مولوی احمد اللہ شاہ، مولوی فضل حق، مہارانی جھانسی، نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے وغیرہ کیوں شامل ہوئے؟ ظاہر ہے جس تحریک میں بادشاہ، امراء، گورنر، نواب، مختلف مذاہب کے رہ نما، اہل علم و دانش اور عوام کی ایک بڑی تعداد شامل ہو اسے فوجی بغاوت یا کسی خاص طبقے کی بغاوت کا نام دینا صحیح نہیں ہوگا۔ اسی لیے غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ 1857 کی تحریک عام و ہمہ گیر تھی، صرف فوج تک محدود نہ تھی کہ اسے 'غدر' قرار دیا جائے اور بلاشبہ اس میں وہ تمام خصوصیات تھیں جو کسی تحریک کے عوامی اور قومی ثابت کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

20.3 جنگ آزادی کے اسباب

1857 کی جنگ آزادی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ یہ ایک اجنبی حکومت تھی کیوں کہ ہندوستان میں اس سے قبل جتنے بھی گروہ آئے تھے وہ مستقل طور پر یہاں کے باشندے بن چکے تھے۔ ہندوستانی عوام ایک عرصے تک ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیسی حکمرانوں کا کارندہ سمجھتی رہی اور اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ براہ راست ہر شئے کی مالک اور خود مختار بن چکی ہے، لیکن جب لوگوں کو صحیح صورت حال کا ادراک ہوا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ انگریزوں نے چالاکی اور عیاری سے سب کچھ چھین لیا ہے تو ان کے خلاف ملک میں ہمہ گیر نفرت کی لہر دوڑ گئی کیوں

کہ کوئی بھی غیرت مند انسان اپنے ملک میں کسی اجنبی کے تسلط اور قبضے کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔اس بنیادی سبب کے علاوہ مختلف سیاسی، معاشی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی اسباب تھے، نیز ایک اہم سبب انگریزوں کی جانب سے ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ غیر منصفانہ اور ظالمانہ سلوک بھی تھا، جس نے آگ میں پٹرول ڈالنے کے مترادف کام کیا تھا۔ذیل میں ان کا تفصیلی جائزہ لیا جارہا ہے:

20.3.1 سیاسی اسباب

انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے بالکل مفلوج کر دیا تھا۔زیادہ تر علاقوں میں ان کی عمل داری تھی اور جن ریاستوں میں براہ راست ان کی حکومت نہیں تھی، ان کے حکمرانوں کو بھی کافی حد تک بے دست وپا کرر کھا تھا۔حال یہ تھا کہ خود ان کی ریاستوں میں ان کے اختیارات کمپنی کے ماتحت ہوتے تھے اور کسی بھی معاملہ میں آخری فیصلہ کمپنی کا ہی ہوتا تھا۔ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ ایسی ریاستوں پر نظر گڑائے رکھتے جہاں خاندانی جھگڑے چل رہے ہوں اور موقع ملتے ہی وہ اس خاندان کے سرپرست بن جاتے اور کسی ایک کا ساتھ دے کر اسے وقتی طور سے کامیاب کرادیتے، پھر جب تک ممکن ہوتا اس شخص سے جاگیر یا رقم کی صورت میں اپنی سرپرستی کی قیمت وصول کرتے اور جب وہ کچھ دینے کے قابل نہیں رہتا تو کسی بہانے سے اسے گدی سے ہٹادیتے تھے۔اس طرح سے ان کا کوئی حلیف بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔اگر کوئی والی ریاست کمپنی کو آنکھ دکھانے کی کوشش کرتا تو اسے حریفوں کے ہاتھوں ختم کرادیا جاتا،یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی دوستی اور دشمنی دونوں ہی یکساں طور پر تباہ کن تھی۔توسیع سلطنت کے دیگر طریقوں میں ماتحتی معاہدہ، ذیلی اتحاد، جنگ، الحاق کی پالیسی اور پنشن کے عوض میں ریاست سے دست برداری وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

انگریزوں نے اپنی ان پالیسیوں سے بنگال کے حکمراں نواب سراج الدولہ کو 1757ء میں پلاسی کی جنگ میں میر جعفر کے ذریعے راستے سے ہٹایا اور پھر مختلف بہانوں سے میر جعفر اور میر قاسم کو بھی استعمال کرنے کے بعد انہیں بھی اقتدار سے بے دخل کر دیا۔بادشاہ میسور ٹیپو سلطان کا چراغ نظام اور مرہٹوں کی مدد سے 1799 میں بجھایا۔حیدرآباد کے ناصر جنگ اور مظفر جنگ، نیز کرناٹک کے نورالدین، چنداصاحب اور محمد علی کی چشمک سے فائدہ اٹھا کر جنوبی ہند پر قبضہ کیا۔شمال میں سکھ ریاستوں کو آپس میں لڑا کر ان کی مرکزیت کا خاتمہ کر دیا اور جب پنجاب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو جگہ جگہ انگریزی فوجی چھاؤنیاں قائم کر کے ان کو اپنے قابو میں کر لیا۔سندھ کی ریاستوں کو سکھوں کے غلبے سے خطرہ تھا تو انگریزوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور ان سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا، ظلم کی انتہاء یہ تھی کہ ریاست میں حفاظت کے نام پر انگریزی فوج متعین کی جاتی اور اس کا پورا خرچ متعلقہ ریاست کے حاکم کو ہی برداشت کرنا پڑتا تھا۔اس طرح سے تمام چھوٹی بڑی ریاستیں ان کے قبضے میں آگئیں۔حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے صرف مکاری، دغابازی اور چالاکی سے کام لے کر یہ تمام کامیابیاں حاصل کی تھیں اور زیادہ تر لڑائیاں دیسی حکمراں اور دیسی سپاہیوں نے لڑیں، یعنی بوجھ انہوں نے اٹھایا اور حکومت انگریزوں کی مضبوط ہوئی۔ظاہر ہے کہ انگریزوں کے ان اعمال کی وجہ سے پورے ملک کے اندر بے چینی پیدا ہوئی اور نتیجہ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

لارڈ ڈلہوزی 1848 میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا اور اس نے توسیع سلطنت کے لیے نت نئے بہانے تراشے۔اس نے ایک

قانون(Doctrine of Lapse) پر سختی سے عمل کیا کہ وہ تمام ریاستی حکمراں جن کے اولاد نہیں ہے، متبنٰی بیٹا ہے، اسے جانشین نہیں مانا جائے گا اور حکمراں کے مرنے کے بعد وہ ریاست کمپنی کے ماتحت ہو گی۔اس اصول کے تحت 1848 میں ستارہ، 1849 میں جیت پور اور سنبھل، 1850 میں باغپت، 1852 میں اُدے پور، 1853 میں جھانسی، 1854 میں ناگ پور وغیرہ کا برطانوی حکومت میں الحاق کر لیا گیا۔اسی اصول کے ذریعے 1853 میں پیشوا باجی راؤ دوم کے انتقال کے بعد ان کے متبنی بیٹے ناناصاحب کی 80,000 پاؤنڈ سالانہ پنشن بند کر دی گئی۔لارڈ ڈلہوزی نے ایک اصول یہ بھی پیش کیا کہ ماتحت ریاستوں کی بدحالی کو درست کرنا برطانوی حکومت کی اخلاقی ذمہ داری ہے، چنانچہ اس کے تحت 1856 میں واجد علی شاہ پر بدانتظامی کا الزام لگا کر انہیں اودھ کے تخت سے معزول کر دیا۔اسی طرح نظام حیدر آباد سے بھی ان کا علاقہ چھین لیا۔اس نے ایک کام یہ بھی کیا کہ بعض حکمرانوں کی پنشن ضبط کر لی اور بعض کے خطابات واپس لے لیے۔ان وجوہات کی بنا پر مختلف بااثر خاندانوں کے افراد بھی انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

20.3.2 معاشی اسباب

ایسٹ انڈیا کمپنی کو ابتداء میں تجارت میں اجارہ داری حاصل تھی۔ہندوستان کی گھریلو صنعتوں کے ذریعے تیار کی گئیں اشیاء جیسے مختلف قسم کے کپڑے، ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھروں وغیرہ کو برطانیہ بھیجا جاتا تھا،اس سے ہندوستانی عوام کو بھی فائدہ ہوتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں اور انیسویں صدی (1760-1820) کے آغاز میں برطانیہ میں صنعتی انقلاب آیا اور وہاں بھی بہترین کپڑے اور دیگر اشیاء بننے لگیں،اس لیے 1813 کے ایکٹ کے ذریعے کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی گئی اور برطانیہ کی دیگر کمپنیوں کو بھی سر زمین ہند میں آزادانہ تجارت کی اجازت مل گئی۔ اس طرح سے ہندوستان انگریز تاجروں کے لیے ایک وسیع بازار بن گیا، جہاں سے سستا کچا مال بر آمد کیا جاتا تھا اور برطانیہ کی اشیاء کو زیادہ سے زیادہ منافع کے ساتھ بیچا جاتا تھا۔صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مارکس نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے:''ہندوستان 1813 تک زیادہ تر مال بر آمد کرنے والا ملک تھا، لیکن اب درآمد کرنے والا ملک بن گیا ہے۔ایک طرف ہندوستان کی پیداوار کو برطانیہ جانے نہیں دیا جاتا اور اگر جانے بھی دیا جاتا تو نہایت کڑی شرطوں پر، دوسری طرف برطانوی مصنوعات برائے نام محصول پر بہ کثرت درآمد ہونے لگیں۔'' اس پالیسی نے جہاں آزادانہ تاجر طبقے کو تباہ کیا وہیں صنعت کاروں، کاریگروں اور دست کاروں کو بھی برباد کر دیا۔

انگریزوں نے معاشی اعتبار سے دوسرا بڑا حملہ زمین اور زراعت سے جڑے تمام طبقوں پر کیا اور یہ فرض کر لیا گیا کہ کمپنی ہی زمین کی سب سے بڑی مالک ہے۔ مختلف قوانین کے ذریعے کسانوں کے بجائے زمین داروں سے بھاری لگان کا معاہدہ کیا گیا،اس طرح کسانوں کی حق تلفی کی گئی، البتہ تھومس منرو نے کسانوں کو زمین کا مالک مان کر ان سے براہ راست لگان وصول کرنا شروع کیا، لیکن انگریز افسر لگان وصول کرنے میں بہت سختی سے پیش آتے تھے اور لگان ادا نہ کرنے کی صورت میں کسانوں سے زمینیں چھین لی جاتی تھیں۔ بشپ ہیبر نے 1830 میں اپنی سوانح حیات میں یہ خیال ظاہر کیا کہ کمپنی کے تحت علاقوں میں کسان مجموعی طور پر والیانِ ریاست کی رعایا کی نسبت زیادہ خستہ حال، زیادہ مفلس اور زیادہ بد دل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی دیسی حکمراں اس قدر مالیہ کا تقاضا نہیں کرتا ہے جتنا ہم کرتے ہیں۔ نیز

ولیم بینٹنگ نے لینڈ رز مپشن ایکٹ پاس کر کے علماء، فن کاروں، شاعروں اور ادیبوں وغیرہ کی انعامی جاگیروں کو ضبط کر لیا۔ اسی طرح متعدد صوبوں میں زمین دار امیروں کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کے لیے ان کے حقوق اور دستاویزات کی جانچ پڑتال کے لیے 'انعام کمیشن' مقرر کیا گیا۔ بغاوت سے پہلے پانچ سالوں میں پینتیس ہزار جاگیروں میں سے اکیس ہزار جاگیروں کو ضبط کر لیا گیا، چنانچہ وہ خاندان جو سالوں سے موروثی جاگیروں پر قابض رہے تھے، اپنی جاگیروں سے محروم ہو گئے۔ اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ برطانوی حکومت کی ظالمانہ اور غیر منصفانہ معاشی پالیسیوں نے ہندوستانیوں کی معاشی اعتبار سے کمر توڑ کر رکھ دی تھی، جس کی وجہ سے صنعت کاروں، کاریگروں، دست کاروں، مزدوروں، کسانوں اور تاجروں وغیرہ نے ایک نئے انقلابی دور میں اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات کو حاصل کرنے کا انتظار کیا اور جب انگریزوں کے خلاف اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو ان تمام طبقات نے اس میں بھرپور شرکت کی۔

20.3.3 سماجی و تعلیمی اسباب

انگریزوں نے بہ حیثیت فاتح خود کو بہت اعلیٰ اور قابل تکریم سمجھا اور ہندوستانی عوام کو محکوم سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ محبت، اخلاص اور ہمدردی و تعاون کے رویے سے اجتناب کیا۔ ان کی زبان، لباس، طور طریقہ، رہن سہن اور برتاؤ وغیرہ سب کچھ میں ہی اجنبیت تھی۔ وہ ہندوستانیوں کو بے وقعت سمجھتے تھے اور ان کی کوئی عزت نہیں کرتے تھے۔ جو ہندوستانی ان سے قریب تھے وہ بھی ان کی تنک مزاجی کی وجہ سے حقائق سے چشم پوشی کرتے اور خوشامد کرتے ہوئے غلط بیانی سے کام لیتے تھے۔ ان حالات کی بنا پر کیوں کر ممکن تھا کہ انگریز حکمراں صحیح صورت حال اور عوام کے بنیادی مسائل سے واقف ہو سکیں؟ پھر ان میں ایک طرح کی ضد پائی جاتی تھی اور وہ اپنے ہر جائز و ناجائز حکم کو تسلیم کرانے میں ہی اپنی شان سمجھتے تھے۔ انگریزوں نے جو عدالتیں قائم کیں، ان سے بھی عوام میں ناراضگی پیدا ہوئی کیوں کہ ان عدالتوں سے فیصلوں میں بہت تاخیر ہوتی تھی، نیز کسی شخص کا مالیہ بروقت ادا نہیں ہوا تو معاملہ عدالت میں جاتا اور جج اس کی معذوری کے اسباب وغیرہ پر غور کیے بغیر اس کے خلاف فیصلہ دے دیا کرتا تھا اور اس کی جائداد نیلام ہو جایا کرتی تھی۔ انگریزوں کی سرپرستی میں سود خور مہاجنوں، زمینداروں اور ذخیرہ اندوز ساہوکاروں کو بھی خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ وہ معمولی رقمیں قرض پر دیتے اور عوام کی ناواقفیت کا فائدہ اٹھا کر سود در سود کے ذریعے بڑی رقمیں بنا لیا کرتے تھے، پھر جب معاملہ عدالت میں جاتا تو وہاں سے من مانے فیصلے کرا لیا کرتے تھے اور فیصلہ کے ساتھ ہی مقروض کی جائداد کو فروخت کرنے کا حکم ہو جاتا تھا۔

جہاں تک تعلیم کی بات ہے تو ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے مدارس، اسکولوں اور کالجوں وغیرہ میں عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، فقہ، حدیث اور ہندو دھرم کی کتابوں وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو انگریزی زبان کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا اور پھر 1835 میں عدالتوں کی زبان فارسی کی جگہ انگریزی قرار دے دی گئی۔ رفتہ رفتہ عربی اور فارسی کی تعلیم بہت کم کر دی گئی اور فقہ، حدیث یا دوسری مذہبی کتابوں کی تعلیم بند کر دی گئی۔ حکومت کے ان اقدامات سے حساس اور دور اندیش لوگوں کو فکر تو ہوئی، لیکن وہ کوئی اعتراض نہیں کر سکے، البتہ جب حکومت کے ذریعے انگریزی سے واقف افراد کو ملازمت میں ترجیح دی جانے لگی اور مشنری اسکولوں کے بالمقابل قومی تعلیمی اداروں کو نظر انداز کیا جانے لگا تو ایک طرف مقامی زبان جاننے والوں میں بے روزگاری کی وجہ سے بے چینی پھیل

گئی تو دوسری طرف لوگوں نے سمجھ لیا کہ انگریزی زبان ہی مغربی تہذیب اور عیسائیت کے فروغ کا سبب ہے۔ بہر حال برطانوی حکومت کے ان اقدامات سے عوام میں سماجی سطح پر انتشار اور اختلاف کی فضا پیدا ہو گئی۔

20.3.4 مذہبی اسباب

1813 کے ایکٹ میں برطانوی حکومت نے مذہبی اور سماجی معاملات میں غیر جانب دارانہ پالیسی اختیار کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن جب اس نے ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما لیے تو اس نے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی طرف بھی توجہ دی اور اس سلسلے میں مختلف پالیسیاں اختیار کیں، جیسے برطانیہ سے مشنریز آئیں اور انہوں نے اپنے دین کی تبلیغ کی۔ مسیحی پادریوں نے ہندوستانیوں میں خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اپنے دین کی تبلیغ کی، بحثوں اور مناظروں میں دیگر مذاہب کے لیے اشتعال انگیز الفاظ استعمال کیے۔ بقول سر سید احمد خان پادریوں نے جو مذہبی کتابیں چھاپیں، ان میں دیگر مذاہب کے مقدس افراد و مقامات کے حوالے سے نازیبا الفاظ اور غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا۔ انگریز حکام اپنے دیسی ماتحتوں کو مجبور کرتے کہ وہ پادریوں کے وعظ کو سنیں، نیز وعظ و تبلیغ کا عام طریقہ یہ تھا کہ تمام لوگ اپنے مکانات یا عبادت گاہوں میں ہی اس عمل کو انجام دیتے تھے، لیکن پادری غیر مذاہب کے مجمع، میلہ اور تیرتھ وغیرہ میں جا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد اور افکار و نظریات پر سخت تنقیدیں کیا کرتے تھے، نیز وہ اپنے ساتھ پولیس بھی لے جاتے تھے تا کہ انہیں تحفظ حاصل رہے۔ اسی طرح انہوں نے مشنری اسکول قائم کیے اور جو طلبہ عیسائی مذہب کے مطابق عقائد کا اظہار کرتے انہیں انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔

برطانوی حکومت نے 1850 میں ایک قانون پاس کیا کہ جو شخص اپنا مذہب تبدیل کرلے گا، وہ آبائی جائداد میں سے اپنا حصہ پانے کا حق دار ہو گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ہی اسے اپنے مذہب کے خلاف اور عیسائیت کی حوصلہ افزائی کا موجب سمجھا کیوں کہ اس وقت تک ہندوؤں کے نزدیک غیر مذہب کا کوئی شخص ہندو نہیں ہو سکتا تھا اور مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر غیر مذہب کا کوئی آدمی مسلمان ہو جائے تو اس کے لیے وارثین کے متروکہ میں سے، جو پہلے مذہب پر قائم ہوں، حصہ لینا ممنوع ہے۔ یعنی اس قانون سے صرف نو عیسائی ہی فائدہ حاصل کر سکتے تھے، اس لیے عوام کو یقین ہو گیا کہ یہ قانون ہندوستانیوں کو صرف عیسائی بنانے کی سرکاری مہم کا حصہ ہے۔ 1854 میں ایک پادری فنڈر ہندوستان آیا جو عربی وفارسی زبان سے بھی واقف تھا۔ اس نے اسلام اور اس کی تعلیمات پر متعدد اعتراضات کیے، بالآخر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں سے اس کا 'توریت وانجیل میں تحریف ہوئی یا نہیں' کے موضوع پر آگرہ میں مناظرہ ہوا اور اس میں پادری فنڈر کو شکست ہوئی اور وہ واپس چلا گیا۔ 1855 میں کلکتہ کے پادری ایڈ منڈ نے ایک خط ملک کے اکثر وبیشتر تعلیم یافتہ افراد بالخصوص سرکاری ملازمین کو بھیجا جس میں لکھا تھا کہ اب ہندوستان میں ایک عمل داری ہو گئی، برقی تار سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی، ریلوے سے سب جگہ کی آمد ورفت ایک ہو گئی۔ اس لیے مذہب بھی ایک ہی ہونا چاہیے، مناسب ہو گا کہ تم لوگ بھی عیسائی ہو جاؤ۔ سوال یہ ہے کہ پادریوں میں برطانیہ سے ہندوستان تک کا سفر کرنے اور یہاں کے لوگوں کے مذاہب پر حملہ کرنے کی جرأت کہاں سے آئی؟ وجہ صاف ہے کہ یہاں پر انگریزوں کی حکومت تھی اور انہیں پوری مدد حاصل تھی۔

برطانوی حکومت نے اسی دوران بعض ایسے قوانین منظور کیے جن کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے بنیادی عقائد و نظریات میں مداخلت سمجھا۔ اس میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے اہم کردار ادا کیا تھا، جیسے لڑکیوں اور بچوں کی قربانیوں کا انسداد کیا گیا اور 1829 میں ستی کی رسم جو ہندوؤں میں ایک دیرینہ رسم سمجھی جاتی تھی، اسے جبری اور قانونی طور پر روکا گیا۔ اسی طرح ہندوؤں میں گود لینے کے رواج کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی، نیز 1856 میں ہندو بیوہ عورتوں کی شادی کا قانون منظور کیا گیا جسے ہندوؤں نے پسند نہیں کیا کہ اس سے ہندو بیوہ عورتیں خود مختار ہو جائیں گی اور مردوں کو سبکی یا ہتک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگرچہ بعض رسموں کا خاتمہ انسانی نقطۂ نظر سے بھی مناسب اور بہتر تھا، لیکن ہندوؤں نے اسے اپنے مذہب میں مداخلت سمجھا۔ اسی طرح جیل میں پہلے ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق کھانا پکانے اور کھانے کی آزادی تھی، لیکن برطانوی حکومت نے وقت کی بچت کے خیال سے سب کے لیے ایک جگہ ہی کھانا پکانے کی ہدایات جاری کیں، چنانچہ اس کی تعمیل میں ایک مسئلہ یہ پیش آیا کہ اونچی ذات والے نیچی ذات والوں کا پکایا ہوا کھانا کیسے اور کیوں کھائیں؟ نیز انہیں حفاظتی نقطہ نظر سے پیتل اور تانبے کے برتنوں کی جگہ مٹی کے برتنوں کے استعمال کی ہدایت دی گئی۔ ظاہر ہے کہ ہندو اس پر راضی نہیں ہو سکتے تھے۔

اسی طرح سے فوجیوں کے لیے بھی متعدد نئے قوانین بنائے گئے جیسے 1806 میں مدراس کی دیسی فوج کو حکم دیا گیا کہ وہ جب یونیفارم پہن لیں تو نہ تو پیشانی پر تلک لگا سکتے ہیں اور نہ ہی کانوں میں بالیاں پہن سکتے ہیں، ان کی داڑھیاں منڈی ہوئی ہوں اور وہ پگڑیوں کی جگہ ٹوپیاں استعمال کریں۔ ظاہر ہے کہ اس سے ہندو اور مسلمان دونوں متاثر ہو رہے تھے کہ ہندو کو ذات پات کے نشان سے محروم ہونے کا خوف تھا اور مسلمان کو احساس تھا کہ وہ دینی شعائر سے دور کیے جا رہے ہیں، بہرحال ان تمام طریقوں کو مذہب میں مداخلت کے طور پر دیکھا گیا اور یہی سمجھا گیا کہ حکومت ذات پات کے نظام اور دینی شعائر کو ختم کر کے عیسائیت کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہ رہی ہے۔ درحقیقت انگریز ہندوستانیوں کو نہایت پس ماندہ، جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا اور قابل اصلاح رسوم کا شکار سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے اصلاح کے شوق میں اتنی جلد بازی سے کام لیا کہ عوام ان کے ہر فعل کو اپنے مذہب میں بے جا مداخلت پر محمول کرنے لگی تھی۔

20.3.5 ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک

انگریز حکام ہندوستانی فوجیوں کو نہایت ہی کم تر اور حقیر سمجھتے تھے، حالانکہ برطانوی حکومت کے قیام و استحکام میں خود ان کی قوم سے زیادہ ہندوستانی فوجیوں کا اہم کردار رہا تھا۔ انگریز فوجیوں کی تنخواہ، بھتہ اور دیگر سہولتوں میں تو اضافہ کیا جاتا تھا، لیکن ہندوستانی فوجیوں کی فریاد کوئی نہیں سننا چاہتا تھا۔ یوں بھی ان کی تنخواہ انگریز فوجیوں کے بالمقابل بہت کم ہوا کرتی تھیں، ایک ہندوستانی پیدل سپاہی کو سات روپئے ماہانہ اور گھڑسوار کو ستائیس روپئے ماہانہ ملتے تھے۔ اس کے برعکس انگریز سپاہیوں کی تنخواہ تین گنا زیادہ ہوا کرتی تھی، نیز ہندوستانی سپاہیوں کو بیرونی جنگوں میں ملنے والے بھتے کو بھی برما اور افغانستان کی جنگوں کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح اونچے اور اہم عہدوں پر صرف انگریزوں کو رکھا جاتا تھا اور یہ طریقہ کارنوالس نے شروع کیا تھا کیوں کہ اسے ہندوستانیوں پر بھروسہ نہیں تھا۔ مزید برآں انگریز حکام نسلی امتیاز کی بنا پر ہندوستانی فوجیوں سے نفرت آمیز رویہ اختیار کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی فوج بھی انگریزوں سے خوش نہیں تھی اور جب انہیں موقع ملا تو انہوں نے مختلف طریقوں سے نہ صرف اپنی نفرت کا اظہار کیا، بلکہ انگریزوں کے خلاف بغاوتیں بھی کیں۔

ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ ناانصافی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1757 میں قائم کردہ 'فوج بنگال' میں موجود انگریزوں کو میر جعفر نے 1764 میں ایک بڑی رقم بطور تحفہ دی تو اسی فوج میں شامل ہندوستانی فوجیوں نے بھی مطالبہ کیا کہ اس رقم میں ان کا حصہ بھی لگایا جائے کیوں کہ لڑائی میں وہ بھی شریک رہے ہیں تو ہر فوجی کو پہلے چھ روپئے دیے گئے اور بڑی ردوکد کے بعد اسے بڑھا کر بیس روپئے کیا گیا، جب کہ ہر انگریز فوجی کو چالیس روپئے دیے گئے۔ ہندوستانی فوجیوں کی ایک بٹالین نے جب اس پر احتجاج کیا تو ان میں سے چوبیس فوجیوں کو توپ سے باندھ کر بطور سزا اڑا دیا گیا۔ اس کے برعکس بنگال میں ہی ایک مرتبہ جب انگریز فوجیوں نے دگنے بھتے کی رقم تاخیر سے ملنے کی وجہ سے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور استعفیٰ دینے کا ارادہ کیا تو انہیں بجائے سزا دینے کے فوراً اضافی بھتہ دے کر خاموش کر دیا گیا۔ افسوس ناک بات یہ رہی کہ بھتے کی رقم کو ہندوستانی فوجیوں کی تنخواہ سے کاٹ کر، ان کے عہدوں کو گھٹا کر اور ان کی ترقی کو روک کر نکالی گئی تھی۔ اسی طرح جب فوج کسی دور مقام پر بھیجی جاتی تو انگریزوں کے لیے بار برداری کا سامان کمپنی دیتی تھی اور ہندوستانی فوج کو اپنا خود انتظام کرنا پڑتا تھا۔ حکومت کی اس دورخی پالیسی نے ہندوستانی فوجیوں میں بے چینی کی فضا پیدا کر دی۔ مسلمان علماء اور ہندو مذہب کے رہ نماؤں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور ان کے عالموں، فقیروں اور سنیاسیوں نے بھیس بدل کر فوج میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی روح پھونک دی۔ عوام کی طرف سے جو لوگ فوجوں میں بھیس بدل کر جاتے، ان کے خفیہ نشانات بھی متعین کر لیے گئے تھے۔ ان میں کنول کا پھول (اسے خلوص اور کام یابی کی علامت سمجھا جاتا تھا) اور چپاتی (انہیں آزادی کا تبرک اور تحفہ سمجھا جاتا تھا) قابل ذکر ہیں، البتہ سرسید احمد خان اور سر تھوفیلس مٹکاف وغیرہ نے چپاتیوں کی تقسیم مقصد اس وقت سماج میں پھیلی متعدد بیماریوں کو ختم کرنا، آنے والی مصیبتوں اور سانحوں کا خاتمہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس کا مقصد سیاسی نہیں تھا۔ بہر حال یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انگریزوں کے غیر منصفانہ اور جابرانہ سلوک کے علاوہ علماء، فقیروں اور سنیاسیوں کی کوششوں نے ہندوستانی فوج میں برطانوی حکومت کے خلاف آگ لگا دی تھی، نیز رہی سہی کسر چربی والے کارتوس نے پوری کر دی، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1853 میں برطانیہ سے ہندوستان میں نئے کارتوس آئے جن پر سور اور گائے کی چربی لگائی گئی تھی اور کہا گیا کہ یہ دیکھنا ہے کہ ان پر یہاں کی آب و ہوا کا کیا اثر پڑتا ہے۔ ہندوستانی فوجیوں کے اعتراضات کے بعد کہا گیا کہ یہ صرف انگریزوں کے لیے ہیں، جب کہ پہلے ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی تھی۔ پھر برطانوی حکومت نے 1856 کے آخر میں فیصلہ کیا کہ پرانی بندوق کی جگہ انفیلڈ رائفل کا استعمال کیا جائے اور اس کے لیے تین مقامات یعنی ڈمڈم، انبالہ اور سیالکوٹ میں تربیتی مراکز قائم کیے گئے۔ مسئلہ یہاں سے پیدا ہوا کہ اس رائفل میں بھی یہی کارتوس استعمال کیے جاتے تھے اور انہیں استعمال کرنے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا، ظاہر ہے کہ اس سے ہندوستانی فوجیوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلم، سخت اعتراض ہوا کہ اس عمل سے ان کا مذہب خراب ہوگا اور انہیں ہم عقیدہ گروہوں سے خارج کر دیا جائے گا پھر ان کے پاس سوائے عیسائیت قبول کرنے کے کوئی اور راستہ نہ ہوگا۔ انگریز حکام نے ہندوستانی فوجیوں کے اعتراضات کو رد کر دیا اور عادت کے مطابق زور زبردستی اور طاقت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستانی فوجیوں کی طرف سے سب سے پہلے ڈمڈم میں پھر بارک پور اور بہرام پور کی چھاؤنیوں میں بغاوت کے آثار نمایاں ہوئے۔

بہرام پور کی چھاؤنی میں 26/ فروری 1857 کو رجمنٹ 19 کے ہندوستانی فوجیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ کماندار کرنل میچل (Mitchell) نے ان کی شکایت کو سننے اور سمجھنے کے بجائے دھمکی دی کہ جو فوجی کارتوس لینے سے انکار کرے گا اسے چین اور برما کے محاذ پر بھیج دیا جائے گا، نیز جب فوج میں بغاوت کے آثار دیکھے تو اس نے رجمنٹ کو توڑنے کا حکم دے دیا اور رنگون سے انگریز فوج بلالی۔ اس کی اس حرکت سے ہندوستانی فوجیوں کو یقین ہو گیا کہ کارتوس میں چربی کی آمیزش کی بات صحیح ہے تو وہ کھل کر مقابلے پر آ گئے۔ 31/ مارچ 1857 کو 19 رجمنٹ بارک پور پہنچی تو ان کے ہتھیار چھین لیے گئے اور برطرفی کا حکم دیا گیا۔ 29/ مارچ 1857 کو رجمنٹ 34 کے ایک برہمن فوجی منگل پانڈے نے جذبات سے بے قابو ہو کر سارجنٹ میجر کو گولی مار دی اور لیفٹیننٹ پر بھی گولی چلائی، لیکن وہ بچ گیا، پھر منگل پانڈے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہ دینے کی وجہ سے بددل ہو کر خود کو گولی ماری، لیکن صرف وہ زخمی ہوا پھر اسے قید کر لیا گیا۔ 07/ اپریل 1857 کو فوجی عدالت نے منگل پانڈے کو بغاوت اور افسروں کے خلاف تشدد کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی اور 08/ اپریل 1857 کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ منگل پانڈے کے دوسرے ساتھی ایشوری پانڈے کو بھی اپنے ساتھی کی مدد کرنے کے جرم میں 21/ اپریل 1857 کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اسی دوران میرٹھ کی چھاؤنی میں ایک انگریز افسر کرنل اسمتھ نے 24/ اپریل 1857 کو ایک پریڈ منعقد کرائی جس میں متنازع کارتوس کے استعمال کا طریقہ بتایا جانا تھا، اسی میں نوے (90) ہندوستانی فوجیوں میں سے صرف پانچ نے کارتوس لیے اور باقی نے انکار کر دیا کہ ہم تو اپنے ساتھیوں میں بدنام ہو جائیں گے، ورنہ پوری فوج کو ہی یہ کارتوس دیے جائیں۔ یہ رویہ دیکھ کر کرنل اسمتھ نے طیش میں آ کر پچاسی (85) فوجیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا اعلان کر دیا۔ فوجی عدالت نے تمام مجرموں کو دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی اور 09/ مئی 1857 کو پوری فوج کے سامنے ان پچاسی باغیوں کی وردیاں اتار کر بیڑیاں پہنا دی گئیں، پھر انہیں قید کر دیا گیا۔ فوج کے باقی ماندہ سپاہیوں نے جب اپنے ساتھیوں کی اس طرح سے تحقیر ہوتی دیکھی تو ان کا خون کھولنے لگا، نیز رہی سہی کسر خواتین کے طعنوں نے پوری کر دی، چنانچہ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو آزاد کر کے ہی دم لیں گے اور اس کے لیے 10/ مئی 1857 کی شام کا وقت مقرر کیا گیا، کیوں کہ اس وقت تمام انگریز گرجاگھر میں ہوا کرتے تھے۔ وقت مقررہ پر ہندوستانی فوجیوں نے جیل کا دروازہ توڑ کر تمام قیدیوں کو آزاد کرا لیا اور مزاحمت کرنے والے انگریزوں کا قتل کر دیا گیا۔ اب تمام ہندوستانی فوجیوں نے دہلی کا رخ کیا، کیوں کہ وہ اب میرٹھ میں محفوظ نہیں تھے اور ایک مضبوط قیادت کے جھنڈے تلے جمع ہونا وقت کی ضرورت تھی، اس لیے ان سب کی نظریں شہنشاہ دہلی کی طرف تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت صرف وہی ایک ایسی شخصیت تھی جس کی قیادت پر ہندوستان کی اکثریت کا اتفاق ہو سکتا تھا۔

20.4 اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی

11/ مئی 1857 کی صبح تک فوجیوں اور عام لوگوں پر مشتمل انقلابیوں کی ایک بڑی تعداد میرٹھ سے لال قلعہ، دہلی تک پہنچ چکی تھی اور انہوں نے مغل سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے اس انقلاب کی قیادت فرمانے کی درخواست کی۔ ابتداء میں انہوں نے انکار کیا، لیکن حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے پھر انہوں نے حامی بھر لی اور لال قلعہ پر مغل جھنڈا لہرا کر بہادر شاہ ظفر کے شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ ان کے شامل ہوتے ہی پورے ہندوستان میں آزادی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ انقلابیوں کا مرکز دہلی تھا، لیکن شمالی ہند کے

دیگر مقامات پر بھی آزادی کی جد وجہد شروع ہو گئی تھی۔اس میں لکھنؤ،کان پور،شاہ جہاں پور، تھانہ بھون کیرانہ شاملی،روہیل کھنڈ، مرادآباد،بدایوں،بجنور،الہ آباد،پٹنہ، متھرا،فرخ آباد،اٹاوہ،بستی، گورکھپور،جون پور،اعظم گڑھ اورسیتا پور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اسی طرح مرکزی ہندوستان کے متعدد علاقوں جیسے مندیسر، جھانسی،اندور، دھار، بھوپال،جے پور،اجمیر، کوٹہ اور ٹونک وغیرہ میں بھی ہندوستانی فوجیوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کردیا تھا۔گجرات کے متعدد علاقوں جیسے وڈودرا،نانددو، گودھرا اور مدیتی وغیرہ میں بغاوتیں ہوئیں،البتہ دکن کے صوبوں اور ریاستوں میں اس کا اثر کم رہا،صرف حیدرآباد میں ہی اس حوالے سے بغاوت کا تذکرہ ملتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے ایک فرمان جاری کیا جس میں جنگ آزادی کی وجوہات بتائی گئیں اور ہندو مسلم کو متحد ہو کر برطانوی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی اپیل کی گئی۔اسی دوران جنرل بخت خاں بریلی سے اپنی فوج لے کر دہلی آگئے اور انہوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ انہیں جنرل کا خطاب دے کر مغل فوج کا کمانڈر مقرر کردیں۔بادشاہ نے بعض شہزادوں کی مخالفت کے باوجود ان کی درخواست کو قبول کیا، اس طرح سے دہلی میں انقلابیوں کی ایک مضبوط قیادت کو ان کے ذریعے پورا کیا گیا۔جنرل بخت خاں نے متعدد علماء بالخصوص فضل حق خیر آبادی وغیرہ سے انگریزوں کے خلاف فتویٰ جاری کرالیا اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے گئو کشی پر پابندی لگادی۔ان کی قیادت میں انقلابیوں نے دہلی سے انگریزوں اور عیسائیوں کو قتل کیا اور ان کے اموال واملاک کو لوٹ لیا تھا،البتہ اس میں شہر کے بدمعاشوں اور شرپسندوں کا زیادہ ہاتھ رہا تھا۔

14/ستمبر 1857 کو انگریزی فوج نے دہلی پر فیصلہ کن حملہ کیا اور 19/ستمبر 1857 کو وہ دہلی میں داخل ہو گئے۔انقلابیوں نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا،لیکن وسائل کی کمی،بے ضابطگی، سکھوں کی دھوکہ دہی اور کچھ اپنوں کی غداری کی وجہ سے انقلابیوں کو شکست ہوئی اور بہادر شاہ ظفر کو آزادانہ طور پر تقریباً چار مہینہ اور چار دن تک دہلی میں حکومت کرنے کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لینی پڑی۔جنرل بخت خاں نے بادشاہ وقت کو اپنے ساتھ دہلی سے باہر لے جانا چاہا،لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے۔بالآخر / 21/22 ستمبر 1857 کو ولیم ہڈسن کے ذریعہ انہیں گرفتار کرلیا گیا اور پھر مقدمہ کے بعد کلکتہ کے راستے برما کے شہر رنگون جلاوطن کردیا گیا،جہاں 07/نومبر 1862 میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

انگریزوں نے چھ مہینہ میں ہی دوبارہ دہلی پر قبضہ کرلیا،لیکن انہیں زبردست جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا۔ایک محتاط اندازے کے مطابق مئی 1857 سے ستمبر 1857 تک تقریباً 3837 فوجیوں کا خاتمہ کردیا گیا،چنانچہ انہوں نے فتح کے بعد آزادی کے متوالوں سے بھرپور انتقام لیا۔جنگ آزادی میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں ہی نے شرکت کی تھی،لیکن انگریزوں نے ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کو نشانہ بنایا کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ آزادی کی اس جنگ میں مسلمانوں کا اہم کردار تھا۔مسلمانوں کا وحشیانہ قتل عام کیا گیا،ان کے اموال واملاک کو لوٹا گیا،جائداد کو ضبط کرلیا گیا،بڑے بڑے رئیس خاندانوں کو ذلیل وخوار کیا گیا اور مسلم خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔کہا جاتا ہے کہ تیس ہزار سے زائد مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔اسی طرح ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند کردیے گئے۔دہلی اس کے بعد ایسی ویران ہوئی کہ چوک سعد اللہ خاں،اردو بازار، خانم کا بازار، بلاقی بیگم کا کوچہ، خاں دوراں کی حویلی،دریا گنج کی گھاٹی گلیوں کا بازار،پنجابی کٹرہ، دھوبی

کٹرہ،رام گنج،مدرسہ دار البقاء،اکبر آبادی مسجد،اورنگ آبادی مسجد چوبی وغیرہ کے نام ونشان مٹ گئے۔مسلمانوں کے اخبارات جو 1857 سے پہلے جاری تھے،انہیں بند کر دیا گیا۔مسلمانوں کو کم زور کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی نکالا گیا کہ ہندوؤں کی سرپرستی کر کے انہیں مسلمانوں پر مسلط کر دیا جائے اور دونوں کے درمیان عداوت اور دشمنی کی فضا پیدا کی جائے۔انگریز اس میں بہت حد تک کام یاب بھی ہوئے۔

20.5 ناکامی کے اسباب

مؤرخین نے 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں،ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔جنگ آزادی کی یہ تحریک پوری تیاری کے بغیر اچانک برپا ہوئی تھی، چنانچہ بعض محققین جیسے جے۔اے۔پی پامر اور تاراچند وغیرہ نے لکھاہے کہ پورے ملک میں 31/مئی 1857 کی تاریخ بغاوت کے لیے طے کی گئی تھی، لیکن میرٹھ اور انبالہ میں طے شدہ تاریخ سے پہلے ہی 10/مئی کو فوجیوں نے بغاوت کر دی، جس کی وجہ سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوسکے۔اس تحریک میں انقلابیوں کے وطنی جذبے اور قربانیوں میں کوئی کمی نہیں تھی، لیکن جدید خیالات اور قومی پیمانے پر تنظیم کی یقیناً کمی تھی۔کسی کے بھی ذہن میں تشکیل جدید اور مستقبل کی تعمیر کا خاکہ موجود نہیں تھا۔صورت حال کچھ یوں تھی کہ انقلابیوں میں زمینوں سے بے دخل کیے گئے زمین دار،تباہ شدہ صنعت کار، کنگال کاشت کار، غیر مطمئن فوجی، علماء اور پنڈت وغیرہ کے ذہنوں میں آزاد ہندوستان کی الگ الگ تصویر تھی۔نیز ایک مرکزی باصلاحیت لیڈر کی غیر موجودگی، ہر جگہ علاحدہ علاحدہ تحریک چلانے اور آپسی تال میل نہ ہونے کی وجہ سے انقلابیوں کا معاملہ کم زور ثابت ہوا اور پوری تحریک کو کسی ایک مرکزی تنظیم کے ماتحت نہیں لایا جاسکا۔مقامی اور انفرادی کوششوں نے ملک کے مختلف حصوں میں ابتری تو پیدا کر دی، لیکن اسے انگریزوں کے خلاف ایک منظم کوشش کے طور پر استعمال کرنا ممکن نہیں ہوا۔چار مہینے کی مدت میں جب دہلی انگریزوں سے آزاد تھی تو بھی کوئی ایسا نظام ترتیب نہیں دیا جاسکا جو ایک کُل ہند نظام کو اپنے اندر جذب کر لینے میں کام یاب ہو جاتا۔

ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ مغل بادشاہ اور شہزادوں کو جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا،اس کے باوجود شہزادوں نے فوج کے کمانڈر بننے پر اصرار کیا، اسی لیے مرزا مغل اور جنرل بخت خاں کے درمیان اختلافات ہوئے۔اسی طرح بعض شہزادوں کی یہ خواہش تھی کہ اگر انگریز کام یاب ہو جاتے ہیں تو وہ ان کو تخت کا وارث تسلیم کر لیں گے، نیز بادشاہ کا خزانہ بھی بالکل خالی تھا اور فوج کو تنخواہ دینے کا بھی مسئلہ بنا ہوا تھا،اس کی وجہ سے بھی فوج میں بے اطمینانی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کا قبضہ ان علاقوں پر تھا جو معاشی اعتبار سے خوش حال تھے۔اس کے برعکس شمالی ہندوستان کے وہ علاقے جو انقلابیوں کے پاس تھے اور جہاں انگریزوں کے خلاف ماحول تھا،وہاں معاشی حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے۔مسلسل سیاسی بدنظمی، بیرونی حملوں اور اندرونی سازشوں نے ان علاقوں کو اتنا بے جان کر دیا تھا کہ وہ اب کسی جنگ کے مصارف کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔

ہندوستانی فوجیوں اور انقلابیوں کے پاس ہتھیار اور اسلحے بھی پرانے اور کمتر درجے کے تھے،اس کے برعکس انگریز بہتر اسلحہ اور

مواصلات کے بہترین انتظامات سے لیس تھے۔ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس تحریک میں جنگی ماہرین کا ہمیشہ فقدان رہا۔ مولانا احمد اللہ شاہ، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، تاتیاٹوپی، خاں بہادر خاں، کنور سنگھ، ناناصاحب اور جنرل بخت خان وغیرہ ضرور تھے، لیکن مستقل انہیں متعدد افراد کی رقابتیں درپیش رہیں، اس لیے وہ متحد ہوکر ایک محاذ نہیں بناسکے۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کو مغل شہزادوں کا تعاون نہیں ملا، بلکہ اس مشکل وقت میں بھی یہ افواہ پھیلائی گئی کہ شیر شاہ سوری کی طرح اس کا اقتدار بھی مغلیہ خاندان کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ لکھنؤ کی بیگم حضرت محل کو ذہن نشین کرایا گیا کہ اگر احمد اللہ شاہ کی مدد سے اقتدار قائم ہوا تو سُنّیوں کا غلبہ ہو جائے گا۔ لارنس نے سکھوں کو بہادر شاہ ظفر سے بدظن کیا اور ان کی اکثریت نے انقلابیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس وقت جتنی بھی طاقتیں آزادی کے میدان میں سرگرم تھیں، ان میں سے کوئی بھی ایک پورے ہندوستان کا نظام سنبھالنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی اور یہ ایسی محرومی تھی جس نے ساری تحریک کی روح کو مضمحل کر دیا تھا۔

جنگ آزادی کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملک کے اکثر وبیشتر ریاستی حکمراں اپنے مفاد اور ضروریات کے لیے انگریزوں کے ماتحت تھے، جیسے پنجاب اور سرحد کے باشندوں کی بڑی جماعتیں، ستلج اور جمنا کی درمیانی سکھ ریاستیں، دولت آصفیہ یا بعض دوسرے خطے کی ریاستیں اور آبادیاں وغیرہ، ان کی وجہ سے بھی انگریزوں کو بہت مدد ملی اور آزادی کے متوالوں کو نقصان پہنچا۔ نیز معاہدوں کی وجہ سے ان کی جنگی صلاحیتیں بھی ختم ہوچکی تھی۔ ان کی اپنی کوئی فوج نہیں تھی، وہ انگریزوں کی فوج پر منحصر ہوتے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ فوج کا خرچ بھی ان مقامی حکمرانوں کو ہی دینا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ متعدد ریاستوں اور بالخصوص بہادر شاہ ظفر کے امراء اپنے ہی لوگوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے اور درپردہ انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان میں اکثر وبیشتر ایسے تھے جو ذاتی مفاد کی خاطر بڑے سے بڑے مفاد کو قربان کرسکتے تھے۔ انہیں نہ تو اپنے ملک سے محبت تھی اور نہ ہی بہادر شاہ ظفر سے، بلکہ وہ ذاتی اقتدار میں اضافہ کرنے کے لیے دربار سے جڑے ہوئے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں اور نواب احمد قلی خاں وغیرہ جن کا تعلق دربار کے عمائدین میں سے تھا، عوام انہیں انگریزوں کے جاسوس ہونے کا گمان کرتی تھی۔ دربار کی ساری خبریں ان جیسوں سے ہی انگریزوں تک پہنچتی تھیں۔ بعض امراء ایسے بھی تھے جن کے پاس مال ودولت کی فراوانی تھی، لیکن جب مشکل وقت میں ان سے بہادر شاہ ظفر اور جنرل بخت خاں وغیرہ نے پیسہ مانگا تو ایک بھی امیر ایسا نہیں تھا جس نے روپیہ سے مدد کی ہو، بلکہ وہ لڑنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں کسی کے لیے بھی جنگ کامیابی کے ساتھ جاری رکھنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ بہرحال یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے ہندوستانی عوام کو 1857 کی جنگ آزادی میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

20.6 اثرات

اگرچہ 1857 کی جنگ آزادی بظاہر ناکام ہوگئی، لیکن ملک میں اس کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے، جیسے 1857 میں ہی ملکہ وکٹوریہ کی براہ راست حکومت کا قیام، ملکہ کا شاہی فرمان، جس میں باقاعدہ اعلان کیا گیا کہ ہندوستانی حکمرانوں کے حقوق، شان اور عزت کا ہم ایسا ہی پاس ولحاظ رکھیں گے جیسے کہ اپنا، نیز ہندوستانی باشندے جو اپنی موروثی آبائی زمینوں کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں، اس کا پاس ولحاظ

رکھا جائے گا اور قوانین بنانے اور نافذ کرنے میں ہندوستان کے قدیم حقوق اور رسم ورواج کا بھی مناسب لحاظ رکھا جائے گا۔ اس بات سے صرفِ نظر کہ ان وعدوں پر کتنا عمل ہوا، لیکن یہ تو سچ ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی میں بھلے ہی انگریز جیت گئے ہوں، لیکن وہ اپنی مختلف پالیسیوں پر دوبار غور وفکر یا تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح الحاق کی پالیسی کا خاتمہ، برطانوی حکومت کی نئی تنظیم اور اس کے پہلے وائس رائے لارڈ کیننگ کی احتیاط اور اعتدال پر مبنی پالیسیوں کا انعقاد، برطانوی حکومت کے کونسلوں میں ہندوستانیوں کی نمائندگی، لارڈ رپن کے زمانے میں لوکل سیلف پنچایتوں کے الیکشن، لارڈ ڈفرن کے دور میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام اور تحریک آزادی کا آغاز وغیرہ، سب کے سب 1857 کی جنگ آزادی کی اہمیت کا واضح ثبوت ہیں۔ اسی کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ہندوستانیوں نے 1857 کی جنگ آزادی میں ناکامی کے اسباب کا مثبت جائزہ لیا اور 1886 میں آزادی کے لیے منظم ہو کر دوبارہ جدوجہد کا آغاز کیا پھر تقریباً اکسٹھ سال بعد 1947 میں انہوں نے آزادی حاصل کرلی۔

20.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- 1857 کی جنگ آزادی کو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے بڑے پیمانے پر پہلی براہ راست کوشش کے طور پر تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ نصف صدی گزرنے کے بعد جب دوبارہ آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں اٹھارہ سوستاون کی جنگ آزادی کا اہم کردار تھا۔ اسی تحریک نے نئے خیالات کے ساتھ نئی بنیادوں پر جدید ہندوستانی قومی آزادی کی تحریک کو تقویت دی اور اس کے مجاہدین کے دلوں میں عزم واستقلال پیدا کیا، جس کے نتیجے میں ہندوستان کو 1947 میں آزادی ملی۔
- 1857 کی جنگ آزادی غیر ملکی اقتدار کی مخالفت کا نتیجہ تھی اور ہندوستانیوں کا ذہن غیر ملکی تسلط کے خلاف مکمل طور سے تیار ہو چکا تھا۔ ان میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا کرنے میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کا اہم کردار تھا۔ آزادی کی اس جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے، یعنی حکمرانوں، نوابوں، فوجیوں، سپاہیوں، عالموں، پنڈتوں، زمین داروں، تعلق داروں اور راجپوتوں وغیرہ نے بھرپور حصہ لیا تھا۔
- 1857 کی جنگ آزادی کے مختلف سیاسی، مذہبی، سماجی، معاشی اور تعلیمی اسباب تھے۔ ان کے علاوہ بعض وجوہات اور بھی تھیں، بقول سرسید احمد خان: رعایا میں غلط فہمی یعنی حکومت کی تجاویز کا غلط مطلب نکال لینا۔ حکومت کی جانب سے ایسے ضابطوں اور طریقوں کا جاری ہونا جو ہندوستانیوں کی عادتوں اور رسم ورواج کے لحاظ سے مناسب نہیں تھے، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حکومت اپنی رعایا کے اصل حالات اور طور طریقوں سے واقف نہیں تھی۔ اسی طرح برطانوی حکومت کا ان امور کو ترک کر دینا جو ان کے لیے واجب تھا۔ فوج میں بدانتظامی اور بے اہتمامی کا غالب ہو جانا وغیرہ۔ مزید برآں سرسید نے لکھا ہے کہ اٹھارہ سوستاون کی جنگ آزادی میں روس اور ایران کی کوئی سازش نہیں تھی، البتہ ممکن ہے کہ دہلی کے بادشاہ نے شاہ ایران کو کوئی خط لکھا ہو، لیکن وہ سرکشی کی بنیاد نہیں تھا۔ اسی طرح اودھ کی ضبطی بھی عام فساد کی وجہ نہیں تھی۔ فوج میں بھی پہلے سے کوئی سازش نہیں تھی، نیز بہادر شاہ

ظفر اور فوجیوں کے درمیان اس جنگ کے حوالے سے کسی سازش کا سراغ نہیں ملتا۔

- 1857 کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا اور ہندوستان کو برطانوی تاج کے تحت بلاواسطہ حکومت کا موجب قرار دے دیا۔ اسی طرح انگریزوں نے الحاق کی پالیسی کا خاتمہ کیا اور ملکہ وکٹوریہ نے باقاعدہ اعلان کیا کہ ہندوستانی حکمرانوں کے حقوق، شان اور عزت کا ہم ایسا ہی پاس ولحاظ رکھیں گے جیسا کہ اپنا، نیز ہندوستانی باشندے جو اپنی موروثی آبائی زمینوں کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں، اس کا پاس ولحاظ رکھا جائے گا اور قوانین بنانے اور نافذ کرنے میں ہندوستان کے قدیم حقوق اور رسم ورواج کا بھی مناسب لحاظ رکھا جائے گا۔ ان وعدوں پر کتنا عمل ہوا، لیکن یہ تو سچ ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی میں بھلے ہی انگریز جیت گئے ہوں، لیکن وہ اپنی مختلف پالیسیوں پر دوبارہ غور وفکر یا تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے۔

20.8 کلیدی الفاظ

ایسٹ انڈیا کمپنی : ہند میں کاروباری مواقع کی تلاش کے لیے تشکیل دیا گیا ایک برطانوی تجارتی ادارہ۔

غدر : ہنگامہ، بغاوت (انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی 1857 میں ہونے والی لڑائی جسے انگریزوں نے غدر قرار دیا تھا۔

رجمنٹ (Regiment) : آٹھ سو یا ہزار فوجی سواروں کا دستہ، پلٹن یا فوج۔

20.9 نمونہ امتحانی سوالات

20.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. 1857 کی جنگ آزادی سے متعلق ظہیر الدین ظہیر دہلوی کی کتاب کا کیا نام ہے؟

(a). داستان ہند　(b). داستان مشرق　(c). داستان بغاوت　(d). داستان غدر

2. سرسید احمد خان نے اسباب بغاوت ہند کس سن میں تصنیف کی تھی؟

1859.(a)　1860.(b)　1862.(c)　1870.(d)

3. لارڈ ڈلہوزی کو کس سن میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا؟

1856.(a)　1848.(b)　1956.(c)　1835.(d)

4. ہندوستان میں انگریزوں نے کس سن میں عدالتوں کی زبان فارسی سے انگریزی کی تھی؟

1856.(a)　1848.(b)　1857.(c)　1835.(d)

5. انگریزوں نے ستی کی رسم کا خاتمہ کس سن میں کیا تھا؟

1856.(a)   1848.(b)   1857.(c)   1829.(d)

6. والی ریاست اودھ واجد علی شاہ کو کس سن میں تخت سے معزول کیا گیا تھا؟

1824.(a)   1856.(b)   1815.(c)   1864.(d)

7. ہندوستانی فوجی منگل پانڈے کو کب پھانسی دی گئی تھی؟

1856.(a)   1857.(b)   1850.(c)   1864.(d)

8. انگریزوں نے کس سن میں ہندوستانی بیواؤں کی شادی کا قانون پاس کیا تھا؟

1850.(a)   1829.(b)   1856.(c)   1844.(d)

9. بہادر شاہ ظفر نے کتنے مہینے دہلی میں آزادانہ طور پر حکومت کی تھی؟

(a). دو مہینہ   (b). سات مہینہ   (c). پانچ مہینہ   (d). چار مہینہ

10. بہادر شاہ ظفر کا انتقال کس سن میں ہوا تھا؟

1860.(a)   1857.(b)   1865.(c)   1862.(d)

20.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد اور اس کے اغراض ومقاصد پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. ہندوستان میں برطانوی حکومت کی الحاق کی پالیسی کی وضاحت کیجیے۔
3. 1857 کی جنگ آزادی کا پس منظر بیان کیجیے۔
4. 1857 کی جنگ آزادی کی نوعیت کا جائزہ لیجیے۔
5. 1857 کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار پر ایک نوٹ لکھیے۔

20.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. 1857 کی جنگ آزادی کے اسباب پر بحث کیجیے۔
2. 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. 1857 کی جنگ آزادی کے اثرات پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

20.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اسباب بغاوت ہند : سرسید احمد خان
2. 1857 پاک وہند کی پہلی جنگ آزادی : غلام رسول مہر
3. اٹھارہ سوستاون : سریندر ناتھ سین
4. اٹھارہ سوستاون کا تاریخی روزنامچہ : خلیق احمد نظامی

اکائی 21: 1857ء کے بعد کے اہم واقعات

اکائی کے اجزا:

21.0 تمہید

21.1 مقاصد

21.2 1857ء کے بعد کے اہم واقعات

21.3 تحریک علی گڑھ

21.3.1 رسالہ تہذیب الاخلاق

21.3.2 تحریک علی گڑھ اور اس کے مقاصد

21.3.3 تحریک علی گڑھ کی خدمات

21.4 تحریک دارالعلوم دیوبند

21.4.1 قیام کی وجوہات

21.4.2 تحریک دیوبند کے مقاصد

21.4.3 چندے کی تحریک

21.5 تحریک ندوۃ العلماء

21.5.1 اغراض و مقاصد

21.5.2 ندوۃ العلماء کی تحریک کی فکری اساس

21.6 اکتسابی نتائج

21.7 نمونہ امتحانی سوالات

21.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

21.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

21.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

21.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

21.0 تمہید

1857ء کا واقعہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ یہ واقعہ سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے آپ ماضی کے نشانات دیکھ سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں کہ غدر قدامت اور جدیدیت کے درمیان ایک کڑی ہے۔1857ء کا واقعہ ایک حادثہ کے طور پر ہندوستان کی تاریخ میں بہت تیزی سے اٹھا اور دب گیا۔ اس حادثے نے ایسے انمٹ نقوش چھوڑے کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس واقعے نے زندگی کے ہر گوشے پر اپنا اثر چھوڑا۔ 1857ء کے واقعے کے بعد جب خاموشی چھائی تو علمائے کرام اور مفکرین نے صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی قوم کے مستقبل کے بارے میں لائحہ عمل تیار کیا اور اس طرف گامزن ہوئے۔ اسی کے تحت کئی اداروں کا وجود منظر عام پر آیا۔ غرض مفکرین نے کوشش کی کہ مسلمانوں کا وہ مقام پھر سے حاصل ہو سکیں۔ یا کم سے کم وہ تعلیم کے ذریعے ایک عزت دار شہری کی طرح اپنی زندگی گزار سکیں۔ اس اکائی میں آپ علی گڑھ تحریک اور اس کے مقاصد، تحریک دارالعلوم دیوبند اور تحریک ندوۃ العلماء کے بارے میں جانیں گے۔

21.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ اس بات سے واقف ہوں کہ 1857ء کے ہندوستان اور مسلمانوں کے کیا حالات تھے؟ اس وقت علمائے کرام و مسلم مفکرین نے کس طریقے سے اپنے سماج کو اوپر لانے کی کوشش کی۔ کیوں کہ اس وقت مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور اقتصادی سبھی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایسے حالات میں کچھ مفکرین دینی تعلیم اور اس کی اشاعت کے لیے کوشاں رہے۔ اس کے علاوہ سرسید احمد خاں نے تحریک علی گڑھ کی شروعات کی اور انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جدید تعلیم، سائنس اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے سے مذہب پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا ہے۔ اس اکائی میں آپ ان تحریکوں کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے۔

21.2 1857ء کے بعد کے اہم واقعات

1857ء، میں دہلی پر قبضہ کرنے اور وہاں کے آخری تیموری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کرنے کے بعد انگریزوں نے برصغیر پر نوے سال تک حکومت کی۔ انگریزوں نے انتظامی لحاظ سے برصغیر کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک وہ علاقے تھے جن کا انتظام براہ راست انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور یہ صوبے کہلاتے تھے۔ دوسرے وہ علاقے تھے جن کا اندرونی انتظام مقامی نوابوں اور راجاؤں کے سپرد

تھا۔ لیکن بیرونی معاملات تمام تر انگریزوں کی دیکھ ریکھ میں تھا۔ انگریزوں کا دور برصغیر کی تاریخ کا بڑا اہم دور ہے اس زمانے میں جو زندگی کے ہر شعبے میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جو جدید دور کہلاتا ہے۔ یہ دور صنعتی ترقی اور سائنس کا دور ہے۔ جیسا کہ انگریزوں نے برصغیر کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سڑکیں بچھوائیں۔ دریاؤں پر بڑے بڑے فولادی پل بنائے، ریل گاڑیوں کی پٹریاں بچھائیں، بجلی کی ایجاد سے گھر میں روشنی پہونچنے لگی، موٹر گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ انسان برق رفتاری سے سفر کرنے لگا اور اسی طرح کے تمام تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لیکن برصغیر میں انگریزوں کی حکومت مسلمانوں کی حکومت سے بالکل مختلف تھی۔ مسلمانوں نے برصغیر کو اپنا وطن بنایا جب کہ انگریزوں نے برصغیر کو اپنا وطن نہیں بنایا بلکہ انگلستان سے بیٹھ کر اس پر حکومت کی یہاں کی ساری قیمتی اشیاء کو لوٹ کر انگلستان لے گیے۔

برصغیر میں انگریزوں نے اپنے مفاد کے لیے مدرسے اور یونیورسٹیاں بھی قائم کیں۔ ان مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں صرف وہ تعلیم دینا چاہتے تھے جو انگریزوں کی مطلب کی ہو۔ ان کی اس تعلیم کا مقصد یہاں کے مسلم اور ہندوؤں کے دل سے ان کے مذہب کی روح کو ختم کر دیا جائے، وہ بس نام کے مسلم یا ہندو رہ جائیں۔ یعنی اپنی سوچ اور فکر کو لوگوں کے اندر داخل کر دیا جائے تاکہ وہ انگریزوں کے جیسا ہی سوچیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان مدرسوں میں پڑھنے والے طلبہ اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب سے نابلد رہے۔ خود اپنی تاریخ اور اپنے بزرگوں کے شاندار کارناموں کو بھول گیے۔ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ اس طرح پڑھائی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات بڑھیں۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کا دشمن ثابت کیا جائے۔ اور مسلمانوں کی ان خدمات پر پردہ ڈالا جائے جو انہوں نے مذہب کا امتیاز کیے بغیر اس خطے میں تہذیب و تمدن اور علوم وفنون کو ترقی دینے کے لیے انجام دی تھیں۔

1857ء کی جنگ کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا، مسلمانوں کو ان کی جائیداد اور زمینوں سے محروم کر دیا، بے شمار لوگوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا، اور کئی ہزاروں کو جزائر اندمان جلا وطن کر دیا گیا، ان تمام وجوہات کے بعد مسلمانوں کو انگریزوں سے نفرت ہونے لگی یہاں تک کہ نہ انگریزی زبان سیکھنا چاہتے تھے اور نہ ہی ان کے لائے ہوئے دوسرے علوم۔ مسلمان انگریزوں سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ طرز عمل انگریزوں کے لیے مفید ثابت ہوا، کیوں کہ ان کو مسلمانوں پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس انگریزوں نے ہر میدان میں ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی اور ہندوؤں نے بھی انگریزوں کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ جس کے سبب انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے انگریزی حکومتوں کی ملازمت اختیار کی۔ انگریزوں نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو تعلیم اور دولت دونوں میں مسلمانوں سے بہت آگے نکل گیے اور مسلمان افلاس اور جہالت کا شکار ہوئے۔

یہ حالات تھے کہ مسلمانوں میں ایک بہت بڑے رہنما پیدا ہوئے، جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے برطانوی نظر سے مسلمانوں کے خلاف قائم تاثر کو دور کرنے کی بے حد کوشش کی اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے مشکل سے مشکل کام کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور اپنے اس عظیم مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ جن کو دنیا سرسید احمد خان کے نام سے جانتی ہے۔ سرسید کی ذات

قدامت اور جدیدیت دونوں کا امتزاج کیے ہوئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت سے ایک ایسی تحریک پھوٹی جس نے ہند کے مسلمانوں کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس دلایا۔

21.3 تحریک علی گڑھ

سرسید اور ان کے رفقاء کے لیے مدرسۃ العلوم ایک تعلیمی درسگاہ، نئے فکری رجحانات کی ایک علامت احیاء ملی کی ایک تحریک کا نام تھا۔ یہاں وقت کے اشاروں کو سمجھنا بھی سکھایا جاتا تھا اور اس کے دھاروں کو موڑنے کی صلاحیت بھی پیدا کی جاتی تھی۔ سرسید کی بلند حوصلگی، عزم راسخ، خلوص نیت اور جہد مسلسل نے اس مشکل اور متنوع کام کو ایک تحریک کی شکل دے دی تھی۔ زمانے کے پیچ و خم کے ساتھ تحریک کے خد و خال بھی بدلتے رہے لیکن سرسید کے افکار کی معنویت ہر دور کے لیے بڑھتی رہی اور ان کی یہ آواز برابر فضامیں گونجتی رہی۔

9 جنوری 1864 کو سرسید نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ترجمہ سوسائٹی بنائی، جس کا مقصد انگریزوں اور دیگر یورپی زبانوں کی سائنسی کتابوں کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کرنا تھا، پہلی ملاقات جنوری 1864 میں غازی پور کے اس وقت کے کلکٹر (A.P.S Pate) کی صدارت میں ہوئی تھی۔ اس سوسائٹی کو اپریل 1864 میں علی گڑھ منتقل کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد اسے علی گڑھ کی سائنسی سوسائٹی بھی کہا جاتا تھا۔ سوسائٹی نے ہندوستان میں مسلم کمیونٹی میں لبرل اور جدید تعلیم اور مغربی سائنسی علم کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ سوسائٹی نے سالانہ کانفرنس منعقد کیں اور تعلیمی مقاصد کے لیے فنڈ تقسیم کیے اور انگریزی اور اردو میں سائنسی مضامین پر باقاعدگی سے ایک جریدہ شائع کیا۔

21.3.1 رسالہ تہذیب الاخلاق

اردو زبان کا مشہور، مقبول معاشرتی اور اصلاحی ماہنامہ ہے جسے سرسید احمد خاں نے انگلستان سے واپسی پر 24 دسمبر 1870 کو علی گڑھ سے جاری کیا۔ اس ماہنامہ کا انگریزی نام محمڈن سوشل ریفارم تھا۔ اس ماہنامہ میں تمام مضامین اردو میں شائع ہوتے تھے۔ اس کا مدعا مسلمانان ہند کو جدید تہذیب اور سائنس کے فیوض سے روشناس کرانا تھا تاکہ وہ ایک ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔ 1876ء میں یہ بند ہوا پھر دوبارہ تین سال بعد جاری کیا گیا۔ پھر چند سال کے بعد بند ہو گیا، پھر تیرہ یا چودہ برس بعد اس کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اس پرچے کی وساطت سے سرسید نے انگریزی زبان انگریزی تعلیم کے حق رائے عامہ کو ہموار کی اور محمڈن کالج قائم کیا۔

اس کے علاوہ سرسید نے 27 دسمبر 1886 کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد بھی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے اقدامات کرنا تھا۔ اس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا تھا۔ کانفرنس نے تعلیم کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر جلسے کیے۔ ہر شہر اور ہر قصبے میں اس کی ذیلی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اس کانفرنس کی کوششوں سے مسلمانوں کے اندر تعلیمی جذبہ اور شوق پیدا ہوا۔ اس کانفرنس نے ملک کے ہر حصے میں اجلاس منعقد کیے اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرایا۔

21.3.2 تحریک علی گڑھ اور اس کے مقاصد

یوں تو بغاوت کے بعد بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں۔ لیکن علی گڑھ تحریک ان تمام تحریکوں میں اپنی انفرادی شان رکھتی ہے۔ یہ سرسید کی سیاسی، سماجی اور مذہبی علمی وادبی کاوشوں کی وجہ سے وجود میں آئی۔ اس لیے اس تحریک کو سرسید تحریک کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک نے اردو شعر وادب پر بھی گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اس تحریک کے اساسی پہلوؤں میں نئے علوم کا حصول مذہبی علوم کی عقلی تفہیم سماجی اصلاح اور زبان وادب کی ترقی و سربلندی شامل تھی۔ انگریزی زبان، مغرب کا اثر وغیرہ بھی اس کے زیر بحث میں شامل تھے۔ اس تحریک کا اہم مقصد ہندوؤں اور انگریزوں کی سیاسی مفاہمت دور میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا احیاء اور نئے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی ترقی، بقااور سربلندی کے لیے ایک مثبت راستے کا تعین بھی تھا۔

21.3.3 تحریک علی گڑھ کی خدمات

علی گڑھ تحریک ایک اہم تحریک تھی۔ اس سے ادبی تحریک کو بھی تقویت حاصل ہوتی رہی ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی، محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس، تہذیب الاخلاق اور ایم او کالج کے بہی خواہوں نے تحریر و تخلیق پر اتنا زور دیا کہ اس کے وجہ سے شعر وادب کا ایک معیار سامنے آگیا۔ انگریزوں کو ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں ایک کے بجائے دو قومیں آباد ہیں۔ انگریزوں نے ہندوؤں کو سیاسی میدان میں آگے بڑھانے کی کوشش کی جب کہ مسلمانوں کے لیے اس کے درمیان مذہب کی رکاوٹ حائل تھی وہ بہت سی نئی چیزوں اور باتوں کو سیکھنے سے گریزاں تھے۔ جس سے ہندوستانی مسلمانوں کی شخصیت میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔

ایسے میں سرسید مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی دلوں میں جو نفرت تھی وہ ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی۔ وہ برابر مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے رہے کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دیں اور علمی میدان میں شانہ بشانہ کھڑے ہوں اور ایسا کرنے سے ہی قوم کی معاشی زندگی میں خوشحالی آئے گی۔ تحریک علی گڑھ کا سیاسی زاویہ ایک فعال زاویہ تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں انقلاب برپا کیا اور انہیں ایک جداگانہ قوم کا احساس دلا کر ان کے لیے سیاسی انقلاب کی راہیں ہموار کیں۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانان ہند کی مذہبی خدمات میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مذہب کا خول توڑنے کی ابتدا کا آغاز بھی سرسید نے ہی کیا۔ اس وقت مذہب کے جس روایتی زاویے نے مسلمانوں کے ذہن کو آلودہ کر رکھا تھا سرسید نے اسے عقل سلیم کے ذریعے حل کیا۔

علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں پر اس نکتہ کو واضح کیا کہ انگریزی تعلیم اسلام کے بنیادی نظریات پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ فقہ اور فلسفہ کے ساتھ اسلام کے تفہیم میں عقلی نقطہ نظر کو استعمال کیا۔ سرسید احمد خان نے علم کے قدیم تصور کو رد کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ تھا کہ ایسا علم حاصل کیا جائے جو قوم کو ترقی اور عروج بخشے اور معاشی زندگی میں حائل دشواریوں کا ازالہ کر سکے۔ علی گڑھ تحریک نے مذہب کی صداقت کے لیے عقل انسانی کو اور قانون فطرت کو معیار قرار دیا۔ مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو پختگی عطا کرنے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے اس تحریک نے اسلام کے داخلی اور خارجی خطروں کو تحفظ بخشا اور ہندوستانی رسومات اور توہمات کے منفی اثرات کو زائل کیا۔

اس تحریک کے ذریعہ زبان کو بھی وسعت ملی اور اردو ادب کے نئے اسالیب سے بھی لوگ آشنا ہوئے۔ علی گڑھ نے سائنسی نقطہ

نظر اور اظہار کی صداقت کو اہمیت دی۔ ادبی زاویے میں اس تحریک کا سب سے بڑا اثر سوانح اور سیرت نگاری پر پڑا۔

اٹھارہویں صدی میں عیسائی مبلغین اسلام کے متعلق غلط کوائف پھیلا رہے تھے چنانچہ اس تحریک نے ان غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی۔ سرسید نے خطبات احمدیہ، مولوی چراغ علی کے رسائل اور نذیر احمد دہلوی کی کتاب امہات میں ان حقائق کو بیان کیا ہے۔ شبلی نعمانی نے اس تحریک کے زیر اثر سیرت نگاری کو موضوع بنایا۔ شبلی نے سیرت النبیؐ، الفاروق، المامون اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر جیسی کتب لکھی۔

اس تحریک کے زیر اثر سرسید نے بہت ساری کتابیں تصنیف کیں جن میں آثار الصنادید، رسالہ اسباب بغاوت ہند، لائل محمڈن آف انڈیا، تحقیق لفظ نصاریٰ جیسی کتابیں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس دور کی ایک کتاب خطبات احمدیہ بھی ہے۔ جو سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کے جواب میں تحریر کی گئی۔ علی گڑھ تحریک کے ایک اہم مصنف نواب محسن الملک ہیں۔۔ محسن الملک تہذیب الاخلاق کے اہم مضمون نگار تھے۔ سرسید کے رفقاء میں مولوی چراغ علی کا نام آتا ہے۔ ان کا اساسی موضوع مذہب تھا۔ آپ نے معترضین اسلام کے خلاف ایک دفاعی مورچہ بنایا۔ الطاف حسین حالی نے اس تحریک کے زیر اثر پادری رماء الدین کی غلط بیانیوں کے جواب میں تریاق مسموم تحریر کی۔ آپ نے اردو میں سوانح نگاری کی ایک بنیاد رکھی۔ حیات جاوید، یادگار غالب اور حیات سعدی ان کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ اس تحریک کے ذریعے مولوی نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر جیسے نامور ناول نگار بھی اردو ادب میں ایک بیش قیمتی اضافہ تھا۔ عبدالحلیم شرر نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کو ان کے تاریخی اسلاف سے متعارف کرایا۔ اس طرح امداد امام اثر نے کاشف الحقائق کی صورت میں اردو تنقید کا ایک روشن زاویہ پیش کیا ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی جو ایک تحریک کی شکل میں 1875 میں قائم ہوئی تھی وہ آج دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ جہاں جدید علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اور یہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔ اگرچہ علی گڑھ ایک فعال تحریک تھی۔ جو ایک واضح نصب العین کی جدوجہد کر رہی تھی مگر اس کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار بھی ہوا۔ داخلی سطح پر چند رفقاء نے بھی سرسید کے مذہبی اور تعلیمی امور پر اختلاف کیا جب کہ کچھ متشدد ناقدین نے بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اول الذکر کا اختلاف شائستہ انداز لیے ہوئے تھا۔ جب کہ موئخر الذکر طبقہ نے ہجو کا انداز اختیار کیا۔ مجموعی طور پر علی گڑھ تحریک اردو کی اوّلین فکری تحریک تھی جس نے نثری اصناف کو فروغ دیا اور قوم کو پسماندگی سے ترقی کی جانب مائل بھی کیا۔

21.4 تحریک دارالعلوم دیوبند

ہندوستان میں مسلمانوں کی 800 سالہ حکومت کا خاتمہ اور 1857 کا المناک سانحہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا اور اس کے لیے کچھ وقتی محرکات بھی نہیں تھے۔ یہ سب کچھ ہندوستان کے مسلمانوں کی اسلام سے دوری اور بے تعلقی کا نتیجہ تھا۔ لیکن اللہ کو سرزمین ہند میں اسلام اور مسلمانوں کی بقامنظور تھی اس لیے ہندوستان میں مسلمانوں کے اس زوال کا احساس کچھ نیک طبیعتوں نے محسوس کیا اور آج اپنی کوشش کا

نتیجہ تھا کہ بدترین حالات سے گزرنے کے باوجود مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔

جس زمانے میں سر سید احمد خان مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور جدید علوم اور جدید تعلیم سے مسلمانوں کو روشناس کر رہے تھے۔ اس زمانے میں علماء کا وہ طبقہ جس کا تحریک مجاہدین سے تعلق تھا اسلامی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ لوگ انگریزی حکومت سے کوئی تعلق قائم نہیں کرنا چاہتے تھے اور مغربی تہذیب وافکار سے مفاہمت کے خلاف تھے۔ اگرچہ علماء کے اس گروہ میں جدید ریاست کو چلانے کی صلاحیت نہیں تھی اور وہ دور جدید کے تقاضوں سے بھی بہرہ ور نہیں تھے لیکن اپنی اسلامی حیثیت پر فخر کا احساس ان کے اندر پایا جاتا تھا۔

21.4.1 قیام کی وجوہات

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانان ہند کے سیاسی اور معاشی زوال کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق، ثقافت، مذہب اور معاشرت پر بھی دوررس نتائج کے حامل برے اثرات مرتب ہوئے۔ مسلمانوں کا ملی تشخص خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ایک طرف سقوط دہلی کے بعد مدرسہ رحیمیہ کے دروازے بند کر دیے گیے تھے تو دوسری طرف ان کو ان کے مذہب سے بے زار کرنے کے لیے مذموم کوششوں کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ مسلمانوں کو اسلامی احکامات کی اصل روح سے باخبر رکھا جائے اور ان میں جذبہ جہاد اور جذبہ شہادت کی تجدید کا عمل بلا تاخیر شروع کیا جائے تاکہ اسپین اور خلافت عثمانیہ کے مسلمانوں کی طرح ان کا شیرازہ نہ بکھر جائے۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور تحریک سے متاثر کچھ علماء نے برطانوی ہند میں دینی مراکز قائم کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ اس ضرورت کے پیش نظر یوپی کے ضلع سہارنپور کے ایک قصبے نانوتہ کے حضرت قاسم نانوتوی نے 30 مئی 1866 بمطابق 15 محرم الحرام 1283ھ کو چھتے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں نہایت سادگی کے ساتھ دارالعلوم کا افتتاح کیا۔

حالات وواقعات کا ایسا زبردست چیلنج تھا جس کو غیرت مند اور باہمت مسلمانوں کے لیے قبول کرنا لازمی تھا۔ چنانچہ مسلم علماء کی جانب سے یہ چیلنج قبول کیا گیا۔ اس وقت کے ان بزرگوں میں جو اس خونی انقلاب سے خود بھی گزر چکے تھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہندوستان میں بے سہارا مسلمانوں کے دین وایمان کو سنبھالنے کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے۔ اس کو اتفاق کہیے یا تقدیر الٰہی کہ اس وقت اس دائرہ عمل کے مذاکروں کا مرکزی مقام دیوبند کی چھتہ والی مسجد بن گئی۔ مسلمانوں میں دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کے ملی شیرازہ بندی کے لیے ایک دینی وعلمی درسگاہ کا قیام ضروری ہے۔ اور یہ طے پایا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونی چاہیے۔ مسلمان چوں کہ پہلے سے ہی حکومت سے متنفر تھے اس لیے انہوں نے یہ طے کیا کہ اس دینی درسگاہ کو حکومت کے رحم وکرم اور امداد سے محفوظ رکھا جائے۔ اس لیے اس کے قیام کے لیے عوامی چندے کی تحریک شروع کی گئی اور ابتدا میں 300 روپیے جمع ہوئے۔ اس درسگاہ کے پہلے مدرس مولانا محمود صاحب تھے اور پہلے طالب علم مولانا محمود الحسن جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوئے۔

21.4.2 تحریک دیوبند کے مقاصد

دنیا کی کوئی بھی تحریک ہو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد یا وہ کسی نہ کسی غرض کے تحت عمل میں آتی ہے۔ اور پھر وہ اس کے حصول کے لیے سرگرم رہتی ہے اور اس کو منزل مقصود کی طرف لے جانے کی تگ و دو کرتی ہے۔ اس طرح تحریک دیوبند بھی کچھ مسائل اور کچھ غرض کے تحت وجود میں آئی اور حد درجہ تک اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب بھی رہی اور اپنے مشن کو برابر آگے بڑھاتی رہی۔ تحریک دیوبند جس مقصد کے لیے وجود میں آئی وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1- قرآن مجید، تفسیر، احادیث، عقائد و کلام اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات پہونچانا۔ رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔

2- اعمال و اخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلباء کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

3- اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت تحریر و تقریر کے ذریعہ ہی لانا۔

4- حکومت کے اثرات سے بچنا اور علم و فکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

5- علوم دینیہ کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق کرنا۔ اس تحریک نے ہمیشہ اپنے مقصد کو پیش نظر رکھا اور حصول مقصد کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم اور اس کی خدمات کو ملک و بیرون ملک میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔

1912ء میں جب مشہور مصری عالم رشید مظہری نے اس مدرسہ کو دیکھا تو انہوں نے کہا کہ:

"اگر میں دارالعلوم کو نہ دیکھا ہوتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتایا کہ ہندوستان میں ابھی بھی عربی اور دینی تعلیم کا اعلیٰ پیمانے پر انتظام ہے۔"

21.4.3 چندے کی تحریک

چندے کی فراہمی کے سلسلے میں جس نے سب سے پہلے عملی اقدام کیا وہ حضرت حاجی محمد عابد تھے۔ حاجی فضل حق صاحب نے حضرت نانوتوی کی سوانح مخطوطہ میں دارالعلوم کے لیے چندے کا طریقہ اختیار کرنے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ایک دن بوقت اشراق حضرت حاجی سید محمد عابدؒ سفید رومال کی جھولی بنا اور اس میں تین روپے اپنے پاس سے ڈال چھتے کی مسجد سے تن تنہا مولوی مہتاب علی مرحوم کے پاس تشریف لے گیے۔ مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپئے عنایت کیے اور دعا کی اور بارہ روپئے مولوی فضل الرحمٰن نے اور چھ روپئے حاجی فضل حق صاحب نے دیے۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی صاحب ذوالفقار علی کے پاس آئے مولوی صاحب نے فوراً بارہ روپئے دیے اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی ثانی بھی موجود تھے انہوں نے بھی بارہ روپیہ عنایت کیا۔ وہاں سے اٹھ کر یہ درویش صفت محلہ ابوالبرکات پہونچے دو سو روپئے جمع ہو گیے اور شام تک تین سو روپئے پھر رفتہ رفتہ خوب چرچا ہوا اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں"

آج سے چند سو سال پہلے بلاشبہ یہ ایک عجیب و غریب اور نئی بات تھی کہ عوامی چندے کی بنیاد پر ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جو حکومت کے اثرات سے آزاد ہو۔ آنے والے عوامی دور کے پیش نظر یہ ایک زبردست پیش بینی تھی۔ اوقاف کے سابقہ طریقے کے بجائے عوامی چندے کا یہ طریقہ بہت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ دینی مدارس کے قیام اور دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیے یہ ایک ایسا مفید اور مستحکم طریقہ تھا جس نے دینی تعلیم کے فروغ کو عوامی چندے کی تحریک میں تبدیل کر دیا۔ چندے کی نسبت دارالعلوم کا شروع سے طے شدہ اصول یہ رہا ہے کہ اس میں نہ تو چندے کے لیے کوئی لازمی مقدار مقرر کی گئی نہ مذہب و ملت کی تخصیص روا رکھی گئی ہے۔ چندے کی اس دفعہ کے الفاظ یہ ہیں۔ ''چندے کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے اور نہ خصوصیت مذہب و ملت ہے''۔

دیوبند اور علی گڑھ کے مدرسوں میں ایک اور بڑا فرق یہ تھا کہ جہاں علی گڑھ یونیورسٹی برطانوی حکومت سے مالی امداد حاصل کرتی تھی دارالعلوم دیوبند نے حکومت سے کسی قسم کی امداد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ علم حدیث کو عام کرنے میں اور مسلمانوں کے معاشرے سے بدعتوں اور غیر اسلامی رسوم کا قلع قمع کیا۔ یہاں کے علماء ملکی سیاست سے بھی بے تعلق نہیں رہے۔ خصوصاً شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی نے آزادی کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا اور قید و بند کے مرحلوں سے گزرے۔

21.5 تحریک ندوۃ العلماء

چودھویں صدی کے آغاز اور انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں عالم اسلام تفرقہ و انتشار، پریشان خیال اور فکری اضمحلال کی آخری منزل میں تھا۔ نئے تغیرات اور نئے حوادث کا سامنا کرنے اور نئے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت علمائے دین میں جو ملت کے حقیقی قائد تھے اور اس طریقہ تعلیم جو ان کو پیدا کرنے کا واحد ذریعہ تھا تیزی سے مفقود ہوتا جارہا تھا۔ مسلم معاشرہ متوازی طبقوں کے درمیان منقسم ہو گیا تھا۔ ایک طرف علماء دین تھے جو عربی مدارس سے قدیم طرز پر پڑھ کر نکلے تھے تو دوسری طرف مغربی تعلیم یافتہ حضرات جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ساختہ پرداختہ تھے۔ ان دونوں کے درمیان اجنبیت اور بے گانگی کی خلیج تھی۔ اور یہ خلیج دن بدن بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اندیشہ تھا کہ وہ اس حد تک پہنچ جائیں کہ کسی ترجمان کے بغیر افہام و تفہیم ممکن نہ ہو۔

معاملہ بس انہی دونوں طبقوں پر منحصر نہ تھا۔ ملت کے مختلف مذہبی فرقے اور فقہی مسلک ایک دوسرے کو تحقیر یا خوف و نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گیے تھے۔ ہر طرف مناظروں اور مجادلوں کا بازار گرم تھا۔ اور وہ کبھی کبھی سخت جارحانہ شکل اختیار کر لیتے تھے۔ معاملہ صرف اثبات و تردید تک محدود نہ تھا بلکہ تفسیق اور تکفیر تک کی گرم بازاری تھی۔ جہاں تک نصاب درس کا تعلق تھا اس میں کسی کمی یا زیادتی کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی تھی۔ علمی حلقوں پر بالعموم ذہنی عزلت اور گوشہ نشینی کی فضا تھی۔ اور جدید علوم و افکار اور علمی تحقیقات کے لیے کوئی وزن کھلا نہیں رہ گیا تھا۔ تیز رو اور تغیر پذیر زندگی سے صرف اسی وقت واسطہ پڑتا تھا جب علماء سیاست کے راستے پر گامزن ہوتے۔ مسلم معاشرہ کی پاسبانی و نگرانی اور مغربی علوم کے حملوں اور اس کی تشکیلی اثرات سے مسلمانوں کی حفاظت کے فریضہ سے علماء کنارہ کش ہوتے چلے جارہے تھے، اور تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کے غاشیہ برداروں فکری اور تہذیبی شکست کے نقیبوں کے رحم و کرم پر تھا۔

اس نازک بحرانی دور میں 1892ء میں وقت کے ایک روشن ضمیر صاحب دل اور ذی ہوش عالم مولانا سید علی مونگیری کی تحریک پر مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی کے موقع پر انجمن ندوۃ العلماء کے قیام کا فیصلہ ہوا اور 22/23/24/ اپریل 1894ء کو اسی مدرسہ فیض عام کی دستار بندی کے موقع پر کانپور میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بڑی شان و شوکت سے ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب علمائے دین جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ مذہب حنفی کے علمبردار علماء اہل حدیث کے ساتھ، امراء و رؤساء اور ماہر تعلیم کے ساتھ شانہ بشانہ اور صف بہ صف نظر آئے۔

نام کی تجویز: اس انجمن کا نام ندوۃ العلماء اس لیے تجویز کیا گیا تھا کہ یہ انجمن دراصل جماعت علماء ہی کے غور و فکر انہی کے دعوت پر قائم ہوئی تھی۔ اور وہی اس کے روح رواں تھے۔ اس انجمن نے جن بنیادوں پر اپنے سفر کا آغاز کیا وہ مسلمانوں کا باہمی اتحاد تھا۔

1894ء سے جس تحریک کا آغاز ہوا اور ندوۃ العلماء نے جو اصلاحی و تعمیری سفر شروع کیا وہ کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ اس کے سالانہ اجلاس بڑی خوش اسلوبی اور بلند معیار کے ساتھ ہندوستان کے مرکزی شہروں میں منعقد ہوتے رہے۔ اور اس کی آواز سارے ہندوستان میں بلند ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ 1898ء میں لکھنو میں اپنے تخیل اور مقاصد کے مطابق ایک تعلیمی تجربہ گاہ اور دینی درسگاہ "دارالعلوم ندوۃ العلماء" کے نام سے آغاز کیا۔ جس نے ہر دور میں نامی گرامی شخصیت پیدا کی۔

تحریک ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے مابعد وجود میں آئی۔ گویا ندوۃ العلماء کی تاسیس اس وقت ہوئی جب کہ قدیم و جدید مکتب خیال کی دونوں تحریکوں کی سرگرمیوں کو برسوں بیت چکے تھے۔ دیوبند کے قیام کو 26 سال ہو چکے تھے اور علی گڑھ کالج اپنی عمر کی اٹھارہویں منزل پوری کر رہا تھا۔ علی گڑھ اور دیوبند کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں کے عین شباب میں اور ان کے ربع صدی کے تجربات کے بعد وہ کیا اسباب تھے۔ جس نے ندوۃ العلماء کی تاسیس و تکمیل پر ملت اسلامیہ کے چند دردمند حضرات کو مجبور کیا۔

21.5.1 اغراض و مقاصد

ابتدا میں اس تحریک کے دو مقاصد تھے۔

1. علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔
2. رفع نزاع باہمی یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

یہ تحریک جوں جوں آگے بڑھتی رہی اس نے اپنے دائرہ کار اور مقاصد میں اضافہ بھی کیا۔ گویا کہ ان دو مقاصد کے بعد اور دو مقاصد کا اضافہ کیا گیا۔

1. ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب و سنت کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔
اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادر وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

21.5.2 ندوۃ العلماء کی تحریک کی فکری اساس

ندوۃ العلماء کی تحریک کی فکری اساس کیا تھی۔ وہ کیا خصوصیت تھی جس کی وجہ سے وہ ملت کی رہنمائی اور حفاظت اور اس کو وقت کے خطروں سے بچانے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی تھی۔ اس بات کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "حیات عبدالحی" میں لکھا ہے کہ مولانا سید عبدالحی صاحب نے ندوۃ العلماء کی تحریک شروع سے اپنی دلچسپی کا اور سرگرمی کا مرکز بنایا اور اپنی تمام توانائی اور صلاحیتیں اس پر کیوں مرکوز کردیں اس کو بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ:

1. اس تحریک کی اساس خالص دینی تھی یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا۔
2. اس تحریک میں علماء طبقہ کو مرکزی مقام دیا گیا اور اسی کو امت کی تعمیر و تخریب ترقی و تنزل و اصلاح و فساد کا اصل ذمہ دار قرار دے کر اپنی دعوت کا جدوجہد کا مرکز بنایا گیا کہ امت میں اصلاح حال کی کوشش حقیقی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک علماء اس کے داعی اور علمبردار نہ بنے۔ اور ان میں امت کی رہنمائی اور قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو اس کے لیے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سنت رمز و شناس ہونے کی ضرورت ہے تو وہیں دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔
3. ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہی اصلاح و ترقی نصاب کے کام سے ہوا تھا۔
4. اس تحریک کا مزاج (سیاسی ہنگاموں کے بجائے) علمی و فکری تھا اور یہی ان کا اصل مزاج تھا۔

21.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- برصغیر میں انگریزوں نے اپنے مفاد کے لیے مدرسے اور یونیورسٹیاں بھی قائم کیں۔ ان مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں صرف وہ تعلیم دینا چاہتے تھے جو انگریزوں کی مطلب کی ہو۔ ان کی اس تعلیم کا مقصد یہاں کے مسلم اور ہندوؤں کے دل سے ان کے مذہب کی روح کو ختم کردیا جائے، وہ بس نام کے مسلم یا ہندو رہ جائیں۔ یعنی اپنی سوچ اور فکر کو لوگوں کے اندر داخل کردیا جائے تاکہ وہ انگریزوں کے جیسا ہی سوچیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان مدرسوں میں پڑھنے والے طلبہ اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب سے نابلد رہے۔
- سرسید کی ذات قدامت اور جدیدیت دونوں کا امتزاج کیے ہوئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت سے ایک ایسی تحریک پھوٹی جس نے ہند کے مسلمانوں کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس دلایا۔
- علی گڑھ یونیورسٹی جو ایک تحریک کی شکل میں 1875 میں قائم ہوئی تھی وہ آج دنیا کی بڑی یونیورسٹی میں سے ہے۔ جہاں جدید علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اور یہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔

- 1892ء میں وقت کے ایک روشن ضمیر صاحب دل اور ذی ہوش عالم مولانا سید علی مونگیری کی تحریک پر مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی کے موقع پر انجمن ندوۃ العلماء کے قیام کا فیصلہ ہوا اور 22/23/24/ اپریل 1894ء کو اسی مدرسہ فیض عام کی دستار بندی کے موقع پر کانپور میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بڑی شان و شوکت سے ہوا۔
- جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانان ہند کے سیاسی اور معاشی زوال کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق، ثقافت، مذہب اور معاشرت پر بھی دور رس نتائج کے حامل برے اثرات مرتب ہوئے۔ مسلمانوں کا ملی تشخص خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر یوپی کے ضلع سہارنپور کے ایک قصبے نانوتہ کے حضرت قاسم نانوتوی نے 30 مئی 1866 بمطابق 15 محرم الحرام 1283ھ کو چھتے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں نہایت سادگی کے ساتھ دار العلوم کا افتتاح کیا۔

21.7 نمونہ امتحانی سوالات

21.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سائنٹفک سوسائٹی کب قائم ہوئی؟

(a).1864ء (b).1920ء (c).1874ء (d).1875ء

2. رسالہ "تہذیب الاخلاق" کی کب شروعات کی گئی؟

(a).1870ء (b).1866ء (c).1864ء (d).1875ء

3. "اسباب بغاوت ہند" کے مصنف کون ہیں؟

(a). سر سید احمد خاں (b). علامہ شبلی نعمانی (c). محسن الملک (d). مولوی نذیر احمد

4. دار العلوم دیوبند کب قائم ہوا؟

(a).1866ء (b).1864ء (c).1820ء (d).1920ء

5. مصر کے مشہور عالم رشید رضا مظہری کس سال میں دیوبند کا دورہ کیا؟

(a).1912ء (b).1920ء (c).1866ء (d).1864ء

6. مولانا محمد علی مونگیری کی تحریک پر کون سا ادارہ قائم کیا گیا؟

(a). ندوۃ العلماء (b). علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (c). دار العلوم دیوبند (d). جامعۃ الفلاح

7. سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب کس نے دیا تھا؟

(a). سر سید احمد خاں (b). شبلی نعمانی (c). ماہر القادری (d). سید مودودی

8. دارالعلوم دیوبند کے تحریک کے روح رواں کون تھے؟

(a). قاسم نانا توی (b). شبلی نعمانی (c). سر سید احمد خاں (d). سب غلط

9. سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی کہاں قائم کی؟

(a). غازی پور (b). مرادآباد (c). اعظم گڈھ (d). بنارس

10. دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم کا نام بتائیں؟

(a). محمود الحسن (b). اشرف علی تھانوی (c). نواب صدیق حسن (d). تمام صحیح

21.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. رسالہ تہذیب الاخلاق کا مختصر تعارف کرایے۔
2. تحریک دیوبند کے مقاصد پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. تحریک ندوۃ پر روشنی ڈالیے۔
4. تحریک ندوۃ العلما کے اغراض و مقاصد پر مختصر روشنی ڈالیے۔
5. چندے کی تحریک پر روشنی ڈالیے۔

21.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. 1857ء کے بعد اہم واقعات پر جامع نوٹ لکھیے۔
2. تحریک علی گڑھ اور اس کے مقاصد و خدمات مفصل مضمون تحریر کیجیے۔
3. تحریک دارالعلوم دیوبند اور اس کے قیام کی وجوہات پر روشنی ڈالیے۔

21.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ دارالعلوم دیوبند : سید محبوب رضوی
2. دارالعلوم دیوبند کی جامع و مختصر تاریخ : مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی
3. تاریخ ندوۃ العلماء : مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی
4. سر سید اور علی گڑھ تحریک : پروفیسر خلیق احمد نظامی

اکائی 22: جماعت مجاہدین اور ریشمی رومال تحریک

اکائی کے اجزا:

22.0 تمہید

22.1 مقاصد

22.2 جماعت مجاہدین کا پس منظر اور قیام

22.3 نوعیت اور مقاصد

22.4 سید احمد شہید (1786-1831) اور تحریک جماعت مجاہدین

22.4.1 تحریک جماعت مجاہدین

22.5 ناکامی کے اسباب اور اثرات

22.6 ریشمی رومال تحریک کا پس منظر اور قیام

22.6.1 نوعیت اور مقاصد

22.7 مولانا محمود حسن (1851-1920) اور ریشمی رومال تحریک

22.7.1 ریشمی رومال تحریک

22.8 ناکامی کے اسباب اور اثرات

22.9 اکتسابی نتائج

22.10 کلیدی الفاظ

22.11 نمونہ امتحانی سوالات

22.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

22.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

22.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

22.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

22.0 تمہید

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات روبہ زوال تھے۔ ایک طرف مغل حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور ملک کا بیشتر حصہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، اب سرزمین ہند پر یا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ تھا یا پھر چند علاقائی حکمرانوں کا۔ وہیں دوسری طرف شاہ ولی اللہؒ (1703-1762) کی تعلیمات کے اثرات اب بھی باقی تھے، اس کے نتیجے میں متعدد ایسی تحریکات وجود میں آئیں جنھوں نے اسلام اور اس کی تعلیمات کو نافذ کرنے اور انہیں غالب کرنے کی جدوجہد کی۔ ان سب کے طریقہ کار مختلف ہونے کے باوجود بھی مقاصد ایک تھے۔ ان ہی تحریکات میں جماعت مجاہدین اور ریشمی رومال تحریک بھی شامل ہیں۔ دونوں تحریکوں کا بنیادی مقصد غلبہ اسلام اور کلمہ حق کو بلند کرنا تھا۔ اس اکائی میں ان دونوں تحریکوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا، البتہ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس اکائی کو لکھنے میں بنیادی طور پر غلام رسول مہر اور مسعود عالم ندوی کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

22.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ کو معلوم ہو جائے گا کہ تحریک جماعت مجاہدین اور ریشمی رومال تحریک کا پس منظر کیا تھا؟ ان کے بانی کون تھے؟ ان کے مقاصد کیا تھے؟ کس طرح سے انہوں نے ان تحریکات کو منظم کیا؟ اس سلسلے میں انہیں کن مسائل ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟ انہوں نے کس طرح کی قربانیاں دیں؟ ان تحریکات کے اہم مراکز کہاں تھے؟ ناکامی کے اسباب کیا تھے اور ان تحریکوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

22.2 جماعت مجاہدین کا پس منظر اور قیام

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے مسلمان زندگی کے تمام شعبوں میں زوال پذیر تھے۔ سیاست میں مغلوں کی شان وشوکت اور دبدبہ ختم ہونے لگا تھا اور ان کی جگہ انگریز اور ان کے ہم نوا بالواسطہ یا بلاواسطہ قابض ہو چکے تھے۔ معاشی طور پر بھی مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی، کیوں کہ وہ سماج مخالف لوگوں کی لوٹ مار اور ظلم وستم سے پریشان تھے۔ دیہاتیوں اور شہریوں میں محنت کرنے کے عناصر مفقود تھے، اس لیے تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت کی ترقی بھی نہ کے برابر تھی۔ مذہبی صورت حال کچھ اچھی نہ تھی، توحید پر تصوف کے غیر شرعی اثرات نمایاں تھے، مسجدیں غیر آباد تھیں، عوام کا تعلق اللہ کے بجائے جعلی فقراء، درویشوں، دیوانوں اور بزرگوں سے تھا، انہیں کو وہ اپنا مسیحا، شفیع اور ولی سمجھتی تھی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مختلف مزاروں کی زیارت کو جاتی اور ان ہی کی پرستش کیا کرتی تھی۔ نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ مسلمان تعلیمی میدان میں بھی کافی پیچھے تھے، کچھ مدارس ضرور تھے، لیکن وہ مالی تنگی اور علمی زوال کی وجہ سے دم توڑ رہے تھے۔ اخلاقی زوال کا یہ عالم تھا کہ معاشرے میں

افیون، شراب اور دیگر نشے کی چیزیں عام تھیں، اسی طرح ذلیل ترین اعمال جیسے تعویز، گنڈے اور بتوں کی پرستش وغیرہ کی جاتی تھی۔ ہندو مسلم تہذیب کا آپس میں اس قدر اختلاط تھا کہ مسلمانوں میں بھی بدعات وخرافات اور ہندوانہ رسم ورواج در آئے تھے۔ معاشرے میں بعض روحانی ہستیاں اور اہل علم ودانش ضرور تھے، لیکن ان کی تعداد کم تھی اور ان میں سے اکثر اسلام کی اصل روح کو پیش کرنے سے قاصر تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مسلمانوں میں سے اسلام کی اصل روح غائب ہو چکی تھی اور ان میں اسلام کے نام پر چند رسومات اور توہمات کے علاوہ کچھ باقی نہیں تھا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ سرزمین ہند میں کوئی ایسی شخصیت جنم لے جو ان تمام بدعات وخرافات کو ختم کر کے اسلام کی حقیقی تصویر انسانوں کے سامنے پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو سید احمد شہید (1786-1831) کے ذریعے لیا۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے 'جماعت مجاہدین' یا تحریک مجاہدین قائم کی۔ اس تحریک کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دعوتی وجہادی تحریک ہونے کا شرف حاصل ہے۔

22.3 نوعیت اور مقاصد

جماعت مجاہدین کا تعلق درحقیقت "ولی اللّٰہی تحریک" (شاہ ولی اللہؒ کی تحریک) سے تھا۔ سید احمد شہید نے اسی تحریک کے بعض شعبوں جیسے اتباع سنت، دعوت وتبلیغ، تصوف اور جہاد کو مزید آگے بڑھایا۔ متعدد مؤرخین نے، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، اس تحریک کو "وہابی تحریک" کا نام دیا ہے اور انہوں نے اسے شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب بن سلیمان نجدی (1703-1792) کی "نجد کی تحریک توحید واصلاح" سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، حالاں کہ یہ بات درست نہیں ہے، کیوں کہ دونوں کے مآخذ (قرآن وسنت) ایک ہونے کے باوجود ان کے درمیان بعض بنیادی مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے، نیز طریقہ کار میں بھی واضح فرق موجود ہے۔ محمد بن عبد الوہاب کی دعوت میں توحید اور ترک بدعت پر زیادہ زور دیا گیا ہے، جب کہ سید احمد شہید نے جہاد کے پہلو کو بطور خاص اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی مشہور ہے کہ محمد ابن علی شوکانی (1759-1834) کے افکار ونظریات بھی اس تحریک کے ماخذ ومراجع میں شامل ہیں، یہ بات بھی غلط ہے کیوں کہ شوکانی اگرچہ ابتدائی عمر میں زیدی فکر کے حامل تھے، لیکن بعد میں وہی اس کے سب سے بڑے ناقد بن گئے تھے۔ سچائی یہی ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک تجدید واحیائے دین بذات خود ایک مستقل تحریک تھی اور اس کا تعلق نہ تو محمد بن عبد الوہاب کی تحریک سے تھا اور نہ ہی اس پر فکرِ شوکانی کے اثرات تھے۔

جہاں تک جماعت مجاہدین کے مقاصد کی بات ہے تو اس حوالے سے سید احمد شہید کے مکتوبات کا مطالعہ ضروری ہے، اس میں انہوں نے اپنی جدوجہد کے مقاصد اور اسباب کی بھرپور وضاحت کی ہے۔ ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

جماعت مجاہدین کا بنیادی مقصد کتاب وسنت کے مطابق توحید کی تبلیغ واشاعت کے علاوہ معاشرے سے بدعات وخرافات کا خاتمہ بھی تھا۔ ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ 'جہاد فی سبیل اللہ' کے تصور کو دوبارہ زندہ کیا جائے، کیوں کہ اس سے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے حکمِ جہاد کی تعمیل ہو گی اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ مسلم حکومتوں، ریاستوں اور جاگیروں وغیرہ پر سے سکھوں اور انگریزوں کے قبضے کا خاتمہ

ممکن ہو سکے گا۔ سید احمد شہید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی قوت کے زوال کی وجہ ان میں سے روح اسلام اور روح جہاد کا ختم ہو جانا ہے اور اسی روح کو دوبارہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کو غیر مسلموں، خواہ وہ سکھ ہوں یا انگریز، کے تصرف سے آزاد کرا لیا جائے تاکہ یہاں حکومت الٰہیہ کا قیام ممکن ہو سکے اور بے تکلف احکام شرعیہ کا نفاذ کیا جا سکے، پھر اسی نظام کو تمام عالم اسلامی میں نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی لیے وہ سکھوں سے زیادہ انگریزوں کے مخالف تھے کیوں کہ مسلم ممالک کے زیادہ تر حصوں پر ان کا ہی قبضہ تھا۔ بانی تحریک اور ان کے رفقاء نے ان مقاصد کے حصول کے لیے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا، وعظ وارشاد کی محفلیں قائم کیں، حلقے اور زاویے بنائے، متعدد حکمرانوں، امراء، نوابوں، علماء اور صوفیاء وغیرہ سے ملاقاتیں کیں اور انہیں تحریک دعوت وجہاد میں شامل ہونے کی دعوتیں دیں۔ اس حوالے سے سید احمد شہید کی خاص بات یہ رہی کہ انہوں نے یہ تمام خدمات صرف اور صرف رضائے الٰہی کے لیے انجام دیں۔ انہوں نے اس حوالے سے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا کہ مجھے سلطنت، منصب اور مال و دولت کی خواہش نہیں ہے، صرف یہ آرزو ہے کہ دنیا کے تمام خطوں میں رب العالمین کے احکام جاری ہو جائیں، جنہیں ہم شریعت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بارے میں کسی کی طرف سے کشمکش کا امکان باقی نہیں رہے۔ (مکاتیب شاہ اسماعیل) اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کی سوانح حیات اور خدمات کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔

22.4 سید احمد شہید (1786-1831) اور تحریک جماعت مجاہدین

سید احمد شہید کی پیدائش اتر پردیش کے مشہور شہر رائے بریلی میں 1786 میں ہوئی۔ والد محترم کا نام سید محمد عرفان ابن سید محمد نور تھا۔ ان کا سلسلہ نسب چھتیسویں پشت پر حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ ان کے آباواجداد سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ہندوستان کے کٹرہ مانک پور (الہ آباد) میں آباد ہوئے تھے۔ سید احمد کے پدری و مادری آباواجداد میں سید قطب الدین محمد المدنی اور حضرت شاہ علم اللہ وغیرہ مشہور ہیں۔ مؤخر الذکر کا شمار عہد شاہ جہاں اور عہد عالم گیر کے بڑے اکابرین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے رائے بریلی میں رہائش کے لیے ایک عمارت تعمیر کی، جو بعد میں ''دائرہ علم اللہ'' یا ''تکیہ علم اللہ'' کے نام سے مشہور ہوئی، سید احمد شہید کی پیدائش اسی ''دائرہ علم اللہ'' میں ہوئی۔

سید احمد شہید جب چار سال کے ہوئے تو حسب دستور ان کو مکتب میں داخل کرایا گیا، لیکن انہیں تعلیم کے بجائے کھیل سے زیادہ دل چسپی رہی اور کوشش کے باوجود وہ چند سورتوں کو حفظ کرنے اور مفرد حروف سیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ متعدد عقیدت مندوں نے انہیں ان پڑھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، کیوں کہ بعد میں انہوں نے قرآن وسنت کے علاوہ شرعی اوامر ونواہی سے واقفیت حاصل کی تھی اور عربی وفارسی زبان بھی بے تکلف سمجھنے لگے تھے۔ انہیں بچپن سے ہی کھیل کود اور ورزش کا زیادہ شغف تھا، خصوصاً سپاہیانہ کھیل جیسے کبڈی، کشتی، تیراکی، ورزش، تلوار، تیر کمان اور بندوق وغیرہ چلانا، اسی لیے انہوں نے ان سب میں غیر معمولی مہارت حاصل کر لی تھی۔ جذبہ جہاد بھی ان میں بچپن سے ہی تھا، اکثر وہ اپنے ہم عصر دوستوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے قلعہ پر فرضی حملہ کراتے یا اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے اسے ''لشکر اسلام'' کا نام دیتے، پھر زور دار آواز میں نعرہ تکبیر کہہ

کر ایک فرضی لشکر کفار پر حملہ کیا کرتے تھے اور اس دوران وہ مارا، یہ فتح ہوا وغیرہ کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ سید احمد شہید کی ایک اہم خصوصیت خدمتِ خلق تھی، انہوں نے اسے اپنا شعار بنالیا تھا اور اس سلسلے میں وہ امیر غریب یا اونچ نیچ میں تفریق کیے بغیر سب کی خدمت کیا کرتے تھے۔

سید احمد شہید جب سترہ یا اٹھارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے 1803 /1804 میں کسب معاش کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ لکھنو کا رخ کیا۔ وہاں وہ ایک مسلمان امیر کے مہمان ہوئے اور سات مہینے روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ سے ملاقات کی اور ان کے کہنے پر وہ حضرت شاہ عبد القادرؒ کے پاس آ گئے اور مسجد اکبر آبادی میں قیام کیا۔ اسی مسجد میں انہوں نے حضرت شاہ عبد القادرؒ سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ 1807 میں انہوں نے حضرت شاہ عبد العزیزؒ سے نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ سلسلے میں بیعت کی، اس وقت ان کی عمر بائیس (22) سال سے زائد نہیں تھی۔ 1808 میں وہ اپنے وطن رائے بریلی واپس ہو گئے اور اسی دوران ان کی شادی کر دی گئی۔

22.4.1 تحریک جماعت مجاہدین

سید احمد شہید کا بنیادی نصب العین ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام اور شرعی احکام کا نفاذ تھا۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے 1811 میں دہلی ہوتے ہوئے نواب امیر خاں، راجپوتانہ کا رخ کیا کیوں کہ وہ آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے طاقت ور امیر تھے۔ انہوں نے نواب کے مشیر خاص اور ان کی فوج کے ایک دستے کے امیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں اور ساتھ ہی ساتھ فوج میں وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ بھی کی۔ ان کی وجہ سے لشکر کی مذہبی و اخلاقی حالت میں زبردست تبدیلی آئی، لیکن بد قسمتی سے ان کا تعلق نواب امیر خاں سے زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا اور دونوں کے درمیان 1818 میں علاحدگی ہو گئی، کیوں کہ نواب امیر خاں نے انگریزوں سے مفاہمت کر لی تھی، جب کہ سید احمد شہید چاہتے تھے کہ ان سے آزادی وطن اور احیائے اسلام کا کام لیا جائے۔

سید احمد شہید نے نواب امیر سے مایوس ہونے کے بعد تیسری مرتبہ 1818 میں دہلی کا رخ کیا اور اب ان کا ارادہ تھا کہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جہاد کے لیے بذات خود ایک مستقل تنظیم قائم کریں۔ دہلی پہنچنے کے بعد ان کی کام یابی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور انہیں متعدد ایسے رفقاء مل گئے جو ان کے ہم خیال تھے، نیز کئی شخصیات نے ان سے متاثر ہو کر بیعت کی، ان میں مولوی محمد یوسف پھلتی، مولانا عبد الحئی، شاہ اسماعیل شہید، شاہ اسحق، شاہ یعقوب، مولانا وجیہ الدین، حافظ معین الدین اور ولی اللٰہی خاندان کے دیگر افراد قابل ذکر ہیں۔ اس بیعت نے انہیں مطلوبہ جماعت فراہم کر دی جس سے انہیں کام لینا تھا۔ سید احمد شہید نے حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے مشورے سے نومبر/ 1818 سے اگلے چھ مہینہ تک اپنے رفقاء کے ساتھ روہیل کھنڈ، اودھ اور آگرہ وغیرہ کے مختلف حصوں جیسے دہلی، غازی آباد، پھلت، بڑھانہ، میرٹھ، سردھنہ، کاندھلہ، مظفر نگر، دیوبند، گنگوہ، سہارن پور، مراد آباد، رام پور، کان پور، لکھنؤ اور بنارس میں بغرض دینی اصلاح اور جہاد کی تیاری کے لیے دورے کیے۔ اس کے بعد وہ مئی/ 1819 میں اپنے وطن رائے بریلی واپس ہو گئے۔ دو سال دو مہینے (جولائی/ 1821) تک وہ رائے بریلی میں ہی مقیم رہے اور اس دوران انہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں دعوت و تبلیغ کے علاوہ اپنے مریدین کو

فنون جنگ کی مشق کرائی، نکاح بیوگان کا اجراء بذات خود بیوہ بھاوج سے کر کے کیا اور نصیر آباد میں شیعہ سنی اختلافات کا خاتمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی مدت میں انہوں نے اپنے مریدوں سے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کے واقعات سن کر ان سے جہاد کا مکمل ارادہ کر لیا تھا، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیوں کہ ان کا ارادہ پہلے سے ہی تھا کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کی جائے، خواہ اس کے لیے انہیں سکھوں سے جنگ کرنی پڑے یا انگریزوں سے، البتہ انہوں نے جہاد سے قبل اچانک حج کرنے کا فیصلہ لیا۔

سید احمد شہید کا حج بھی ایک مستقل جہاد کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ اس زمانے میں متعدد علماء جیسے مولوی یار علی وغیرہ نے بحری راستوں پر انگریزوں اور پرتگیزیوں کے قبضے کے علاوہ راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے فرضیت حج کے سقوط کا فتویٰ دے دیا تھا، حالاں کہ مولانا عبد الحئی، شاہ اسمٰعیل شہید اور شاہ عبد العزیز وغیرہ نے اسے رد کرتے ہوئے فرضیت کا اثبات فرمایا۔ سید احمد شہید نے اس کی عملی مثال پیش کرتے ہوئے تقریباً چار سو (400) افراد کے ساتھ 30/ جولائی 1821 کو رائے بریلی سے حج کے لیے روانہ ہوئے اور 29/ اپریل 1824 کو فریضہ حج کے بعد اپنے وطن رائے بریلی واپس آئے۔ دورانِ سفر دین کی تبلیغ واشاعت اور اصلاح امت کا کام بدستور جاری رہا۔ پھر ان کی توجہ مکمل طور سے جہاد فی سبیل اللہ پر مرکوز ہو گئی، جو ان کی بنیادی خواہش تھی۔ اسی دور میں شاہ عبد العزیزؒ (1746-1824) نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دے دیا، ان کے اس فتویٰ نے مسلمانوں میں جہاد کی روح بیدار کر دی تھی۔

سید احمد شہید نے اپنے رفقاء سے مشورے کے بعد جہاد کا مرکز شمال ومغرب کے علاقہ سرحد (صوبہ سرحد) کو بنایا، کیوں کہ سرحد کی پوری آبادی مسلمانوں کی تھی، ان کے بارے میں عام تصور تھا کہ وہ بڑے جنگجو اور جانباز ہیں، نیز وہ سکھوں کے مظالم کا شکار تھے اور ان کی آزادی چھیننے کی کوشش کی جارہی تھی تو وہ دفاع کے لیے کھڑے ہو سکتے تھے۔ سرحد کے شمال اور مغرب میں دور دور تک مسلمانوں کی حکومتیں اور آبادیاں تھیں تو بوقت ضرورت ان سے مدد مل سکتی تھی یا کم از کم مخالفت کا اندیشہ نہیں تھا۔ پنجاب میں پیش قدمی کی صورت میں ہندوؤں کی مظلوم آبادی بھی ممکن ہے کہ ساتھ دیتی اور دائیں جانب سے بہاول پور، سندھ اور بلوچستان کی حکومتوں سے مدد مل سکتی تھی۔ سید احمد شہید ایک سال دس مہینے تک جہاد کی تیاری کرتے رہے اور بالآخر 17/ جنوری 1826 کو انہوں نے جہاد کی غرض سے پانچ یا ساڑھے پانچ سو رفقاء کے ساتھ رائے بریلی سے مرکز جہاد صوبہ سرحد کی طرف ہجرت کی۔ وہ کالپی، گوالیار، ٹونک، اجمیر، پالی، امر کوٹ، حیدر آباد سندھ، پیر کوٹ، مدھجی، شکار پور، ڈھاڈر، بولان، کوئٹہ، قندھار، غزنی، کابل اور جلال آباد سے پشاور پہنچے۔ انہوں نے راستے میں عام مسلمانوں کے علاوہ سندھ، بہاول پور، بلوچستان، قندھار اور کابل کے حاکموں، روساء اور اکابرین کو جہاد کی دعوت دی۔

سید احمد شہید نے اسلامی روایت کے مطابق سکھوں سے جنگ شروع کرنے سے پہلے دربار لاہور کو ایک تحریری اعلام نامہ بھیجا، جس کا سکھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ سکھ حکومت نے مسلمانوں سے مقابلے کے لیے بدھ سنگھ کو اکوڑہ، صوبہ سرحد بھیج دیا، ان سے ہی پہلی بار 20/ دسمبر 1826 میں مسلمانوں کی شب خون کی شکل میں جنگ ہوئی اور اسی جنگِ اکوڑہ سے سید احمد شہید کے نظریہ جہاد کا عملی آغاز ہوا۔ دیگر اہم واقعات میں واقعہ حضرو اور جنگِ بازار ہیں۔ اسی دوران علماء اور خوانین سرحد نے فیصلہ کیا کہ جہاد کو منظم طریقے سے جاری رکھنے کے لیے ایک امیر یا امام کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ پشاور کے درّانی سردار یار محمد خاں، سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں سمیت سب

نے اتفاق رائے سے 11/ جنوری 1827 کو "ہُنڈ" کے مقام پر سید احمد شہید کے ہاتھ پر امامتِ جہاد کی بیعت کی تا کہ ترویج شریعت، انتظام جہاد، مال غنیمت کی تقسیم اور جمعہ کی نماز کی امامت وغیرہ کا باقاعدہ نظم کیا جاسکے، نیز ان کا نام بھی جمعہ کے خطبے میں شامل کر لیا گیا۔ ہندوستانی غازیوں نے انہیں "امیر المؤمنین"، اہل سرحد نے "سید بادشاہ" اور سکھوں نے "خلیفہ صاحب" کا لقب دیا۔

بیعتِ امام کے بعد سید احمد شہید کی قیادت میں مسلمان تقریباً ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہوئے اور "شیدو" (صوبہ سرحد کا مشہور گاؤں) کے مقام پر پہلی بار سکھوں سے ان کی روبرو جنگ ہوئی، ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی ملی، لیکن یار محمد خاں کی غداری سے مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی، کیوں اس سے سکھوں نے پہلے ہی خفیہ طور پر سازباز کر لی تھی اور ان کی ایماء پر اس نے جنگ سے پہلے سید احمد شہید کو زہر بھی دیا تھا۔ سید احمد شہید نے پھر پنجتار (خدو خیل کا مرکزی مقام) کو اپنا مرکز بنایا، بونیر وسوات کا دورہ کیا، اسی دوران پشاور اور مردان کے میدانی اور کوہستانی علاقوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ ہو گئی تھی، نیز ہندوستانی مجاہدوں کی ایک جماعت بھی ان کے پاس پہنچ گئی۔ پھر ہزارہ کے محاذ پر مسلمانوں نے ستمبر یا اکتوبر/ 1827 میں ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکوں میں سکھوں کو شکست سے دوچار کیا۔ ان پر سید احمد شہید کا اس قدر رعب تھا کہ وہ مصالحت کے لیے اٹک پار کا پورا علاقہ انہیں دینے کو تیار تھے۔

بدقسمتی سے پشاور کے درانی سردار سید احمد شہید کے خلاف ہو گئے اور وہ جنگ کے لیے ایک بڑا لشکر لے کر اوتمان زئی پہنچ گئے، لیکن اس میں مجاہدین کامیاب رہے۔ سید احمد شہید نے فروری/1829 میں پنجتار میں تقریباً ڈھائی ہزار علماء اور خوانین سے نظام شریعت کے اجراء کی بیعت لی۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ علاقہ سرحد میں شرعی نظام قائم ہو جائے اور ہر خاص وعام اس مقدس نظام کے ماتحت ہو کر ایک جماعت بن جائیں۔ اسی دوران علاقہ سرحد کے ہُنڈ کے ایک رئیس خادے خاں نے سکھوں سے سازباز کر کے سید احمد شہید کے خلاف بغاوت کر دی اور سکھوں کو پنجتار بلا لیا، حالاں کہ سکھ حملہ میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ پھر سید احمد شہید نے خادے خاں سے جنگ کرنے اور ہُنڈ کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا اور اس میں کامیاب بھی رہے، نیز خادے خاں کو قتل کر دیا گیا۔ سید احمد شہید کی درانیوں سے 4/5 ستمبر/ 1829 میں جنگ زیدہ ہوئی اور اس میں یار محمد خاں مارا گیا جو سکھوں سے ملا ہوا تھا۔ اس کے بعد سید احمد کے مجاہدوں نے امب، مایار، پشاور، اٹک وغیرہ کو فتح کر لیا، البتہ پشاور کو اس شرط پر سلطان محمد خاں کو واپس دے دیا گیا کہ وہ وہاں شرعی نظام رائج کرے گا اور جہاد میں مجاہدین کی مدد کرے گا۔ اس طرح سے پشاور سے اٹک اور اٹک سے امب تک پورا علاقہ سرحد ایک نظام کے تحت ہو گیا تھا۔

سلطان محمد خاں درانی نے نومبر/ 1830 میں سید احمد شہید سے کیے گئے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور تقریباً ڈیڑھ سے دو سو غازیوں (ان میں قضاۃ و محصلین بھی شامل تھے) کو شہید کرا دیا۔ اس کی اس حرکت سے سید احمد کو سخت صدمہ ہوا اور درانیوں کے علاوہ بعض دوسرے خوانین کی مسلسل فتنوں اور شر انگیزیوں سے تنگ آکر انہوں نے دسمبر/ 1830 میں اپنے چار سال سے زائد مرکز جہاد پنجتار سے دوسری بار ہجرت کر گئے اور جنوری/ 1831 میں رواج دواری پہنچے۔ انہوں نے اپنے لشکر کو آس پاس کے علاقوں جیسے بھوگڑمنگ، گونش، بالاکوٹ اور مظفر آباد (کشمیر) وغیرہ میں پھیلا دیا۔ اسی دوران متعدد غازیوں نے سید احمد شہید کے ہاتھ پر "بیعت اہل صفہ" کی۔ خوانین کے کہنے پر سید احمد شہید نے 6/ مارچ 1831 میں راج دواری سے سچوں کا رخ کیا اور دو دن بعد سچوں پہنچ گئے۔ وہ راستے میں سکھوں سے ٹکراؤ کے بغیر کشمیر پہنچنا

چاہتے تھے تا کہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ سکھوں کے خلاف لڑنے کا موقع ملے اور کشمیر سکھوں سے آزاد ہو جائے، البتہ ان کا خیال تھا کہ اس عمل سے بالا کوٹ اور آس پاس کے علاقوں کے مسلمانوں کو سکھوں کی طرف سے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا، بہر حال وہ یہیں رک گئے کہ پہلے سکھوں کے حملے کا انتظار کر لیا جائے پھر آگے کشمیر کی طرف جایا جائے۔ وہ گڑھی حبیب اللہ خاں کے کہنے پر 17/ اپریل 1831 کو سچوں سے بالا کوٹ (بالا کوٹ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کا مشہور قصبہ ہے) روانہ ہوئے، جہاں رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ دس ہزار فوج کے ساتھ مٹی کوٹ کے راستے بالا کوٹ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ بالآخر 6/ مئی 1831 کو بالا کوٹ میں سکھوں اور مسلمانوں کی جنگ شروع ہوئی اور اسی دن سید احمد کو شہید کر دیا گیا، نیز مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی تدفین کہاں ہوئی اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیر سنگھ نے ان کی تدفین دریائے کنہار سے متصل کرائی تھی اور پھر بعد میں دو سکھ مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ نے ان کے جسم کو قبر سے نکلوا کر دریا میں ڈال دیا تھا کہ کہیں ان کی قبر مسلمانوں کے لیے مسلسل عزیمت کا پیغام نہ دیتی رہے۔ چوں کہ سید احمد شہید کا سر بدن سے الگ کر دیا گیا تھا اس لیے یہ بھی مانا جاتا ہے کہ ان کا جسم دریا کے کنارے مدفون ہے اور سر تلہٹہ کے قبرستان میں دفن ہے۔

22.5 ناکامی کے اسباب اور اثرات

متعدد مواقع پر سکھوں کے خلاف قبائلی سرداروں کی عدم موافقت، خوانین کی غداری، افغان سرداروں کی جاہلانہ عصبیت، افغان علماء کا مسئلہ عشر کی وجہ سے مخالفت کرنا، بعض علماء سوء کی تفریق انگیز حرکات، قاضیوں کے غلط فیصلوں اور کچھ مجاہدین کی ناتجربہ کاری یا ناعاقبت اندیشی جیسے افغانی قبائلوں کی بغیر معقول تربیت کے ان کے مروجہ رسم و رواج کو خلاف شریعت اسلامیہ قرار دے کر یک لخت بند کرا دینے کے اقدام نے یا سید احمد شہید کے بعض ساتھیوں کے طور طریقے یا عقائد نے سردارانِ پشاور اور علماء کو مجاہدین کے خلاف نہ صرف یکجا کر دیا بلکہ بہ حیثیت مجموعی بھی تحریک مجاہدین کو نقصان ہوا، لیکن ان سب کے باوجود یہ تحریک اپنے مقاصد میں ناکام نہیں رہی۔ معرکہ بالا کوٹ میں مسلمانوں کی شکست کے بعد بھی یہ تحریک کم زور تو ضرور ہوئی، لیکن ختم نہیں ہوئی۔ سید احمد شہید کے خلفاء نے اپنے رہبر و رہنما کے مشن کو جاری رکھا اور ہندوستان میں دین کی تبلیغ و اشاعت یا اصلاح امت کے علاوہ انگریزوں کے خلاف وطن کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ خلفاء کے اہم مراکز استھانہ، پٹنہ، دکن، ٹونک اور دیوبند تھے، ان تمام جگہوں سے دعوت و اتحاد، تبلیغ و ہدایت، جہاد اور اس کے لیے تربیت وغیرہ کی خدمات انجام دی جاتی رہی تھیں، یہاں تک کہ ہندوستان کی 1857 میں پہلی جنگ آزادی کے بعد جتنی بھی تحریکیں وجود میں آئیں ان سب کا سلسلہ کہیں نہ کہیں اسی تحریک سے جڑا ہوا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ گا کہ موجودہ مسلم معاشرے میں تجدید و احیائے دین اور اعلائے کلمہ حق کا جذبہ جو کار فرما ہے وہ بھی اسی تحریک کا مرہون منت ہے۔

22.6 ریشمی رومال تحریک کا پس منظر اور قیام

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مسلمانوں کو سیاسی طور پر نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں بھی کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ 1911-1912 میں اٹلی نے مغرب کے اشارے پر طرابلس جو خلافت عثمانیہ کا حصہ تھا، پر حملہ کر دیا اور برطانوی حکومت

نے ترکوں کو مصر کے راستے فوج لے جانے کی اجازت نہیں دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا۔ پھر بلقان کی ریاستوں نے مغربی طاقتوں کے اشارے پر 1912-1913 میں ترکی کے خلاف بغاوت کر دی اور بلقانیوں نے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا۔ ادھر ہندوستان میں 1911 میں بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا گیا۔ رہی سہی کسر جنگ عظیم اول (1914-1918) نے پوری کر دی، اس جنگ میں ترک انگریزوں کے خلاف تھے اور جرمنوں کے حلیف تھے۔ ان تمام واقعات سے عالم اسلامی میں مغربی قوموں بالخصوص انگریزوں کے خلاف نفرت کی لہر پھیل گئی، خود ہندوستانیوں کو احساس ہو گیا کہ ان تمام جنگوں میں انگریزوں کا ہاتھ ہے اور ان کا اصل مقصد خلافت عثمانیہ کو ختم کرنا ہے، نیز انہیں 1857 میں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی جانب سے ظلم و ستم اور بربریت کا نشانہ تو بننا ہی پڑا تھا تو وہ انگریزوں کے خلاف ہو گئے۔

مولانا محمود حسن، جن کی گہری نظر عالم اسلام اور ہندوستان کے سیاسی واقعات پر رہتی تھی، نے سمجھ لیا کہ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے نہیں نکالا جائے گا، وہ ممالک اسلامیہ اور افریقہ سے بھی نہیں جائیں گے، چنانچہ اس کام کو ایک دینی فرض سمجھ کر وہ نہ صرف میدان عمل میں اترے، بلکہ انہوں نے اپنے ساتھ ہندوستان اور عالم اسلام کے دیگر ذی اثر علماء اور قائدین کو بھی لیا اور انگریزوں کے خلاف 1915 کے بعد سے باقاعدہ ایک تحریک کا آغاز کیا، جسے "ریشمی رومال تحریک" کے نام سے جانا جاتا ہے، البتہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس تحریک کے ابتدائی نقوش 1865 میں ہی مرتب کیے جا چکے تھے۔ اسی طرح بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس تحریک کے بانی مولانا عبید اللہ سندھی ہیں، حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ وہ اس تحریک کے عناصر کابل میں اس وقت بھی محسوس کرتے ہیں جب وہ شیخ الہند کے کہنے پر 1915 میں پہلی بار گئے تھے، اس کا اعتراف انہوں نے اپنی ذاتی ڈائری میں کیا ہے۔

22.6.1 نوعیت اور مقاصد

مولانا محمود حسن نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات اور سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے طرز عمل کی روشنی میں معاشرے سے ظالموں خاص کر انگریزوں کے خاتمہ کے لیے تربیت یافتہ افراد کی ایک منظم جماعت تیار کی اور باقاعدہ تحریک ریشمی رومال کا آغاز کیا۔ اس تحریک کا ابتدائی مقصد ملک کے مختلف حصوں بالخصوص یاغستان میں دینی اور اسلامی درس گاہوں کا قیام تھا تاکہ مسلمان اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہو سکیں، عوام کی اصلاح کی جا سکے، دین کے غلبے کے لیے جد و جہد کی جا سکے اور برصغیر میں مسلم اقتدار کی بحالی ممکن ہو سکے۔ ان درس گاہوں سے درپردہ عسکری مہمات کا بھی کام لیا گیا، جب یہ ضروری سمجھا گیا کہ تشدد یا زور زبردستی کیے بغیر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال کر آزادی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

22.7 مولانا محمود حسن (1851-1920) اور ریشمی رومال تحریک

مولانا محمود حسن کا تعلق اتر پردیش کے قصبہ دیوبند کے چند علمی خاندانوں میں سے ایک "عثمانی خاندان" سے تھا۔ ان کی پیدائش 1851 میں ہوئی۔ والد محترم کا نام مولانا ذوالفقار علی تھا۔ ابتدائی تعلیم میاں جی منگلوری اور میاں جی عبد اللطیف سے حاصل کی۔ فارسی کی

تمام درسی کتب اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا مہتاب علی سے پڑھی۔1866 میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور 1872 میں فراغت حاصل کی۔اس دوران کنزالد قائق، مختصر المعانی، ہدایہ، مشکوۃ، مقامات حریری، کتب ستہ، حجۃ اللہ البالغۃ وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔ان کی تعلیم و تربیت میں بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانا توی کا اہم کردار رہا۔دوران تعلیم ہی انہوں نے بطور معاون استاد متعدد کتابیں طلبہ کو پڑھائیں۔1875 میں انہیں دارالعلوم دیوبند کا استاد مقرر کردیا گیا۔1877 میں انہوں نے اکابر علماء اور مشائخ دیوبند کے ساتھ حج کرنے کی سعادت حاصل کی۔ انہوں نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ہاتھ پر بیعت کی۔1878 میں انہیں شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ 1888 میں ان کو دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس مقرر کیا گیا۔مولانا قاسم نانا توی کی وفات کے بعد ان کی علمی تحریک کی قیادت مولانا محمود حسن کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی۔اس کے بعد دیوبند میں دو راہیں وجود میں آئیں،ایک تو تعلیم و تعلم اور دین کی نشرواشاعت تھی اور دوسری وہی راہ تھی جسے شیخ الہند نے اختیار کیا تھا،یعنی ریشمی رومال تحریک۔ان کا ماننا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کا قیام ہی ان کے استاد قاسم نانا توی نے 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کی تلافی کے لیے کیا تھا اور ان کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا تھا جو سیاست میں مسلمانوں کی کھوئی ہوئی ساکھ کو بچا سکیں۔

22.7.1 ریشمی رومال تحریک

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ مولانا محمود حسن نے اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی سے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کا منصوبہ بنایا لیا تھا اور اس کے لیے انہوں نے اس وقت سے کوشش شروع کردی تھی جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں برائے نام تھیں۔ملک کے مختلف حصوں میں اسلامی درس گاہوں کی تحریک بھی دراصل ان کی اسی پالیسی کا حصہ تھی۔اسی طرح مختلف تنظیمیں جیسے ”انجمن ثمرۃ التربیت 1878-“، ”جمعیۃ الانصار 1909-“ اور ”نظارہ المعارف القرآنیۃ 1913-“ کا قیام بھی اسی تحریک کے پیش نظر عمل میں لایا گیا۔ شیخ الہند نے اپنی تحریک کے لیے متعدد اصحاب کو ان کی صلاحیتوں کی بناپر بطور مشیر و معاون منتخب کیا تھا اور ان لوگوں نے بھی آخر تک ان کا ساتھ دیا۔ان میں مولانا عبید اللہ سندھی، حاجی صاحب ترنگ زئی، ملا صاحب سنڈا، مولانا سیف الرحمن، مولانا محمد میاں، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود، مولانا محمد اکبر، مولانا عبدالرحیم رائے پوری، مولانا خلیل احمد، مولانا محمد احمد چکوالی، مولانا تاج محمود امروٹی، مولانا محمد صادق کراچی، مولانا محمد ابراہیم راندیری، شیخ عبدالرحیم سندھی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، نواب وقار الملک وغیرہ جیسے بڑے بڑے اہل علم و دانش اور رہ نما قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک اس تحریک کے مراکز کی بات ہے تو اس کے اہم مراکز دیوبند، دہلی، پانی پت، دین پور (ریاست بہاول پور کا مرکز)، امروٹ (سندھ اور بلوچستان کا مرکز)، کھڈہ کراچی، لاہور، راندیر (سورت، گجرات، ممبئی)، چکوال اور زنگی یاغستان وغیرہ تھے،ان تمام مراکز کے الگ الگ امیر مقرر کیے گئے، نیز اندرون و بیرون ملک میں کئی جگہ خفیہ اسلحہ خانے قائم کیے گئے۔

شیخ الہند کا منصوبہ یہ تھا کہ تحریک کے نمائندے ملک کے مختلف حصوں میں قائم کیے گئے مدارس میں رہ کر عوام کے جذبہ حریت کو بیدار کریں اور جب ہر طرف سے حمایت کا یقین ہو جائے تو ایک مقررہ تاریخ 19/ فروری (1917) کو پورے ہندوستان میں بغاوت

کر دی جائے، نیز کسی دوسرے ملک یا صوبہ سرحد اور یاغستان کے آزاد قبائل کی طرف سے بھی ہندوستان پر حملہ کیا جائے، اس طرح انگریز بیک وقت اندرونی و بیرونی حملوں کا دفاع نہیں کر سکیں گے اور ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ اسی لیے شیخ الہند نے گہری منصوبہ بندی کے ساتھ اور اعلیٰ حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوستان کے قرب و جوار افغانستان، ترکی، حجاز اور ماوراء النہر کے ممالک میں اپنے نمائندے بھیج کر ان سے اخلاقی اور جنگی امداد طلب کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک طویل منصوبہ تھا جو وقت طلب تھا۔ اچانک پہلی جنگ عظیم کے شروع ہو جانے کی وجہ سے شیخ الہند کو مطلوبہ وقت نہیں مل سکا اور انہوں نے ارادہ کر لیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے فوراً کیا جائے تاکہ انگریزوں کی مشکلات میں اضافہ ہو، ترکوں کو آسانی ہو اور ہندوستان کو بھی آزادی مل سکے۔

مولانا محمود حسن نے 1914 میں مولانا سیف الرحمن کابلی کو حاجی ترنگ زئی کے پاس پشاور بھیجا اور ان کو پشاور سے یاغستان ہجرت کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اب جہاد کرنے کا وقت آگیا ہے، اس طرح سے زیگی، یاغستان میں تحریک کا مرکز قائم ہوا اور مولانا سیف الرحمن، حاجی ترنگ زئی کی قیادت میں مجاہدین نے برطانوی فوج کے خلاف جنگ کی ابتداء کی، حالاں کہ جلد ہی اسے روک دیا گیا کیوں کہ مجاہدین کے پاس اسلحہ اور رسد کی کمی ہوگئی تھی۔ شیخ الہند نے 1915 میں بیرونی حکومتوں سے مدد لینے کے لیے مولانا عبید اللہ سندھی کو خاموشی اور رازداری کے ساتھ کابل بھیجا تاکہ وہ افغان حکومت کو انگریزوں کے خلاف جہاد میں تعاون کرنے کے لیے آمادہ کر سکیں۔ کابل پہنچ کر انہوں نے تحریک کے اقدامی مرحلے کے لیے روابط اور طریقہ کار کے منصوبوں پر کام کیا، چنانچہ انہوں نے سردار نصر اللہ خاں، امیر حبیب اللہ خاں اور سردار عنایت اللہ خاں وغیرہ سے ملاقاتیں کیں، نیز انہوں نے افغانستان میں خدام خلق کی ایک جماعت بھی تشکیل دی جس کا نام "جنود اللہ / جنود ربانیہ" رکھا گیا۔ امیر امان اللہ خاں کے دور میں ایک ہندوستانی تعلیم گاہ قائم کرنے کی اجازت بھی لی جسے برطانوی سفیر نے منسوخ کرا دیا۔ انہوں نے 1923 میں افغانستان سے ماسکو اور استنبول کا قصد کیا اور وہاں سے وہ مکہ مکرمہ آگئے۔ 1939 میں ان کی وطن واپسی ہوئی۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے 1916 میں کابل سے ایک خط جس میں بعض مؤرخین کے مطابق یکبارگی اندرونی و بیرونی حملہ کا منصوبہ، راستہ اور تاریخ 19 / فروری (1917) وغیرہ طے کی گئی تھی، کے علاوہ "ہندوستان کی پہلی جلاوطن حکومت (یہ حکومت دسمبر / 1915 میں قائم ہوئی تھی اور اس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی، وزیر خارجہ مولوی قصوری اور وزیر دفاع مولانا محمد بشیر وغیرہ تھے) اور جنود اللہ / جنود ربانیہ" کے احوال کی تفصیل درج تھی، نیز آئندہ کے لائحہ عمل طے کرنے کے لیے مشورے طلب کیے گئے تھے، اسی طرح ایک اور خط جو مولانا محمد میاں انصاری کا شیخ الہند کے نام تھا، زرد رنگ کے ریشمی رومال (اس کی لمبائی اور چوڑائی ایک گز تھی) پر لکھ کر نو مسلم عبد الحق (اللہ نواز خاں کا ملازم) کے ذریعے شیخ عبد الرحیم سندھی کے پاس بھیجا تھا اور کہا تھا کہ وہ فوراً حجاز چلے جائیں یا کسی بھروسہ مند انسان کے ذریعے اس خط کو شیخ الہند تک پہنچا دیں، لیکن معلوم نہیں کیوں اس نے خط شیخ عبد الرحیم کو دینے کے بجائے اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر رب نواز خاں (ملتان) کو دے دیا، ان سے پھر وہ خط پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائر تک پہنچ گیا۔ اس طرح سے حکومت کو شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی تحریک کے بعض راز معلوم ہو گئے اور انہوں نے شیخ عبد الرحیم کا تعاقب شروع کر دیا، نیز ہندوستان

میں بڑے پیمانے پر تحریک کے اراکین کی گرفتاریاں بھی ہوئیں۔اس خط کا مضمون غالباً یہ تھا کہ ہندوستان کی پہلی جلاوطن حکومت نے افغانستان سے عہد نامہ کرلیا ہے، باقی حکومتوں کے پاس بھی سفارتیں بھیجی جارہی ہیں، اس سلسلے میں ترکی حکومت سے بھی ربط وضبط پیدا کرنا منظور ہے، آخر میں حضرت موصوف سے درخواست کی گئی تھی کہ ربط و ضبط پیدا کرانے اور معاہدہ کرانے میں تعاون کریں۔ادھر ہندوستانیوں کی ترکوں کی حمایت کی وجہ سے بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہورہی تھیں، حکومت ہند کا ارادہ شیخ الہند کو گرفتار کرنے کا تھا کیوں کہ وہ بھی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے انہیں حکومت کے ارادے سے مطلع بھی کر دیا تھا۔ شیخ الہند نے مولانا ابوالکلام آزاد کی مخالفت کے باوجود اپنے دیگر رفقاء سے مشورہ کرنے کے بعد 1915 میں حج کے بہانے حجاز کا رخ کیا، اس حال میں کہ ان کے پیچھے حکومت کے کارندے لگے ہوئے تھے۔انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے حجاز پہنچیں اور وہاں ترک ذمہ داروں سے ملاقات کر کے ان کی مدد سے ایران وافغانستان ہوتے ہوئے یاغستان چلے جائیں۔

مولانا محمود حسن نے حج کے بعد مکہ مکرمہ کے مشہور تاجر حافظ عبدالجبار دہلوی کے توسط سے حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی اور ان کو اپنی آمد کا اصل مقصد بتا کر ان سے مدد طلب کی اور انہوں نے بھی بھرپور تعاون کا وعدہ کرتے ہوئے شیخ الہند کی مرضی کے مطابق انہیں تین تحریروں سے نوازا۔پہلی تحریر مسلمانان ہند کے نام تھی، دوسری تحریر مدینہ منورہ کے گورنر بصری پاشا کے نام تھی، جس میں لکھا تھا کہ حضرت شیخ الہند معتمد علیہ شخص ہیں، ان کا احترام کیا جائے اور انہیں استنبول پہنچا دیا جائے۔ تیسری تحریر غازی انور پاشا کے نام تھی کہ شیخ الہند کے مطالبات پورے کیے جائیں۔ان میں سے پہلی تحریر ہندوستانی تاریخ میں "غالب نامہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

غالب پاشا نے شیخ الہند کو یقین دلایا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو انگریزوں سے آزادی دلانے میں ہر ممکن تعاون کریں گے اور صلح کی کانفرنس میں آزادی ہند کی کامل حمایت کریں گے۔اس کے بعد شیخ الہند مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہیں پر انہیں ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا اور شامی محاذ کے سربراہ جمال پاشا سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔انہوں نے مفتی مدینہ کے وساطت سے انور پاشا سے بند کمرے میں ملاقات کی اور انہیں غالب پاشا کا خط پیش کرنے کے بعد ہندوستان کی تحریک آزادی کا منصوبہ بتا کر اس میں تعاون اور مدد کرنے کی درخواست کی۔انور پاشا نے ہر طرح کے تعاون کے وعدے کے ساتھ چند تحریریں لکھ کر دیں جن میں آزاد قبائل کو مجاہدین کا ساتھ دینے اور انگریزوں کے خلاف کاروائی تیز کرنے کی ہدایات تھیں، نیز انہیں اعانت کا بھی اطمینان بھی دلایا گیا تھا، بشرط کہ ہندوستانی پیچھے نہ ہٹیں اور وہ کامل آزادی کے مطالبے پر ڈٹے رہیں۔ شیخ الہند نے ان تحریروں کو عربی، فارسی، ترکی زبانوں میں لکھ کر دینے کی خواہش کی تا کہ انہیں ہندوستان بھیجا جا سکے۔اسی طرح انہوں نے یہ بھی درخواست کی کہ انہیں محفوظ طریقہ راستے سے افغانستان بھیج دیا جائے جہاں سے وہ یاغستان چلے جائیں گے۔انور پاشا نے اس سے معذرت کرلی کیوں کہ روسی فوجیں ایران پہنچ چکی تھیں، انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر ہندوستان واپسی میں آپ کو خطرہ ہے تو فی الحال حجاز میں ہی قیام کریں۔ شیخ الہند حجاز میں ہی رک گئے اور غالب نامہ، انور پاشا کی عربی، فارسی اور ترکی زبان میں لکھی ہوئی تحریروں کے علاوہ بعض دیگر ضروری کاغذات کو ہندوستان پہنچانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ انہوں نے کپڑے رکھنے کے لیے لکڑی کا ایک صندوق بنوایا اور اس کے تختے اندر سے کھود کر اسی میں تمام کاغذات چھپا دیے، پھر اس صندوق کو مولانا ہادی حسن رئیس خاں جہاں

پور، مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش سندھی کی سرپرستی میں ممبئ بھیج دیا گیا۔ ممبئ بندرگاہ پر سی آئی ڈی کے لوگ موجود تھے، لیکن مولانا محمد نبی اسے بحفاظت نکال لانے میں کام یاب ہوگئے۔ دہلی میں حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر نے ان کے فوٹو لیے اور مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری نے ان تحریروں کے عکس کو سرحد کی طرف پہنچادیا۔ انہوں نے اپنے ایک عزیز سے تحریروں کا ذکر کیا، جس کی وجہ سے بات انگریزوں تک پہنچ گئی اور متعدد اصحاب کی تلاشیاں ہوئیں اور مختلف مصائب کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔

مولانا محمود حسن کا ارادہ تھا کہ وہ کسی طرح ایران کے راستے یاغستان پہنچ جائیں، لیکن راستے میں انگریزی اور روسی فوجیں تھیں تو انہوں نے چاہا کہ بحری سفر کے ذریعے ممبئ کے بجائے بلوچستان کی بندرگاہ پر اتر کر یاغستان چلے جائیں۔ واپسی سے پہلے وہ غالب پاشا سے آخری ملاقات کے لیے مکہ مکرمہ گئے۔ اسی دوران شریف حسین نے انگریزوں کی شہ پر ترکوں کے خلاف بغاوت کردی اور 1916 میں ایک فتویٰ جس میں ترکوں کو غاصب، خائن اور کافر لکھا گیا تھا، شیخ الہند سے توثیق کرنے کا مطالبہ کیا، انہوں نے انکار کیا تو شریف حسین نے انگریزوں کی خواہش کے مطابق انہیں گرفتار کرکے جدہ پہنچادیا، جہاں سے انگریز انہیں مصر لے گئے پھر انہیں 1917 میں مالٹا بھیج کر نظر بند کردیا گیا۔ شیخ الہند نے نظر بندی کا زمانہ بہت صبر واستقلال کے ساتھ گزارا، بیشتر وقت عبادت میں صرف کیا اور اسی دوران قرآن مجید کا اردو ترجمہ مکمل کیا۔ ادھر ہندوستان میں ان کی رہائی کی کوششیں جاری تھیں، چنانچہ تین سال اور سات مہینہ کے بعد 8/جون 1920 میں ممبئ لاکر رہا کیا گیا اور پھر وہ 14/جون 1920 کو دیوبند آگئے۔

مولانا محمود حسن نے مالٹا سے واپس آنے کے بعد تحریک آزادی کے حوالے سے اپنی پالیسی تبدیل کردی اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے مسلح جدوجہد کے برعکس عدم تشدد کی حکمت عملی کو ضروری قرار دیا۔ اسی طرح سے انہوں نے قومی سیاسی حکمت عملی میں بھی تبدیلی کی کیوں کہ تحریک ریشمی رومال میں کامیابی کا انحصار بیرون ہند کی حکومتوں بالخصوص خلافت عثمانیہ پر تھا، لیکن جب انگریزوں نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے شریف حسین کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس سے ترکوں کے خلاف بغاوت کرادی تو ترکوں کو خود اپنا وجود سنبھالنا مشکل ہوگیا، ان حالات نے شیخ الہند کا خیال بدل دیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ہمیں اپنی قومی آزادی کی جنگ بذات خود لڑنی ہوگی اور باہر سے امداد حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، اسی لیے انہوں نے عصری تعلیمی اداروں کی طرف بھی توجہ دی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاح کے لیے باوجود کم زوری اور نقاہت کے تشریف لے گئے، نیز وہ 1920 میں انتقال سے پہلے تک مسلمانوں کے اداروں کی تعمیر وترقی کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔

22.8 ناکامی کے اسباب اور اثرات

متعدد مؤرخین نے اپنی تحریروں میں ریشمی رومال تحریک کی ناکامی کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے:

مولانا محمود حسنؒ ریشمی رومال تحریک کے حوالے سے ایک طویل المیعاد منصوبہ رکھتے تھے اور اس پر عمل کرنے کے لیے کافی وقت درکار تھا جو جنگ عظیم اول کے شروع ہوجانے سے ممکن نہ ہوسکا۔ اس لیے بدلتے حالات کو دیکھتے ہوئے جلد بازی میں متعدد اقدامات

اٹھائے گئے جس کی وجہ سے بعد میں تحریک کو نقصان پہنچا۔ ناکامی کی دوسری اہم وجہ شریف حسین کا ترکوں کے خلاف بغاوت کرنا اور برطانیہ سے مدد حاصل کرنا تھا، اسی وجہ سے نہ صرف ترک منصوبہ کے مطابق شیخ الہند کی مدد نہیں کرسکے، بلکہ انگریزوں کے کہنے پر شریف حسین نے انہیں گرفتار بھی کرلیا اور باوجود کوشش کے انہیں یاغستان کی طرف جانے کا موقع نہیں مل سکا۔ ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی مولانا محمود حسن نے اپنی سادہ لوحی اور نیک نیتی کی وجہ سے ان لوگوں پر اعتماد کیا جو قابل بھروسہ نہیں تھے، ان لوگوں نے بھی تحریک کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس تحریک کی ناکامی سے قطع نظر ایک بڑا فائدہ ضرور ہوا وہ یہ کہ ملک کو آزاد کرانے کی لہر تیز ہوگئی اور علماء، طلبہ اور عوام کی ایک بڑی تعداد ملک کی آزادی کے لیے کوشاں رہی۔ بہر حال ریشمی رومال تحریک کا منصوبہ اپنی اصل حالت میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اگرچہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا، لیکن تحریک شیخ الہند جاری رہی اور اس کے حاملین آزادی ہند کی مختلف تحریکوں میں سرگرم رہے۔

22.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات روبہ زوال تھے۔ ایک طرف مغل حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور ملک کا بیشتر حصہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، اب سرزمین ہند پر یا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ تھا یا پھر چند علاقائی حکمرانوں کا۔ وہیں دوسری طرف شاہ ولی اللہؒ (1703-1762) کی تعلیمات کے اثرات اب بھی باقی تھے، اس کے نتیجے میں متعدد ایسی تحریکات وجود میں آئیں جنہوں نے اسلام اور اس کی تعلیمات کو نافذ کرنے اور انہیں غالب کرنے کی جدوجہد کی۔ ان سب کے طریقہ کار مختلف ہونے کے باوجود بھی مقاصد ایک تھے۔ ان ہی تحریکات میں جماعت مجاہدین اور ریشمی رومال تحریک بھی شامل ہیں۔ دونوں تحریکوں کا بنیادی مقصد غلبہ اسلام اور کلمہ حق کو بلند کرنا تھا۔
- سید احمد شہید کی تحریک تجدید احیائے دین اور جہاد کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے بنیادی مقاصد توحید کی اشاعت و تبلیغ، شرک اور بدعات وخرافات کا خاتمہ، قبر پرستی اور مراسم محرم کی بیخ کنی، خوشی اور غم کے موقع پر غیر اسلامی رسموں کی اتباع کے بجائے اسلامی زندگی کی پیروی، نکاح بیوگان کی ترویج واشاعت کے علاوہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ بانی تحریک نے ہندوستان میں حکومت الٰہیہ کے قیام اور مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم وستم سے محفوظ کرنے کے لیے جہاد کا آغاز کیا اور تقریباً چار ساڑھے چار سال تک ان سے برسرپیکار رہے، بالآخر متعدد مواقع پر سکھوں کے خلاف قبائلی سرداروں کی عدم موافقت، خوانین کی غداری، افغان سرداروں کی جاہلانہ عصبیت، افغان علماء کا مسئلہ عشر کی وجہ سے مخالفت کرنا، بعض علماء سوء کی تفریق انگیز حرکات، قاضیوں کے غلط فیصلوں اور کچھ مجاہدین کی ناتجربہ کاری یا ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے انہیں اور ان کے رفقاء کو معرکہ بالاکوٹ میں شہادت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی شہادت کے بعد تحریک مجاہدین کا خاتمہ تو نہیں ہوا، البتہ رفتار ضرور سست ہوگئی۔
- مولانا محمود حسن نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات اور سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے طرز عمل کی روشنی میں ہندوستان سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے لیے تربیت یافتہ افراد کی ایک منظم جماعت تیار کی اور باقاعدہ تحریک ریشمی رومال کا آغاز کیا۔ اس

تحریک کا ابتدائی مقصد ملک کے مختلف حصوں بالخصوص یاغستان میں دینی اور اسلامی درس گاہوں کا قیام تھا تاکہ مسلمان اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہو سکیں، عوام کی اصلاح کی جاسکے، دین کے غلبے کے لیے جدوجہد کی جاسکے اور برصغیر میں مسلم اقتدار کی بحالی ممکن ہو سکے۔ ان درس گاہوں سے درپردہ عسکری مہمات کا بھی کام لیا گیا، جب یہ ضروری سمجھا گیا کہ تشددیا زور زبردستی کیے بغیر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال کر آزادی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ 1916 میں شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد اس تحریک کا عملاً خاتمہ ہو گیا۔

22.10 کلیدی الفاظ

حضرو : حضرو علاقہ چھچھ ضلع کیمبل پور کا مشہور مقام ہے۔

بالاکوٹ : بالاکوٹ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کا مشہور قصبہ ہے۔

غالب نامہ : حجاز کے گورنر غالب پاشا کی ہندوستانیوں کے نام لکھی گئی تحریر۔

خوانین : خان کی جمع خوانین ہے۔

22.11 نمونہ امتحانی سوالات

22.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک مجاہدین کے بانی سید احمد شہید کی سن پیدائش اور وفات کیا ہے؟

(a). 1735-1835 (b). 1790-1830 (c). 1786-1831 (d). 1780-1836

2. کس تحریک کو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دعوتی وجہادی تحریک ہونے کا اعزاز حاصل ہے؟

(a). ریشمی رومال تحریک (b). خاکسار تحریک (c). فرائضی تحریک (d). تحریک مجاہدین

3. رائے بریلی میں دائرہ علم اللہ / تکیہ علم اللہ کی تعمیر کس مشہور شخصیت نے کی تھی؟

(a). شاہ ولی اللہ (b). شاہ علم اللہ (c). شاہ عبدالقادر (d). شاہ رفیع الدین

4. سکھوں نے سید احمد شہید کو کیا نام دیا تھا؟

(a). خلیفہ صاحب (b). امیر المؤمنین (c). بادشاہ صاحب (d). سلطان

5. معرکہ بالاکوٹ میں سید احمد شہید کے بالمقابل سکھوں کا سربراہ کون تھا؟

(a). بدھ سنگھ (b). رنجیت سنگھ (c). شیر سنگھ (d). گوبند سنگھ

6. ریشمی رومال تحریک کا بانی کون تھا؟

(a). مولانا قاسم نانا توی (b). مولانا عبید اللہ سندھی (c). سید احمد شہید (d). مولانا محمود حسن

7. مولانا محمود حسن نے کس مشہور بزرگ کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی؟

(a). حضرت بختیار کاکی (b). حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (c). حاجی ابراہیم یوسفی (d). شاہ عبد العزیز

8. جمعیۃ الانصار کس سن عیسوی میں قائم کی گئی تھی؟

(a).1709 (b).1809 (c).1909 (d).1915

9. جنود اللہ / جنود ربانیہ کو کس نے قائم کیا تھا؟

(a). ابوالکلام آزاد (b). محمد علی جوہر (c). عبد الرحیم سندھی (d). عبید اللہ سندھی

10. مولانا محمود حسن کو انگریزوں نے کس جگہ نظر بند کیا تھا؟

(a). مصر (b). مالٹا (c). حجاز (d). یاغستان

22.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک مجاہدین کا پس منظر اور اس کے مقاصد پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. سید احمد شہید کا سفر حج اور اس کے اسباب کی وضاحت کیجیے۔
3. ریشمی رومال تحریک کی نوعیت اور مقاصد بیان کیجیے۔
4. ریشمی رومال تحریک میں مولانا عبید اللہ سندھی کے کردار کی وضاحت کیجیے۔
5. تحریک مجاہدین اور ریشمی رومال تحریک کی ناکامیوں کے اسباب بیان کیجیے۔

22.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سید احمد شہید کی حیات و خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. مولانا محمود حسن کی حیات و خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. تحریک مجاہدین اور ریشمی رومال تحریک کے اثرات پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

22.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تحریک سید احمد شہید : غلام رسول مہر

2. تعارف جماعت مجاہدین : چوہدری عبد الحفیظ
3. جب ایمان کی باد بہاری چلی : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
4. تحریک شیخ الہند : مولانا سید محمد میاں
5. ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک : مسعود عالم ندوی

6. Silken Letters Movement : Maulana Muhammad Miyan

اکائی 23: جنگ آزادی میں مسلمانوں کی حصہ داری (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

23.0 تمہید

23.1 مقاصد

23.2 انگریزوں کی آمد اور ان کی ریشہ دوانی

23.2.1 دفاعی دور

23.2.2 دکن میں دفاع

23.2.3 دہلی پر قبضہ، غلامی کا اعلان

23.3 حضرت شاہ عبد العزیز کا فتوی

23.4 تحریک سید احمد بریلویؒ

23.4.1 سید صاحبؒ کا دوسرا دورہ

23.4.2 پروپیگنڈہ اور اس کی حقیقت

23.4.3 جہاد کی تیاری

23.4.4 سکھوں پر حملہ، عارضی حکومت، غداری

23.4.5 غداری

23.4.6 بالاکوٹ کی جنگ

23.4.7 جنگ استھانہ

23.5 علماء صادق پور

23.6 1857ء کی تحریک آزادی

23.6.1 شاملی کی جنگ آزادی

23.6.2 ثمرۃ التربیت

23.7 اکتسابی نتائج

23.8 نمونہ امتحانی سوالات

23.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

23.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

23.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

23.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

23.0 تمہید

سلطان محمود غزنوی کی ہندوستان آمد سے پہلے ہی اسلام ہندوستانی سرزمین پر عرب تاجروں کے ذریعہ آچکا تھا، لیکن اسلامی شان و شوکت کا ظہور اس وقت نہیں ہوا تھا، سلطان کے آنے سے باضابطہ اسلامی حکومت کا دور شروع ہوتا ہے، اس سرزمین پر مسلم حکمرانوں نے قابض بادشاہوں جیسا سلوک نہ کیا بلکہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا، اور اپنے گھر کی طرح اس کو سجایا اور چمنستان ہند کی آبیاری کی، اس لئے تجارت، صناعت، زراعت، تعلیم انصاف رسانی غرضیکہ ہر محاذ پر اس ملک کو ترقی سے ہمکنار کیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان عالمی سطح پر سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور ہوا اور بقول مجاہد آزادی مولانا حسین احمد مدنی "1772ء میں صرافوں کی دوکانوں پر شہروں میں اشرفیوں اور روپیوں کے ڈھیر ایسے لگے ہوتے تھے جیسے منڈیوں میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں، اور یہی وجہ تھی کہ سبھی قومیں ہمیشہ ہندوستان کا رخ کرتی تھیں"، ترقی کا اثر یہ ہوا کہ تاجر برادری پوری دنیا سے ہندوستان کی طرف کھنچے چلے آئے۔

23.1 مقاصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور اس کے مقاصد سے واقف ہو سکیں گے نیز ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کے قیام کی مخالفت کرتے ہوئے کس طرح سے مسلمانوں نے دیگر اقوام کے ساتھ مل کر ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرایا ہے آگاہی حاصل کر سکیں گے۔

23.2 انگریزوں کی آمد اور ان کی ریشہ دوانی

تقریباً 100 برطانوی تاجروں نے تیس ہزار پونڈ کی ایک خطیر رقم جمع کر کے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے 31 دسمبر 1600ء کو باقاعدہ ایک تجارتی کمپنی کا آغاز کیا، 1617ء میں مغل حکمراں جہانگیر کے دربار میں انگریز سفیر سر تھامس رو (Sir Thomas Roe) پہنچا۔ 1687ء تک ان کی تجارت کا مرکز سورت رہا۔ کمپنی نے 1717ء میں مغل شاہی فرمان کی اجازت سے کسٹم فری تجارتی

مراعات حاصل کرلی۔ فرخ سیر کا یہ فرمان انگریزوں کی تجارتی سرگرمیوں اور سیاسی پالیسیوں کے لحاظ سے سنگ میل ثابت ہوا۔ 1623ء تک انہوں نے سورت، بڑوچ، احمد آباد، آگرہ اور مچھلی پٹنم (مسولی پٹنم) میں کوٹھیاں قائم کرلیں۔ 1625ء میں کمپنی کے اربابِ اقتدار نے سورت کی کوٹھی قلعہ بند کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت مغل حکومت قوی تھی، اس لیے مقامی حکام نے کمپنی کے افسرِ اعلا کو گرفتار کرکے پابہ زنجیر کردیا۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے انگریزوں کی سیاسی توسیع کا عمل شروع ہوا۔ مغل حکومت کے زوال سے فائدہ اٹھاکر انگریز تاجروں نے سیاسی ریشہ دوانیاں شروع کردیں، منصوبہ کے تحت انہوں نے حکمراں امراء اور حکام کے خلاف نت نئے الزامات اور فتنے شروع کئے تاکہ عوام بدظن ہو اور ان کا کام آسان ہو جائے، ساتھ ہی ہندوستانی حاکموں کو ہٹانے اور بے دخل کرنے کی کوششیں ہونے لگیں، انگریزوں کے ان فتنوں کو ختم کرنے کے لئے باشندگان ہند نے ان کے خلاف آزادی کی جنگ چھیڑ دی۔

23.2.1 دفاعی دور

مغل حکومت کے بکھرنے کے بعد ملک چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہوگیا، چنانچہ گجرات، مالوہ اور وسطی ہندوستان میں مرہٹے، بنگال میں علی وردی، اودھ میں برہان الملک، روہیل کھنڈ افغانی سردار حافظ رحمت اللہ خاں اور دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے آزاد اور خود مختار حکومتیں بنالیں، مغل حکومت کو کمزور ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا دیکھ کر سکھوں نے پنجاب میں خود مختار حکومت قائم کرلی، دکن میں نظام الملک کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں اور نواسوں کے درمیان جانشینی کے بارے میں اختلاف کی وجہ سے انگریز کو دخل اندازی کا موقع ملا اور محمد علی والا جاہ نے انگریزوں کے سہارے ریاست کرناٹک میں حکومت بنائی لیکن محمد علی والا جاہ کی حیثیت کرناٹک کی حکومت میں صرف ایک نواب کی تھی اصل حکمرانی انگریز کی تھی۔

اس بکھرتے ہندوستان میں انگریز اپنی مکاریوں اور ریشہ دوانیوں کے ذریعہ ایک ریاست کے بعد دوسری ریاست کو نگلتے اور قبضہ کرتے رہے اور ہندوستانی حکمران اپنے ملک اور ریاست کو بچانے کے لئے مسلسل کوششیں کرتے رہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

1. بکسر کی جنگ۔پہلی جنگ آزادی

بنگال بہت ہی خوشحال اور متمول ریاست تھی، یہاں کے نواب علی وردی کی وفات کے بعد ان کے پوتے سراج الدولہ کو بنگال کا امیر بنایا گیا، انگریزوں نے سازش کے تحت قلعہ ولیم کو اپنی فوجی چھاؤنی بنایا تو سراج الدولہ نے انگریزوں کو کسی بھی فوجی کارروائی سے روکا لیکن انہوں نے سرکشی کی اور نہ مانے تو حاکم سراج الدولہ نے فوجی کارروائی کرکے انہیں نکال دینے کا اردہ کیا اور فوج لے کر نکلے، ادھر انگریزوں نے مدراس اور دوسرے کئی علاقوں سے مدد لے کر اپنی فوج اکٹھا کی، اس طرح انگریزی فوج بھی آگئی اور دونوں فوجیں پلاسی کے میدان میں 1757ء میں آمنے سامنے ہوئیں، لڑائی سے کچھ دیر پہلے مسلمان لشکر کے تین اہم کمانڈر میر جعفر، ولبھ رام اور یار لطیف خان نے سراج الدولہ سے غداری کی اور اور اپنے زیر کمان فوج لے کر الگ ہوگئے، اس طرح سراج الدولہ کی فوج کچھ ہی دیر میں شکست کھاگئی اور سراج الدولہ کو گرفتار کرکے بے رحمی سے قتل کردیا گیا۔

سرج االدولہ کی حکومت ختم ہونے کے بعد میر جعفر کو ایسٹ انڈیا نے حاکم بنگال بنایا لیکن میر جعفر سے ایسٹ انڈیا کی زیادہ نہ جمی

اور اسکو ہٹا کر اس کے داماد میر قاسم کو حاکم بنایا، میر قاسم نے ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کی طرح مساوی سلوک کیا جسکی وجہ سے کمپنی ناراض ہو گئی اور اس کو عہدہ سے ہٹانا چاہا لیکن میر قاسم نے اودھ کے شجاع الدولہ اور شاہ عالم کے ساتھ مل کر بکسر کے قریب 1764ء میں مقابلہ کیا لیکن ہندوستانی فوج کے حصے میں ایک اور شکست لکھ دی گئی اور یہاں بھی شکست کی وجہ غداری ہی رہی اور غدار میر قاسم کی فوج کا سربراہ نجف خان تھا۔

23.2.2 دکن میں دفاع

ہمارے ملک ہندوستان کے جنوب میں میسور نام کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے، میسور کا راجہ کرشنا ہندو تھا، اس نے اپنے وزیر حیدر علی (ٹیپو سلطان کے والد) کی فوجی صلاحیت اور دیانت سے متاثر ہو کر "فتح بہادر علی" کے عظیم خطاب سے نوزا اور اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا، اسی حیدر علی کے بیٹے کا نام ٹیپو سلطان ہے، حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے اس دکنی (جنوبی) علاقہ میں انگریزوں سے مسلسل 30 (تیس) سال چار جنگیں لڑیں جن کی قدرے تفصیل درج ذیل ہے:

1. پہلی جنگ آزدی میسور میں انگریزوں کے خلاف حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے 1767ء-1769ء کے درمیان لڑی، دونوں نے مل کر دشمن کو شکست سے دوچار کیا حیدر علی نے ان کا تعاقب کیا انگریزی فوج بھاگتے ہوئے مدراس کے قریب "کوہ تھامس" کے قریب جا پہنچی۔ دشمن نے اپنی مکمل تباہی سامنے دیکھی تو حیدر علی سے صلح کی درخواست کی اور حیدر علی نے اپنی مرضی کی شرائط پر صلح کی، یہ جنگ دو سال تک چلتی رہی تھی۔
2. حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی انگریز سامراج کے خلاف دوسری جنگ 1780ء میں شروع ہوئی، اس کو "جنگ پولی لور" کا نام دیا گیا ہے۔ انگریز کی طرف سے سر بکنز اور کرنل بیلی کی متحدہ فوج نے حصہ لیا جن کو حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے شکست فاش دیا، اس جنگ میں مرہٹہ سرداروں نے سلطان کا ساتھ اس امید پر دیا کہ وہ ان انگریزوں کو ملک بدر کر سکتے ہیں، لیکن اسی درمیان انتقال ہو جانے کی وجہ سے وہ مایوس ہو گئے اور نانا فرنویس نے انگریزوں کی اطاعت مجبوراً قبول کر لی۔
3. سنہ 1786ء میں حکومت برطانیہ نے لارڈ کانوالس کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر بھیجا، یہ جنرل امریکہ کے مقابلہ میں شکست کھا چکا تھا اس لئے بہت پر جوش تھا تا کہ اپنے اوپر سے ناکامی کا داغ صاف کر سکے اس لئے ہندوستانی زمین پر قدم رکھتے ہی اودھ کے نواب پر ظلم اور عدوان کا سلسلہ شروع کر دیا اور اودھ کو لوٹ لیا، پھر کارنوالس کلکتہ سے مدراس پہنچا اور نظام حیدرآباد اور مرہٹوں کو ملا کر متحدہ لشکر سے ریاست میسور پر حملہ کر دیا، اس اتحادی فوج کو سلطان نے کئی مقامات پر شکست دی، لیکن پیچھے ہٹتے ہوئے سرنگا پٹنم پہنچے اور اس متحدہ فوج نے سلطان کے پایۂ تخت کو محاصرہ میں لے لیا اور اس کا محاصرہ طویل ہونے کی وجہ سے کارنوالس نے صلح کی بات کی، اس صلح میں سلطان ٹیپو کا بڑا خسارہ ہوا، آدھی سلطنت چھن گئی اور بطور تاوان جنگ تین کروڑ دینے پڑے، نیز بطور ضمانت اپنے بیٹوں عبد الخالق اور معز الدین کو انگریزوں کے حوالے کیا لیکن وطن عزیز کی غلامی کو پسند نہ کیا، سلطان کی اس عظیم قربانی کو دیکھتے ہوئے مرہٹہ سردار نے کہا کہ انگریز کے ساتھ مل کر سلطان سے جنگ کرنا غداری ہے اور اسی مرہٹہ

سردار نے چوتھی جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔

4. برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں لارڈولزلی کو گورنر بناکر بھیجا گیا، نئے گورنر نے عہدہ سنبھالتے ہی باقی ماندہ ریاست میسور کے خلاف تیاریوں کا آغاز کر دیا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سلطان ٹیپو مختلف طریقوں سے جدوجہد آزادی کو بین الاقوامی سطح پر لے جانا چاہتے تھے، اس کام کے لئے اپنے سفیر ایران، افغانستان، ترکی، فرانس اور امریکا بھیجا اور لارڈ ولزلی نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستانی راجے مہاراجے اپنے تعلقات کو بین الاقوامی سطح پر استوار کریں اور حکومت برطانیہ کی راہ میں مشکلات پیدا کریں، لہذا ولزلی نے نظام حیدرآباد کی کثیر فوج کو ساتھ ملا کر ریاست میسور پر دوطرفہ حملہ کیا، مدراس کی طرف سے جنرل ہارس اور ملیبار اور گوک کی طرف سے جنرل اسٹورٹ سرنگا پٹنم کی طرف بڑھے۔

5. سلطان ٹیپو نے دشمن کو شکست دینے اور وطن کی آبرو کی حفاظت کے لئے ہر جتن کئے مگر کلکتہ کی جنگ پلاسی کا منظر سامنے تھا، یہاں میر صادق، میر معین الدین، میر قاسم، میر قمرالدین اور میر بدرالزمان خان جیسے ضمیر فروش ظاہر ہوئے، ان لوگوں کی رہنمائی میں انگریز فوجیں قلعہ کی فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہوئیں، سلطان نے ہتھیار ڈالنا پسند نہ کیا اور لڑتے ہوئے شہید ہوگئے، آپ کے پانچ ہزار حفاظتی دستے کا کماندار ہندو تھا اور آپ کے ساتھ شہید ہونے والوں میں کچھ برہمن زادیاں بھی تھیں جو سلطان کو اپنا باپ کہتی تھیں۔ اس مرد آہن کی شہادت کے بعد انگریز فوج کے کمانڈر لارڈ ہارس نے اعلان کیا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔

23.2.3 دہلی پر قبضہ، غلامی کا اعلان

انگریز اپنی جعل سازیوں، فریب کاریوں اور طاقت کے ذریعہ تقریباً پورے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے لیکن دہلی میں مغل حکومت کا چراغ ابھی ٹمٹمارہا تھا، ٹیپو کی شہادت کے بعد لارڈ ہارس نے دہلی کو اپنا نشانہ بنانا شروع کیا اور 1800ء میں اپنی فوج لے کر دہلی کی طرف بڑھا، مغل حکومت کی محافظ مرہٹہ فوج بھی انگریزی فوج کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکیں اس لئے وہ 1803ء میں دہلی میں فاتحانہ داخل ہوئے اس وقت دہلی میں شاہ عالم حکمراں تھا انگریزوں نے اس سے جبراً یہ معاہدہ لکھوایا کہ "اب آج سے خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، اور حکم کمپنی بہادر کا"، اس معاہدہ کا صاف مطلب تھا کہ آج سے قانون ایسٹ انڈیا کا چلے گا اور ہندوستان سے اسلامی قوانین ہمیشہ کے لئے ختم اور اب ہندوستان غلام بن چکا ہے، نیز یہ معاہدہ اس امر کا اعلان تھا کہ اب حکمرانوں اور راجہ مہاراجاؤں کا ہندوستانی سرزمین پر دفاع مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے، لیکن یہیں سے عوامی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے اور اس کی بنیادی آواز شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ ہے۔

23.3 حضرت شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ

جب انگریز نے اپنا قانون حکومت نافذ کرنے اور ہندوستانی قانون ختم کرنے کا اعلان کیا تو حضرت شاہ صاحب کو احساس ہوا کہ اب ملک غلام ہو چکا ہے لہذا اس کی آزادی کی فکر کرنی چاہئے، اس لئے علماء کو نسل کا اہتمام کیا اور اس مجلس میں درج ذیل علماء کرام تشریف

لائے:

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا بڈھانویؒ، شاہ محمد اسحاقؒ، مفتی الٰہی بخشؒ کاندھلوی، مفتی شرف الدین رامپوریؒ، مولانا ابوالحسن کاندھلویؒ، مولانا کرامت علی جونپوریؒ، قاضی فضل الرحمن بردوانیؒ، مولانا وجیہ کلکتویؒ، مولانا عبدالحق آرویؒ، مولانا محمد ابراھیم ٹھٹویؒ، محمد مخدوم تربتائیؒ، مولانا عبدالرسول جوتالویؒ، مولانا عبدالکریم بیتارویؒ اور مولانا عبدالرحیم کوتویؒ۔

شاہ صاحب نے اپنے ان احباب کے ساتھ مل کر فارسی زبان میں یہ فتوی دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور انگریز کی فوج میں بھرتی ہونا اور ان سے کسی طرح کا تعاون کرنا حرام ہے۔ اس فتوی کا اردو ترجمہ پیش ہے:

"اس شہر میں امام المسلمین کا حکم بالکل جاری نہیں ہے، اور احکام کفر جاری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، رعایا کے انتظامات، خراج، باج، اور عشر (مالگزاری) اموال تجارت ڈاکوں اور چوروں سے حفاظت کے انتظامات، نزاعات کے فیصلوں اور جرائم کی سزاؤں کے مقدمات میں کافر ہی بطور حاکم مقرر ہو گئے ہیں۔ اور یہاں اگرچہ انہوں نے بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ، عیدین، اذان اور گائے کے ذبیحہ سے کوئی (فی الحال) تعرض نہیں کیا لیکن ان چیزوں کی اصل اصول (یعنی مذہبی آزادی اور شعائر اسلام کی حیثیت) ان کی نظر میں بے حیثیت اور فضول ہے۔ اسی وجہ سے وہ مسجدوں کو بے تکلف مسمار کر دیتے ہیں۔ اور کوئی بھی مسلمان یا ذمی ان کی اجازت اور امان کے بغیر اس شہر میں داخل نہیں ہو سکتا۔"

ماہرین کی رائے اور جنگ آزادی کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتوی سنہ 1801ء-1809ء کے درمیان دیا گیا ہے، جبکہ کئی اہل قلم نے 1803ء کو راجح قرار دیا ہے۔ بہر حال فتوی کی تاریخ کچھ بھی ہو یہ فتوی ہندوستان میں جنگ آزادی کا نقطہء آغاز ثابت ہوا، اور عوام میں یہ ولولہ پیدا ہوا کہ وطن عزیز میں اسلام کی حفاظت کے لئے استعمار سے ٹکر لینا ضروری ہو گیا ہے، اور عوام و خواص کی فکر میں انقلاب پیدا ہوا اور انگریز کے خلاف مختلف انداز میں صف آرا ہوئے اور کئی تحریکات وجود میں آئیں، ان میں سید احمد رائے بریلویؒ کی تحریک بھی ہے جسکی قدرے تفصیل درج ذیل ہے:

23.4 تحریک سید احمد بریلویؒ

یہ 1818ء کی بات ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ قائد کی حیثیت سے راہ وفا کے پچاس متوالوں کو لے کر دہلی سے روانہ ہوئے، اس پہلے دورہ میں دہلی سے نکل کر آپؒ غازی آباد، مراد نگر، میرٹھ، سردھنہ، بڈھانہ، پھلت، مظفر نگر، دیوبند اور سہارنپور تشریف لے گئے، پھر گڑھ مکتیشور، مرادآباد اور بریلی تشریف لے گئے، اور یہاں سے اپنے اصلی وطن رائے بریلی کی خانقاہ "تکیہ شاہ علم اللہ" میں چند مہینے قیام فرمانے کے بعد الہ آباد، کانپور، بنارس، سلطان پور پہنچے، پھر اس کے بعد مملکت اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ میں قیام فرمایا۔

مقصد: اس دورہ کا اعلانیہ مقصد یہ تھا کہ اسلامی سماج اور معاشرہ میں اصلاح پیدا کرنا اور کلمہ طیبہ سے عوام و خواص کے رشتہ کو مضبوط تر کیا جائے، لیکن اصل مقصد جہاد کی تیاری کرنا تھا، اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کی حقیقت میں دو وجوہات تھیں:

1. جہاد کی کامیابی پختہ ایمان اور اسلام کے سایہ میں ہوتی ہے، جب تک معاشرہ مکمل اسلامی نہ ہو اور شرک وبدعات اور خرافات سے پاک نہ ہو تب تک جہاد کی کامیابی کی موہوم امید رکھنا بھی غلط شمار کیا جاتا ہے۔

2. دوسری وجہ احتیاط برتنا تھی کیوں کہ ہر طرف انگریز اور اس کے غنڈوں کی بالادستی قائم تھی، اور ان کے کارندے ہر طرف موجود ہوتے اس لئے ان سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا لیکن اصل مقصد جہاد کی تیاری رہا۔

آپؒ کا طریقہ یہ تھا کہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے بیانات کرتے اور شرک وبدعات سے دور رہنے پر زور دیتے، اور جب موقع ملتا تو جہاد کی ترغیب دیتے اور آپؒ خود اپنے ساتھ اسلحہ رکھتے تاکہ دوسرے احباب کو بھی اس کی اہمیت اندازہ ہو۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے اپنے مرید کو ایک طمنچہ دیا اور فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کی نیت سے ہتھیار لگاؤ، اور اسلحہ چلانے کی مشق کرو اس سے بہتر کوئی فقیری اور درویشی نہیں ہے، یعنی آپؒ موقع کی مناسبت سے ہر کام کرتے تھے کیوں کہ حکمت ہر کامیابی کی کلید ہے۔

23.4.1 سید صاحبؒ کا دوسرا دورہ

آپؒ اپنے وطن اصلی رائے بریلی سے الہ آباد، مرزاپور، پٹنہ، مونگیر، بھاگلپور اور مرشد آباد ہوتے ہوئے چار سو(400) احباب ومتوسلین کو ساتھ لے کر کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے، کلکتہ پہنچنے سے پہلے یہ تعداد آٹھ سو ہو گئی اور سفر حج کے لئے پانی کے جہاز کا انتخاب کیا گیا۔ اس دورہ کا مقصد تو جہاد ہی تھا لیکن دورہ کو سفر حج کا عنوان دیا گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ عرصہ سے بعض علماء یہ فتوی دے رہے تھے کہ چونکہ سفر حج بیت اللہ کے لئے راستہ مامون نہیں ہے اس لئے حج بیت اللہ شریف ضروری نہیں ہے۔ اس فتوی کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے حج پر جانا ہی چھوڑ دیا، اس باطل خیال کی اصلاح بہت ضروری تھی اس لئے سفر حج کا عنوان دیا، اور حج کے ساتھ آہستہ آہستہ جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کرتے رہے۔

23.4.2 پروپیگنڈہ اور اس کی حقیقت

یہ پروپیگنڈہ بڑے زور وشور سے کیا گیا کہ حضرت سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء سفر حج کے دوران عبد الوہاب نجدی کے خیالات اور افکار سے متاثر ہو گئے ہیں بلکہ ان کے پیروکار ہو گئے ہیں اور ان کے خیالات کی تبلیغ بہت ہی شد ومد سے کرتے ہیں، یہ پروپیگنڈہ بہت ہی زور وشور سے کیا گیا تاکہ لوگ سید صاحب اور ان کی فکر سے الگ ہو جائیں اور ان کا کام خراب ہو جائے، اس لئے کہ اس علاقہ کے لوگ عبد الوہاب نجدی کی فکر کو پسند نہیں کرتے تھے، لہذا انگریزوں نے جہاد کی کوششوں کو بدنام کرنے کے لئے یہ پروپیگنڈہ کروایا۔

محمد بن عبد الوہاب نجدی اپنے دور کے مصلح کی حیثیت سے مشہور ہیں، ان کی اصلاحات میں سختی کا عنصر بہت زیادہ تھا، مگر سید صاحب کی نسبت محمد عبد الوہاب نجدی سے جوڑنا محض ایک الزام اور پروپیگنڈہ سے زیادہ کچھ نہ تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عبد الوہاب نجدی کی وفات 1792ء میں ہوئی اور اس علاقہ میں ان کے حامیوں کی حکومت 1776ء–1818ء کے درمیان رہی ہے، اس کے بعد ترکی اور مصری افواج نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا اور محمد بن عبد الوہاب کے ہم خیال حکمرانوں کو مکمل طور پر بے دخل کر دیا تھا، سید صاحبؒ کی ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، اس کے باوجود سید صاحبؒ یا ان کے احباب یا بعد میں تیار ہونے والے علماء کو وہابی کہنا انگریز حکمرانوں کی ایک چال اور

سازش کے علاوہ، لڑاؤاور حکومت کروکا ایک حصہ تھا،اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔

23.4.3 جہاد کی تیاری

سید صاحبؒ حج سے واپسی کے بعد 20اپریل / 1824ء کو کلکتہ کے راستہ سے رائے بریلی پہنچے، کچھ ضروری گھریلو مصروفیات کے بعد رفقاء کار مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحی وغیرہ کو جہاد کے فضائل وغیرہ بیان کرنے کے لئے ملک کے مختلف علاقوں میں بھیجا اور آپ 17 جنوری 1826ء کو رائے بریلی سے جہاد کی غرض سے جہاد کے مرکز صوبہ سرحد کے لئے روانہ ہوئے، آپؒ کے ساتھ پانچ سو لوگ تھے، قدسیوں کا یہ قافلہ براہ گوالیار، ٹونک، اجمیر، حیدرآباد، سندھ، شکارپور، کوئٹہ، قندہار، کابل اور پشاور پہنچے، پھر وہاں سے چارسدرہ کے مقام پر پہنچ کر قیام فرمایا، یہاں تک پہنچنے میں دس مہینے لگے اور اب مجاہدین کی تعداد ڈیڑھ ہزار ہو گئی تھی اور لوگ مسلسل اس قافلہ میں شامل ہوتے جارہے تھے۔

صوبہ سرحد کو سید صاحبؒ نے مرکز جہاد کے لئے منتخب کیا اس کے کئی اسباب رہے ہیں۔ 1- جہاد کے مرکز کے لئے ایسے مقام کی ضرورت تھی جہاں صرف مسلم آبادی ہو اور وہ علاقہ کسی بیرونی طاقت کے زیر اثر نہ ہو، یہ ساری خوبیاں صوبہ سرحد میں مکمل تھیں۔ 2- پٹھانوں کی دینی حمیت اور غیرت مشہور تھی اس لئے ان کا حاصل کرنا ضروری تھا۔ 3- یہ خبریں بڑی تواتر کے ساتھ آرہی تھیں کہ سکھ اپنی مسلم رعایا کے ساتھ ظلم وجبر کا معاملہ کررہے ہیں، ان وجوہات کی بناء پر ضروری محسوس ہو کہ اس حکومت کو ختم کیا جائے اور انگریزوں پر منظم انداز میں حملہ کیا جائے، لیکن حملہ سے پہلے راجہ رنجیت سنگھ کے نام خط لکھ کر رابطہ کیا، اس خط میں تحریر تھا" ہم لوگ نہ تیرے ملک ومال کے طالب ہیں۔ نہ لڑنے کے خواہاں ہیں۔ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ساتھ دے اور ہمارے رفیق بن جا'، لیکن رنجیت سنگھ نے اس پیغام محبت کو منظور نہ کیا۔

23.4.4 سکھوں پر حملہ، عارضی حکومت، غداری

سید صاحبؒ صرف انگریزوں سے مقابلہ کے لئے نکلے تھے لیکن مجبوراً رنجیت سنگھ کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑا، اس مقصد کے لئے جیالوں کی یہ جماعت دسمبر 1826ء میں بھاولپور، حیدرآباد (سندھ) شکارپور، درہ بولان، قندھار اور کابل سے گزرتے ہوئے خیبر پہنچے اور پشاور کے اطراف واکناف کے علاقوں کو متحد کر کے ایک فلاحی ریاست کی تشکیل دی اور شہروں قصبات میں اپنے عامل مقرر کئے، عشر و خراج کی وصولی کا انتظام فرمایا، غیر شرعی رسومات، بدعات اور خرافات سے پورے علاقے کو پاک کیا، امن وامان کو یقینی بنایا، اور یہ واقعی ایک اسلامی ریاست تھی۔

23.4.5 غداری

پشاور کے قبضہ کے بعد تمام مسلمان سرداروں نے آپؒ کی اطاعت قبول کرلی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے، مگر سرداروں کو نفس پرستی نے اسلامی حکومت اور اس کے قوانین پر عمل کرنا شاق گزرا، لہٰذا ان سرداروں نے غداری کی اور رنجیت سنگھ کے ساتھ مل کر سید

صاحبؒ کے خلاف اکٹھے ہوگئے اور مقابلہ پر اتر آئے، چنانچہ سکھ فوج سے سیدو کے مقام پر مقابلہ کے وقت حاکم پشاور یار محمد خان نے سید صاحبؒ کو زہر ملا کر کھانا بھجوایا، جس کو کھانے سے سید صاحب کی حالت خراب ہوگئی، لیکن سید صاحبؒ اسی حالت میں معرکہ میں حاضر ہوگئے، سیدو کی اس جنگ میں ابتدا میں مجاہدین غالب ہوئے لیکن دوران جنگ سرداران پشاور نے غداری کی اور اپنی فوج لے کر درمان سے نکل گئے اس طرح یہ جیتی ہوئی جنگ مجاہدین ہار گئے اور مجاہدین کی یہ مقدس جماعت نے ایک گاؤں پہنچ کر اپنی جان بچائی۔

اسی مقام پر اور ایسی کسم پرسی کی حالت میں سید صاحب کو وہابی تحریک سے منسوب کرکے بدنام کیا گیا، چونکہ یہ تحریک مسلمانوں میں بدنام تھی اس لئے آپؒ کے خلاف لوگوں میں غصہ اور نفرت پھیل گئی، جس کی وجہ سے علاقے میں متعین عمال کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا، روایت یہاں تک ہے کہ ایک رات میں چار ہزار (4000) مجاہدین کو قتل کر دیا گیا، اس صورتحال نے سید صاحب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور آپؒ نے فیصلہ کیا کہ ان خود غرض سرداروں پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اس لئے جہاد کے کو پنجتار سے ہٹانے کا فیصلہ کیا اور "سندھ" کو مرکز بنایا، اور رفقائے جہاد کو اجازت دے دی کہ جو اپنے گھروں کو جانا چاہیں جاسکتے ہیں اس کی مکمل اجازت ہے مگر کوئی آپ سے الگ نہ ہوا۔

23.4.6 بالاکوٹ کی جنگ

سید صاحبؒ نے جب اپنا مرکزِ جہاد تبدیل کیا تو سکھ فوج نے سمہ اور پشاور کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور ان کی فوجیں سید صاحب کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے لگیں لیکن ان کے حصہ میں کامیابی نہ آئی، بالآخر یہ مقدس قافلہ بالاکوٹ پہنچ گیا اور پہاڑوں کے درمیان ایک محفوظ جگہ پر قیام کیا۔ ادھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ بالاکوٹ سے کچھ دوری پر بیس ہزار (20000) فوج کے ساتھ تیار تھا، وہ یہ چاہتا تھا کہ سید صاحبؒ کی اسلامی قوت کو مکمل ختم کر دیا جائے تاکہ مستقبل میں کبھی بھی سکھ حکومت کے لئے کوئی خطرہ باقی نہ رہے، چنانچہ اس نے اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے غدار خریدے اور ان سے سازباز کرکے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کیا اور صبح کی اولین ساعتوں میں اچانک مسلم مجاہدین پر حملہ کر دیا، سید صاحبؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنے مجاہدین کے ساتھ مل کر خوب مقابلہ کیا لیکن دشمن کی کثرتِ تعداد اور قبل از وقت حملہ اور تیاری نہ ہونے کی وجہ سے کوئی تدبیر اور جدوجہد کامیاب نہ ہوئی، بروز جمعہ 7 مئی 1831ء کو سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے جاں نثار مجاہدین رفقا نے اللہ کے راستے میں بڑی بہادری سے جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ سکھ حکومت نے شہداء کا احترام کیا اور سکھ حکومت میں موجود مسلمان سپاہیوں کے ذریعہ نماز جنازہ اور تدفین کا اہتمام کیا۔ اس سلسلہ میں ایک بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ مجاہدین کے اس پورے قافلہ میں کسی ہندو کا نام نہیں ملتا ہے، صرف ایک شخص "راجہ رام" توپ چلانے والے کا تذکرہ ملتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ اور مجاہدین کی شہادت سے یہ معرکہ تو ختم ہوگیا لیکن یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ آپؒ کے مریدین اور متوسلین کے ذریعہ یہ تحریک جاری رہی، اور اس راہ وفا میں بہت سے پروانوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں۔

23.4.7 جنگ استھانہ

سید صاحب کی شہادت کے بعد آپؒ کے عقیدت مندوں نے آپؒ کے پیغام حق وصداقت کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھا، اور اس کی ادائیگی میں پوری جانفشانی سے لگے رہے، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پانی پتیؒ مظفر آباد (موجودہ: پی او جے کے POJK) سے روانہ

ہوئے اور سرحدی مقام " آستھانہ) پہنچے اور اس علاقہ میں باقی ماندہ مجاہدین کو جمع کیا اور دوبارہ گوریلا جنگ کا آغاز فرمایا، ادھر حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحبؒ بحکم مولانا شاہ محمد اسحاقؒ 1835ء میں ہجرت کے ارادہ سے دہلی سے نکلے اور ریواڑی، جے پور، ٹونک، اجمیر، جودھپور اور سندھ کے راستے سے ہوتے ہوئے 4سال بعد 1839ء میں استھانہ میں پہنچے اور مجاہدین کے امیر بنائے گئے۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ دہلی میں رہ کر مجاہدین کی مالی امداد بہت عمدگی سے کرتے رہے، آپ نے استھانہ کیمپ کے مجاہدین کی ذمہ داری اپنے سر لے لیا تھا، مسلمان ملازمین نے اپنی تنخواہوں کا ایک حصہ استھانہ کے مجاہدین کے لئے خاص کر دیا تھا۔

مولانا نصیر الدینؒ نے جہاد میں حضرت سید صاحبؒ کا طریقہ کار اختیار کیا، منصوبہ کے تحت آپؒ علماء کو خطوط لکھ کر آزادی اور اسکی اہمیت کو بیان کرتے تاکہ قوم مسلم ہمہ وقت بیدار رہے اور کبھی غافل نہ ہو، مولانا نصیر الدین کی وفات کے بعد دلی میں ابتری شروع ہوئی تو حضرت شاہ محمد اسحاقؒ اپنے بھائی محمد یعقوبؒ اور دوسرے منتسبین و محبین کے ساتھ سنہ 1844ء میں اخلاص وللّٰہیت کی سرزمین مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت فرماگئے، اس طرح دلی خالی ہوگئی، اس لئے حضرت شاہ عبد الغنیؒ نے حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کی مسند بیعت و سلوک سنبھالا اور شاہ عبد الغنیؒ سے اس وقت بڑے بڑے علماء نے فیض حاصل کیا، آپؒ کے منتسبین کا احاطہ مشکل ہے، حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، امام ربانی قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وہ شخصیات ہیں جنہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا، ہنگاموں کے بعد حضرت شاہ عبد الغنیؒ بھی مکہ مکرمہ ہجرت فرماگئے۔

23.5 علماء صادق پور

مولانا ولایت علیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ سے فیض یاب تھے، صادق پور پٹنہ بہار کے رہنے والے تھے، جب سید صاحبؒ نے جہاد کے سفر کا آغاز کیا تو حضرت مولانا ولایت علیؒ بھی ساتھ تھے، مولانا نے تحریک کے ابتدائی ایام میں ہی پٹنہ کو جہاد کا مرکز بنادیا تھا، مگر بحکم سید صاحبؒ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے، اس وقت حیدرآباد کے حکمرانوں نے آپؒ کے اعمال کو پسند نہ کیا اس لئے ممبئی تشریف لے گئے، آپؒ کے ممبئی میں قیام کے دوران بالاکوٹ کا تکلیف دہ حادثہ پیش آیا، آپؒ فوراً برہان پور، جبل پور، اور تسنگھ پور وغیرہ کے راستے پٹنہ کے مرکز واپس آگئے اور اپنے پیرومرشد حضرت سید صاحبؒ کے مشن کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے میں مصروف عمل ہوگئے۔

مولانا ولایت علیؒ نے اس مرکز صادقپور میں جہادی سرگرمیوں کو بڑھانے میں حضرت سید صاحبؒ کے طریقہ کو اختیار کیا، عوام کے درمیان تشریف لے جاتے اور اسلامی عنوانات پر خطابات فرماتے، لیکن جہاد کے عنوان اور مضمون کو خصوصی اہمیت دی جاتی، مختلف مقامات پر درس قرآن اور درس حدیث شریف کا اہتمام کیا جاتا اور بوقت ضرورت اصلاحی کتابچے شائع کئے جاتے تاکہ عوام وخواص میں یکساں آگہی پیدا ہو۔ آپ کے بھائی عنایت علیؒ سید صاحب کے حکم سے بنگال میں کام کررہے تھے، یہ جماعت مختلف مقامات پر انگریزوں کے خلاف نبردآزما رہی لیکن گوناں گوں تگ ودو کے بعد آخر کار ضامن شاہ کی غداری کی وجہ سے اس کا بھی انجام بالاکوٹ جیسا ہوا، اس حادثہ کے بعد مولانا ولایت علیؒ نے "سوات" (پاکستان) میں واقع استھانہ کیمپ جانے کا اردہ کیا، آپؒ کو انگریز کے مقبوضہ علاقے سے گزرنا تھا اس لئے

انگریز سے اجازت لی مگر اس دشمن نے اجازت دینے کے بعد گرفتار کرلیا اور پٹنہ بھیج کر نظر بند کر دیا، دو سال کی قید سے رہائی کے بعد پھر سوات استھانہ کیمپ پہنچے اور 1853ء میں اپنے رب کریم سے جاملے اور استھانہ میں مدفون ہوئے۔

مولانا ولایت علیؒ کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علیؒ استھانہ کیمپ کے امیر بنے اور اپنے پیش رو دوستوں کی طرح انگریزوں کے خلاف مصروف عمل ہو گئے اور 1858ء میں وفات پائی، آپؒ کی وفات کے بعد مولانا نوراللہ صاحبؒ نے زمام خلافت وامارت سنبھالی لیکن کچھ ہی دنوں بعد کابل کے راستہ میں وفات پاگئے، ان کی وفات کے بعد میر مقصود علیؒ میر کارواں منتخب ہوئے، اور 1882ء میں ان کے رحلت فرمانے کے بعد مولانا عبداللہ کو امیر بنایا گیا، وہ 1902ء تک اپنی ذمہ داری بخوبی سنبھالتے رہے، پھر ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالکریمؒ اور 1905ء میں مولانا نعمت اللہ اور ان کے بعد مولانا رحمت غازیؒ کو امیر بنایا گیا، انگریزوں نے 1857ء کے واقعہ کے بعد استھانہ کیمپ کو تباہ وتاراج کر دیا تھا لیکن مجاہدین اپنے گھروں کو واپس نہ گئے بلکہ پہاڑوں میں روپوش ہو کر کارروائی کرتے رہے، انگریزوں نے دہلی مرکز سے ملنے والی مالی امداد کا راستہ بالکل بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے درخت کے پتوں اور چھالوں پر گزارا کرنا پڑا مگر انہوں نے جہاد سے منہ نہیں موڑا بلکہ ثابت قدم رہے۔

پٹنہ کیمپ کا حال بھی استھانہ پاکستان سے الگ نہ رہا، یہاں سے امیر محترم مولانا ولایت علیؒ کے مکہ مکرمہ ہجرت کرنے کے بعد مولانا فرحتؒ امیر قافلہ بنائے گئے، 1858ء میں ان کی وفات کے بعد مولانا محمد یحیٰ علیؒ نے ذمہ داری سنبھالی، مگر مولانا یحیٰؒ کو 1864ء میں گرفتار کرکے جزیرہ انڈمان بھیج دیا گیا، پھر اس کے بعد جس شخصیت کو بھی اس عظیم کام کا ذمہ دار بنایا جاتا انہیں گرفتار کرکے جزیرہ انڈمان بھیج دیا جاتا، دھیرے دھیرے سرحدی کیمپ استھانہ سے بھی رابطہ ختم ہو گیا مگر تحریک رکی نہیں اور 1947ء میں ملک کے آزاد ہونے تک یہ تحریک چلتی رہی، مجاہدین نے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا اور بہت سے نشیب وفراز دیکھے مگر ان کے استقلال میں کمی نہ آئی۔

ان مختصر سے سرفروشوں کا طریقہ عمل گوریلا جنگ کا تھا، یہ لوگ اپنی رہائش اور آمد ورفت وغیرہ کو مخفی رکھتے اور دشمن پر اچانک حملہ کرتے اور نقصان پہنچا کر اپنے مقام پر واپس آجاتے، اس طرح اپنے دشمن کو ہمیشہ خوف میں مبتلا رکھتے اور انہیں آرام نہ کرنے دیتے، ان کی صحیح تعداد ایک وقت میں بارہ سو (1200) تھی مگر استعماری انٹیلیجنس (12000) بارہ ہزار سمجھ رہی تھی، یہ مجاہدین کی کارروائیوں سے خوف زدہ تھے، چونکہ ایک طویل المیعاد جنگ رہی ہے اس لئے ان سورماؤں کا احاطہ بہت مشکل ہے، تاہم مولانا سید محمد علی رامپوریؒ، مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ، مولانا احمد اللہ، مولانا یحیٰ عظیم آبادی، مولانا جعفر تھانیسری جیسے مجاہدین کے نام ان میں سرفہرست ہیں۔

23.6 1857ء کی تحریک آزادی

1857ء ایسٹ انڈیا کمپنی کی ترقی کا دور تھا، انگریز فوجیں پورے ملک پر قابض ہو چکی تھیں سلطنت مغلیہ دلی میں لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، ملک کی لوٹ مار تقریباً مکمل ہو چکی تھی، ہندوستانیوں کے جان مال اور عزت وآبرو کا انگریزی فوج میں کوئی سوچنے والا نہ تھا، ہاں جو تنظیمیں پہلے سے کام کر رہی تھیں وہ ہندوستانیوں کو بیدار کرنے میں اپنی بساط کے بقدر کوششیں تھیں، سب کے دل میں ملک کی

محبت ٹمٹمارہی تھی، ایسے میں انگریز نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں اپنی سرپرستی میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کردی، مسیحی پادری شہر شہر، بستی بستی گھومتے، وعظ کرتے اور عیسائی کتابچے تقسیم کرتے، تاکہ عیسائیت ہر قریہ اور گھر تک پھیل جائے، اس کے اثرات ہندوستانی معاشرہ میں ظاہر ہونے لگے، اب ہندوستانی سماج کو احساس ہوا کہ غلامی کی ذلت کے ساتھ ساتھ اب ہمارا مذہب بھی محفوظ نہ رہا وہ بھی خطرے میں پڑ گیا، اسی دور میں یہ خبریں پھیلنا شروع ہوئیں کہ: 1- انگریزوں نے آٹے میں سور اور گائے کی ہڈیوں کا سفوف ملا دیا ہے تاکہ ہندو اور مسلم دونوں کا ایمان خراب ہو۔ 2- گھی میں ناپاک چربی ملا دی گئی ہے۔ 3- پانی کے کنویں میں گائے اور سور کا گوشت ڈال دیا گیا ہے تاکہ پانی ناپاک ہو جائے۔ 4- نیز سب سے اہم بات یہ مشہور ہوئی کہ فوج میں استعمال ہونے والے کارتوس میں سور اور گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے اور اس کو منھ لگا کر کھولنا لازم ہے۔

ان اسباب کے علاوہ علمائے کرام نے فتویٰ دیا کہ اب ہر ہندوستانی پر جہاد فرض عین ہے کہ جہاں بھی ذرا بھی ممکن ہو جہاد کیا جائے اور فتویٰ پر درج ذیل علمائے کرام نے دستخط کئے؛ 1- سید محمد نذیر حسین 2- مولانا رحمت اللہ۔ 3۔ مفتی محمد صدرالدین۔ 4۔ مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی۔ 5۔ مولانا محمد ضیاء الدین۔ 6۔ عبدالقادر۔ 7۔ فقیر احمد سعید احمدی۔ 8۔ محمد میر خان (یا میر محمد خان یا میر خان محمد)۔ 9۔ محمد عبدالکریم۔ 10۔ فقیر سکندر علی۔ 11۔ محمد کریم اللہ۔ 12۔ خادم العلماء محمد عبد الغنی۔ 13۔ فرید الدین۔ 14۔ محمد سرفراز علی۔ 15۔ سید محبوب علی جعفری۔ 16۔ ابو احمد بن محمد حاجی الدین۔ 17۔ سید احمد علی۔ الہی بخش۔ 19۔ محمد مصطفی خان ولد حیدر شاہ نقشبندی۔ 20۔ محمد انصار علی۔ 21۔ محمد سعید الدین۔ 22۔ حفیظ اللہ خان۔ 23۔ محمد نورالحق عفی عنہ۔ 24۔ سراج العلماء ضیاء الفقہاء مفتی عدالت عالیہ محمد رحمت علی خاں۔ 25۔ حیدر علی۔ 26۔ سیف الرحمن۔ 27۔ سید عبدالحمید عفی عنہ۔ 28۔ محمد ہاشم۔ 29۔ سید حافظ۔ 30۔ محمد امداد علی عفی عنہ۔ 31۔ خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسین۔

یہ وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے ہزاروں علماء، عوام، دانشور، مزدور، کسان، کچھ جاگیردار اور ہندوستانی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے منصوبہ بندی کی اور انگریزوں سے جنگ کی تاریخ طے کی گئی، اور بلند شہر، مظفر نگر، فتح گڑھ اور فرخ آباد، علی گڑھ، بنارس، الہ آباد، فتح پور، کانپور، روہیل کھنڈ، مرادآباد، لکھنؤ اور ریاست اودھ، صوبہ بہار، بنگال اور آسام، پنجاب اور سندھ، صوبہ سرحد اور دکن حیدرآباد، غیرہ میں جہاد کے متوالے پورے جوش وخروش کے ساتھ انگریزوں سے جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، ہر ایک مقام کے لئے جنگی حکمت عملی تیار کی۔

میرٹھ میں انگریزی فوج کی بہت بڑی تعداد مقیم تھی اور یہاں کا توپ خانہ بہت مضبوط اور مستحکم سمجھا جاتا تھا انگریزوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں بھی کچھ ہو سکتا ہے، اس لئے انہوں نے ایک فوجی بٹالین یعنی 90 سپاہیوں کی پریڈ کرائی اور سور اور گائے کی چربی لگا کارتوس ہندوستانی فوجیوں کو منھ سے کاٹ کر استعمال کرنے کے لئے کہا، سب نے اعلیٰ حاکم کی بات ماننے سے انکار کر دیا، ان سپاہیوں میں سے 49 مسلمان اور 36 ہندو تھے، سب نے انگریز افسروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا، اس حکم عدولی کی وجہ سے ان اہل وفا پروانوں کو دس دس سال قید کی سزا ہوئی، ان کے میڈلس اور تمغے واپس لے لئے گئے، فوجی لباس پھاڑ دئے گئے، پابند سلاسل کر کے شہر میں کھلے عام گشت

کرایا گیا، یہ منظر ہندوستانی فوج کے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھا برداشت نہ کرسکے اور 31 مئی (جس دن پورے ملک میں ایک ساتھ حملہ کرنے کا پلان تھا) کا انتظار نہ کرسکے اور 10 مئی کو ہی بغاوت کرکے فوجی بیرکس توڑ دئے، جیل سے تمام قیدیوں کو آزاد کردیا، جو بھی انگریز ملا کسی کو معاف نہیں کیا، عدلیہ، پولیس اور سارے اختیارات اپنے قبضہ میں لے لئے، راستہ میں موجود انگریز فوجی چوکیوں کو آگ لگاتے ہوئے میرٹھ سے دہلی لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کے پاس پہنچے، ان مجاہدین نے بہادر شاہ کو ساری روداد سنائی اور فریاد رسی کی، بادشاہ نے کہا کہ میرے گھر سے بادشاہت رخصت ہوچکی ہے، میں صلح کرواسکتا ہوں، چنانچہ اس غرض کے لئے انگریز کمشنر کو بلایا اور اس تحریک کو ایک معمولی قرار دیا اور صلح کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔

انگریز اس اچانک غیر متوقع حملہ سے گھبرا گئے، اس افراتفری میں ان کا نقصان بھی بہت ہوا، پھر وہ سنبھلے اور دہلی فتح گڑھ کی پہاڑی پر مورچہ بند ہوئے اور پنجاب اور دیگر صوبوں میں موجود انگریزی فوج سے کمک منگوایا اور پورے دہلی کے اطراف مورچہ مضبوط کیا۔ ہندوستانی افواج میں جذبہ اور ایثار کی کوئی کمی نہ تھی، روہیلہ کمانڈر جنرل بخت خاں دہلی کی مدد کو پہنچے اور دو مہینے تک اپنی افوج کے ساتھ مغل سلطنت کے آخری مقام کا دفاع کیا، علماء کرام کی جانب سے فتوی بھی جاری ہوا، لوگ جمع ہوئے، خوب قربانی دی، مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور انگریزی فوج ہندوستانی فوجیوں کی لاش سے گزر کر 20 ستمبر 1857ء کو دہلی پر قابض ہوگئی، بہادر شاہ ظفر اس وقت ہمایوں کے مقبرہ میں مقیم تھے ان کو وہاں سے گرفتار کیا گیا، جو شہزادے ملے سب تہ تیغ کردئے گئے۔

دہلی پر قبضہ کے لئے انگریزوں نے ہزاروں جانباز ہندوستانیوں کو قتل کیا، پوری دلی کو لوٹ لیا گیا، قبضہ کے بعد بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا، مصنف قیصر التواریخ کے بقول 27000 لوگوں کو پھانسی دی گئی، ایڈورڈ تھامسن کے الفاظ میں صرف چاندنی چوک نہیں بلکہ دلی کے ہر چوراہے پر سولی کے پھندے لگائے گئے، اگر کوئی مسلمان انگریز کو مل جاتا اس کو ہاتھی پر بیٹھا کر گلے میں سولی کا پھندا ڈال کر ہاتھی کو ہانک دیا جاتا، کسی مسلمان کو رسی سے باندھ کر توپ کے دہانے پر رکھ کر توپ چلادی جاتی جس سے پورا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ہوا میں بکھر جاتا، ہندو مورخ میوارام گپت نے لکھا "ایک اندازہ کے مطابق 1857ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ اس قتل میں بڑی تعداد علماء کرام کی تھی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ مقدس جماعت مجاہدین کی پہلی صف میں رہے بلکہ جن شہروں میں لوگ انگریز کے خلاف صف آرا ہوئے وہاں اکثر مقامات پر قائد علماء ہی رہے۔

23.6.1 شاملی کی جنگ آزادی

شاملی اس وقت صوبہ اترپردیش کا ایک ضلع ہے، جس وقت میرٹھ میں جہاد کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں تو شاملی ضلع سہارنپور کے ماتحت ایک تحصیل تھی اور تھانہ بھون ایک قصبہ تھا، اسی زمانہ میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ تھانہ بھون کے مشہور رئیس قاضی عنایت علی کے بھائی قاضی عبدالرحیمؒ نے اپنی ضروریات کے لئے ایک ہاتھی خریدا، انگریز کارندوں نے خبر پہنچائی کہ قاضی صاحب نے انگریز سے بغاوت کے لئے ہاتھی خریدا ہے، چونکہ اس زمانہ میں ہاتھی جنگ کا بہت بڑا سامان تھا اس لئے ان کو گرفتار کرکے فورا مسٹر اسپنکی نے پھانسی پر لٹکادیا۔ اس واقعہ کے بعد بزرگان دین میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حافظ

ضامن شہیدؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کیا، جہاد کے لئے امام اور قاضی وغیرہ سب انہیں حضرات میں سے منتخب کیے گئے اور جہاد کی تیاری شروع ہو گئی، ان بزرگوں کا اتنا اثر تھا کہ لوگ جوق در جوق اس قافلے میں پرانے ہتھیاروں کے ساتھ ہی شامل ہوتے گئے۔

اس مجاہدین کو خفیہ اطلاع ملی کہ سہارنپور سے شاملی کے لئے فوجی ساز و سامان بھیجا جارہا ہے اور پوری پلٹن ساتھ ہے، لہذا اس سے نمٹنے کے لئے ایک پروگرام کے تحت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو حضرت حاجی امداد اللہ نے تقریباً چالیس مجاہدین کا امیر مقرر کیا، حضرت گنگوہیؒ نے سڑک کے کنارے ایک باغ میں کمین لگائی، جب انگریز وہاں سے گزرے تو اچانک اپنے پاس موجود بندوقوں سے حملہ کیا جس سے سراسیمہ ہو کر انگریزی فوج نے بھاگ جانے میں عافیت سمجھی، سبھی ہتھیاروں پر قبضہ ہو گیا، اس کامیاب کارروائی کے کچھ دنوں بعد شاملی میں موجود انگریز فوجی چھاؤنی پر حملہ کیا گیا اور اس پر قبضہ کر کے حکومت قائم کر دی گئی۔

جب انگریز دہلی پر قبضہ سے فارغ ہوئے تو اطراف کی سمت متوجہ ہوئے، اور چند ایام میں تھانہ بھون پہنچے، شہریوں نے دفاع کی کوشش کی لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ جنگ صرف دو گھنٹے میں انجام کو پہنچ گئی، صبح ہوئی تو اس مسلم حکومت کے ہاتھ سے تھانہ بھون نکل گیا، شہر کی فصیلیں توڑ دی گئیں، دروازوں کو اکھاڑ دیا گیا، مٹی کا تیل استعمال کر کے گھروں کو جلا دیا گیا، جو بھی ملا قتل کر دیا گیا، تقریباً ایک ہزار (1000) لوگ شہید کر دیئے گئے، جو لوگ بھٹک کر مصائب کا شکار ہوئے ان کی تعداد الگ ہے، قائدین تحریک روپوش ہو گئے یا گرفتار کر کے پس زندان ڈال دیئے گئے۔

23.6.2 ثمرۃ التربیت

1857ء کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے معاش کی فکر نہ کر کے اپنے ایمان کی حفاظت اور اسلام کی بقا کی خاطر 1866ء میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی، تقریباً دس سال بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مشورہ سے "ثمرۃ التربیت" نام کی ایک انجمن قائم کی گئی، مقصد یہ تھا کہ حوصلہ مند افراد کو جوڑ کر 1857ء میں ہوئے نقصانات کی تلافی کی جا سکے، اس تحریک کے قیام کے دو سال بعد حضرت نانوتویؒ کا وصال ہو گیا اور ظاہری سرگرمیاں بند ہو گئیں، لیکن حضرت شیخ الہندؒ اپنے شاگردوں کے ذریعہ خفیہ طور پر اس عظیم مقصد سے وابستہ رہے، اس بیداری کا فائدہ تحریک ریشمی رومال وغیرہ میں نظر آیا۔

اس تنظیم کے سرپرست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (شیخ الہند) تھے، دیگر ارکان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں: مولانا احمد حسن امروہویؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، مولانا عبد الحق پور قاضویؒ، مولوی محمد فاضل صاحب پھلتیؒ، مولوی میر محمد صادق صاحب مدراسیؒ، مولوی عبد القادر صاحب دیوبندیؒ، مولوی فتح محمد تھانویؒ، مولانا عبد اللہ صاحب انبیٹھویؒ، مولانا محمد مراد صاحبؒ ساکن پاک پٹن، مولانا عبد اللہ صاحب گوالپاڑیؒ، مولانا عبد العلی میرٹھیؒ، مولانا نہال احمد صاحب دیوبندیؒ، مولانا عبد اللطیف صاحب سسپوریؒ، مولانا عبد اللہ صاحب جلال آبادیؒ، مولوی محمد اعلی صاحب انبیٹھویؒ، مولانا عبد العدل صاحب پھلتیؒ، مولانا کوثر صاحب نگینویؒ مولانا کرامت اللہ صاحب دہلویؒ۔

23.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مغل حکومت کے زوال کے زمانے میں انگریزوں نے مغل حکومت سے عوام کو بدظن کرنے کے لئے نت نئے الزامات اور فتنے شروع کردیئے۔
- مغل حکومت کے بکھرنے کے بعد ملک میں چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں انگریزوں سے مل کر قائم کی گئی تھیں، جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک کے بعد دوسری ریاستوں کو بآسانی اپنے قبضے میں لیا جاسکے۔
- سراج الدولہ جس وقت بنگال کے امیر بنائے گئے تو انہوں نے انگریزوں کے خلاف فوجی کاروائی کی چنانچہ دونوں فوجیں پلاسی کے مقام پر اکٹھی ہوئیں، اپنوں کی غداری کی وجہ سے سراج الدلہ کو شکست ہوئی اور انہیں بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔
- دکن میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے تقریباً 30 سال تک انگریزوں سے جنگیں لڑی ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد لارڈ ہارس نے دہلی کو اپنا نشانہ بنایا، چنانچہ 1803 میں شاہ عالم کے دور حکومت میں دہلی پر قابض ہو گیا اور جبراً ایک معاہدہ لکھایا کہ اب آج سے خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا، جس سے صاف ہو گیا کہ اب حکومت نام کی رہ گئی جبکہ قانون ایسٹ انڈیا کمپنی کا چلے گا۔
- 1803ء میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور علماء کرام کی ایک جماعت نے یہ فتوی دیا کہ اب ہندوستان دارالحرب ہو گیا لہذا ان سے جہاد کرنا فرض ہو گیا اسی طرح ان کی فوج میں بھرتی ہونا یا کسی طرح کی مدد کرنا حرام ہے۔
- مولانا ولایت صادق پوری نے صادق پور کو جہاد کا مرکز بنایا تھا، مگر سید احمد شہید کے حکم سے وہ حیدرآباد، ممبئی، برہان پور، جبل پور، وغیرہ کے راستے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے واپس آگئے اور عوام کے درمیان اسلامی عنوانات پر خطاب فرماتے لیکن جہاد کے عنوان و موضوع کو خصوصی اہمیت دیتے۔
- 1857 ایسٹ انڈیا کمپنی کی ترقی کا دور تھا، اس زمانے میں انگریزوں اسی زمانہ میں انگریزوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے مسیحی پادریوں کو آزاد چھوڑ دیا جس کی وجہ سے اب ملک کے ساتھ مذہب بھی محفوظ نہ رہ سکا چنانچہ انگریزوں نے اس کے علاوہ کچھ اور گھناؤنی حرکتیں مثلاً کارتوس میں سور اور گائے کی چربی کا استعمال کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے پورے ملک میں بغاوت ہوئی مگر 20 ستمبر 1857 کو انگریز دہلی پر قابض ہو گئے، اور پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسی دی جن میں کثیر تعداد علما کی تھیں۔

23.8 نمونہ امتحانی سوالات

23.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام کب عمل میں آیا؟

(a).1600 (b).1601 (c).1602 (d).1603

2. بکسر کی پہلی جنگ کس سن میں ہوئی؟

(a).1601 (b).1764 (c).1757 (d).1857

3. لارڈ ہارس نے اپنی فوج لیکر دہلی کا رخ کس سن میں کیا؟

(a).1700 (b).1750 (c).1800 (d).1830

4. انگریزوں کے خلاف جہاد کا پہلا فتویٰ کس نے دیا؟

(a).شاہ ولی اللہ (b).شاہ اسمٰعیل شہید (c).شاہ عبد العزیز (d).شاہ اسحاق

5. 1818 میں سید احمد شہید کتنے لوگوں کو لیکر دہلی سے روانہ ہوئے؟

(a).10 (b).20 (c).40 (d).50

6. بالاکوٹ میں رنجیت کے فوج کی تعداد کتنی تھی؟

(a).20ہزار (b).21ہزار (c).22ہزار (d).ان میں سے کوئی نہیں

7. مولانا ولایت علی کا تعلق کس جگہ سے تھا؟

(a).صادق پور (b).جبل پور (c).رام پور (d).غازی پور

8. انگریز دہلی پر کس سن میں قابض ہوئے؟

(a).1757 (b).1803 (c).1857 (d).1900

9. ایسٹ انڈیا کمپنی کا آغاز کہاں ہوا؟

(a).حیدر آباد (b).کلکتہ (c).ممبئی (d)سورت

10. آخری مغل حکمراں کون تھا؟

(a).اورنگ زیب (b).شاہ عالم (c).بہادر شاہ ظفر (d).ان میں سے کوئی نہیں

23.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ایسٹ انڈیا کمپنی پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
2. جنگ بکسر سے متعلق معلومات قلم بند کریں۔
3. جہاد سے متعلق شاہ عبد العزیز کے فتوی کی تفصیل بیان کریں۔
4. مولانا ولایت علی صادق پوری کے سفر جہاد کی روداد بیان کریں۔
5. شاملی کی جنگ سے متعلق ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

23.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. 1857 کی جنگ آزادی پر ایک مفصل نوٹ قلم بند کریں۔
2. تحریک سید احمد شہید سے متعلق تفصیلات لکھیں۔
3. ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب اور عوامی جدوجہد آزادی پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

23.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار : محمد سلمان منصور پوری
2. تاریخ جنگ آزادی 1857ء : سید خورشید مصطفی رضوی
3. تحریک آزادی اور مسلمان : اسیر ادروی
4. ڈاکٹر شوکت اللہ خاں، آزادی ہند کی جدوجہد میں مسلمانوں کا کردار 1857 تا 1947 (مدیر اعلیٰ: پروفیسر رفاقت علی خاں)، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی، 2018

اکائی 24: جنگ آزادی میں مسلمانوں کی حصہ داری (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

24.0 تمہید

24.1 مقاصد

24.2 جمعیت الانصار

24.3 تحریک ریشمی رومال

24.4 جمعیت علماء ہند کا قیام اور تائید ترک موالات

24.5 شدھی تحریک اور اس کا مقابلہ

24.6 مکمل آزادی-سائمن کمیشن

24.6.1 نہرو رپورٹ

24.6.2 تحریک نمک سازی

24.7 اکتسابی نتائج

24.8 نمونہ امتحانی سوالات

24.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

24.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

24.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

24.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

24.0 تمہید

ہندوستان کو طویل جد وجہد کے بعد آزادی کی عظیم نعمت حاصل ہوئی ہے، جس کے لیے اسلاف نے زبر دست قربانیوں کا نذرانہ پیش کیا، جان ومال کی قربانیاں پیش کیں، تحریکیں چلائیں، پھانسی کے پھندے کو جرأت و حوصلہ اور کمال بہادری کے ساتھ بخوشی گلے سے

لگایا، قید و بند کی صعوبتوں کو جھیلا اور حصول آزادی کی خاطر میدان جنگ میں نکل پڑے، آخر کار ہندوستان پر قابض انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔

24.1 مقاصد

اس اکائی کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو 1900ء کے بعد کے حالات معلوم ہوں گے کہ کس طرح طرز بدل کر مسلمانوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا؟ اس سے اتفاق ہو جانے پر مختلف تحریکات مثلاً تحریک ریشمی رومال، جمعیت علماء ہند، شدھی تحریک، جامعہ ملیہ اسلامیہ، تحریک سول نافرمانی، ہندوستان چھوڑو تحریکات کے ذریعہ ہندوستان کو آزاد کرانے اور انگریزوں کو اس ملک کے چھوڑنے پر کس طرح مسلمانوں نے مجبور کیا؟

24.2 جمعیت الانصار

جنگ آزادی کے متوالوں کا انداز بہت ہی نرالا تھا، چنانچہ اگر کوئی تحریک ناکام یا بند ہو جاتی تو دوسری شروع فرماتے اور زیادہ تعداد میں باطل سے ٹکرانے کے لئے سر بکف نکل پڑتے، قیام دار العلوم 1866ء کے بعد انگریز کے ارتدادی افکار سے مقابلہ کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے "ثمرة التربیة" نام سے ایک انجمن قائم کی جس کی سرگرمیاں رک جانے کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے دیوبند میں 1327ھ 1909ء میں "جمعیت الانصار" نامی تنظیم کی تشکیل جس کی نظامت مولانا عبید اللہ سندھی کے سپرد کی، اس تحریک کو لوگوں تک پہنچانے اور کامیاب کرنے کے لئے جمعیت الانصار نے انتھک کوششیں کیں۔

یہ تحریک "جمعیت الانصار" کی پہلی میٹنگ 15۔17 / اپریل 1911ء میں اتر پردیش کے شہر مراد آباد میں منعقد ہوئی، جس میں علی گڑھ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اکابرین بھی شریک ہوئے، دوسرا اجلاس حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زیر صدارت 1912ء میں یوپی کے مشہور شہر میرٹھ میں ہوئی۔ اور تیسری میٹنگ کا انعقاد 1913ء میں شملہ میں ہوئی، ان میٹنگوں کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں اس وقت کے مجاہدین علماء و عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ شریک ہوتا تھا۔ یہ حالات اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ تنظیم کافی مشہور ہو چکی تھی اور اس میں عوام و خواص برابر کے شریک تھے، یہ اتحاد و یکجہتی حکومت برطانیہ کو چبھنے لگی اور خطرہ و اندیشہ ہوا کہ انگریز دار العلوم میں قائم جمعیت کے بہانے دار العلوم پر ہی یلغار نہ کر دے، اس لئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے مشورہ سے مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے جمعیت الانصار کی صدارت سے استعفی دے دیا، تاکہ اس مادر علمی سے دیر تک امت مسلمہ سیراب ہوتی رہے۔

24.3 تحریک ریشمی رومال

مولانا عبید اللہ سندھیؒ جمعیت الانصار کی صدارت سے استعفیٰ دینے کے بعد دہلی تشریف لائے اور مسجد فتح پوری میں اسلاف کے افکار پر مبنی ایک اہم ادارہ قائم فرمایا، جس کی سرپرستی حضرت شیخ الہندؒ، نواب وقار الملک اور حکیم اجمل خان جیسے علم ووفاء کے آفتاب

وماہتاب نے کی، اس کا مقصد اصلی عوام وخواص کا ذہن بنانا اور ان کو بیدار رکھنا تھا۔

تقریباً دوسال تک مولانا سندھیؒ دہلی میں مقیم رہ کر اپنی عظیم خدمات سے ادارہ کو فیضیاب کرتے رہے، اور حضرت شیخ الہندؒ کی ساری توجہ افراد سازی اور امت مسلمہ کے ذہن کو بیدار کرنے پر مرکوز رہی، اس مخلصانہ کردار سازی کا اثر یہ ہوا کہ شیخ الہندؒ کے بہت سے شاگردوں نے اپنے علاقوں میں اسی مقصد کے تحت کام شروع کردیا، ان متوالوں کی فکر تھی کہ پہلے اچھی طرح تیاری کرلی جائے پھر عملی اقدام کرکے انگریزوں کو ضرر پہنچایا جائے۔

اس تحریک کے مراکز پورے ملک میں قائم کئے گئے، ان اہم مراکز میں سے دیوبند، دہلی، پانی پت، چکوال، دین پور، امروٹ اور کراچی شامل ہیں، ان علاقوں کے لوگوں نے مجاہدین کا بھرپور تعاون کیا اور مالی امداد بھی کیا، اس ماحول میں جہاد کچھ دنوں تک بہت عمدگی سے چلتا رہا، اس کے بعد مجاہدین کو دوطرفہ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔

1. پہلی مشکل یہ پیش آئی کہ رسد کم ہوگئی۔
2. دوسری رکاوٹ یہ ہوئی کہ انگریز کے کارندے اس قبائلی علاقے میں گھوم پھر کر کہتے کہ یہ جہاد صحیح نہیں ہے کیونکہ اس جہاد کا کوئی امیر نہیں اور تمہارا امیر والی افغانستان امیر حبیب اللہ ہے لہذا امیر حبیب اللہ جب تک حکم نہ دے جہاد صحیح نہیں ہے۔

اس صورتحال میں حضرت شیخ الہندؒ نے محسوس کیا کہ تحریک چلانے کے لئے بیرونی ممالک سے امداد حاصل کیا جائے، اس کے لئے انہوں نے دوکام کئے، ایک یہ کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو افغانستان بھیجا تاکہ افغان حکومت اور اس کے اراکین سے اخلاقی ومالی تعاون حاصل کیا جاسکے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ خود اپنے کچھ رفقاء کے ساتھ حجاز مقدس کا سفر فرمایا تاکہ خلافت عثمانیہ سے جہادی کام میں مدد حاصل کیا جاسکے اور بوقت ضرورت فوجی مدد بھی مل سکے۔

حضرت شیخ الہندؒ 19 اکتوبر 1915ء کو مکہ مکرمہ پہنچ کر غالب پاشا سے ملاقات کی اور انہیں ہندوستان کی نازک صورتحال سے آگاہ کیا، چنانچہ انہوں نے اپنی طرف سے ہندوستانی مسلمانوں کے نام ایک خط تحریر کرکے حضرت شیخ الہندؒ کو دیا، اس خط میں مسلمانوں سے اپیل کیا تھا کہ انگریز کے خلاف پوری طاقت کے ساتھ نبرد آزما ہوں، حضرت شیخ الہندؒ راستہ کے مخدوش ہونے کی وجہ سے خط لے کر خود نہ جاسکے لیکن جناب سید ہادی حسن صاحبؒ رئیس جانجھانپور ضلع مظفر نگر یوپی کے ذریعہ بہت ہی احتیاط اور راز داری کے ذریعہ ہندوستان پہنچایا، اور اسکی نقل کراکر قبائلی علاقوں میں تقسیم کرایا، تاکہ جہاد کے خلاف انگریز کی پھیلائی ہوئی بدگمانی اور نفاق دور ہو اور وہ میدان سرفروشی میں حصہ دار بنیں۔ اس خط کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا کہ لوگ بڑے ذوق وشوق سے جہاد کی تیاریاں کرنے لگے کہ جب بھی موقع میسر ہو بھرپور کارروائی کی جائے گی۔

جس وقت ترکی کے گورنر غالب پاشا نے مدد کا وعدہ کیا تھا اس وقت خلافت باقی تھی لیکن 28 جولائی سے شروع ہونے والی جنگ میں ترکی خلافت عثمانیہ نے جرمنی اتحاد کا ساتھ دیا تھا لیکن حریف مخالف کو امریکہ کی مدد اور شریف مکہ کے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کے نتیجہ میں جرمنی اتحاد کو شکست ہوگئی، اب جب خلافت کا وجود نہ رہا اور مدد کی توقع ہی ختم ہوگئی۔ ادھر حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کابل میں

ہندوستان کی جلا وطن حکومت "حکومت موقتۃ ہند" میں شریک ہوئے اور اس حکومت کے صدر مہاراجہ پرتاب سنگھ بنائے گئے اور مولانا سندھی اور مولانا برکت اللہ بھوپالی وزیر کی حیثیت سے چنے گئے، مولانا سندھیؒ نے دوسرا اہم کام یہ کیا کہ "جنود ربانیہ" نام سے مجاہدین کی ایک جماعت تشکیل دی جس کا مرکز مدینہ منورہ تھا اور اسکے سالار شیخ الہندؒ (جو کہ اس وقت مکہ، مدینہ میں مقیم تھے اور یہ جماعت افغانستان میں تشکیل دے رہے ہیں) تھے، اس سرگرمیوں کے بارے میں اطلاع دینے کے لئے استفادہ کیا جاسکے، پروگرام کے مطابق مولانا سندھیؒ نے ایک تفصلی خط مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ سے لکھوایا، جس میں کابل میں حکومت کا قیام اور جنود ربانیہ کے تحت تمام مجاہدین کی تفصیل درج تھی، اور ریشمی کے رومال (راز داری کے لئے) لکھوایا۔

یہ خط مولانا سندھیؒ نے اپنے ایک معتمد خاص عبد الحق کو دے کر یہ تاکید فرمایا کہ یہ خط مولانا عبد الرحیم سندھیؒ کو مدینہ منورہ پہنچا دیا جائے، مگر افسوس یہ خط عبد الحق کی کوتاہی سے برطانوی حکومت کے وفادار حق نواز خان کے ہاتھ لگ گئی اور اس نے پنجاب کے گورنر مائکل اڈوائر کے حوالہ کر دیا۔

اسیران مالٹا

جس وقت خط کا معاملہ جاری تھا، حضرت شیخ الہندؒ مکہ مکرمہ میں تھے لیکن شریف مکہ نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر کے انگریزوں سے دوستی کر لی تو آپ طائف میں محصور ہو گئے تھے، ڈھائی مہینہ تک طائف میں مقیم رہ کر 10 شوال 1334 ہجری کو مکہ واپس ہوئے۔

قید کا حکم

ہندوستان سے انگریز حکومت کا ایک آدمی خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی مکہ مکرمہ آیا اور شریف مکہ سے ملاقات کی اور اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ حرم کے علماء کی جانب سے ایک ایسا فتویٰ جاری کرایا جائے کہ جس میں ترکوں (خلافت عثمانیہ کے احباب) کو کافر قرار دیا گیا ہو، تاکہ اس کو ہندوستان میں انگریز اور اس کے کارندوں کے حق میں استعمال ہو سکے، لہذا ایسا ہی ہوا کہ اسی مضمون کا فتویٰ تیار کر کے مکہ مکرمہ میں موجود علماء کے پاس دستخط کے لئے بھیجا گیا جس پر شریفی علماء نے دستخط کر دئے مگر علماء حق نے اس فتوی پر اتفاق کرنے سے انکار کر دیا جس میں مولانا محمود الحسن بھی شامل تھے، یہ فتوی دو مقاصد کے تحت تیار کرایا گیا تھا: پہلا ہندوستان میں پھیلی ہوئی بے چینی کو کم کیا جائے، دوسرا شیخ الہندؒ لازمی طور پر انکار کریں گے، اس لئے ان کو اس بہانے گرفتار کرانے میں سہولت ہو گی، چنانچہ یہی ہوا۔ آپ بھی اس سازش کو سمجھ گئے تھے، اس لئے آپؒ مکہ مکرمہ کے حدود سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ ابھی روانگی بھی نہ ہوئی تھی کہ جدہ میں برطانیہ کے نمائندے کرنل ولسن کے ایک اشارے پر شریف مکہ نے آپؒ اور آپ کے احباب کے خلاف گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔

سب سے پہلے شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو گرفتار کیا گیا، جب حضرتؒ کو قید کر کے حمیدیہ میں لائے تو کمشنر پولیس نے کہا کہ انگریزی حکومت کو برا کہنے کا سزا چکھ، اور جیل میں ڈال دیا گیا۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ گرفتاری کا حکم آنے کے بعد رفقاء کی رائے ومشورہ سے روپوش ہو گئے، انگریز نواز شریف مکہ کی پولیس تلاش بسیار (بہت تلاش) کے بعد بھی آپؒ تک نہ پہنچ سکی، جب شریف مکہ کو صورتحال کا علم ہوا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا اور حکم دیا کہ اگر عشاء

کی نماز تک مولانا نے اپنے آپ کو پیش نہ کیا تو ان دو ساتھیوں مولانا عزیز گل اور حکیم نصرت حسین کو قتل کر دیا جائے اوران کے مطوف کو سو کوڑے مار کر لائسنس ختم کر دیا جائے۔

یہ تکلیف دہ خبر سن کر حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے آپ کو حکام کے حوالے کر دیا، اس گرفتاری کے بعد ہی جدہ بھیج دیا گیا، روانگی کے وقت آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے کہ "اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ مجھے مصیبت آئی، نہ میں گناہ میں مبتلا ہوا"، اس گرفتاری کے وقت آپ کے ساتھ مولانا وحید احمد صاحب فیض آبادیؒ، حضرت مولانا عزیز گل صاحبؒ اور حکیم سید نصرتؒ تھے ان بزرگوں کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ قید ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ اور رفقاء کی خواہش تھی کہ جنگ عظیم کے اختتام تک ان کو جدہ اور اس کے اطراف میں رکھا جائے، لیکن انگریز جنرل ولسن نہ مانا اور سب قیدیوں کو دخانی کشتی کے ذریعہ 12 / جنوری 1917ء کو مصر بھیج دیا، پانچ دن کی مسافت طے کر کے یہ قافلہ قاہرہ پہنچا اور وہاں سے شہر جیرہ میں واقع سیاسی قید خانہ میں قیدیوں کو الگ الگ رکھا گیا۔ ہر ایک سے الگ الگ تفتیش کی گئی، اور کسی بھی قیدی کو ملاقات کی اجازت نہ تھی، اس کے باوجود سب کے بیان میں یکسانیت ہونے کی وجہ سے انگریز حکومت کو پھانسی جیسی سزا کے لئے ثبوت دستیاب نہ ہوئے، ایک ہفتہ الگ رکھنے کے بعد یکجا کیا گیا۔ اور مکمل ایک مہینہ کے بعد 24 ربیع الثانی 1335ء / 16 فروری 1917ء کو مالٹا کو اسکندریہ (مصر) کی بندرگاہ سے مالٹا روانہ کر دیا گیا، (مالٹا ایک جزیرہ ہے) یہ یوروپی بلاک کا حصہ ہے، اس کے چاروں طرف پانی ہے خشکی کا کوئی راستہ نہیں ہے، دریائی حدود اٹلی اور لیبیا سے اور دوسرے طرف افریقی علاقہ اور مشرقی وسطی سے ملتا ہے، اس کا کل رقبہ 31 کلو میٹر پر مشتمل ہے اس قید خانہ میں شیخ الہند اور آپ کے ساتھیوں کو تین سال دو ماہ رکھنے کے بعد 12 مارچ 1920ء کو رہا کیا گیا، یہ قافلہ 3 مہینے بعد بذریعہ جہاز ممبئی کے ساحل پر پہنچا۔ جب یہ قافلہ ممبئی کے ساحل پر اترا تو وہاں ہزاروں افراد استقبال کے لئے موجود تھے، ان قائدین میں گاندھی جی اور مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ شامل تھے، شیخ الہند نے اس صورتحال میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل پر بات کی اور دیوبند تشریف لے گئے۔

خطوط کی ضبطی کے ذریعہ منصوبے کے انکشاف کے بعد اگرچہ بہ ظاہر تحریک ریشمی رومال ختم ہو گئی، مگر شیخ الہند کے جذبۂ آزادی میں کوئی کمی نہیں آئی، جب تک زندگی رہی سوتے جاگتے آزادی کا خواب دیکھتے رہے۔

24.4 جمعیت علماء ہند کا قیام اور تائید ترک موالات

نومبر 1919ء میں خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس جلسہ کے صدر مولانا فضل الحق صاحب تھے، اس میں برطانیہ کی طرف سے منعقد ہونے والے پروگرام جشن صلح سے لاتعلقی اور بائیکاٹ کی رائے دی گئی، اس فکر کی تائید مسلمانوں کے علاوہ گاندھی جی نے بھی کی، اس موقعہ پر شریک جلسہ علماء کرام نے "جمعیت علماء ہند" کے نام سے باضابطہ طور پر قانونی جماعت تشکیل دیا اور مشورہ سے یہ طے کیا کہ 30 دسمبر 1919ء کو امرتسر میں خلافت کمیٹی کے پروگرام کے موقعہ پر جمعیت علماء ہند کی پہلی نشست کا انتظام کیا جائے، چنانچہ حضرت مولانا

عبد الباری فرنگی محلیؒ کی صدارت میں 28 دسمبر کو اجلاس کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں مکمل اور منظم جدوجہد کے لئے کمیٹی کا قیام اور ابتدائی دستور سازی بھی عمل میں آئی، سب سے پہلے عارضی صدر حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب اور سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو ناظم عمومی منتخب کیا گیا۔

19 جون 1920ء کو خلافت کانفرنس کا انعقاد الہ آباد میں ہوا، یہیں سے ترک موالات کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا، حضرت شیخ الہندؒ نے ترک موالات کی تائید میں فتویٰ جاری فرمایا (یعنی انگریز حکومت کے ساتھ کسی طرح کا معاملہ کرنے سے منع فرمایا) اس فتویٰ کی تشریحات مولانا ابو المحاسن سجادؒ نے ترتیب دیا، نیز اس فتویٰ کی جمعیت علماء کے 474 بافیض علماء نے دستخط کر کے توثیق و تائید کیا، 6 ستمبر 1920ء کو جمعیت علماء کے ایک اہم اجلاس کا انعقاد کلکتہ میں ہوا، یہاں بھی وہ فتوے اکابر علماء کے سامنے پیش کیا گیا، اس مقام پر موجود 200 علماء نے ترک موالات کو منظور کیا، اس ترک موالات کے معاملہ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ برطانوی حکومت کے ساتھ کسی طرح کی دوستی، تعاون اور تعلقات حرام ہے، خصوصاً وہ عمل جن کا اہتمام ضروری ہے، مندرجہ ذیل ہیں:

1. سبھی سرکاری خطابات واعزازت ترک کرنا۔
2. کونسلوں کی ممبری سے دوری اختیار کرنا اور اس کو ترک کرنا۔
3. انگریز کو کسی طرح کا تجارتی فائدہ نہ پہنچانا۔
4. ہندوستان کالجوں اور یونیورسیٹوں کے واسطے (انگریز) سرکاری امداد قبول نہ کرنا اور حکومتی یونیورسیٹیوں سے تعلق بالکل نہ رکھنا۔
5. انگریزی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور ان کو کسی طرح کی کوئی فوجی مدد نہ دینا۔
6. انگریز کی جانب سے قائم عدالتوں میں اپنے مقدمات نہ لے جانا اور ان کی پیروی بھی نہ کرنا وغیرہ۔

ہندوستان کی سرزمین پر جابجا مقاطعہ اور عدم تشدد کی تحریکات کے درمیان تحریک "ترک موالات" کا یہ پیغام عوام وخواص کے درمیان لے جانے کی ذمہ داری جمعیت علماء ہند نے علماء کرام کے سپرد کی۔ تاکہ یہ تحریک ہندوستان کے ہر گھر تک پہنچ سکے۔

اس تحریک کے سایہ تلے کام کرتے ہوئے علماء نے 31 اگست 1920ء کو شروع ہونے والی تحریک عدم تعاون میں خوب حصہ لیا اور اپنا کردار بحسن وخوبی ادا کیا اس کی وجہ سے حکومت حواس باختہ ہوگئی اور فتوی کو ضبط کر لیا گیا، اور اپنی دشمنی اور عناد کو یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ 18 ستمبر 1921ء کو جانشین شیخ الہندؒ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد کانپوریؒ، پیر غلام مجدد اور ڈاکٹر سیف الدین کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا، یہ واقعات اور حالات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جمعیت علماء مسلمانوں کی طرف سے تحریک ترک موالات میں اپنے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ بہت عمدگی سے اپنا فرض ادا کرتی رہی اور عدم تشدد کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا، یہ تحریک موالات چوراچوری کے واقعہ تک باقی رہی۔

چوری چوراہندوستان ریاست اترپردیش میں شہر گورکھپور کے قریب ایک قصبہ ہے، یہاں کے رہنے والوں نے تحریک موالات کے دوران سول نافرمانی میں 4 فروری 1922ء کو برطانوی پولیس کی چوکی نذر آتش کر دیا تھا جس میں 22 پولیس اہلکار جل کر مر گئے تھے، اس

واقعہ کے بعد گاندھی جی نے اس تحریک کو روک دینے کا اعلان کر دیا تھا، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی عدم تشدد کے اصول پر گامزن رہے۔

جبکہ دوسرے قائدین کی رائے یہ تھی کہ یہ تحریک بند نہ کی جائے، کیوں کہ اس کے رک جانے سے ساری قوم کا جذبہ سرد پڑ گیا، اس تحریک کی آبیاری کے دوران تیس ہزار لوگ جیل گئے، ان سورماؤں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔

24.5 شدھی تحریک اور اس کا مقابلہ

شدھی کے معنیٰ ہیں "پاکیزہ" بنانا اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ جو مسلمان ہندوستان میں ہیں ان کو پاکیزہ یعنی ہندو بنادیا جائے، تاکہ وہ سناتن دھرم کے ماننے والے ہو جائیں، اسی خیال کو سامنے رکھتے ہوئے دیانند اسر سوتی اور اس کے شاگرد سوامی شر دانند نے 1920 میں اس تنظیم کا آغاز کیا، مگر یہ تحریک تقریباً6 سال ہی کے قلیل عرصے میں 1926ء میں ختم ہو گئی تھی۔

اب ہر طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ اچانک برادران وطن کے دل میں یہ سب کیوں پیدا ہوا؟ اور اس تحریک کا جنگ آزادی سے کیا واسطہ ہے؟ تو اصل بات یہ ہے کہ جنگ آزادی ہندوستان کے طول و عرض میں بڑے زور سے جاری تھی، لوگ مذہب، ملک اور ذات برادری کی سطح سے اوپر اٹھ کر تحریک خلافت اور ترک موالات کے سایہ تلے یک جان ویکجا ہو گئے تھے، عوام وخواص، ہندو مسلم سب کا ایک خیال اور ایک ہی فکر ملک آزاد کیسے ہو، یہ ہم آہنگی اور اتحاد ہمارے مشترک دشمن انگریز کے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھی، اس لئے اس نے "شدھی تحریک" کا بیج بویا اور اس کی آبیاری کی، تاکہ اہل ہند آپس میں دست و گریباں ہوں اور آزادی کی تحریکیں ناکام ہوں اور استعماری اقتدار کو دوام حاصل ہو۔

اس صورتحال کو علماء نے محسوس کیا اور جمعیت علماء کی قیادت میں رہ کر اس فتنہ ارتداد کے سدباب کے لئے ہر ممکن قدم اٹھایا، ارتداد کے خاتمہ کے لئے فروری 1923ء میں "شعبۂ تبلیغ و حفاظت دین" تشکیل دیا، ان کی منظم اور انتھک کوششوں کی برکت سے بفضلہ تعالیٰ نور اسلام دور دور تک روشن ہوا، ارتداد کی راہ چلنے والے ہزاروں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

جامعہ ملیہ کا قیام

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود غازیان اسلام اپنا آزاد تعلیمی وتربیتی ادارہ بنانا چاہتے تو حضرت شیخ الہندؒ نے مصروفیات وناتوانی کے باوجود علی گڑھ کا سفر فرمایا اور شہر علی گڑھ ہی میں 29 اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی، اس ادارہ کو بعد میں دہلی منتقل کر دیا گیا اس ادارہ کے قائم کرنے کا مقصد نسل نوع کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا تھا، اور علماء کرام نے تحریک ترک موالات (بائیکاٹ) کے تحت یہ اعلان کر دیا تھا کہ حکومتی اداروں / یونیورسٹیوں میں جانا پڑھنا اور کسی طرح کا تعاون کرنا حرام ہے، اس فتویٰ کے بعد تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لئے جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا۔

24.6 مکمل آزادی-سائمن کمیشن

ہندوستان میں آزادی کی جنگ ملک کے کونے کونے میں جاری رہی، ہر فرد اپنی بساط کے مطابق بلکہ اس سے زیادہ کردار ادا کر رہا تھا، اخلاص کی بھی کوئی کمی نہ تھی، مگر یہ ابھی تک جزئی آزادی مل جانے پر بھی راضی تھے، مکمل آزادی کا نعرہ سب سے پہلے مسلمانوں نے بلند کیا، پھر یہ صدا تحریک بن گئی، اصلاً ہوا یہ کہ 11-14 مارچ 1926ء کو جمعیۃ علماء ہند کا جلسہ عام کا انعقاد ہوا، اس کی صدارت حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا، کلکتہ کے اس اجلاس میں، مکمل آزادی" کی تجویز کو منظور کیا گیا، اور پشاور میں جمعیۃ علماء کے 5 دسمبر کے اجلاس میں حضرت امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے آزادئ ہند کی تجویز میں صدر جلسہ ہونے کی حیثیت بطور خاص لکھوایا" آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ اپنی جد وجہد سے حاصل کی جاتی ہے" مسلمانوں نے مکمل آزادی کا مطالبہ کانگریس سے پانچ سال پہلے کیا ہے۔

حکومت برطانیہ نے ایک کمیٹی تشکیل دیا، تاریخ اس کو سائمن کمیشن کے نام سے یاد کرتی ہے، اس کا کام یہ تھا کہ ہندوستانی دستور میں اصلاحات کرے، پس پردہ برطانیہ کا مقصد یہ تھا کہ اصلاح کے بہانے مقاطعہ اور بائیکاٹ کی تحریک کو کم کر کے سرد خانہ میں ڈال دیا جائے، لیکن انگریز کارندوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اب باگ ڈور اللہ والوں کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ پشاور کے اجلاس میں ہی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تجویز منظور ہوئی، یہ رنگ گلستان دیکھ کر کانگریس کو بائیکاٹ کی رائے پسند آئی اور اہمیت وافادیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنے مدراس کے اجلاس 1927ء کو سائمن کمیشن کے مقاطعہ کا اعلان کیا، اس فکری و عملی اتحاد کا یہ اثر ہوا کہ یہ کمیشن 3 فروری 1928 کو برطانیہ سے آکر ہندوسنان میں قدم رکھا، اور بائیکاٹ کی فضا کو دیکھ کر 31 مارچ 1928ء کو واپس ہو گیا۔

24.6.1 نہرو رپورٹ

سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے بعد 19 مئی 1928ء کو ہندوستانی سیاسی پارٹیوں کا اجلاس منعقد ہوا اس کمیٹی میں 9 ممبران شامل تھے، جس کے صدر موتی لعل نہرو تھے، پنڈت نہرو کے قانون اصلاحات کی ایک رپورٹ کرنا تھا، اس میں نہرو نے مکمل آزادی کے بغیر یہ مشورہ دیا تھا کہ حکومت برطانیہ کے ماتحت رہ کر کچھ رعایت حاصل کی جائے، نیز کچھ دفعات ایسی تھیں کہ جن سے مسلمانوں کے مذہبی امور میں دخل اندازی ہوتی تھی، اس لئے جمعیۃ علماء ہند نے اس کو رد کیا اور کانگریس سے دوری اختیار کیا اور کسی طرح کا کوئی تعاون نہ دیا، کانگریس نے جب اپنے لاہور کے اجلاس 31 دسمبر 1929ء میں اس نہرو رپورٹ سے دور ہوئی اور مکمل آزادی کی تجویز کو منظور کیا تو علماء کانگریس کے پھر قریب ہوئے۔

24.6.2 تحریک نمک سازی

انگریزی حکومت نے مختلف محاذوں پر اہل ہند کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، جس میں سے ایک ڈانڈی مارچ اور نمک سازی کی تحریک ہے، چنانچہ جب گاندھی جی نے مارچ 1930ء میں یہ تحریک شروع کی تو اس جمعیۃ العلماء ہند کے رہنماؤں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، یہ تحریک نمک پر ٹیکس لگائے جانے اور نمک سازی پر اجارہ دی کی مخالفت میں شروع کی گئی تھی، عدم تشدد کی راہ اپنائے ہوئے گاندھی جی نے

ہزاروں ہندوؤں اور مسلمانوں کے احمد آباد سے سمندر کی طرف چار سو کیلو میٹر کا سفر پیدل کیا، انگریزوں کی گرفت کو کمزور کرنے کے لئے یہ ایک بہت بڑی تحریک تھی جس میں انہوں نے اسی لوگوں کو جیل تھا جس میں جمعیۃ کے تمام اکابر علماء موجود تھے جس میں چند کے نام یہ ہیں:

حضرت مفتی کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ علماء ہند، مولانا احمد سعیدؒ ناظم عمومی جمعیہ علماء ہند، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانویؒ، مولانا سید عطاء اللہ بخاریؒ، مولانا فخر الدین مراد آبادیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا عبد القادر قصوریؒ، مولانا محمد شاہد فاخریؒ، مولانا نور الدین بہاریؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا محمد صادق کراچیؒ، مولانا عبد العزیز کراچیؒ وغیرہ سب جمعیۃ علماء ہند سے واسطہ رہے ہیں سب کو گرفتار کیا گیا، اور جیل کی سزا ہوئی۔

تحریک سول نافرمانی

گاندھی نے تحریک سول نافرمانی کو 8 مارچ 32-1933 کو احمد آباد، گجرات سے شروع کیا، اس تحریک میں پورا ہندوستان شریک ہوا، کانگریس کے زیر سایہ اس تحریک میں شامل ہوتے ہوئے ملت نے اپنی گرفتاریاں پیش کیا، فرزندان اسلام نے اپنا بھرپور حصہ ادا کیا، جمعیۃ علماء ہند نے کانگریس کی تجویز کو قبول کر کے استعماری ارباب اقتدار کے ایوانوں میں ہلچل کر دیا، جمعیۃ علماء وکابر کا طریقہ کار یہ ہوتا کہ گرفتاری پیش کرنے والوں کے ایک گروپ کا ایک لیڈر انتخاب کرتے وہ سب کو ساتھ لے کر گرفتاری دیتا۔

اس طریقہ کار کے تحت سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو بحیثیت لیڈر منتخب کیا گیا، مفتی صاحب نے ایک لاکھ لوگوں کی قیادت کی اور دہلی کے آزاد پارک میں گرفتاری پیش کی، آپؒ 18 مہینے جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہے، مفتی صاحبؒ کے بعد بہت سے علماء ڈکٹیٹر قائد منتخب ہوئے، کچھ نام درج ہیں:

مولانا بشیر احمد کھٹورویؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا نور الدین بہاریؒ، مولانا عبد الحلیم صدیقیؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی محمد نعیم لدھیانویؒ، مولانا محمد اسماعیل سنبھلیؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا عبد اللہ دیوبندیؒ ثم بٹالوی، مولانا مبارک حسین سنبھلیؒ، مولانا مدنیؒ کو دیوبند سے دہلی کے لئے سفر کے دوران گرفتار کیا گیا تھا اور حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ اور مولانا حبیب الرحمنؒ، اس طریقہ کار کے آغاز سے پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے، مرکزی کے علاوہ صوبائی اور ضلع کے سطح پر بھی جمعیۃ نے اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے گرفتاری دی، کوئی ریاست اور ضلع اس نیک عمل سے خالی نہ رہا، ان تمام مجاہدین کو ڈیڑھ سے دو سال کے درمیان سخت اذیت برداشت کرتے ہوئے جیل میں رہنا پڑا، اس تحریک میں 90 ہزار لوگوں نے گرفتاری کے لئے خود کو پیش کیا، ان میں ساڑھے چوالیس ہزار پانچ سو (44500) مسلمان تھے۔

انڈیا ایکٹ 1935ء کا نفاذ

ہندوستان میں اٹھنے والی مختلف قسم کی تحریکوں سے انگریزی حکومت کو احساس ہوا کہ یہاں جبر واکراہ کے سہارے دیر تک حکومت نہیں کی جاسکتی اور اہل ہند کی حق تلفی کر کے قبضہ برقرار نہیں رہ سکتا، اس لئے اس نے 1935ء میں ایک نیا قانون لاگو کیا کہ جس

سے ہندوستانی اپنی حکومت قائم کر سکیں، اس دستور کے تحت حکومت قائم کرنے کے لئے عام الیکشن ضروری تھے اور نظام انتخاب انگریز نے اپنی مرضی کے مطابق اس طرح ترتیب دیا کہ جس سے ہندو اور مسلمان میں اختلاف کی دیوار کھڑی ہوگئی، اس قانون کے مطابق ہندو صرف ہندو امیدوار کو ووٹ دے سکتے ہیں اور مسلمان صرف مسلمان امیدوار کو ووٹ دے سکتا ہے۔ اسی قانون سے ہندو اور مسلمان میں نفرت کی خلیج قائم ہوئی جو بعد میں ہر لمحہ کے ساتھ وسیع ہوتی گئی۔

اس الیکشن کے وقت دو مسلم جماعتیں تھیں، ایک جمعیۃ علماء ہند، مسلم قیادت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی، اس کے وزن کو ہندو اور مسلمان دونوں برابر محسوس کرتے تھے، دوسری جماعت مسلم لیگ تھی، اس جماعت کا قیام 1906ء میں ہوا مگر اس کو عوامی پارٹی کا مقام نہ حاصل ہوا، اس کے ذمہ داران نواب اور رؤسا تھے، جو ہر وقت انگریز کی جی حضوری میں مصروف رہے، لیکن جس وقت انڈیا ایکٹ 1935ء کو نافذ کیا گیا اور انتخابات کی تیاریاں شروع ہو گئیں تو مسلم لیگ کو اندازہ ہوا کہ اب انگریز حکومت ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے سامنے ہتھیار ڈالنے والی ہے تو انہیں اقتدار میں حصہ داری کی فکر ہوئی لہذا اس نے جمعیۃ علماء ہند اور اسکی حلیف جماعتوں سے معاہدے کئے، اور ان کا ہر فیصلہ اور شرط ماننے پر راضی ہوئے۔ اب جمعیت نے پورے ملک میں اس کی رہنمائی کی اس طرح مسلم لیگ عوامی سطح پر مشہور ہوئی، اس ساری تگ ودو سے جمعیۃ علماء یہ چاہتی تھی کہ قوم وملت کا فائدہ ہو جائے اور دوسرا سماجی نفع سامنے نہ تھا، مسلم لیگ جمعیۃ علماء کی مدد سے کامیاب ہوئی لیکن جو وعدے کئے تھے اور شرائط کو قبول کیا تھا، یکسر فراموش کر دیا بلکہ جمعیۃ علماء کو حاشیہ پر لانے میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔

یہ الیکشن 1936ء میں ہوئے تھے، اکثر صوبوں میں کانگریس نے حکومت بنائی، اور مسلم لیگ نے دوسری بڑی پارٹی کا درجہ حاصل کیا، کانگریس نے جزوی اختیارات حاصل کر کے حکومت میں مصروف ہوگئی، دونوں (کانگریس اور مسلم لیگ) میں قربت بھی ہوئی اگر حکمت ودانائی کا راستہ اختیار کیا جاتا تو آزادی کا حصول آسان ہو جاتا اور یہ منزل قریب تر ہو جاتی، مگر بد قسمتی کہ دونوں طرف فرقہ پرست کارندے موجود رہے کہ جن کی کم فہمی یا سازشی فکر کی وجہ سے فریقین میں بدگمانیاں پیدا ہوئیں اور پھر یہ لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ کانگریس کو اپنے زیر اقتدار صوبوں میں دوسری بڑی جماعت کا درجہ حاصل کرنے والی مسلم لیگ کو بلا شرط حکومت کا حصہ بنالینا چاہئے تھا، ہر صاحب خرد ودانش کی رائے یہی تھی، لیکن کانگریس کے متعصب ممبران اور افراد حکومت نے مسلم لیگ کو حکومت کا حصہ نہ بننے دیا، اس کا یہ اثر ہوا کہ مسلم لیگ نے اپنی تمام توانائیاں کانگریس کی مخالفت میں صرف کر دیا، اس اختلاف سے آزادی کی رفتار سست اور منزل دور ہوگئی، انگریز غاصب کو راحت نصیب ہوئی، یہ اس حکومت میں موجود تمام وزراء نے 1939ء میں احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔

اس استعفیٰ کا اصل سبب جنگ عظیم ثانی رہی، جرمنی نے 1939ء میں برطانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور پوری دنیا اس میں ملوث ہوگئی، ہندوستان کو اس جنگ سے کوئی سروکار نہ تھا، مگر برطانیہ نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے ہندوستان کو بھی اس میں شامل کیا، اور ہندوستانی فوجوں کو مختلف محاذوں پر استعمال کیا، جس کی وجہ سے دولاکھ کے قریب اس جنگ میں کام آئے، حکومت برطانیہ کا یہ عمل اہل ہند کو بالکل پسند نہ آیا، پوری کانگریس نے اپنی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا، اس اجتماعی طور پر حکومت سے مکمل طور پر الگ ہو جانے کا یہ اثر ہوا کہ برطانوی حکومت مزید چند رعایتیں دینے پر رضامند ہوئی، لیکن یہ شرط لگائی کہ ہندوستان اس جنگ میں مکمل طور سے برطانیہ کی مدد

کرے۔ اس تجویز کو کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند نے قابل اعتناء نہیں سمجھا اور یکسر مسترد کر دیا، چنانچہ جمعیۃ علماء نے 1945ء میں جونپور کے اجلاس میں برطانوی تجویز کو مسترد کیا گیا اور اعلان ہوا کہ برطانیہ کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی، نیز انگریز کے مکمل بائیکاٹ کی تجویز کی منظوری کے ساتھ مکمل آزادی کا اعلان کیا گیا، اور ارکان جمعیۃ علماء سے انگریز کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی اپیل بھی شامل رہی۔

جمعیۃ علماء کے اس جراتمندانہ اعلان کا اثر ہونا تھا وہ ہوا، برطانوی حکومت کے کارندے جبر وتشدد کے لئے میدان میں آئے اور گرفتاریاں شروع کر دیں، اور راہ حق کے ان مسافروں کو پس زنداں کر دیا، ان مجاہدین کی بڑی تعداد کو گرفتار و قید کیا، کچھ نام درج ہیں:

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا قاسم صاحبؒ شاہجہانپوریؒ، حضرت مولانا ابوالوفاءؒ شاہجہانپوریؒ، مولانا محمد شاہد فاخریؒ، مولانا محمد اسماعیل سنبھلیؒ، اور حضرت مولانا اختر الاسلام صاحبؒ۔

مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء میں اتحاد کی کوشش

جمعیۃ علماء ہندوستان کی مکمل آزادی کی طلبگار تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی آزادی پر دوسرے کئی اسلامی ممالک کی آزادی کا مدار تھا اب یہ مکمل آزاد نہ ہوا تو دوسرے ممالک کا کیا بنتا، جبکہ مسلم لیگ کے قائدین کے مطمح نظر تھا کہ عارضی رعایت حاصل کر کے انگریزی سایۂ عاطفت میں زندگی گزاری جائے، کامل آزادی کا ذکر بھی انکی زبانوں پر نہ ہوتا تھا، دونوں جماعتوں کے نقطہ نظر میں یہی بنیادی فرق تھا، اس تضاد کے باوجود بعض احباب خیر نے 1945ء کے اوائل میں ملی نفع کی خاطر دونوں جماعتوں میں اتفاق واتحاد کی کوشش کی، اس مقصد کے لئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت مولانا کفایت اللہ صاحبؒ کو بصد اصرار واحترام مسٹر جناح سے ملاقات کے لئے بھیجا، اس ملاقات کے لئے پہلے یہ طے تھا کہ دونوں جماعتوں میں خلیج کو کم کیا جاسکے، لیکن مسٹر جناح نے مفاہمت کے لئے یہ شرط رکھی کہ جمعیۃ علماء ہند کے احباب کانگریس سے استعفیٰ دے کر مسلم لیگ کے ارکان بن کر اس کے احکام پر عمل کریں، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے قبولیت کی رضامندی ظاہر کیا اور یہ شرط رکھی کہ مسلم لیگ پر لازم ہوگا کہ حکومت برطانیہ کے سامنے مکمل آزادی کا مطالبہ رکھے اگر حکومت برطانیہ قبول نہ کرے تو لیگ جارحانہ اقدام کرے۔ اور اس طرح اتحاد کی کوشش بے نتیجہ اختتام پذیر ہوئی۔

ہندوستان چھوڑو تحریک

یہ تحریک انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے گاندھی جی نے شروع کی تھی، اس کا مقصد سول نافرمانی کر کے انگریزی سامراج کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کرنا تھا، پورا ملک اس میں شریک ہوا، مسلمانوں نے بھی بخوبی اپنا کردار نبھایا، اصل بات یہ تھی کہ یورپ میں جنگ عظیم جاری تھی، برطانیہ ہندوستان سے مدد کا خواہاں تھا، ہندوستان کے کسی طرح کی مدد سے انکار کے بعد بھی جنگی مدد کے لئے اپنا نمائندہ سر اسٹیفورڈ کو ہندوستان بھیجا، تاکہ ہندوستانی عمائدین سے گفتگو کر کے عارضی حکومت سازی پر آمادہ کر سکے، مگر بات یہاں آکر پھنس گئی کہ برطانوی نمائندہ چاہتا تھا کہ اب جنگی امداد دے دو اور اقتدار کی منتقلی، حکومت سازی جنگ کے اختتام کے بعد ہو اور ہندوستانی قائدین چاہتے تھے کہ دوران جنگ ہی یہ سارے کام ہو جائیں۔ اس لئے جمعیۃ علماء اور کانگریس کے قائدین نے گریس کے اس پلان کو رد کیا، اس پروگرام کی

ناکامی سے حکومت برطانیہ بوکھلا گئی اور انتقامی کاروائی کرتے ہوئے 1942ء میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ایک تقریر کا بہانہ بناتے ہوئے گرفتار کرلیا پھر اگست 1942ء میں کانگریس نے اپنی مجلس عاملہ میں انگریز کو دھمکی دی کہ ہندوستان چھوڑ دو ورنہ حالات سنگین ہو جائیں گے، اس کی تائید جمعیۃ علماء نے بھی کی۔

اس نعرے کے آتے ہی پورے ملک میں طوفان برپا ہو گیا، کانگریس اور دوسری جماعتوں کے ارکان کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جنگ آزادی سے وابستہ ہر فرد کو گرفتار وقید کیا گیا، اس قید و بند سے حکومت برطانیہ کا مقصد یہ تھا کہ آزادی کے جذبات کو مدھم یا سرد کر دیا جائے، مگر دشمن کی ان کاروائیوں نے ہندوستانیوں کے عزم واستقلال میں اضافہ کر دیا، اور پورے ملک میں انگریز کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی، لوگ سڑکوں پر نکل آئے بجلی کا نظام ناکارہ کر دیا، حکومتی دفاتر، تھانے اور کچہریوں کو نذر آتش کر دیا، حکومت پندرہ دن تک مفلوج رہی اور پولیس اور فوج عضو معطل بنی رہی، اس کے بعد انگریزی حکوت نے ظلم وتشدد کا سہارا لیا اور آزادی کے متوالوں پر متعدد مقامات پر گولیاں چلائیں اور ہزاروں کو قتل کیا، ان اقدامات سے ظاہری طور پر جذبات دب گئے، مگر حکومت کو محسوس ہوا کہ اب ہندوستانی سرزمین ان کے لئے تنگ ہو گئی ہے۔

شملہ کانفرنس

1944ء میں برطانوی حکومت کا نیا وائسرائے لارڈ ویول ہندوستان آیا، سب سے پہلے اس نے 1942ء کے تمام گرفتار شدہ قائدین کو رہا کرنے کا حکم دیا، چنانچہ مئی 1944ء جون 1945ء کے درمیان سب لوگ آزاد کر دئے گئے، اور یہ تجویز رکھی کہ آزادی کے پہلے مرحلہ میں ایک بااختیار اعلیٰ اختیاراتی کونسل قائم کی جائے جس میں ہندو اور مسلمان مساوی ہوں، اس پروگرام پر عمل درآمد کرنے کے لئے لارڈ ویول نے ایک مشاورتی نشست کا اہتمام کیا، جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے قائدین کو شرکت کے لئے مدعو کیا گیا، تمام تر کوششوں کے باوجود یہ کانفرنس بھی ناکام ہوئی، اس کی ناکامی کا بنیادی سبب مسٹر جناح تھے، انہوں نے یہ شرط رکھی کہ اس اعلیٰ اختیاراتی کونسل میں شامل کئے جانے والے تمام مسلم قائدین مسلم لیگ کے منتخب کردہ ہوں، برطانوی وائسرائے نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا اس طرح یہ کانفرنس بھی 14 جولائی 1945ء کو ناکام ہو گئی۔

وطن تقسیم کی راہ پر

شملہ کانفرنس اور کرپس مشن کے بے نتیجہ ثابت ہونے کے بعد ہندوستان میں موجود برطانوی وائسرائے نے لندن سفر کیا، واپسی پر اگست 1945ء میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں فرقہ وارانہ اساس پر انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا، تاکہ ہر جماعت اپنی قوم کی نمائندگی کا ثبوت پیش کر سکے، مسلم قوم کی نمائندہ جماعت ہونے کو ثابت کرنے کے لئے مسلم لیگ سامنے آئی، اس کے ساتھ ہی جمعیۃ علماء ہند نے قوم پرست مسلم جماعتوں کا گروپ آل انڈیا مسلم پارلیمنٹری بورڈ، کے نام سے تشکیل دیا، تاکہ یہ بتاسکے کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ مسلم لیگ 1945ء سے ہی مسلسل الگ ملک پاکستان بنانے کا مطالبہ کر رہی تھی، بڑے سنہرے خواب دکھائے، عوام وخواص کو

ایسا محسوس ہوا کہ یہ قیام پاکستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ خلافت راشدہ کو قائم کرنے کا مشن ہے، لیگی کارکن مسلم لیگ کی تائید وحمایت نہ کرنے والے مسلمانوں کو مسلمان ہی نہ سمجھتے تھے، اسی وجہ سے "مسلم پارلیمنٹری بورد" کے عمائدین کو جابجا تشدد کا نشانہ بنایا، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو سید پور ضلع رنگپور بنگال اور بھاگلپور وغیرہ میں لیگی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جمعیۃ علماء ہند نے تقسیم کی مخالفت کی اور قضیہ کے حل کے لئے مختلف تجاویز پیش کیا مگر کامیابی نہ ملی۔ الیکشن کے نتائج نے مسلم لیگ کے فکر کو تقویت بخشا، اس لئے کہ 84٪ سیٹیں مسلم لیگ اور 16٪ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے حصہ میں آئی تھیں، ووٹوں کے تناسب میں بھی مسلم لیگ آگے تھی، اس کو 60٪ اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کو 40 فیصد ووٹ ملے تھے۔

برطانوی حکومت بغور اس صورتحال کا مشاہدہ کر رہی تھی، لہٰذا اس نے اپنے تین وزیر ہندوستان بھیجے، تاکہ سیاسی قائدین سے مل کر مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا جاسکے، اس برطانوی وفد نے ہندوستان پہنچ کر کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ، کانگریس اور مسلم لیگ کے قائدین سے طویل گفتگو کی، کچھ سفارشات بھی پیش کیے، ان میں سے ایک خاص بات یہ تھی مسلم لیگ کے تقسیم ہند کے مطالبہ کو مختلف اسباب کی بناء پر رد کر دیا گیا تھا، دوسری اہم تجویز تھی ایک عارضی حکومت کا قیام، یہ مسئلہ بھی مسلم لیگ کے ضدی رویہ کی وجہ مؤخر ہوتا رہا، لیکن جب 1946ء میں مسلم لیگ نے برطانوی وزراء کی سفارشات کو رد کر دیا اور اعلان کیا کہ 16 اگست کو یوم جہاد منائے گی پاکستان بنانے کے لئے، لہٰذا وائسرائے نے کانگریس کو حکومت سازی کی دعوت دی اور مسٹر جواہر لال نہرو کی قیادت میں حکومت تشکیل دی گئی، مسلم لیگ کی حکومت میں شریک نہ ہوئی، لیکن بعد میں اس کا حصہ بنی، اور عارضی حکومت میں شریک ہونا بھی مسلم لیگ اس حکمت عملی کا حصہ تھا، اس مسلم لیگ نے ایکشن ڈے منایا، جس کی وجہ سے ملک کے طول وعرض میں فسادات پھوٹ پڑے، صرف کلکتہ شہر میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو مسلمان کا قتل ہوا، بنگال کے نواکھائی میں لیگی اوباشوں نے 200 سے زائد معصوم ہندوؤں کو قتل کیا اور اس طرح ہر طرف خون کی ہولی کھیلی گئی۔ ان لیگی کارندوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ عارضی حکومت میں شامل ہو کر حکومت کے کاموں میں روڑے اٹکاتے، تاکہ کانگریس ارکان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کانگریس اور مسلم لیگ ایک ساتھ حکومت نہیں چلاسکتے۔ اس طرح کے پے در پے اقدام سے ہندو مسلمان کے دل میں نفرت نے جگہ بنائی اور پھر کوئی بھی ملک وملت کے انجام بد پر غور کرنے کے لئے تیار نہ تھا، بلکہ سب کی خواہش تھی کہ اپنی مرضی کی حکومت مل جائے۔ مسلم لیگ کی تمنا تھی کہ اسکی حکومت میں کوئی غیر شریک نہ ہو اور کچھ ہندو جیسے راج گوپال آچاریہ، سردار پٹیل اور پنڈت ولبھ پنت کی کوشش تھی کہ ایک وسیع تر ہندو مملکت بن جائے۔ یہ وہ حالات تھے کہ ہر لمحہ آزادی اور تقسیم کے قریب ہوتا گیا اور 15 اگست 1947ء کو آزاد ہونے سے پہلے 14 اگست 1947ء کو تقسیم ہو گیا۔

24.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دارالعلوم دیوبند سے وابستہ علماء میں ایک مشہور عالم شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے 1910 میں "جمعیت الانصار" نامی تنظیم کے ذریعہ کئی علماء کرام اور عوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، نیز اس تنظیم کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مدارس خاص طور پر دارالعلوم دیوبند انگریزوں کے شر سے محفوظ رہ سکے، جیسی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

- مولانا عبید اللہ سندھی کی کوششوں سے شروع کی گئی تحریک ریشمی رومال کا دہلی کی فتح پوری مسجد میں کس طرح قیام عمل میں آیا، نیز اس تنظیم کے ساتھ شیخ الہند اور آپ کے شاگردوں نے پورے ملک میں مراکز قائم کیے، اس تحریک کو مضبوط بنانے کے لیے افغانستان اور حجاز مقدس کا سفر علماء کرام نے کیا، تاکہ سلطنت عثمانیہ کے ذریعہ مضبوطی پیدا ہو اور ہندوستان انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہو سکے، مگر اس تحریک میں بھی علماء کامیاب نہ ہو سکے اور جیل کی سلاخوں میں قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔

- جن ریشمی کپڑوں پر خطوط لکھے گئے تھے وہ کچھ کوتاہیوں کی بنا پر انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے، جس کی وجہ سے انگریزوں نے سازش کر کے شیخ الہند کو مکہ سے گرفتار کر کے مالٹا کی جیل بھیج دیا، بعد تفتیش ثبوت ناکافی ہونے کی بنا پر رہائی کا حکم جاری ہوا، اس طرح شیخ الہند اور آپ کے ساتھی 3 سال دو مہینے کے بعد 7 مارچ 1920ء کو رہا کر دیے گئے۔

- 3 دسمبر 1919ء کو امرتسر خلافت کمیٹی کے جلسے میں جمعیت علماء ہند کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا، چنانچہ جمعیت کے پہلے صدر مولانا کفایت اللہ کو منتخب کیا گیا، جبکہ ناظم عمومی کے عہدے پر مولانا احمد سعید فائز ہوئے۔

- ترک موالات یعنی انگریزوں کے ساتھ کسی بھی طرح کا معاملہ کرنے سے روکا گیا اور فتوی کی شکل میں اس کے حرام ہونے کی تائید تقریباً 200 علماء نے کیا، جس میں چند نکات کی نشاندہی کی گئی، مثلاً تمام سرکاری اعزازات و خطابات کو ترک کیا جائے، انگریزوں کو کسی طرح کا تجارتی فائدہ نہ پہنچایا جائے، ہندوستانی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے سرکاری امداد کا قبول نہ کرنا، انگریزوں کے ذریعہ چلائے جانے والے اداروں سے تعلق نہ رکھنا، انگریزی فوج میں ملازمت نہ کرنا، انگریزی عدالتوں میں اپنے مقدمات نہ لے جانا اور نہ اس کی پیروی کرنا۔

- جمعیت علماء ہند اور خلافت تحریک سے وابستہ علماء اسی طرح گاندھی جی اور آپ کے ساتھی اور تمام مسلم عوام و علماء نے اس تحریک (ترک موالات) میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا نیز عدم تشدد کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

- ترک موالات تحریک کو 4 فروری 1922ء کو برطانوی پولیس چوکی کے نذر آتش کرنے کی وجہ سے روک دیا گیا، اس تحریک میں شامل 30 ہزار لوگوں کو جیل میں ڈالا گیا جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔

- انگریزوں کے ذریعہ تیار کردہ "شدھی تحریک" جس کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنا تھا مسلم علماء نے دور اندیشی سے ایک کمیٹی 1923ء میں "شعبۂ تبلیغ و حفاظتِ دین" قائم کر کے مسلمانوں کو ارتداد سے نہ صرف بچایا بلکہ ہندو مسلم اتحاد بھی برقرار رکھا، اس طرح انگریز اپنی اس سازش میں بھی ناکام و نامراد رہے۔
- گاندھی جی نے ایک تحریک "سول نافرمانی" کے نام سے گجرات میں شروع کی، چنانچہ اس تحریک میں پورا ہندوستان شامل ہوا، اس تحریک میں اکابروں نے یہ طریقہ اپنایا کہ گروپ کی شکل میں گرفتاریاں دیں اور ہر گروپ کا ایک لیڈر منتخب کیا جائے، چنانچہ سب سے پہلے مفتی کفایت اللہ کو دہلی سے بحیثیت لیڈر گرفتار کیا گیا جو ایک لاکھ لوگوں کی قیادت کر رہے تھے، اس تحریک میں 90 ہزار لوگوں نے گرفتاریاں دیں جن میں (44500) مسلمان تھے۔

24.8 نمونہ امتحانی سوالات

24.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جمعیت الانصار کا قیام کس سن میں ہوا؟

(a). 1909 (b). 1910 (c). 1911 (d). 1921

2. جمعیت الانصار کے ناظم کون تھے؟

(a). مولانا قاسم نانوتوی (b). مولانا ارشد مدنی (c). مولانا عبید اللہ سندھی (d). تمام غلط

3. اسیر ان مالٹا کتنے سال قید میں رہے؟

(a). تین سال دو مہینے (b). تین سال (c). تین سال تین مہینے (d). چار سال

4. جمعیت علماء ہند کا قیام کس سن میں ہوا؟

(a). 1900 (b). 1909 (c). 1919 (d). 1920

5. شدھی تحریک کتنے سال تک قائم رہی؟

(a). 20 سال (b). 50 سال (c). 6 سال (d). 8 سال

6. سائمن کمیشن ہندوستان کس سن میں آیا؟

(a). 1908 (b). 1918 (c). 1928 (d). 1938

7. جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد کس نے رکھی؟

(a). شیخ الہند نے (b). سر سید احمد خان نے (c). سید سلیمان ندوی نے (d). تمام غلط

8. تحریک سول نافرمانی میں کتنے لوگ گرفتار ہوئے؟

(a).90 ہزار　(b).80ہزار　(c).70ہزار　(d). 44ہزار500

9. ہندوستان چھوڑو نعرہ کس نے دیا؟

(a). جمعیت علماء نے　(b).کانگرس نے　(c). مسلم لیگ نے　(d). تینوں نے

10. ہندوستان چھوڑو تحریک کس نے شروع کی؟

(a). نہرو نے　(b). گاندھی نے　(c). پٹیل نے　(d). تمام غلط

24.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. شملہ کانفرنس پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. شدھی تحریک اور اس کے مقصدِ قیام کو واضح کریں۔
3. گاندھی کے ذریعہ شروع کی گئی تحریک سول نافرمانی کا کیا اثر ہوا؟
4. 1935ء میں انگریزوں کے ذریعہ شروع کیے گئے ایکٹ پر روشنی ڈالیں۔
5. جمعیت الانصار نامی تنظیم کا تعارفی خاکہ پیش کریں۔

24.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک ریشمی رومال پر ایک مفصل نوٹ لکھیے۔
2. جمعیت علماء کے قیام و مقاصد پر تفصیلی بحث کیجیے۔
3. ہندوستان چھوڑو تحریک کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

24.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	تحریک آزادی اور مسلمان	:	مولانا اسیر ادروی
2.	تحریک آزادی ہند میں علماء اور عوام کا کردار	:	مفتی سید سلمان منصور پوری تاریخ دیوبند
3.	تاریخ دیوبند	:	سید محبوب رضوی
4.	تحریک شیخ الہند	:	مولانا محمد میاں
5.	آزادی سے جمہوریت تک	:	مولانا ندیم الواجدی

بی۔اے، اسلامک اسٹڈیز

پانچواں پرچہ (اسلام ہندوستان میں)

جملہ نمبرات:70 **وقت:3 گھنٹے**

ہدایات:

1. حصہ اول میں 1 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔ 1x10=10

i. محمد بن قاسم نے جب سندھ پر حملہ کیا تو اس وقت راجہ کون تھا؟

(a). راجہ گوپال (b). راجہ منیش (c). راجہ اہرن (d). راجہ داہر

ii. کتاب "سدھانت" کس زبان میں تصنیف کی گئی تھی؟

(a). عربی (b). یونانی (c). سنسکرت (d). فارسی

iii. دہلی سلطنت میں کس سلطان نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ شروع کیا؟

(a). علاءالدین خلجی (b). بلبن (c). سکندر لودھی (d). ایلتتمش

iv. "فتاویٰ غیاثیہ" کا تعلق کس سلطان کے عہد سے ہے؟

(a). غیاث الدین بلبن (b). محمد بن تغلق (c). ناصر الدین محمود (d). سکندر لودھی

v. آگرہ کا شہر کس سلطان نے بنوایا؟

(a). قطب الدین ایبک (b). سکندر لودھی (c). محمد تغلق (d). غیاث الدین بلبن

vi. پانی پت کی پہلی جنگ کب ہوئی؟

(a).1526ء (b).1420ء (c).1626ء (d).1545ء

vii. مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کب ہوا؟

(a).1857ء (b).1762ء (c).1845ء (d).1850ء

viii. "رام چرت مانس" کس کی تصنیف ہے؟

(a). تلسی داس (b). کبیر داس (c). رحیم داس (d). پورن آنند

ix. ایسٹ انڈیا کمپنی کا آغاز کہاں ہوا؟

(a). حیدر آباد (b). ممبئی (c). کلکتہ (d). سورت

x. "اسباب بغاوت ہند" کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a). سر سید احمد خاں (b). علامہ شبلی نعمانی (c). محسن الملک (d). مولوی نذیر احمد

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو لفظوں پر مشتمل ہو۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبر مختص ہیں۔ 6x1=6

2. عربوں کے توسط سے ہندوستان میں درآمد کی جانے والی اشیا کے بارے میں لکھیے۔
3. دہلی سلطنت کے قیام میں قطب الدین ایبک کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
4. محمد بن تغلق کی تعمیراتی خدمات پر تبصرہ کیجیے۔
5. ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے قیام کے اسباب بیان کیجیے۔
6. جلال الدین محمد اکبر کے نظم ونسق کا جائزہ لیجیے۔
7. ایسٹ انڈیا کمپنی پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
8. ریشمی رومال تحریک کی نوعیت اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔
9. دارالعلوم دیوبند کے قیام کی وجوہات پر مضمون لکھیے۔

(ج) حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً 500 لفظوں پر مشتمل ہو۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔

10. عرب وہند تعلقات کے آغاز وارتقا پر ایک مضمون لکھیے۔
11. عہد خلجی کی اصلاحی کوششوں پر تفصیلی گفتگو کیجیے۔
12. مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب بیان کیجیے۔
13. مغل فن موسیقی اور مصوری میں عہد شاہ جہانی کے کارناموں کا تجزیہ کیجیے۔
14. 1857ء کی جنگ آزادی پر تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔